Click here to Visit Complete Collection

داؤد رہبر

سلام و پیام

جلد دوم

KUTABKHANA OSMANIA

891.4396 Dawood Rahbar
Salaam-o-Payaam(vol. II)/ Dawood Rahbar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2004.
472pp.
1. Urdu Literature - Letters.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2004
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1591-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

KUTABKHANA OSMANIA

سلام و پیام

جلد دوم

مکاتیب

داؤد رہبر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ترتیب

دیباچہ	5
مکتوب الیہم کا تعارف	8
خطوط بنام:	
اعجاز حسین بٹالوی	11
آغا بابر	76
ضیاء محی الدین	99
وجیہہ الدین احمد	108
صبیحہ غلام جیلانی	157
حمید نسیم	161
ڈاکٹر جمیل جالبی	183
مشفق خواجہ	216
سید امجد الطاف	229
آفتاب احمد خاں	231
ڈاکٹر نعمان الحق	237
عبدالوہاب خاں سلیم	265
ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو	277
پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر	290
ڈاکٹر وزیر آغا	304
احمد ندیم قاسمی	311
انتظار حسین	311
ڈاکٹر اسلم فرخی	315
ڈاکٹر آصف فرخی	318
افتخار عارف	320
محمد سعید شیخ	321
ڈاکٹر وحید قریشی	322
ڈاکٹر محمد سہیل عمر	324
چودھری نیاز احمد	326
افتخار جالب	331
ڈاکٹر آغا اشرف علی	335
نوید ریاض	338
حیات احمد خاں	344
بیگم عاتکہ صدیقہ	345
لطف المنان خاں	354
خالد احمد	357
ظفر احمد چودھری	361
اے۔ایچ۔انجم	364
شمیم احمد میرزا	365
سیمیں ایوب	368
نصرت اقبال	369
پروفیسر عبدالقوی ضیاء	370
سہیل صفدر	372
بیگم شبنم شکیل	373
بیگم رفعت مرتضیٰ	375
ایوب اولیاء	379
ڈاکٹر جمال قادری	384
بیگم عابدہ احمد	385
مظفر۔اے۔غفار	386
خالد اقبال یاسر	387
پروفیسر منظور الٰہی	388
خورشید غیاث	389
خالد غیاث	390
محمد ایوب	390

KUTABKHANA OSMANIA

تنویر قیصر شاہد	391
قیوم الملکی	392
محب عارفی	393
اُویس صادق ملک	395
جوہر میر	396
اعجاز قمر	398
ڈاکٹر اعجاز قریشی	399
سجاد حیدر نسیم	400
کرنل انور احمد	400
ضمیمہ: بہت نئے خطوط	
بنام:	
ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب	402
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب	403
پروفیسر مختار الدین احمد صاحب	404
ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب	406
مشفق خواجہ صاحب	408
پروفیسر نعمان الحق صاحب	409
ضیاء محی الدین صاحب	411
ڈاکٹر آصف فرخی صاحب	412
شمیم میرزا صاحب	413
بخدمت آغا بابر مرحوم	415
چودھری نیاز احمد صاحب	415
اعجاز حسین بٹالوی صاحب	416
ضیاء محی الدین صاحب	423
ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب	423
ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب	430
مشفق خواجہ صاحب	431
چودھری نیاز احمد صاحب	432
عبدالوہاب خاں سلیم صاحب	433
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب	434
ڈاکٹر نعمان الحق صاحب	437
عاتکہ صدیقہ صاحبہ	437
ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب	438
ڈاکٹر وزیر آغا صاحب	439
نوید ریاض صاحب	440
وجیہہ الدین احمد صاحب	441
محمد ایوب صاحب	444
اویس ملک صاحب	445
ڈاکٹر گیان چند صاحب	446
سید شمیم رجز صاحب	447
شفیق نیازی صاحب	448
راغب شکیب صاحب	448
ڈاکٹر عطا خورشید صاحب	452
پروفیسر ندیم خاں صاحب	453
ضمیمہ: بہت پرانے خطوط	
بنام:	
رضوی صاحب	453
مشفق خواجہ صاحب	454
مولانا صلاح الدین احمد صاحب	459

دیباچہ

سلام و پیام کی جلد اوّل کی اشاعت کے بعد ہمارے باغِ تہذیب کے دو باغبان جنت کو سدھارے آغا بابر اور حمید نسیم۔ آغا صاحب کا انتقال ۲۶۔ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ہوا۔ حکومت پاکستان کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو کر انہوں نے امریکہ میں اپنی دختر ڈاکٹر بابرہ کے پاس میری ٹاؤن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ قصبہ نیو یارک کے نواح میں ہے۔ یہاں انہوں نے ''نشست'' نام سے ایک کلچرل انجمن قائم کی۔ یہیں رہ کر خدوخال کے عنوان سے ایک سلسلہ یادوں کا قلمبند کیا۔ اُن کے اس مشغلے میں میرے اکسانے کو بھی کچھ دخل تھا۔ یہ سلسلہ ایک کتاب کی شکل میں عنقریب لاہور کے مطبعِ سنگ میل سے شائع ہوگا۔

میرا رشتۂ مودّت ان کے برادر عزیز اعجاز حسین بٹالوی صاحب سے بھی عمر بھر کا ہے اور ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم سے بھی مجھ کو نیاز مندی رہی۔ میں نے اپنے آپ کو ان تینوں بھائیوں کا برخوردار سمجھا اور اس تعلق پر نازاں رہا۔

آغا بابر صاحب کی وفات کے چند ہی روز بعد حمید نسیم صاحب نے انتقال کیا۔ ان سے میری مراسلت کا آغاز ۵۔ ستمبر ۱۹۹۵ء کو ہوا۔ اعجاز حسین بٹالوی صاحب سے انہیں خبر ملی کہ میں اردو کی آپ بیتیوں پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس میں ان کی آپ بیتی (ناممکن کی جستجو) پر بھی ایک باب ہوگا۔ اعجاز صاحب سے جب انہیں معلوم ہوا کہ اس کتاب کی تصنیف میں کم سے کم تین سال لگ جائیں گے تو انہیں مایوسی ہوئی۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ اتنے سال تو میں زندہ نہیں رہوں گا اور اس کتاب کا پڑھنا مجھے نصیب نہ ہوگا۔

ان دنوں میں جوشؔ صاحب کی آپ بیتی پر ایک باب لکھ رہا تھا۔ حمید نسیم صاحب کے پاسِ خاطر سے میں نے اب ان کی آپ بیتی پر لکھنا مقدم سمجھا اور ''یادوں کی برات'' والے باب کا لکھنا ملتوی کر دیا۔ خط لکھ کر میں نے حمید نسیم صاحب کو اس فیصلے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اب میں نے ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا ہے جس میں ذوالفقار علی بخاری صاحب کی آپ بیتی (سرگزشت) اور آپ کی آپ بیتی دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ رہے گا۔ اس سلسلے کے چند ابواب لکھے گئے اور لاہور کے ادبی رسالہ ''علامت'' میں شائع ہوئے۔ (بعنوان: ریڈیو

برادری کے دو سربراہوں کی آپ بیتیاں) ''علامت'' میں ان ابواب کو پڑھ کر مرحوم بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مجھے اگا تار خط لکھے اور بڑی محبت کا اظہار کیا۔ اللہ ان کی روح کو جنت کی نعمتیں عطا فرمائے۔

مکاتیب کی اس دوسری جلد میں میرے صمیمی دوست وجیہہ الدین احمد صاحب (فرزند ارجمند مولانا صلاح الدین احمد مرحوم) کے نام جو خطوط ہیں، ان کا قصہ رنگین ہے۔ گزشتہ پچیس برسوں میں وقتاً فوقتاً میں انہیں اپنی غزلیں بھیجتا رہا۔ ۱۹۹۳ء میں، میں کراچی پہنچا تو وہاں انہوں نے مجھ سے کہا، اپنا کلام مرتب کر کے اسے چھپواتے کیوں نہیں؟ یہ محفوظ ہو جانا چاہیے۔ چار سال اور گزر گئے تو انہوں نے فون کی ایک گفتگو میں کہا، کہو تو میں یہاں تمہاری منظومات کی طباعت کا انتظام کروں۔ میں نے ان کے خیال کو خوش بختی سمجھا۔ غیر معمولی التفات اور اعتناء کے ساتھ انہوں نے میرے کلّیات کی طباعت کی نگرانی فرمائی اور پچھلے سال کلّیات کی طباعت مکمل کرا کے دم لیا۔

مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ کلّیات کا دیباچہ وجیہہ صاحب لکھیں، یہ بڑے قلندر منش اور گوشہ نشین آدمی ہیں اور نمود سے کتراتے ہیں۔ میری خواہش سن کر تذبذب میں رہے۔ میری ضد کو جان کر انہوں نے قلم اٹھایا ہی تھا کہ ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ بینائی کی کمزوری دور نہ ہوئی۔ پھر بھی یہ دیباچہ لکھنے میں لگے رہے۔ تغزل کا نفسیاتی تجزیہ اس دیباچے کا موضوع تھا۔

دو سال مسلسل ٹیلی فون پر مجھے بتاتے رہے کہ دیباچے کی شکل کیا بن رہی ہے۔ مجھے ان کی گفتگوؤں سے اندازہ ہوا کہ جو کچھ یہ لکھنا چاہتے ہیں، ایک دیباچے کے کوزے میں سما نہیں سکتا۔ ایک اچھی خاصی کتاب کی تصنیف اس کے لیے درکار ہے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ کلّیات ان کے دیباچے کے بغیر چھاپ دیے جائیں اور جو کچھ لکھا گیا نظر ثانی اور اضافات کے ساتھ کتاب کی صورت سے الگ شائع ہو۔

جیسی وسعت مطالعہ وجیہہ صاحب کے ہاں ہے، پاکستان میں کم ہی کسی کی ہوگی۔ دس سال یونائیٹڈ نیشنز کے ملازم ہو کر یہ مصر میں بھی رہے اور وہاں عربی بھی سیکھی۔ قرآن، حدیث، بائبل، مختلف ملتوں کے اساطیر تاریخ تمدن فنونِ لطیفہ، ادبیاتِ مشرق، ادبیات مغرب، ان سب میدانوں میں انہوں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ ان کی آزاد خیالی اور طبع کی رسائی کا بھی جواب نہیں۔ علم نفسیات کا گہرا مطالعہ انہوں نے کیا ہے۔ اس سے ان کی آزاد خیالی کو استحکام حاصل ہے۔

مجھ سے انہوں نے فون پر جو گفتگوئیں کیں، ان کی یادداشتیں میرے پاس جمع ہیں۔ ان شاء اللہ ان پر ایک مضمون کے لیے قلم اٹھاؤں گا۔

ان کے نام جو خطوط اس مجموعۂ مکاتیب میں ہیں، ان کا تعلق انہی ٹیلی فونی گفتگوؤں سے ہے۔

موجودہ مجموعے کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے۔ یہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو چالیس پچاس برس پہلے مولانا صلاح الدین احمد صاحب اور جناب مشفق خواجہ صاحب کو لکھے گئے۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کو میں نے جتنے خط لکھے، ان کے انتقال کے بعد ان کا پلندا ان کے فرزند معزالدین احمد صاحب سے عزیزہ عاتکہ صدیقہ نے حاصل کیا۔ اس میں ستر سے زیادہ خطوط تھے۔ اس عزیزہ نے مولانا کی سوانح عمری مرتب کرتے ہوئے سارا پلندا مجھے بھیجا۔ میں نے اس میں سے سولہ (یا شاید سترہ) خط

KUTABKHANA OSMANIA

چن کر تجویز پیش کی کہ سوانح عمری میں بس یہی شامل کیے جائیں۔ میری تجویز موصوفہ کو معقول لگی اور اس پر عمل کیا گیا۔ یہ انتخاب موجودہ جلد میں بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

راقم السطور صریرِ خامہ کا آدمی ہے۔ ای میل کے جال سے آزاد، ٹائپ رائٹر سے بھی اسے واسطہ کم ہی رہا۔ اس کے ہاتھ میں قلم ہی رہا۔

سلسلہ سلاموں کا میرے ہی قلم سے ہے
رسم نامہ لکھنے کی زندہ میرے دم سے ہے

فلوریڈا

۲۲۔جنوری ۲۰۰۲ء

خیر خواہ

داؤد رہبر

مکتوب الیہم کا تعارف

جن اصحاب کے نام اس دوسری جلد میں خطوط ہیں، ان میں سے متعدد کے نام جلد اول میں بھی خط موجود ہیں۔ جلد اول کے شروع میں ان سے مختصراً تعارف کرایا جا چکا ہے۔ زیادہ تعداد اس دوسری جلد میں ان صاحبان کی ہے جن کے نام جلد اول میں کوئی خط شامل نہیں۔ ان میں احمد ندیم قاسمی صاحب، انتظار حسین صاحب، ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، ڈاکٹر محمد سہیل عمر صاحب، چودھری نیاز احمد صاحب (مالک مطبعہ سنگ میل) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب مشہور ترین شخصیتیں ہیں۔ ان کے تعارف کی ضرورت نہیں، انہیں سب جانتے ہیں۔

دیگر ادب نواز:

پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر صاحب، آپ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے اورینٹل کالج میں ادبیاتِ اُردو کے استاد ہیں۔

خالد احمد صاحب:

آپ پاکستان کے مشہور صحافی ہیں۔ انگریزی کے کالم نگار ہیں۔

محمد سعید شیخ صاحب:

ادبی رسالہ ''علامت'' کے ایڈیٹر ہیں۔

افتخار جالب صاحب:

نقاد اور منفرد شاعر۔ ان کی تازہ ترین تصنیف کا عنوان ہے ''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر''

عاتکہ صدیقہ صاحبہ:

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی سوانح عمری کی مصنفہ، حالاً ان کی سکونت امریکہ میں ہے۔

جوہر میر صاحب:

حلقۂ اربابِ ذوق نیویارک کے ادبی رسالہ ''زاویہ'' کے ایڈیٹر ہیں۔

KUTABKHANA OSMANIA

شبنم شکیل صاحبہ:

سید عابد علی عابدؔ مرحوم کی دختر۔ جدید رنگ کی شاعرہ۔

بیگم عابدہ احمد:

جمہوریہ بھارت کے سابق صدر فخر الدین علی احمد مرحوم کی بیگم، دہلی کی غالب اکیڈمی کی سربراہ۔

پروفیسر عبد القوی ضیاء صاحب:

کینیڈا کے ایک کالج میں تاریخِ تمدن کے استاد، کینیڈا میں اُردو کی خدمات میں پیش پیش۔

رفعت مرتضیٰ صاحبہ:

افسانہ نگار، حالاً ان کی سکونت امریکہ میں ہے۔

ظفر احمد چودھری:

ریٹائرڈ ایئر مارشل، ایک زمانے میں پاکستان کی ایئر فورس کے کمانڈر ان چیف تھے۔ گورنمنٹ کالج میں میرے ہم درس تھے۔

پروفیسر مظفر اے غفارؔ:

نیشنل کالج آف آرٹس (لاہور) میں پڑھاتے ہیں۔ کلاسیکل موسیقی کے رسیا ہیں اور موسیقاروں کے مربیّ۔

عبد الوہابؔ خاں سلیم صاحب:

پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی لائبریری کے سابق لائبریرین۔ حالاً ان کی سکونت نیویارک میں ہے۔ بڑے علم دوست آدمی ہیں۔

شمیم میرزا صاحب:

پاکستان کے نامور وکیل۔ گزشتہ اٹھائیس برس سے ان کی سکونت فلوریڈا میں رہی ہے۔ یہاں بھی وکالت ہی سے انہوں نے روزی کمائی ہے۔

نصرت اقبال صاحب:

کینیڈا کے صدر مقام اوٹوا میں رہتے ہیں۔ ان کی ملازمت ریٹائرڈ ہونے سے پہلے پاکستان نیوی کے سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ کلاسیکل موسیقی کے ماہر ہیں۔ مصوری کا شغل بھی رکھتے ہیں۔

قیوم الملکی صاحب:

مجید ملکی کے بھائی ہیں۔ کلاسیکل موسیقی کے شائق ہیں۔ میرے بھائی محمد ایوب صاحب سے ان کی دوستی لائلپور میں ہوئی۔

اعجاز قمر صاحب:

۶۸-۱۹۶۶ء میں ان سے وسکانسن یونیورسٹی میں رسم و راہ رہی جہاں یہ طالب علم تھے۔

ڈاکٹر اعجاز قریشی صاحب:

یہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ ٹیری ٹاؤن (نیویارک) کی ادبی محفلوں میں ان سے ملاقات ہوئی۔

ثمینہ ایوب صاحبہ:

میرے برادر محمد ایوب صاحب کی دختر ہیں۔

خالد اقبال یاسر صاحب، پروفیسر منظور الٰہی صاحب، کرنل انور احمد صاحب، تنویر قیصر شاہد صاحب، محب عارفی صاحب اور اویس صادق ملک صاحب سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ ان کو خط ان کے کرم ناموں کے جواب میں لکھے گئے۔

1501 N.E. 32 Street

Pampano Beach, Florida 33064

9 November 1993

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی!

میزبان!

خدا تیری میز کو گلدستوں سے گلزار کیے رکھے۔ تیرے مہمانوں کا تنفس گرم بریانی کی باس سے بہرہ یاب رہے (اس حسن طلب کی داد ملے!)

اگر خدا نے چاہا تو اس مہینے کے آخر میں یاراں کی محفل جمے گی۔ (یار کی جمع رکنی اردو، پنجابی اور فارسی میں یاراں ہی تو ہے، یاروں کی محفل کیوں لکھوں، فارسی میں کہیں گے محفلِ یاراں، نہ کہ محفل یاروں)

کل ضیاء محی الدین کا خط ملا۔ اس کی مجبوری معلوم ہوئی۔ اس نے چاہا تھا کہ اسے برمنگھم سے چھٹی ایسی ملے کہ وہ لاہور کی نشستوں میں شریک ہو سکے۔ اس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ وہ ہسپانیہ میں ایک فلم کی شوٹنگ سے بروقت فارغ نہ ہو پائے گا، افسوس۔

لاہور میں ضیاء کے بھانجے نوید ریاض کے ہاں دو راتیں گزار کر تمہارے ہاں منتقل ہو جاؤں گا، شادمانی وہیں ملے گی۔

فلورڈا کی زندگی کی مزید جھلکیاں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ سعادت حسن منٹو کردار نگاری کرتا تھا، میں جھلکیاں لکھتا ہوں۔ میں نے حلقہ 'ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں اپنا مضمون ''انگلستان کی چند یادیں'' پڑھا، وہاں منٹو بھی رونق افروز تھے۔ مضمون سن کر انہوں نے چابک رسید کیا۔ ''بھلا یہ بھی کوئی قصہ گوئی ہے؟ بتایئے، کونسا کردار اس بیان میں ابھرا؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے گفتگو لکھی ہے، کردار نگاری نہیں کی۔'' مولانا صلاح الدین احمد بھی موجود تھے۔ انہوں نے مضمون مجھ سے لے کر ادبی دنیا میں شاباش کے ساتھ چھاپ دیا۔

تم فلوریڈا کے ساحل کے بنچ پر بیٹھ چکے ہو۔ اب جو گفتگو لکھ کر بھیج رہا ہوں، اس کا لطف تم زیادہ اٹھاؤ گے۔

فلاحت کو سلام

خدایا!

میں آیا کہ آیا

1501 N.E. 32 Street

Pampano Beach, Florida 33064

6 December, 1993

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی!

خوش گلِ شاہ دل، السلام علیکم،

کہاں سے لاؤں الفاظ کہ تمہاری مہر و محبت کا حق ادا ہو، نوید کے گھر سے لاہور کے ہوائی اڈے کا فاصلہ موٹر کار پر پانچ منٹ کی دوڑ کا ہے، ہوائی جہاز صبح ڈھائی بجے پہنچا۔ اس سراپا ایثار نے ساڑھے چار بجے تک اڈے کے باہر راہداری کے پروانہ اور سامان کے معائنہ کے باعث میرا انتظار کیا۔ تین روز بعد رخصت کی رات پھر وہی زحمت اُٹھائی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میرے خیر مقدم کو اور الوداع کو تم رات بھر جاگو۔ چنانچہ وہاں سے تمہارے ہاں منتقل نہ ہوا۔ تمہاری طبیعت ان دنوں افاقہ طلب بھی تھی، استراحت میں خلل ڈالنا غلط ہوتا۔

بہر حال بڑی بات تو یہ ہے کہ نوید رشید کا آباد گھر بھی دیکھ لیا اور تمہارا شادمان گھر بھی۔ دونوں گھروں میں منتخب کتابوں سے الماریاں معمور پائیں۔ تم نے نذر محمد اور حامد علی بیلا کے ریکارڈ سنوائے، نوید نے استاد فیاض خاں کی بھیروں کا ایک نادر ریکارڈ سنوایا۔

اور پھر تم نے ڈاکٹر جالبی اور انتظار حسین کو ڈنر میں شریک کر کے رونق بڑھائی۔ جالبی صاحب نے بہت ہی محبت کا سلوک رکھا۔ انتظار حسین سے مل کر یوں لگا کہ یہ میرا بھائی ہے اور میں اسے مدت سے جانتا ہوں۔ پیاری شخصیت ہے۔

سفرہ پر دیگر لذیذ نفائس کے درمیان دو طرح پکے ہوئے کریلے موجود تھے۔ ان کے پاس ہی نہایت پاکیزہ اور میٹھے امرود تھے۔ کریلے اور امرود موعود تھے، وعدہ ایفا ہوا، پہلے منہ نمکین ہوا پھر میٹھا ہوا۔

گرامی نیاز احمد صاحب سے رابطہ کی ابتداء ہوئی۔ پروف دیکھ کر جی خوش ہوا۔ یہ سب کچھ تمہارے توسل اور تمہاری تائید سے ہو رہا ہے۔ خدا نے تمہارا دل میرے حق میں گداختہ کیا۔ الشکر للہ۔

یہ خط اظہار تشکر کو ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر پھر خط لکھوں گا۔ فلاحت کی صحت مجھے سابق سے بہتر لگی۔ اللہ سب کو تندرست رکھے۔ سلمان سلمہ (جو ایک زمانے میں کٹ کٹ تھا) کو دیکھ کر بھی دل کو ٹھنڈک پہنچی۔

فلاحت کو سلام اور میزبانی کا شکریہ۔ سلمان اور شاہد کو دُعا۔ نیاز احمد صاحب اور انتظار حسین کو سلام۔ نوید نے آج فون پر اطلاع دی کہ موسیقی والی کتاب انہوں نے چپڑاسی کے ہاتھ تمہیں پہنچا دی۔ امید ہے تم نے حیات احمد خاں صاحب کے ہاں سے البموں کا ہر الفافہ حاصل کر لیا ہو گا اور جالبی صاحب سے ڈکشنری موصول ہو گئی ہو گی۔

تشنہ

11April, 1994

برادرِ رہبر و بابر!

سلام مسنون!

ضیاء محی الدین کی بہن رشیدہ سلیم سیمیں اور مسعود مجھے خط لکھتے ہیں تو سلام مسنون کر کے بات شروع

کرتے ہیں۔ میں پڑھ کر جی میں کہتا ہوں، سیدھا السلام علیکم کیوں نہیں لکھ دیتے۔ اگر ادیب بن کر دکھانا مقصود ہے تو آداب لکھیں، تسلیم لکھیں، بندگی لکھیں، رام رام لکھیں۔ سلام مسنون سن کر تو میں قل اعوذ باللہ سننے کو تیار ہو جاتا ہوں۔ (مسنون کے ہندی معنی شاید ہیں سنا ہوا)

امّا بعد، بھائی بابر کا وقت پاکستان میں کیسے گزر رہا ہے؟ اسلام آباد سے آرام آباد کب پہنچے؟ انہوں نے تمہارے ساتھ مل کر قطب الدین ایبک کا مزار پھر دیکھا یا نہیں؟ داتا کے دربار میں حاضر ہوئے یا نہیں؟ بیشتر وقت وہ گھر میں رہتے ہیں یا ملاقاتوں کو نکل جاتے ہیں؟ وہ مزاجاً حقہ پینے والے خانہ نشین بزرگ نہیں ہیں۔ میں جس شام تمہارے گھر میں تھا، تمہاری بہو نے رضی ترمذی سے کہا: ''بابا، کھانا تیار ہے۔'' میں سوچتا رہ گیا یہ وہی رضی ترمذی ہے، جس کی آمد حلقہ ارباب ذوق کے جلسہ میں سنسنی دوڑا دیتی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے رشک آیا کرتا تھا، بخدا۔

میں کبھی تصور نہیں کرسکتا کہ بابرہ یا ہما یا منزہ بھائی بابر کو بابا کہہ کر بلائیں، بزرگ بننے کی انہیں خواہش بھی نہیں۔ وہ رم زندگی کے لیے پیدا ہوئے۔ جس طرح ریاض قادر کا دوست خلیل الرحمٰن آہستگی کے لیے پیدا ہوا۔

بھائی بابر کو میرا اسلام پہنچے۔ آج اپریل کی گیارہویں ہے۔ میرا یہ خط ۲۴ یا ۲۵ اپریل کو لاہور پہنچے گا۔ وہ کہہ کے تو گئے تھے کہ اپریل کے آخر میں ان کی واپسی ہوگی لیکن میں جانتا ہوں اور سب جانتے ہیں کہ وہاں ان کے قیام کی توسیع ایک معمول ہے۔ چنانچہ میرے انتظار کو ہر سال طول ہے، وہ لوٹ کر اور بزم یاراں لوٹ کر آئیں تو میں ان کو فون کروں اور لاہور کی کہانی سنوں یعنی کہانی کو مسنون کروں، یعنی مسموع۔

آمدم برسر مطلب، یادگارِ داغ، یادگارِ داغ، یادگارِ داغ اگر میری عمر اس وقت چار ہوتی تو میں گریہ کر کر کے اُچھل اُچھل کر بے تال کتھک ناچ ناچ کر فرش پر ایڑی مار مار کر کہتا یادگارِ داغ۔ کیوں نہیں دیتے، مجھے یادگارِ داغ، مجھے کہیں سے لادو یادگارِ داغ۔

اس خط کے ملنے تک اگر کراچی سے وہ تمہیں حاصل ہو چکا ہو تو گویا تمہیں ایک تردّد سے چھٹی ہوئی۔ اگر تعویق درپیش رہی اور بھائی بابر پا بہ رکاب نہیں بلکہ پا بہ قطرۃ الطیارہ ہوئے تو موقع پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کراچی کے بزرگ جواب نواز ہیں، انہیں بندہ نوازی یاد دلاؤ، آفتاب احمد خاں عرف بلند بانگ کو میں نے خط لکھ دیا تھا۔ خدا جانے اس نے ہاتھ پیر ہلائے یا نہیں۔

میری درخواست یہ ہے کہ مشفق خواجہ صاحب کا ٹیلی فون نمبر دریافت کر کے انہیں فون فرماؤ اور ان تک (فریادِ داغ نہیں) فریادِ داؤد پہنچاؤ۔ ان کو بھی میرا خط اس بارے میں مل چکا ہے۔ ان سے کہو کہ یادگارِ داغ کا ایک نسخہ یا اس کی فوٹو کاپی تم کو تمہارے دفتر کے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے جلد از جلد بھیج دیں تا کہ بھائی بابر اسے ساتھ لا سکیں۔ فوٹو کاپی بنوانے میں جتنے روپے لگیں، میں بخوشی جلد انہیں بھیج دوں گا۔ داغ کے اس چوتھے دیوان پر ایک مختصر باب باندھے بغیر میرا کتابچہ مکمل نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس دیوان کے مطالعہ سے مزیدار باتیں حاصل ہوں گی۔

داغ کو بھول کر قوم کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ دوستوں سے کہو کہ حضرتِ داغ بھی ن۔م۔ تھے (نواب میرزا) اور پھر وہ اقبال کے استاد بھی تھے۔

پاکستان سے بھائی بابر میرے لیے قلفی نہ لائیں۔ اس کے راہ میں پگھل جانے کا خدشہ ہے۔ قلفی فلورڈا میں دستیاب ہے۔ ایک بنگلہ دیشی نے میرے گھر کے پاس دکان کھول دی ہے۔ وہاں قلفی ملتی ہے۔ بھائی جی صرف تین سوغاتیں لے کر آئیں:-

۱۔ حمید نسیم کی آپ بیتی پر تمہارا وہ تبصرہ جو قومی زبان میں چھپا ہے۔

۲۔ انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو کا وہ نمبر جس میں میرا مضمون داغ پر چھپا ہے۔

۳۔ یادگارِ داغ، بھگوان تمہیں دھن پتی رکھے، گھر میں سب کو دعا۔

8 June, 1994

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی!

ناظم سنگتِ یاراں

داغ نے ایک مدحیہ قصیدہ میں نظام کو رستم زماں کہا۔ اس بنا پر کہ نظام نے بندوق سے شیروں کا شکار کیا۔ میدانِ جنگ والے رستم شاہنامے میں رہ گئے۔ کشتی کے اکھاڑے والے رستم البتہ اب بھی ہیں۔

حمیدہ خانم کی آپ بیتی چھپے تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ مجھے بھجواؤ۔ عصمت چغتائی نے افسانے لکھے۔ حمیدہ خانم نے ''نام بدل'' کہانی نہیں لکھی۔ اس بی بی کو کہانی کہنا آتا ہے۔ جو چیز تم نے مجھے بھیجی ہے، اس کے قلم کا شاہکار ہے۔ کیا تمہارا اختر حسین رائے پوری اور اس کی بیگم سے میل جول رہا؟ لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ''ہم سفر'' چھپ کر آئے تو دیکھنا ہوگا کہ اس میں اختر حسین کی بیگم کی تصویریں بھی ہیں یا نہیں۔ قیاس ہے کہ یہ بیگم برقعہ پوش کبھی نہ رہی۔ اس کے عہد شباب کا فوٹو دیکھ کر ہی معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب کے تار جاں کو کس صورت کی دید نے چھیڑا۔ یوں کہ وہ تار جھنجنا اٹھا۔ بوڑھے باپو (مہاتما گاندھی) کی افلاطونی ہم بستریوں میں رومان کا شائبہ تک نہیں۔ مولوی صاحب اور حمیدہ خانم کی دوستی میں معصومیت اور رومان کی آمیزش سے ایک طلسماتی کہانی نکلی۔ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے۔ یہ مولوی صاحب کی بہو ہے یا ہو بہو یعنی ان کے خوابوں کی پری۔

بنارس کی سنگیت برادری میں ایک گھرانہ ہے۔ یہ لوگ مشرا کہلاتے ہیں۔ رسالہ آواز (جو آل انڈیا ریڈیو کا رسالہ ہے) میں اس کے ہجے مصرا ہیں، مشرا کے معنی ہیں ملاوٹ والے۔ آمیختہ، اس برادری کی کہانی یوں ہے کہ آج سے سات سو برس پہلے یہ لوگ اچھوت تھے، پھر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ گزشتہ دو صدیوں میں انہوں نے ہندو کلاکاروں سے شادیاں کیں اور بعض اولاد پھر سے ہندو ہوگئی اور اب یہ لوگ مشرا کہلائے۔ بیسویں صدی کا بہترین ہندو سارنگی نواز تھا" آں جہانی پنڈت گوپال مشرا، اس کے دو بیٹے ہیں۔ راجن ساجن مشرا، ان کی گائکی بڑی زوردار ہے۔ خاں صاحبان کی ٹکر کے لوگ ہیں۔ اس لیے کہ مشرا ہیں۔ ان کے گانے کے انداز میں کچھ بات بڑے غلام علی خاں صاحب کی ہے۔ کچھ امیر خاں صاحب کی۔

امیر خسرو بھی مشرا تھے، اختر حسین رائے پوری بھی۔ الطاف گوہر اور تجمل بھی۔ حمید نسیم بھی، ہدایت اللہ سردار اور سردار اقبال موکل بھی۔ مشرا لوگ پیوندی لوگ ہیں۔

حمیدہ خانم نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کو سید ہاشمی فریدآبادی کی والدہ سے بڑی عقیدت

KUTABKHANA OSMANIA

تھی۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ ہاشمی صاحب کی والدہ غالب کے شاگرد اور قرابت دار نواب علاء الدین خاں علائی رئیس لوہارو کی بیٹی تھی۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا

نجانے کس راہ کا

12 July, 1994

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی!

مجی، السلام علیکم

براؤن یونیورسٹی امریکہ کی بہترین دانش گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر نعمان الحق خیر آبادی نے اب اس یونیورسٹی میں اسلامیات کی تدریس کا کام سنبھالا ہے۔ اس سے پہلے ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی پڑھا چکے ہیں۔ مسلمان بزرگوں کی فلسفہ طرازی اور سائنس پردازی کی تاریخ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ اسی میدان میں ریسرچ کر کے انہوں نے تھیسس تیار کیا اور لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند لی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم ان کے جد امجد تھے۔ اپنے بزرگوں کے جوہر کے یہ سچے وارث ہیں۔ لندن میں نعمان صاحب کی بھائی عاشق سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ بھائی بابر بوسٹن تشریف لائے تو نعمان صاحب ان سے بھی ملے۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور بی بی سی میں نعمان صاحب کام کر چکے ہیں۔ تم سے ملیں گے تو موضوع گفتگو تمہارے ان کے درمیان بہت ہوں گے۔

خط پڑھ لیا۔ اب ان سے باتیں کرو اور ان کو پان کھلاؤ، یہ واپس امریکہ آ کر مجھے بتائیں گے، کیا باتیں ہوئیں۔

خانہ آباد، دولت زیادہ

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا

طنبورہ نواز

24 August 1994

یارم!

آج فون پر تم سے دو چار منٹ باتیں ہوئیں۔ دور پار بلکہ سمندر پار فون پر آخر کتنی باتیں ہو سکتی ہیں! چلغوزے ٹھنگنا اور الغوزے بجانا فون پر کیونکر ہو۔

بجا کہتے ہو کہ راشد صاحب، بھائی عاشق اور مولوی شفیع صاحب والے مضمون پراگندگی کی کہانیوں میں شامل نہیں ہونے چاہئیں کہ یہ مضمون تو ''نسخہ ہائے وفا'' ہیں۔

تمہارا خط سرسری نہ تھا۔ تم نے جی لگا کر لکھا۔ مہربانی۔ ''کلچر کی کھچڑی'' اور قومی زبان ابھی ٹیری ٹاؤن سے موصول نہیں ہوئے۔ ان شاء اللہ پرسوں تک مل جائیں گے۔

ضیاء محی الدین کو تم حوصلہ نہ دو گے تو کون دے گا۔ اس کو دعوت دے کر تم نے خوش کر دیا۔ نصیحت اور ملامت سے کیا فائدہ! نوبت جہاں تک پہنچی وہاں مداوا یہی ہے کہ اسے ملنسار دوست نصیب ہوں۔ اس کا بخت اچھا

ہے کہ تم نے اسے مرحبا کہا اور فلاحت نے اسے میلاد شریف کی کھیر کھلائی۔

فلاحت کو سلام

نصیر خاں کا استاد

داؤد رہبر

16 September, 1994

یار مہرباں!

تمہارے جگر بند سعادت مند عزیز سلمان صاحب نے تین صفحے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی نگارش کے جادو کی مشین سے مجھے پہنچا دیئے۔ میرے تشکر کا شربت بنا کر انہیں پلا دو۔

تمہارا رقعہ اور اس کے ساتھ کے ملفوفات مجھ تک نہ پہنچے یا تو پاکستان کے کارکنان برید سے کوتاہی ہوئی یا امریکی ڈاکیے نے لفافہ یہاں کسی ہمسائے کے گھر جا ڈالا۔ ایسی خرابی سابق میں بھی ہوئی۔

میں نے کل ایک عریضہ جناب شیخ نیاز احمد صاحب کو لکھا۔ اس کی فوٹو کاپی دیکھ لو اور اپنے پاس رکھو۔ میں نے جو مقدمہ تمہیں بھیجا تھا اور جو تم نے بھائی بابر کو دکھایا تھا، اس کی نقلیں میرے پاس محفوظ تھیں۔ میں نے فوٹو کاپی پچھلے دنوں بھائی بابر کو ٹیری ٹاؤن بھیجی۔ انہوں نے اسے پڑھ کر فون کیا اور مشورہ دیا کہ آخری تین صفحے حذف کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ بطور خاتمہ ایک نیا پیراگراف لکھا جائے۔ میں نے کہا، آمنا۔

جو تین صفحے خارج کیے، ان کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ نیا پیراگراف جو لکھا اس کی کاپی بھی۔ (صفحہ 15 پر) منصور حلاج والا مقالہ مجھے ۳۔ اکتوبر کو پیش کرنا ہے۔ اس کی کاپی تم کو بھیجوں گا۔ اچھا سا خط عن قریب لکھوں گا۔

فلاحت کو اور سلمان کو سلام

تمہارا گرویدہ

داؤد

19 September, 1994

شادماں!

تم سے گفتگو کرتے ہی میں نے مشفق خواجہ صاحب سے نمبر ملایا۔ انہوں نے بتایا کہ مضمون کی کتابت ابھی شروع نہیں ہوئی۔ اب وہ میرے نئے مضمون کے منتظر ہیں جو آج انہیں بھیج دیا گیا۔ تم بھی پڑھ لو، بھائی بابر کو بھی ایک کاپی بھیج دی جائے گی۔

جو کچھ میں نے نئے سرے سے لکھا ہے، اشعار کی مثالیں دے کر لکھا ہے۔ پہلی بار جو مضمون یادگار داغ پر لکھ کر بھیجا گیا تھا، وہ میں نے (دو چار عبارات قلم زد کر کے) نئے مقالے کے آخر میں ملحق کر دیا ہے۔ امید ہے نیا مضمون پڑھ کر تم کو تشفی ہوگی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نومبر میں ریٹائر ہو رہے ہیں۔ ریٹائرمنٹ آ رہی ہے تو نئے انتظام در پیش ہوتے ہیں۔ نیاز دور والے ابواب کتابی شکل میں چھاپنے کی اجازت مانگنے کو میں نے انہیں خط لکھ دیا تھا، اس خط کی کاپی تمہیں بھی بھیج دی تھی۔ نیاز احمد صاحب سے مشورہ کر کے جب مناسب سمجھو اس امر کا تتبع فرماؤ، مہربانی۔

KUTABKHANA OSMANIA

اگلے وقتوں میں لوگ خط کے آخر میں لکھا کرتے تھے:

''زیادہ زیادہ'' اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید مطلب یہ تھا کہ مزید کچھ لکھا تو زیادتی ہو جائے گی۔ تایا ابا ایک روز میرے ساتھ کسی بزرگ سے ملنے گئے۔ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر بولے، اب تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں۔

فلاحت کو سلام

ممکن کا جوئندہ

3 October, 1994

وفا کیش خیر اندیش!

اب کوئی یہ نہیں کہے گا کہ اس شخص نے یادگارِ داغ کو سرسری نظر سے دیکھا، تکملہ لکھ کر میرا جی خوش ہوا۔ اتنا شور مچا کہ دیوان حاصل کیا تو باقی تین دیوانوں کی وقعت سے اس کی وقعت زیادہ سمجھی، اسے اچھی طرح پڑھا۔

بھائی بابر سے اگر میں پوچھوں کہ آپ اب زاویہ نشین کیوں ہیں، خاموش کیوں ہیں۔ فون کیوں نہیں کرتے تو یہ گویا یاددہانی ہوگی ان کی درماندگی کی۔ اگر میں ٹیری ٹاؤن میں ڈیرا ڈالتا تو میل جول سے انہیں بہلاتا رہتا۔ میری متواتر فون زنی سے وہاں چہل پہل کیسے ہو۔ شامِ غریباں ان پر بھی ضرور آئی۔ اسی طرح جیسے ہر پردیسی پر آتی ہے۔ ان کا مزاج رجائی سہی لیکن اس وقت بشاشت کے لیے اولاد کا پاس ہونا کافی نہیں۔ اعزہ اور احباب کی صحبتیں بھی درکار ہیں۔ خدّ و خال کی تحریر کا ریلا چار پانچ سال چلا۔ اس سے فشار بھی ہوا اور تھکن بھی۔ ٹیری ٹاؤن میں انہوں نے جو دوست بنائے، لکھ پتی ہو کر بھی ''چکھ پتی'' نہیں ہیں۔ شوق پتی ہوں تو ہوں، ذوق پتی ہرگز نہیں ہیں۔

سودا کا مخمس اور حالی کا مسدس تم پڑھ چکے، اس خط کے ساتھ رنگین کاغذ پر ایک مثمن تمہیں بھیج رہا ہوں۔

فلاحت کو سلام۔

خلدون کے پسر کا ہے خاصا مقدمہ
حالی نے بھی ضخیم ہے لکھا مقدمہ
کب میں نے تم سے مانگا ہے اتنا مقدمہ
درکار ہے یہاں تو ذرا سا مقدمہ
دائر ہے ہائیکورٹ میں کیسا مقدمہ؟
کر ڈالو اب کتاب کا پورا مقدمہ
ہو کر فگار خامہ یہ نامہ نگار ہے
تکمیل کی خبر کا مجھے انتظار ہے

قلم بگوش!
(ہوئی صبح اور رکھ کر کان پر گھر سے قلم نکلے)

18 November, 1994

بزم آرا!

اکتوبر کی آخری اتوار کو امریکہ میں گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر دی جاتی ہیں۔ آج میں نے تم کو فون کیا تو نئے وقت کے حساب سے یہاں ساڑھے بارہ بجے تھے یا ساڑھے دس۔ اگر وہاں بھی گھڑیاں پیچھے کر دی گئی ہیں تو پھر شام لاہور کے ساڑھے نو بجے تم سے باتیں ہوئیں۔

کل رات ایک بجے میں اپنے ایک شاگرد کی بیاہ پارٹی میں شریک ہو کر واپس آیا۔ کئی برس پہلے بوسٹن میں میں اس کی پہلی شادی کی پارٹی میں بھی شریک ہوا تھا۔ وہ شادی ٹوٹ گئی اور کل اس نے دوسرا بیاہ کیا۔ یہ طالب علم مقدونیہ کا رہنے والا ہے۔ اپنی لکھی ہوئی ایک کہانی (تین شاگرد) میں میں اس کا تعارف کرا چکا ہوں۔ اس کا نام انصار وف ہے۔ اس کے ماں باپ اور چار چچا میامی میں رہتے ہیں۔ شادی کی اس تقریب میں تقریباً چالیس رشتہ داروں کا مجمع تھا۔ چار گھنٹے مقدونیہ کا ''بھنگڑا'' ہوتا رہا۔ میں تماشائی ہی رہا اور سوچتا رہا۔ اعجاز ہوتا تو ضرور اٹھ کر ناچ میں شریک ہو جاتا۔

خدا کے واسطے اوقاتِ شب و روز کی تقسیم میں تخلیقی کام کو مقدم رکھو۔ ایک تخلیقی منصوبہ چن کر اس کے لیے روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ وقف کرو، اپنے مطبوعہ مضامین و مقالات اور تبصروں اور افسانوں کو یکجا کرو، نئی چیزیں لکھنا جاری رکھو۔ ان کی اشاعت سے دوستوں اور شائقینِ ادب کو فرحت حاصل ہوگی۔

امرود یہاں نہیں ملتا۔ البتہ اس کا شربت ننھے کنستروں میں ملتا ہے۔ ہفتے میں دو تین بار پیتا ہوں۔ بنگلہ دیش کی دکان سے کبھی کبھی کریلے بھی مل جاتے ہیں۔ چھوٹے سائز کے کریلے بہتر ہوتے ہیں کہ ان میں تلخی ہوتی ہے۔ بڑے کریلے کڑوے نہیں ہوتے۔ کریلا کڑوا نہ ہو تو اس کی بجائے ٹنڈے کھانے چاہئیں۔

میں نے لاہور سے واپس آ کر لاہور والا لیکچر کسی امریکی دوست کو سال بھر نہ دکھایا۔ پچھلے دنوں بوسٹن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر دوست (Merlin Swartz) کو اس کی فوٹو کاپی بھیجی۔ یہ اسلامیات اور عربی کا استاد ہے۔ اس نے مقالہ پڑھ کر جو خط مجھے لکھا، اس کی کاپی ارسال ہے۔

امورِ اشاعت تصانیف کے بارے میں خطِ عن قریب لکھوں گا۔ جیسا کہ ٹیلی فون کرتے ہوئے میں نے اظہار کیا کہ میری خواہش یہ ہے کہ مکاتیب کے چھپ جانے کے بعد پراگندہ طبع لوگ کی باری آئے۔ نیاز صاحب سے مشورہ کر کے جو فیصلہ کرو مجھے قبول ہوگا۔

فلاحت کو سلام۔

نصیر خاں کا استاد

2 December, 1994

یارِ غار اعجاز بٹالوی کو آمدِ سال نو مبارک ہو، میں مدتوں یہ سمجھتا رہا کہ یارِ غار وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ بچپن میں کسی غار کے اندر ہمجولی پن رہا ہو۔ عربی پڑھی تو معلوم ہوا کہ غار اور غور دونوں ''غ ور'' سے مشتق

ہیں، غور کے معنی گہرائی، غار کے معنی گہرا۔

شمسی تقویم کا نوروز ہر سال جاڑوں میں آتا ہے۔ قمری تقویم کا نوروز گرمیوں میں بھی آ سکتا ہے۔

شمسی تقویم بندھی ہوئی سمفنی ہے، قمری تقویم خیال گائیکی۔

پچھلے سال ۲۔ دسمبر کو میں لاہور میں تھا۔ آج پھر ۲ دسمبر ہے، چھوٹی گھڑی بارہ بجاتی رہتی ہے۔ بڑی گھڑی نوروز بجاتی رہتی ہے۔

جن دنوں یادگار داغ کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی اور کوئی کام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا، ان دنوں تھوڑی بہت غزل گوئی البتہ ضرور ہوئی۔ اس کا ایک انتخاب ارسال ہے۔

دسمبر کے آغاز میں امریکی دوستوں کو تیس چالیس کارڈ بھیجنا میرا معمول ہے۔ ان کے ساتھ میں اپنی غزلوں کے بعض اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی ملفوف کیا کرتا ہوں۔ اب کے ایک اور طرح کی انگریزی نظم تیار کر کے تبریک کے ہمراہ بھیج رہا ہوں۔ تم بھی دیکھ لو، تفنن ہی تو ہے۔

کوئی دوست آئے تو میری ان غزلوں میں سے اپنی پسند کی غزل اس کو بھی سنا دو، رضی ترمذی تو اب تمہارے سمدھی ہیں۔ ان کو بہرحال سنا دو۔ ان کو میرا سلام۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

23 January, 1995

اعجاز نا!

امیر خسرو اوائل میں اپنی غزلیں خواجہ نظام الدین کو دکھایا کرتے تھے۔ خواجہ نے ان کو ان لفظوں میں ہدایت دی:- ''طرز صفاہانیان بگوئے یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز'' داغؔ کا کلام پڑھتے ہوئے مجھے یہ قول خواجہ کا یاد آیا۔ میری غزل گوئی گزشتہ سال اس قول سے متاثر رہی۔ آج کل میں غزل کم ہی کہتا ہوں۔ کل ایک غزل کی زمین سوجھی، پاؤں کا Fetish ہمارے ہاں عام ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرا Fetish بازو ہے، کل کی کہی ہوئی غزل بھیج رہا ہوں ؎

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
رکھتا ہے کھینچ کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

مولوی عبدالحق کو اصرار تھا کہ ''پاؤں'' کے صحیح ہجے ہیں ''پانو'' چنانچہ انجمن ترقی اردو کی مطبوعات میں یہ لفظ مولوی صاحب کے اصول کا تابع پایا جائے گا۔

میں نے افتخار عارفؔ کو ایک مضمون آج سے تین سال پہلے بھیجا تھا۔ اسلام آباد کے رسالہ ''ادبیات'' میں یہ اب آ کر چھپا ہے۔ اس کی فوٹو کاپی بھی ارسال ہے۔

6 February, 1995

مشفقا!

تمہیں فون کرنے سے پہلے صبح کہی ہوئی غزل بھائی بابر کو سنا دی تھی۔ انہوں نے سن کر ہنس کر داد

دی اور فرمایا، غزل اعجاز اور ضیاء کو بھیج دو کہ وہ کسی ڈنر کے بعد اسے نیبل ٹاک کے ضمن میں دوستوں کو سنا دیں۔

آج دو چار خط لکھے جائیں گے۔ پھر راگ رنگ کی سوچ ہوگی۔ عروض اور تال ودیا پر بیک وقت غور کیا جائے گا۔ آج کل اس خیال کا مزا لے رہا ہوں کہ شعر کا پہلا مصرع سنا کر پڑھنے والا چند لمحے خاموش رہتا ہے اور پھر دوسرا مصرع پڑھتا ہے۔ طبلہ بجانے والا ایسا نہیں کر سکتا، تال کے ایک چکر کا آخری ماترہ بجاتے ہی معاً دوسرے چکر کا پہلا ماترہ بجانا لازم ہوتا ہے۔ طبلچی کی مصروفیت کا عالم مختلف ہوتا ہے۔

ضعف جنون والا شعر غالباً میرزا نے لڑکپن میں کہا۔ رسالہ اردو کے ایک پرانے نمبر (جلد نمبر ۴۶۔ شمارہ ۱۔ بابت ۱۹۷۰ء) میں کلام غالبؔ کے اس نسخے کا سارا متن شامل ہے جو میرزا نے انیس برس کے سن میں مرتب کیا۔ یہ نسخہ اب غالبیات میں نسخۂ عرشی زادہ کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ اسے امتیاز علی عرشی (ناظم کتابخانۂ رامپور) کے فرزند نے شائع کیا۔ اس میں عجیب و غریب اشعار ہیں، ملاحظہ ہو ؎

شب کہ وہ گل باغ میں تھا جلوہ فرما اے اسدؔ
داغ مہ جوشِ چمن سے لالۂ مہ ہو گیا

اے اسدؔ وا شدنِ عقدۂ غم گر چاہے
حضرتِ زلف میں جوں شانہ دلِ چاک چڑھا

مطبوعہ متن میں لفظ ''حضرت'' ہی ہے (ض کے ساتھ) حضرتِ زلف کی ترکیب عجیب ہے لیکن میرزا کے ہاں عجائب کی کمی نہیں۔ اگر اسے حفرت (ف کے ساتھ) پڑھیں تو بھی عجیب ہوگا۔ حفرت کے معنی گڑھا۔

اس دیوانچہ کی فوٹو کاپی بنا کر عنقریب تمہیں بھیجوں گا۔

عزیزی نوید ریاض کے نام کے خط ضرور شامل کرو۔ انہیں ترتیب دے کر ان میں کے پہلے خط کے اوپر دائیں کونے میں یہ لفظ جلی حروف میں کمپوز کیے جائیں تو التباس نہ ہو:-

خطوط بخدمت نوید ریاض

تمہارا کرم ہے، تم نے بڑا کام کیا، سارے پروفوں کو ایک بار دیکھ لیا۔ اس کے لیے وقت نکالا۔ یہ تمہارا ایثار ہے لگاتار ہے۔ بندہ شکرگزار ہے۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

نیاز احمد صاحب کی خدمت میں بھی سلام۔

(پچھلے چند مہینوں میں مزید خطوط جو لکھے گئے، ان میں لائق اضافہ کوئی خطوط نہیں ہیں)

27 January, 1996

اعجازی، تمہیں اور فلاحت کو نبیرہ کی، سلمان اور بہو کو بیٹے کی اور رضی ترمذی صاحب کو نواسے کی ولادت مبارک ہو۔ تم نے فون پر خوش خبری سنا کر کہا، کوئی نام تجویز کرو تو سب سے پہلے مجھے مبارک حسین سُوجھا۔ اس کے بعد دیگر نام حافظے سے نکلے۔ سلمان کے ہم قافیہ فاران، فرمان، رضوان، عرفان، خوش آیند لگے۔ حسین کے ساتھ ان کا جوڑ بھی اچھا لگا۔ قافیہ کی شرط نہ رکھو تو بہت سے نام ممکن ہیں۔ فرخ حسین، فدا حسین، ذکاء حسین،

KUTABKHANA OSMANIA

ذاکر حسین، نثار حسین، مبشر حسین، بشارت حسین، مبارک حسین، کرامت حسین، اکرام حسین، عشرت حسین، عارف حسین، دلدار حسین۔ ان سب ناموں سے مانوس ہونا آسان ہے۔ انوکھا نام انوکھا تو ہوتا ہے لیکن طرفہ ہوتا ہے۔ اختر شیرانی کے والد بزرگوار تھے محمود شیرانی۔ اختر کا اپنا نام تھا داؤد شیرانی۔ اس نے قافیہ ملایا اور اپنے ایک بیٹے کا نام خوشنود رکھ دیا۔ شاعر باپ تو بیٹے کا یہ نام رکھ کر خوش رہا، خود خوشنود خوش رہا یا نہیں، ہمیں نہیں معلوم۔ سکول میں اس کے ہم جماعتوں کو یہ نام عجیب ہی لگتا ہوگا۔ حمید نسیم صاحب نے اپنی ایک بیٹی کا نام رکھا بہجت۔ اقارب نے اسے نرالا سمجھا لیکن شاعر باپ نے پروا نہ کی۔

بھائی اسحاق مرحوم کی بڑی بیٹی کا نام (تسکین) میری تجویز سے رکھا گیا۔ ہماری بہن سارہ کا بیٹا پیدا ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا، کیا نام رکھیں اس کا۔ میں نے کہا تسلی بخش اچھا رہے گا۔ موڈل ٹاؤن میں ہمارے گھر کے باغیچے کا مالی علم دین تھا۔ یہ اپنے آپ کو علم دین ہی کہتا تھا۔ ایک روز باغیچے میں یہ حقہ ہاتھ میں لیے آیا۔ اپنے بیٹے کے تولد کی خوش خبری دے کر اس نے کہا، کیا نام رکھیں اس کا؟ (دسو کیہ ناں رکھیے ایہدا) میں نے کہا چلم دین۔

امید ہے مشفق خواجہ صاحب جلد ہی گرد پوش کے لیے "تقریظچہ" لکھ کر تمہیں بھیج دیں گے اور "تمتہ" کے ساتھ وہ مکرمی نیاز احمد صاحب کو پہنچ جائے گا۔ تمتہ میں حمید نسیم صاحب کے نام کا خط شوق سے شامل کرو۔

بزنگا

19 February, 1996

شادمان!

شہنشاہ اکبر کے دربار کے نورتنوں میں ملا عبدالقادر بدایونی کا شمار ہے یا نہیں، مجھے معلوم نہیں لیکن دربارِ اکبری کو پچھلے دنوں پڑھ کر جی میں کہتا ہوں۔ اکبر کے ملازمین میں سب سے بڑا ظرف ملا صاحب ہی کا تھا۔ اکبر کا دل ان سے ناراض رہ کر بھی ان کی طرف کھنچتا رہا۔ وقت ملے تو دربارِ اکبری کا یہ باب میری خاطر پھر پڑھو۔

اس سال بشرطِ توفیق دو کام کیے جائیں گے۔ انگریزی میں چار لیکچر لکھے جائیں گے اور اردو میں باتیں چیتیں (Ramble) لکھی جائیں گی۔

اس خط کے ساتھ ایک خط قبلہ نیاز احمد صاحب کے نام کا بھی ملفوف ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو، یہ انہیں پہنچا کر ثواب کماؤ۔

تمہارے مجموعۂ مضامین کے دیکھنے کا مجھے بہت اشتیاق ہے۔

رہبرنگ آورم

ملا صاحب ٹونڈہ میں پیدا ہوئے تھے جو صوبہ آگرہ کا ایک قصبہ تھا۔ خود لکھتے ہیں، میں بادشاہ سے پانچ مہینوں کی رخصت لے کر وہاں گیا۔ اپنی ایک لونڈی سے ایسا عشق ہوا کہ سال بھر واپس حاضر نہ ہوا۔ سات مہینوں کی غیر حاضری بلا اجازت تھی جو بادشاہ کی ناراضی کا باعث ہوئی۔ ہفتے کے سات دنوں کے لیے اکبر نے سات امام مقرر کیے تھے۔ بدھ کی نمازوں کی امامت ملا عبدالقادر کے سپرد تھی۔

5 March, 1996

میرے پرسانِ حال!

سچ کہتا ہوں قلم کاری سے مجھے تعطیل چاہیے۔ یہ مضمون جو تمہیں بھیج رہا ہوں، آسانی سے نہ لکھا گیا۔ دماغ نچڑا ہوا ہے، جاؤ خیال اندھا ہو چکا ہے۔ ذوالفقار علی بخاری کی کتاب سرگزشت اور حمید نسیم صاحب کی آپ بیتی پر مارچ میں مضمون لکھوں گا۔ اس کے بعد لاہور کے لیکچر (انگریزی میں) لکھنے کا کام شروع ہوگا۔ آپ بیتیوں پر باقی مضمون ملتوی رہیں گے، استاد ذوق والا مضمون بھی۔

"تمہید" جو تمہیں بھیجی جا رہی ہے، اس کی فوٹو کاپی حمید نسیم صاحب کو کل بھیج دی۔ وہ ضیاء جالندھری کو "علامت" کے لیے دے دیں گے۔ لاہور آؤں گا تو مجھے حفیظ جالندھری کی آواز کا ریکارڈ بھی سنا دینا۔

فلاحت کو سلام۔ نیلے گنبد کے کبوتروں کو میری طرف سے مکئی کی کھیلیں کھلا دیا کرو۔

داؤد نابود

6 May, 1996

یاسر کے دادا کو سلام!

آج پیر کا دن ہے۔ تاریخ چھ مئی۔ میری ولادت کی تاریخ یہی ہے۔ آج تمہارا برخوردار ستر کا ہو گیا۔ چار برس اور جیے تو الف ثالث کا نوروز بھی دیکھ لے۔ کیا اچھا ہو اس روز ہم دونوں احباب کے ساتھ یکجا ہو کر نوروز لاہور میں منائیں۔

پرسوں یعنی سنیچر کے روز پہلے تمہارے فون کا نمبر گھمایا، ملازمہ نے کہا اعجاز صاحب پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے مشفق خواجہ صاحب کو فون کیا اور حال پوچھا، انہوں نے کہا لاہور سے آ کر میں بیمار ہو گیا۔ بیماری کو طول ہوا، اب تندرستی واپس آ رہی ہے۔

اچھی خبر ان سے یہ سنی کہ رسالہ "اردو" کا ایک اور خاص نمبر چھپ کر آ گیا ہے۔ "یادگارِ داغ" والا مضمون اس میں شامل ہے۔ رسالہ مجھے نوید ریاض سلمہ کے ذریعے بھیجا جائے گا۔ الحمد للہ کہ داغ کے چاروں دواوین پر ایک ایک باب لکھ دیا گیا، تمہاری مدد نہ ہوتی تو یہ کام ادھورا رہ جاتا۔ رسالہ وہ تمہیں بھی ضرور بھیجیں گے۔

اب بفضل خدا وہ صحت یاب ہیں۔ تمہاری طرف سے تقریظ کی یاددہانی کا خط انہیں مل چکا ہے۔ تقریظ ان شاء اللہ اب جلد تمہیں مل جائے گی۔

عزیزی سلمان بن اعجاز نے گرد پوش کے لیے جو ڈیزائن القابات سے تیار کیا، تمہیں مناسب نہ لگا۔ مجھے خبر نہیں کہ اس کے بعد کوئی اور ڈیزائن تجویز ہوا یا نہیں۔ آج صبح اٹھا تو طبیعت نہ مطالعہ پر مائل ہوئی نہ قلم کاری پر۔ نہ غزل گوئی پر۔ البتہ نقاشی کو جی چاہا، گرد پوش کے لیے ایک ڈیزائن بنایا۔ اگر کار آمد لگے تو کام میں لاؤ ورنہ پھینک دو، ہوا میں اڑا دو۔

میرے پاس بعض پرانی مطبوعات ہیں۔ ان کے سرورقوں پر گل بوٹے ہوا کرتے تھے۔ مثنوی زہر عشق کے سرورق کا ایک سادہ سا ڈیزائن مجھے اچھا لگا۔ گرد پوش پر یہ بھی منتقل ہوسکتا ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

صبیحہ کو ہسپتال لے جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ وہاں جسمانی معائنہ بھی ہوگا اور ذہنی معائنہ بھی۔ ابھی کہا نہیں جا سکتا کہ ہسپتال میں اسے کتنے دن رکھیں گے۔ واپس گھر آئے گی تو ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اس کی تیمارداری ہوگی۔

ہندو مصنفوں کی چار پانچ مفصل آپ بیتیاں ہاتھ آئیں تو منش کے احوال کا تنوع سامنے آیا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے آپ بیتی لکھی ہے۔ انھی کو خط لکھ کر پوچھوں گا، سکھوں کی نمائندگی تو مفتوں کی کتاب سے کما حقہ ہو جائے گی۔ لاہور آؤں گا تو کتابیں تلاش کروں گا۔

جویندہ یابندہ

یعنی بندہ

داؤد رہبر

24 June, 1996

القاب سے بے نیاز اعجاز!

السلام علیکم!

رات کی کہی ہوئی تازہ غزل بھیجی جا رہی ہے۔ اس میں قافیے کا حساب وہی ہے جو خواجہ حافظ کے اس مطلع میں ہے

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شاد عظیم آبادی کی سوانح عمری میں ایک لطیفہ نظر سے گزرا۔ کتاب سے اس کی کاپی کر کے ملفوف کر رہا ہوں۔

گزشتہ نومبر میں تمھیں فون کیا تو تم نے امید دلائی کہ مکاتیب کی کتاب جنوری میں چھپ کر تیار ہو جائے گی اور یہ کہ بھائی عاشق کی کتاب چھپ گئی ہے۔ اب تمھاری کتاب کی باری ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ کسی وجہ سے پھر کسی دوسری کتاب کی طباعت مقدم ہو گئی اور میری کتاب کی موخر، اب نیاز صاحب کو میرا سلام پہنچاؤ اور یہ پیغام کہ جولائی میں ''سلام و پیام'' کے چھپ جانے کی صورت نکالیں، میں بے حد ممنون ہوں گا۔

گویا ریاض اس غرض سے کرتا ہے کہ محفل میں گائے، فنکار قلم اس لیے چلاتا ہے کہ اس کی نگارش قارئین تک پہنچ جائے۔

ناصبور

31 July, 1996

شادمان!

آج جولائی کا آخری دن ہے۔ آپ بیتیوں پر مسلسل قلم چلا۔ اب یکسوئی سے لمس (LUMS) کے لیکچر لکھنے کا کام ہوگا

KUTABKHANA OSMANIA

اُن دنوں یار نے چھونے نہ دیا ہاتھ اپنا
ہائے کس عمر میں ہے لمس کی دعوت آئی!

تم نے دو چیزیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا:-

(۱) فیلڈن کی کتاب کی ایک عبارت کی فوٹو کاپی۔

(۲) ساقی فاروقی کے لکھے ہوئے تبصرہ کی فوٹو کاپی۔

دونوں چیزیں ایک ہی لفافے میں بھیج کر ثواب کماؤ، اس تکلف میں نہ رہو کہ خط لکھنے کا وقت ملے گا تو یہ چیزیں اس کے ساتھ بھیجوں گا۔

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

بس یہی دو چیزیں بھیجو بذریعہ ڈاک، کتابیں جو میرے لیے تم نے محفوظ رکھی ہیں، میں لاہور آ کر تم سے مانگ لوں گا، کسی کے ہاتھ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اب میں انگریزی میں لیکچر لکھنے کا کام کر رہا ہوں، اردو کا کام ۱۹۹۷ میں کیا جائے گا۔

۱۵ اگست کو یوم آزادی ہے۔ اس روز جمعرات ہوگی، ۱۷ کو سنیچر ہوگا، ۱۸ کو اتوار ہوگی، میں تمھیں فون سنیچر یا اتوار کو کیا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ ان دو دنوں میں فون کے دام نصف ہوتے ہیں۔ یہ خط تمھیں یوم آزادی سے پہلے مل جانا چاہیے، پھر تمھیں فون کروں گا۔

فلاحت کو سلام اور سلمان کو دعا، ان گرمیوں میں تم آ جاتے تو لطف رہتا۔

ممنون

4 January, 1997

حکایت جو اور قصہ اندوز دوست اعجاز بٹالوی کو نیا سال مبارک ہو، انتھنی سٹور کی کتاب پاہائے گل* آج رجسٹری کرا کے ہوائی ڈاک میں ارسال ہوئی۔

نفاس لوگ سب خود گورو ہوتے ہیں، سٹور بھی گورو ہے۔ گوروؤں پر اس نے جو تذکرہ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص دیگر نفاسوں کی طرح ظرافت سے بے بہرہ ہے (اولیاء بھی بالعموم اداس لوگ ہیں، شاہ غوث علی شاہ قلندر مستثنیٰ)

گوروؤں کا تذکرہ سٹور نے ان کے چیلوں کی حکایات شامل کیے بغیر لکھ ڈالا۔ چنانچہ تذکرہ ادھورا رہا۔ چیلوں کی حکایات اس وجہ سے خارج رہیں کہ مصنف کا میل جول بدعتی (Cultic) حلقوں سے رہا ہی نہیں، سنی سنائی باتیں اس نے لکھ دیں۔

پاہائے گل کا استعارہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

واماندۂ راہِ شوق

---

* Feet of Clay

11 January, 1997

شادمان و کامران!

باغ بینظیر نام کا ایک باغ رامپور میں تھا، نواب احمد علی خاں نے وہاں ایک سالانہ میلے کی طرح ڈالی۔

یہ بینظیر کا میلہ کہلایا جیسے لاہور میں شالامار کا میلہ ہوتا ہے۔ رامپور کے اس میلے میں میرزا داغ کی ملاقات منی بائی حجاب سے ہوئی۔ ''فریادِ داغ'' میں میرزا نے اس میلے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ میلہ گویا ''بے نظیر کا میلہ ادبی'' ہو گیا۔ پاکستان میں بھی بینظیر کا ایک میلہ ہوا لیکن یہ ''بینظیر کا میلہ سیاسی'' تھا۔ (حلقہ ارباب ذوق بھی دو فریقوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک حلقہ ارباب ذوق ادبی اور ایک حلقہ ارباب ذوق سیاسی۔)

پاکستان میں جو مہمان نوازیاں اب کے ہوئیں، ان کو یاد کر کے جی میں کہتا ہوں ؎

وطن میں پہنچا تو ہر میزباں نے مجھ سے کہا
کباب قاب سے لے اور مزا کباب سے لے

ضیاء محی الدین نے تم سے سسرالی مہمانوں کے لیے نہالیاں مانگیں تو نہالیاں مہیا کرتے ہوئے تم نے نوید کو میراثی کا جو لطیفہ سنایا، اس کا مزا لے رہا ہوں۔ نہالیوں کا یہ قصہ سن کر مجھے ایک اور لطیفہ یاد آیا۔ ضیاء جب بوسٹن آیا تو میرزا غالب کے بعض اشعار کی شرح شاملِ گفتگو ہوئی، یہ شعر پڑھا گیا ؎

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

تو ضیاء نے کہا اس شعر میں نہالی میسر نہ آنے کا رونا ہے یا اس کے مہین اور بوسیدہ ہونے کا؟ میں نے کہا شکل نہالی سے یہاں مراد ہے نہال یعنی بوٹے کی سی شکل، یہ سن کر ضیاء کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

منشی نبی بخش حقیر کے نام میرزا غالب نے جو خط لکھے، ان میں سے چند حقیر کے خاندان کے ایک صاحب آفاق حسین آفاق صاحب کے ہاتھ آئے۔ آفاق صاحب نے یہ خطوط ''نادراتِ غالب'' کے عنوان سے شائع کیے۔ بابائے اردو کا لکھا ہوا ایک دیباچہ اس اشاعت میں شامل ہے۔

تمہارے گھر میں لیاقت سے جو ملاقات ہوئی، اس سے جی بے حد خوش ہوا۔ اس کو میرا سلام۔ اس کی صحت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے، فلاحت کو سلام اور سلمان کو دعا۔

''پاکستان میں تین ہفتے'' اس عنوان کا مضمون لکھ کر تمہیں بھیجوں گا۔ اس کے لکھنے کو بھی تین ہفتے چاہئیں۔ اب میرا قلم سرپٹ نہ دوڑے گا، آہستگی ہی میں آرام ہے۔

Link کی کالم نگاری سے بھائی بابر کا جی بہلا ہوا ہے۔ میں گھر میں موسیقی کی کلاس کھولنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں۔ اس کے لیے گھر میں طبلے کی دو تین جوڑیوں کا موجود رکھنا لازم ہے، ایک جوڑی علی اکبر خاں کالج کی دکان سے منگاؤں گا۔ یہ دکان لاس اینجلس میں ہے، ایک جوڑی میامی سے خریدوں گا۔ فلورڈا کے معنی ہیں پھولوں والی بستی۔ میامی کل ایک سو سال پرانا شہر ہے۔ اس لیے اسے گلشنِ نو آفریدہ کہنا چاہیے۔ فلورڈا کی آبادی روز افزوں ہے، اب کے آؤ تو یہاں کی تفریح گاہیں مل کر دیکھی جائیں۔

14 January, 1997

تتمہ ۱۱۔ جنوری والے خط کا

(تتمہ کا لفظ ہکلا کر بولنا چاہیے

میرا طبلچی دوست ششی ناگ جنوری کا تلفظ جانوری کیا کرتا تھا، میں نے ایک روز اس سے کہا، کیا ہر سال جانوری سے شروع ہوتا ہے؟)

دو التماس:-

(۱) عزیزی و مکرمی و نویدی یعنی نوید ریاض عرف بوبی پراگندہ طبع لوگ کا مسودہ دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مسودہ کا مجلد نسخہ اعجاز صاحب کی موجودگی میں نیاز احمد صاحب کے پاس رکھوا دیا گیا تاکہ جونہی اس کی کتابت (یا کمپوزنگ) کا تہیہ ہو، مسودہ نیاز صاحب کے پاس موجود ہو اور یہ بھی بتایا کہ ساری کہانیاں یکے بعد دیگرے اعجاز صاحب کو بھیجی گئی تھیں۔
بوبی میاں علی الخصوص ایک کہانی پڑھنے کے خواہاں ہیں۔ اس کا عنوان ہے ''رس لیلا'' دیگر کہانیاں پڑھ کر بھی وہ خوش ہوں گے۔ جتنی کہانیاں محفوظ ہیں، انہیں دے دو۔ ان کا ٹیلی فون نمبر تمہارے پاس ضرور ہوگا۔ اگر نہیں ہے تو ضیاء محی الدین کا نمبر کھٹکھٹا کر انہیں کوئی لطیفہ سنا کر یہ پیغام پہنچا دو، مہربانی۔

(۲) مکاتیب پر اردو اور انگریزی رسائل میں کوئی تبصرے نظر سے گزریں تو ارسال فرماؤ۔

آداب

29 January, 1997

یارِ غار، السلام علیکم!

کل ایک لفافہ ملا۔ اس میں انتظار حسین صاحب کا لکھا ہوا تبصرہ ملفوف تھا اور اس کے ساتھ تمہارا رقعہ۔ ان ملفوفین نے جی خوش کیا۔ تمہارا اور میاں ہونا سب اس بات کا ہے کہ انتظار حسین صاحب کی مہربانی مجھ پر بے پایاں ہے۔ ان کی طرف سے سابق میں بھی قدر افزائی ہوئی۔ داد کا بھوکا کون نہیں ہے لیکن داد گنی صاحبوں سے ملے تو وہ انعام کا درجہ رکھتی ہے۔ میری طرف سے انہیں ممنونیت کا پیغام پہنچا دینا۔

پرسوں بھائی بابر کو اپنی ایک تازہ غزل فون پر سنائی۔ اس کا ایک شعر تم بھی سن لو ؎

یاروں کے آجانے سے ہو جاتی ہے دنیا آباد
یار نہیں آتے تو دنیا خالی خالی ہوتی ہے

مطلع اس کا یہ ہے ؎

پیارے سچ تو یہ ہے، بات کچھ اور ہی سچ کی ہوتی ہے
جھوٹے لوگوں کی حق حق ایمان کی ہچکی ہوتی ہے

بھائی بابر نے بتایا کہ وہ طلعت محمود کی بیٹی کی شادی منانے کو لاہور جائیں گے۔ ۱۴۔ فروری کو پرواز ہوگی۔ میں ٹلچر والی کتاب کا مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے آٹھ دس روز میں مکمل ہو جائے گا اور بھائی بابر کے ہاتھ

KUTABKHANA OSMANIA

تمہیں بھیج سکوں گا۔ فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

برخوردار

12 February, 1997

یارِ مہرباں!

بھائی بابر برادری کی شادیوں کی خوش خبری کے منتظر رہتے ہیں۔ طلعت محمود کے بیٹے کی شادی کی خبر پہنچی تو آن کی آن میں اُڑنے کو تیار ہوگئے اور کل طیارے پر سوار۔

لاہور میں شامیانے تانے جاتے ہیں اور شادیانے بجتے رہتے ہیں۔ لاہور شادیات کا شہر ہے۔ نومبر میں بھی کئی محلے چراغاں تھے۔ لاہور کا عمر خیام رُلدو محمد دین ہے۔ بھائی بابر کو میری یہ تجویز پہنچا دو کہ رُلدو محمد دین سے ایک انٹرویو کریں اور لاہور کے کسی اخبار میں چھپوا دیں، تاکید ہے۔

انتظار حسین صاحب کے لکھے ہوئے کالم کا تراشا شامل کیا گیا تھا۔ میں نے رسید کا رقعہ تمہیں لکھ بھیجا تھا۔

ضیاء محی الدین، نے تم سے اخبار Nation والے کالم کا ذکر کیا تھا، اسے میرا اسلام پہنچے۔ وہ تراشا اس سے حاصل کر کے ادھر کو اُڑا دو تو مہربانی۔

جب میں گرامی شیخ نیاز احمد صاحب کی دکان میں تمہارے پاس بیٹھا گرم گرم سموسے کھا رہا تھا تو ان کے بیٹے نے بتایا کہ نیا دور والے ابواب کی کمپوزنگ ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے لیے ایک مقدمہ میں نے لکھا ہے۔ یہ ملفوف ہے۔ میرے سلام کے ساتھ شیخ صاحب کو پہنچا دو، مہربانی۔

صبیحہ کا حال بہتر ہے۔ کاش اتنا بہتر ہوتا کہ ایک آدھ مہینے کے لیے میکے جا سکتی۔ بچاری کو نہ سسرال نصیب ہوئی نہ میکا۔ اگر وہ میکے جا سکتی تو میں امریکہ اور یورپ میں جا بجا پہنچ کر گا، بجا سکتا اور لیکچر دے سکتا۔

۵۔ اپریل کو بوسٹن میں میرے گانے کا ایک جلسہ قرار پایا ہے۔ تین روز کے لیے نکلوں گا۔ ایک لیکچر ۴۔ اپریل کو بوسٹن یونیورسٹی میں دوں گا۔

''تین ہفتے پاکستان میں'' یہ سفرنامہ عنقریب لکھنا شروع کروں گا۔ بھائی بابر اور فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا، لیاقت کو بھی سلام۔

لاہور میں تمہاری مصروفیات کا کوئی انت نہیں۔ امریکہ آ کر ایک کامل تعطیل مناؤ۔ کچھ وقت ٹیری ٹاؤن میں اور کچھ یہاں فلوریڈا میں گزارو۔

بھائی بابر کہہ کے گئے ہیں، مارچ کے آخر میں واپسی ہوگی۔ میری پیشگوئی ہے کہ اپریل کے آخر میں واپس آئیں گے۔

کاہن

ترنگ کیسا تخلص ہے؟
آج سے ساٹھ برس پہلے سوچتا تو
شاید اختیار کر لیا جاتا، رہبر لکھتے
ہوئے اب تامل ہوتا ہے۔

31 March, 1997

کارسازِ اعجاز!

یہ شعر میرے لیے کسی استاد نے کہا ؎

کار ساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

شکر ہے کل اتوار کو تم سے ٹیلی فون پر گفتگو ہو سکی۔ اس سے قبل دو اتواروں کو تمہارا نمبر گھماتا رہا۔

ٹیلیفون کے کارخانے سے ریکارڈ کی ہوئی ہدایت سنائی دی:-

''اس وقت سارے سرکٹ (Circuit) مصروف ہیں، آئندہ کسی وقت قسمت آزمائیے۔''

ایک پاکستانی شناسا سے معلوم ہوا کہ جمعے کی جگہ اب پھر تعطیل اتوار کو ہونے لگی ہے۔ اکناف عالم سے پاکستانی مہاجرین اپنے عزیزوں کو ٹیلی فون اتوار ہی کو کرتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے میں نے جی میں کہا، ٹیلی فون اب وہ نقار خانہ ہے جس میں طوطی طوطیا ہو کر رہ گیا ہے۔

Eric Hobsbawm کی دوسری کتاب آج رجسٹری کرا کے ہوائی ڈاک سے بھیج رہا ہوں۔

نیاز احمد صاحب کا آپریشن ہو چکا ہوگا، ہمدردی کا کارڈ لوئر مال کے پتے پر ان کو بھیجوں گا، میرا اسلام انہیں پہنچے۔

فکشن ہاؤس جس نے سر رضا علی کی آپ بیتی (اعمال نامہ) چھاپی ہے، اس کا پتہ ۱۸۔ مزنگ روڈ ہے۔

یہ کتاب اور سحاب قزلباش کی کتاب دونوں مجھے مل جائیں تو اس کے بعد مجھے مزید آپ بیتیوں کی ضرورت ریسرچ کے واسطے نہ رہے گی۔ تمہاری مہربانی سے بہت کچھ جمع ہو گیا ہے۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

31 October, 1997

نگہبانِ عدل و انصاف!

السلام علیکم! آج سارا دن مکتوب نویسی ہوگی، پانچ چھ خط لکھے جائیں گے۔ مضمون نگاری کی تعطیل ہے۔ آٹھ دس دن مضمون لکھنے سے باز رہوں گا۔ ٹیلی فون کروں گا اور گراموفون بجاؤں گا۔

یادگار پروفیسر ماسی نیوں (Massignon) کا جلسہ خوب تھا۔ مقالے سن کر عبرت ہوئی۔ اس زندہ دل مستشرق کے معتقدین کا ایک حلقہ پیرس میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں سے بھی کچھ لوگ جلسے میں آئے تھے۔ الجزائر کی تحریک آزادی میں موصوف نے حصہ لیا۔ فرانس میں اس تحریک کے مویدین کا پیشوا ماسی نیوں ہی تھا۔ یوں فرانس کی تاریخ میں اس نے ایک مقام پایا۔ اگر یہ صرف محقق ہی رہتا تو یہ بات نہ ہوتی۔

کانفرنس میں ذکر خیر زیادہ تر ماسی نیوں ہی کا رہا۔ حلاج کا ذکر صرف دو مقالوں میں تھا۔ ایک میرا مقالہ اور ایک مقالہ ایک پروفیسرہ کا۔ (پروفیسر کی تانیث پروفیسرہ ہی ہوگی)

یہ کانفرنس نقد و نظر کی تقریب نہ تھی۔ اس کا مقصد خراج تحسین تھا۔ ماسی نیون کا خیال تھا کہ حلاج کی شہادت کا چرچا یورپ میں کیا جائے تو دینِ ابراہیمی کے وارثوں کے درمیان سرد مہری کم ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ خوش

KUTABKHANA OSMANIA

فہمی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی تنقید کا موقع اس کانفرنس میں نہیں تھا۔ میں نے جو مقالہ پڑھا، ملاحظہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ یہ کانفرنس کی روئیداد میں شائع ہوگا۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول ''دشتِ سوس'' میرے لیے محفوظ رکھو، مہربانی اس کا تبصرہ جو تم نے لکھا، اس کی کاپی مجھے بھیج دو۔

تم نے فرمائش کی کہ حلاج کے تصوف کے بارے میں ایک کتابچہ لکھوں۔ دل بڑھاتے رہو گے تو یہ کام بھی ہوجائے گا۔

بھائی بابر کو آج شام فون کروں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

نارسا

داؤد رہبر

23 December, 1997

قطعہ

وصل جاناں کا ہے اس میں التوا کیوں اس قدر
زندگی ہے اے خدا صبر آزما کیوں اس قدر
حسن کو تو نے کیا ہے دلربا کیوں اس قدر
عشق کو رکھا ہے تو نے نارسا کیوں اس قدر
کیوں نہیں ٹلتی بلا تیرے کرم سے اپنے آپ
کرنی پڑتی ہے مصیبت میں دُعا کیوں اس قدر
سن کے یہ فریاد میری ہیں فرشتے کہہ رہے
آرہا ہے نیچے سے شورِ بکا کیوں اس قدر

یاتری!

تم نے عمرہ کیا، مبارک ہو۔ اگر پورا حج کیا ہوتا تو میں حاجی لکھتا۔ گھر کے پاس میکڈانلڈ نام کا قہوہ خانہ ہے۔ صبح یہاں اکثر کافی کا فنجان پینے آ بیٹھتا ہوں۔ آج بھی کاغذ اور قلم لے کر یہاں آیا کہ تمہیں خط لکھوں۔ خط کی تمہید کے لیے ایک قطعہ ہوگیا۔

نیویارک سے ایک صاحب مجھے فون کرتے رہتے ہیں۔ ان کا نام عبدالوہاب سلیم ہے۔ کسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے عملہ میں تھے۔ وہاں کی نوکری چھوڑ کر امریکہ کی کسی لائبریری سے وابستہ ہوئے۔ اب ریٹائرڈ ہوگئے ہیں۔ اردو کی کتابیں بھارت اور پاکستان سے منگاتے رہتے ہیں۔ سنگ میل کی فہرست مطبوعات ان کو ملتی رہتی ہے۔ ۱۹۹۷ء کی فہرست انہیں پچھلے دنوں ملی تو انہوں نے اس پر نظر ڈال کر مجھے بتایا کہ اس میں خطباتِ اعجاز بٹالوی بھی درج ہے۔ یہ خوش خبری ہے، کوئی عزیز ادھر پرواز کرے تو پیکٹ بنا کر اور اس پر میرا پتہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس ہدایت کے ساتھ اسے دے دو کہ امریکہ پہنچتے ہی ڈاک سے میری جانب روانہ کر دے۔

اب مجھے پوری یکسوئی کے ساتھ انگریزی کی تصنیف کا کام کرنا ہے۔ انگریزی قلم کاری سے تھوڑا تھوڑا وقت بچا کر اردو میں منصور حلاج کے تصوف کے بارے میں البتہ لکھتا رہوں گا۔ سوڈیڑھ سو صفحوں کی تصنیف کا فراہم ہوجانا ممکن نظر آتا ہے۔

میں نے جناب نیاز احمد صاحب کو پروف پڑھ کر بھیج دیئے تھے۔ دو غلطیاں اس ترسیل کے بعد دھیان میں آئیں۔ ان کی نشان دہی جادو کی مشین (آناً فاناً مشین) سے نوید ریاض کی معرفت بھیجی۔ فنِ طباعت کی اصطلاح ہے۔ ''غلطیاں لگ گئیں'' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اغلاط کی درستی کردی گئی۔ ان دونوں غلطیوں کا ''لگ جانا'' بے حد ضروری ہے۔ اتنی ہی اہم ایک اور بات ہے: آیاتِ قرآنی اعراب کے بغیر نہیں چھپنی چاہئیں۔ میری خوش بختی ہے کہ تم ان امور کی نگرانی بخوشی کرتے ہو۔

ٹیری ٹاؤن میں نشست کی دو تقریبیں ہوئیں۔ ایک لیکچر آغا اشرف علی (برادر آغا شوکت علی) کا اور ایک پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا۔ بھائی بابر کو آغا اشرف علی کا لیکچر بہت پسند آیا۔

سنا ہے تمہارے گھر میں اب ای میل بھی آتی رہتی ہے۔ میرے گھر میں فقط ایک فی میل ہے۔

فلاحت کو سلام اور سلمان کو دعا۔

فلورڈا کی بنی ہوئی شکر کا پیکٹ جو تم کو جدہ میں ملا، مجھے بھیج دینا۔ میں اسے چائے میں گھول کر پیوں گا۔ اسے آبِ زمزم سمجھ کر پیوں گا۔

شکر خورہ

داؤد

19 February, 1998

دوست!

اس مضمون کے لیے سوچ زیادہ درکار تھی۔ انڈیانا کی کانفرنس کے لیے جو مقالہ لکھا، اس کے لیے جو کچھ پڑھا تھا، وہ دماغ پر مسلط ہوگیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک مضمون اردو میں بھی لکھ ڈالوں اور اس کے بعد طنبورہ بجا کر مسائل سے خلاصی پاؤں۔

خیالی ''حقہ نوشی'' کے حال میں ہلکی پھلکی اردو نویسی جاری رہے گی لیکن اب ایک کتاب انگریزی میں لکھنا چاہتا ہوں۔ کئی مہینے اس میں صرف ہوں گے۔ بشرطِ توفیق۔

کسی مقامی درسگاہ میں اب مجھے جز وقتی نوکری بھی چاہیے۔ کچھ کمائی کروں تو اس کٹیا کی قیمت کا بقایا ادا ہو اور وارثوں کو چھت نصیب رہے۔ انگریزی تصنیف کے لئے کسی فاؤنڈیشن کی امداد کے امکانات بھی امریکہ میں ہیں۔ ان کے لیے عرضیاں تیار کروں گا۔

بھائی بابر سے کل باتیں ہوئیں۔ گفتگو سے لگا کہ چاق و چوبند ہیں۔ حسبِ سابق چٹخاروں کے آرزومند ہیں۔ مارچ کے آخر میں بوسٹن اور نیویارک جاؤں گا تو ان سے ملاقات ہوگی، ان شاءاللہ۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

گرویدہ

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

24 March, 1998

حبیبی!

آج صبح تم سے فون پر کئی روز بعد باتیں ہوئیں۔ بھائی بابر کی علالت کی خبر کے اثر سے طبیعت مائل بہ سکوت تھی، یوں بھی فون کی گفتگو میں میں کچھ لکنت زدہ ہو جاتا ہوں۔ بلاغت دھری رہ جاتی ہے۔ فون پر بلاغ ممکن ہے لیکن بلاغت ممکن نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ قاطع برہان والے مضمون کا خاتمہ بالخیر نہ ہوا تھا۔ چند سطور کل میں نے اور لکھیں، دیکھ کر بتاؤ کہ اب نیا س درست ہوا یا نہیں۔

جو مسودہ میں نے بھیجا تھا، اس کے آخری صفحے کا نمبر ۳۹ ہے، اضافے کی سطور کی ابتداء اسی صفحے پر کر دی گئی ہے۔ نیا صفحہ اس کے بعد نمبر ۴۰ ہے۔ اس پر اب اضافہ ختم ہوتا ہے۔

مسودے پر تھوڑا سا آپریشن کرو، اس میں پانچ منٹ لگیں گے، زحمت معاف۔

(۱) مسودے کا آخری صفحہ (نمبر ۳۹) پھاڑ کر پھینک دو اور اضافے والے صفحہ (نمبر ۳۹) کو اس کا جانشین کرو اور آگے نیا صفحہ (نمبر ۴۰) بڑھا دو۔

(۲) صفحہ نمبر ۱۰ نیچے سے چوتھی سطر:-
''اس سے'' کے بعد لفظ ''قبل'' چاہیے۔

(۳) صفحہ نمبر ۳۴ کی پہلی سطر:- ''ناک منہ چڑھا کر'' کی جگہ ''ناک بھوں چڑھا کر'' چاہیے۔

(۴) اسی صفحے کی (یعنی ۳۴) کی چودھویں سطر:- ''موضوع سے'' کی بجائے ''موضوع پر'' چاہیے۔

(۵) صفحہ نمبر ۳۸ کے آخر میں ایک جملہ میں نے یوں لکھ دیا تھا:- ''خواہم گفت درست سمجھا جاتا ہے''
یہاں خواہم گفت کو کاٹ کر اس کی جگہ میخواہم بگویم کر دو، مہربانی، ثم مہربانی۔

بھاگڑ میں یہ اغلاط سرزد ہوئیں۔ کل مضمون پر نظر ڈالی تو گویا پروف خوانی ہو گئی۔ اپنی خطاؤں سے آگاہی ہوئی۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا، بھائی بابر کو کل فون کروں گا۔

خواستگار تلطف

داؤد

8 March, 1998

سنگت یاراں کے رسیا!

چند سال قبل ایک روز میں الطاف گوہر کو خط لکھنے بیٹھا، القاب ذہن میں تھے، بھائی جان گوہر لیکن قلم سے سہو ہوا اور لکھ گیا ''بھائی گوہر جان''

پچھلے ہفتے بوسٹن کی زیارت ہوئی، تین دن وہاں ٹھہرا۔ بوسٹن یونیورسٹی کے چند احباب کے ساتھ شرکت شرب و گزک رہی۔ ایک لیکچر نعمان الحق صاحب کا محرم' نوحہ خوانی، مرثیہ گوئی اور رسوم تعزیہ کے بارے میں سنا۔ ٹیکنالوجی کی مشہور عالم انسٹی ٹیوٹ (M.I.T) میں ایک امریکی لیکچرر ہندوستانی سنگیت کا درس دیتا

ہے۔ یہ استاد علی اکبر خاں سرود نواز کا شاگرد ہے۔ سرود نوازی اس نے سیکھی ہے۔ اس کی مضراب زنی اب تک میں نے سنی نہیں۔ اس کے ساتھ ایک ہندوستانی ریستوراں میں کھانا کھایا، یہ خواہش مند ہے کہ اس کی کلاس کو آگرہ گھرانے کی گائیکی سے متعارف کراؤں۔ ان شاءاللہ نومبر میں بوسٹن جاؤں گا تو وہاں کلاس روم میں ایک نشست گانے کی ہوگی۔

''علامت'' کا شمارہ اپریل پرسوں ملا، مہربانی۔ گوہر کی توصیف میں چاروں نگارشیں پڑھیں۔ گوہر کے دو روپ ہیں۔ ترکی ٹوپی اور شلوار میں ملبوس اور سوٹ اور نکٹائی میں ملبوس۔ تم نے ان کا ذکر ایک کہانی بنا کر کیا اور اپنے مضمون کو رنگین کیا۔ گوہر کے ہاں بیک وقت میرا جی اور مولانا مودودی سے عقیدت مندی کو دیکھ کر اقبال کا فرمودہ یاد آیا ؎

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

گنگا جل اور آبِ زمزم دونوں کا ایک ایک گھونٹ شاہ غوث علی قلندر اور گوہر دونوں نے پیا۔

بھائی بابر نے اپنے والد بزرگوار سے ہمارا تعارف کرایا۔ اب سعید شیخ صاحب نے راجا تفضل حسین صاحب سے، یہ بڑی بات ہے، دونوں تعارفوں سے میرے جی کو ٹھنڈک پہنچی۔

''علامت'' میں یہ تحریریں پڑھ کر گوہر کی تازہ تصنیف (اور سابق تصنیف ''تحریریں چند'') پڑھنے کے اشتیاق نے غلبہ کیا ہے۔ جولائی میں دونوں کا تحفہ بنا کر ساتھ لیتے آنا اور شکر کی وہ پڑیا بھی جو جدہ سے لے کر تم نے میرے لیے محفوظ کر لی تھی۔

انگریزی کتاب کا خاکہ اب ذہن میں تیار ہے۔ اس کا عنوان یہ ہوگا:

We are all in it together

اس کتاب کی سپرٹ یہ ہوگی کہ ملتوں کا تنوع کبریا کی مرضی سے ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے النا کا تنوع اور نباتات اور جمادات کا تنوع، ملتوں کے تنوع سے جھگڑے ہی نہیں، بھگڑے بھی ہیں۔ مجادلے ہی نہیں مقابلے اور مسابقتیں بھی ہیں اور باہمی تاثر بھی ہیں۔ اس تنوع سے کرۂ ارض پر میلہ لگا ہوا ہے اور پیوند ہائے تہذیب کا سلسلہ جاری ہے۔ ادیان کے تنوع سے دھڑے بندیاں ہیں، اس تنوع کا مزا فرد لیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام ہندوستان میں آیا تو ہندومت سے اس کی ٹھن گئی لیکن غور کریں تو کہیں گے کہ ایک بات بن گئی۔ دھرپد گائیکی سے خیال گائیکی نکلی اور کھڑی بولی سے اردو، طفلی میں شاہ غوث علی شاہ قلندر نے ایک ہندو ہمسائی کی چھاتی سے شیر خواری فرمائی۔ تذکرہ غوثیہ پھر پڑھو اور شاہ جی کی دو طرفہ باتیں سنو، صوفی محاورہ اور ویدانتی محاورہ دونوں کیسے گھل مل گئے ہیں۔ اپنے میرا جی کو یاد کرو، میرا سین نہ ہوتی تو میرا جی بھی نہ ہوتا، بت کافر نہ ہوتا تو غزل میں اس کی کمی رہتی۔ غالب کے مکاتیب میں منشی شونارائن آرام اور منشی ہرگوپال تفتہ کے نام خط شامل نہ ہوتے تو گنگا جمنی کی بات نہ ہوتی اور پھر رتن ناتھ سرشار اور مہاراجا کرشن پرشاد شاد اور دیا رام نگم اور تلوک چند محروم کس کس کا نام لیں!

القفطی کی تاریخ الحکماء کا ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اسے شایع کیا۔ اس میں بڑے مزے کی حکایات ہیں۔ اسے لائبریری سے نکلوا کر پڑھو گے تو دیکھو گے کہ اموی دور اور عباسی دور میں قابل ترین طبیب جو خلفاء اور ان کے متعلقین کے معالج تھے تقریباً سب نصرانی تھے اور یونانی کتب کے مترجم بیشتر

KUTABKHANA OSMANIA

یہودی اور نصرانی تھے۔ انہیں اسلامی تہذیب کے معاونین میں شمار کریں یا نہیں؟

ماسی نیوں والے مضمون پر دو تین صفحوں کا اضافہ میں نے کیا اور علی گڑھ بھیجا۔ اس کا فوٹو تمہیں بھی بھیج رہا ہوں۔ یہ خط مئی کی بیس یا اکیس کو ملے گا، اس کے بعد فون کروں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

منتظر

داؤد

12 May, 1998

اعجاز، غریب نواز!

کل میں کاغذوں کی چھانٹی میں لگا رہا۔ ایک لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک مضمون برآمد ہوا۔ یہ دو سال پہلے لکھا گیا تھا۔ نومبر ۱۹۹۶ء میں جب میں لاہور آیا تو یہ لفافہ بھی میرے ساتھ لاہور آیا۔ سعید شیخ صاحب کی ضیافت سے بہرہ مند ہوا لیکن مضمون سوٹ کیس ہی میں پڑا رہ گیا اور میرے ہمراہ واپس فلوریڈا آ گیا۔ اب تمہاری معرفت "علامت" کے لیے بھیج رہا ہوں۔ فرصت ملے تو اسے پڑھ لو اور ہرکارے کے ہاتھ سعید شیخ صاحب کو پہنچا دو، مہربانی۔

کل بھائی بابر سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ لطیفوں کی پنگ پونگ کھیلی گئی۔ خوب بشاشت کے ساتھ انہوں نے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا اعجاز کے جولائی میں یہاں آنے کی خبر پکی نہیں۔ میں نے کہا میرے دل میں آمدِ یار کی اُمید قوی ہے۔

سوز بغیر ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

5 June, 1998

یارِ مہرباں!

جون تو آ گیا، جولائی کا آنا بھی محقق ہے۔ تم آؤ گے یا نہیں؟ ہر ہفتہ سوموار سے شروع ہوتا ہے، پھر جمعہ آتا ہے۔ پھر سنیچر اور اتوار، دوسرا سوموار آتا ہے تو میں کہتا ہوں، یہ اتنی جلدی کیسے آ گیا۔

کرنے کو بہت کچھ ہے مگر وقت ہے تھوڑا
لگتا ہے مجھے وقت بھی گھڑ دوڑ کا گھوڑا

پرسوں ایک خط نیاز صاحب کو لکھا، اس کی نقل تمہیں بھیج رہا ہوں۔ انگریزی میں جو کتاب لکھی جائے گی، اس کے موضوعات کی فہرست بھی ملفوف ہے۔

بھائی بابر سے معلوم ہوا کہ ان کا قلم چل رہا ہے۔ "خدوخال" کا ایک باب اور انہوں نے لکھا ہے۔ اس میں بٹالہ شریف کی کسی درسگاہ کا تذکرہ ہے۔ مسودے کی فوٹو کاپی مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ میں اس قسط کا منتظر ہوں۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا، یاسر کو بھی دُعا، یاسر کے دادا کو مجرا۔

منتظر

داؤد

31 August, 1998

آپریشن نے کیا بروقت دل کو معتدل
چاک سینہ ہو گیا فضلِ خدا سے مندمل

ان شاء اللہ وسط ستمبر میں تم سے ملنے آؤں گا، فون کر کے اپنی آمد کی تاریخ بتاؤں گا۔

اعجاز حسین بٹالوی!

ٹیری ٹاؤن میں کہرام ہے اور جنت میں شادیانے کہ آرٹ کونسل کا ڈائریکٹر اور نشست کا بانی آ گیا۔ بزمِ سخن اور بزمِ طرب کا منتظم آ گیا۔ اداکاروں کا ہدایتکار آ گیا۔ اب تفریح کے اچھے اچھے پروگرام ہوا کریں گے۔

ماتمی

داؤد رہبر

7 October, 1998

اعجازی!

تمہاری واپسی میں اب صرف دس روز باقی ہیں۔ اب کے تمہاری آمد کے احوال غیر معمولی رہے۔ بھائی کی عیادت کو آئے اور عیادت میں علالت شامل ہو گئی۔ خود ہسپتال جانا پڑا۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر بابرہ اور ڈاکٹر جمیل کا توسط نہایت مفید رہا۔ شکر ہے تمہارے عارضہ کی تشخیص بروقت ہوئی اور آپریشن بہترین ہسپتال میں لائق ترین سرجن نے کیا۔

بھائی بابر کی زندگی سو سال ہوتی تو ان کی سرپرستی ان کی اولاد کو اور تمہیں اور مجھے چند سال اور حاصل رہتی۔ ان کی بزم آرائیاں اور قلم کاریاں جاری رہتیں۔ ایک بڑا افسوس یہ ہے کہ "خدوخال" کے آخر میں بھائی عاشق کا تذکرہ (یعنی کتاب کا آخری باب) جو وہ لکھنا چاہتے تھے، لکھا نہ جا سکا۔ اب اس کتاب کی تدوین اسی طرح تمہارے ہاتھ میں ہے جیسے بھائی عاشق کے آثارِ قلم کی باقیات تمہاری کوشش سے محفوظ اور شایع ہوئیں۔ تمہاری برادر نوازی سے میں بھی خوب مستفید ہوا۔

لاہور کی زیارت کا خیال آتا رہتا ہے۔ تقریب کی صورت نہ نکلی تو تقرب کی صورت تو بہرحال ہے۔

اس خط کے ساتھ پندرہ ڈالر ملفوف کر رہا ہوں۔ ان کی رقم مبادلہ میرے سلام نیاز کے ساتھ جناب چودھری نیاز احمد صاحب کو پہنچا دینا۔ میری اس درخواست کے ساتھ کہ پراگندہ طبع لوگ کی کمپوزنگ ہو جائے تو پروف مجھے رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔ یہ رقم ڈاک کے خرچ کے لیے ہے۔

بھائی بابر کے ہسپتال جانے سے پہلے آخری غزل جو میں نے فون پر انہیں سنائی، وہ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ خود بھی پڑھ لو اور ڈاکٹر جمیل کو بھی سنا دو (یاد کھا دو) سب اعزہ کو پیغامِ تعزیت اور سلام عافیت۔

زاویہ نشیں

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

ہوں غرق تو پھر خواہش منزل نہیں ہوتی
ماہی کو کبھی حاجت ساحل نہیں ہوتی
ہو جاتے ہیں ساماں تو مساعی سے فراہم
کم بخت قناعت ہے جو حاصل نہیں ہوتی
لیتے ہیں مزا درد کا تب جاگنے والے
جب وصل کی شب عشق میں شامل نہیں ہوتی
کیوں سوچ پہ دن رات ہے وحشت کا تسلط
کیوں عقل کسی بات کی قائل نہیں ہوتی
تقدیر وہاں اپنے مقدر کو ہے روتی
تدبیر جہاں مدمقابل نہیں ہوتی
دیتی نہیں خیرات تو خاموش رہو جی
سائل کی صدا بہر مسائل نہیں ہوتی
معمولی سی نعمت بھی مزا دیتی ہے ہم کو
خوبی وہی اچھی ہے جو کامل نہیں ہوتی
کیا کم ہیں غزل گوئی میں ہاتف کی عنایات
کیوں روئیں کہ آیت کوئی نازل نہیں ہوتی
جاگا ہے فرشتوں کے دلوں میں یہ تقاضا
کیوں عرش پہ فرشی کوئی محفل نہیں ہوتی
ہم دور سے آئے ہیں ترے شہر میں ساقی
سن کر کہ محبت یہاں مشکل نہیں ہوتی
رہبر ترا انداز ہے اپنا ہی ترے ہاں
طرز سخن غالب و بیدل نہیں ہوتی

9 October, 1998

ادب نواز اور ادیب نواز اعجاز!

لاہور ہوائی ڈاک دو ہفتوں میں پہنچتی ہے۔ یہاں سے ٹیری ٹاؤن تین دنوں میں۔ اس لیے پے در پے تمہیں لفافے بھیج رہا ہوں اور فون کر کے باتیں بھی کر لیتا ہوں۔ اگلے ہفتے ایک بار پھر فون کروں گا کہ خدا حافظ کہہ سکوں۔

تمہاری شادمان والی کوٹھی کا نقشہ میری یاد میں ہے۔ جس کمرے میں تمہاری لائبریری ہے، اس کے عقب میں ایک اور کمرہ ہے۔ میں اور چند مہمان وہاں بیٹھے تھے کہ ایک موکل کچھ کاغذ لیے وہاں آیا۔ اسے ساتھ لے کر تم عقبی کمرے میں گئے تھے۔ وہ کمرہ میں نے نہیں دیکھا، ضرور وہاں بھی ایک ڈیسک ہوگا۔

KUTABKHANA OSMANIA

تمہاری ادبی مشغولیت وکالت کی مصروفیت سے کم نہیں۔ ایک ڈیسک تمہارے گھر میں ادبیات سے مخصوص ہو جائے تو مناسب ہے۔ وہاں بیٹھ کر اپنی ساری نگارشات کو مرتب فرما ڈالو، میں انہیں یکجا دیکھنے کا مشتاق ہوں۔

سلمان کیا اب تک تمہارے پاس ہے؟ اُسے دُعا، فلاحت کو سلام۔

28 November, 1998

حامی وناصر اعجاز!

بھائی عاشق نے سچ کہا تھا: ''انسان کیا کیا پڑھے!'' واقعی نئی کتابوں اور سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی کسی دکان کے اندر جاتا ہوں تو کتابوں کے عنوان دیکھ دیکھ کر ہی سر چکرانے لگتا ہے۔ محققین اور مفکروں نے کیسے کیسے دماغ لڑائے ہیں اور ناول نویسوں نے کیسے کیسے فرضی مکالمے لکھے ہیں اور صحافیوں نے کیسی کیسی سیاستیں بیان کی ہیں اور سوانح نگاروں اور آپ بیتی نویسوں نے کیا کیا پردے اٹھائے اور پردے ڈالے ہیں۔

بڑے لوگ تھے شاہ غوث علی قلندر اور سری رام کرشن کہ انہوں نے خود کچھ نہ لکھا۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات قلمبند کیے۔ ہم چھوٹے لوگ ہیں، ہمیں اپنے ملفوظات خود ہی لکھنے پڑیں گے۔

ملا عبدالقادر بدایونی مورخ تھا، اسے لائبریری جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اس نے آنکھوں دیکھی باتیں لکھیں۔ مورخ ہونے کی یہ صورت بہتر ہے۔

عبدالوہاب سلیم صاحب اکثر فون فرماتے ہیں اور اخباروں کے تراشے بھیجتے رہتے ہیں۔ سات حج اور تین عمرے کر چکے ہیں۔ اب یکم دسمبر کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ پھر عمرے کو جا رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے حج میں ہجوم اتنا ہوتا ہے کہ مراقبہ ممکن نہیں ہوتا، عمرے میں کچھ تخلیہ بھی میسر آتا ہے۔ اس سے راحت ملتی ہے۔

میرزا داغ کے حاجی ہونے کی شہادت تمکین کاظمی صاحب کی کتاب داغ میں ملتی ہے۔ فریاد داغ کا دیباچہ بھی انہی نے لکھا ہے۔ اس دیباچے میں منی بائی کا ایک خط منقول ہے۔ اس خط میں اس نے میرزا داغ کو حاجی صاحب کہہ کر ان سے خطاب کیا ہے۔ داغ نے حج نواب رامپور کی معیت میں کیا۔

اخبار ''ڈان'' مورخہ ۸ نومبر کا تراشا میرے برادر ایوب نے کراچی سے بھیجا۔ یہ انتظار حسین صاحب کا لکھا ہوا کالم ہے۔ اس میں اشفاق حسین نقوی کی روایت یعنی میرے مرحوم ہو جانے کی خبر کی تردید ہے اور میری درازیٔ عمر کی دعا بھی۔ میں انتظار حسین صاحب کا بہت احسان مند ہوں۔ ان سے ملاقات ہو تو یہ خط ان کو دکھا دینا۔

نقار خانے کا طوطی ہو کر مجھے انگریزی میں ایک کتاب لکھنی ہے۔ تفریحاً اردو میں بھی لکھتا رہوں گا تاکہ احباب مجھے یاد رکھیں۔

اس کہاوت میں طوطی سے مراد طوطا ہے یا اس نام کا کوئی ساز از قسم شہنائی؟

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

تمہارا برخوردار

داؤد

1501 N.E. 32 Street

Pampano Beach, Florida 33064

31 December 1998

سخن شناس!

چند ہفتے قبل ایک روز میں یہاں ایک میکدے میں نبیذ کے گھونٹ کے لیے جا بیٹھا۔ آٹھ دس گٹھے ہوئے دبنگ آدمی وہاں غٹا غٹ پی رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر کثیف لطیفے تھے اور ٹھٹھا زوروں پر تھا۔ میں نے ہر ایک کے بائیں ہاتھ پر نظر ڈالی۔ ازدواج کی انگوٹھی کسی ہاتھ پر نہ تھی۔ تم جانتے ہی ہو، بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے متصل جو انگلی ہوتی ہے، اس پر انگشتری چڑھی ہو تو اس سے مراد یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہم شوہر لوگ ہیں، چھڑے نہیں۔ ان لوگوں کی پھبتیاں ایک دوسرے کی مُطلقہ بیویوں کے بارے میں تھیں۔

مہمانداری پر اس میکدے میں ایک ساقن مامور تھی، اس کی پوشاک میں ستر برائے نام تھا، سارا سراپا سامنے تھا۔ مخموروں کی فحش پھبتیوں کا مقابلہ دلنواز خندہ اور تبسم سے کر رہی تھی۔

اس نے نبیذ کا گلاس میرے سامنے رکھتے ہوئے مجھے آنکھ ماری، میں نے زبانِ حال سے کہا، کاش میں تیرا ہم سن ہوتا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک مقطع کہا گیا ؎

رہبر نہ یہ سمجھ کہ یہ شوخی تجھی سے ہے
ہر اک سے بات کرتا ہے وہ آنکھ مار کر

میں نے یہ مقطع ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو سنایا اور کہا دیکھیے آدابِ غزل نے مجھے سچ بولنے سے روک دیا۔ ''کرتی ہے'' نہ کہہ سکا۔ ''کرتا ہے'' کہنا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''کرتی ہے'' کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مونث کا استعمال اردو شاعری میں شروع ہو چکا ہے۔ میں نے کہا، نظم میں شروع ہوا ہوگا، یہ تو غزل کا مقطع ہے۔ انہوں نے کہا تو پھر ''کرتے ہیں'' کر دیجیے۔

آج جمعرات ہے اور ایک سال کا آخری دن بحسابِ تقویمِ شمسی، تقویمِ ہجری کی دوڑ بھی جاری ہے اور بکرمی سمت بھی مقابلے پر ہے۔ وقت کی ندی کو ان جنتریوں کی پروا نہیں۔

پرسوں سینچر کو تمہیں فون کروں گا اور تمہارے اشغال معلوم کروں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

نفسِ مُطمئنہ کا متمنی

داؤد

2 February 1999

مشفقا!

ایک قطعہ بھیج رہا ہوں، اس کی فوٹو کاپی بنوا کر جیلانی کامران کو پہنچا دو تو کرم ہوگا۔

سوچ کی ہانڈی بھی روز پکاتا ہوں، انگریزی والی تصنیف کا کام جاری ہے۔ اس کے ضمن میں اردو بھی

لکھتا رہوں گا۔ سعید شیخ صاحب کو میرا سلام، ایک سلسلہ مضامین کا علامت کے لیے لکھوں گا۔ تم فون پر پوچھتے ہو ''کوئی تازہ خبر؟'' تازہ خبر کی بہترین صورت مضمون ہی ہیں۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

برخوردار

داؤد

قطعہ

درد سے ہوتا ہوں خوش، آہ سے خوش ہوتا ہوں
ہجر کے حال میں میں چاہ سے خوش ہوتا ہوں
تعزیت کے مجھے پیغام ہیں آتے رہتے
اپنے مر جانے کی افواہ سے خوش ہوتا ہوں

24 March, 1999

دوست!

''مخزن'' اور ''زمانہ'' اور ''اودھ پنچ'' کا دور کچھ اور تھا۔ ہماری تحریریں ان رسالوں میں چھپتیں تو یلدرم اور فرحت اللہ بیگ کی سی ناموری ہم کو بھی حاصل ہوتی۔ ہمارا دور نگار، ساقی، ہمایوں اور ادبی دنیا کا دور تھا۔ یہ دور بھی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارا علامت اب غنیمت ہے۔ سعید شیخ صاحب کی ہمت سے یہ زندہ ہے۔ اس کا حجم دگنا ہو تو اس کا افادہ زیادہ ہو (اس ذکر سے میں نے خط کی تمہید باندھی ہے)

راشد صاحب کو ایک روز میں نے اپنی ایک غزل سنائی، اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہمت سے یا تو آدمی بھگوان بن گیا
یا پھر خدا نے چاہا اور انسان بن گیا

یہ شعر سن کر راشد صاحب نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں، یہ شعر تو مجھے کہنا چاہیے تھا۔

اماموں اور صوفیوں کے ہاں حلول کی باتیں ہیں۔ ہندوؤں اور مسیحیوں کے ہاں اوتاروں کی۔ پوچھیں تو جواب ملے گا یہ شرک نہیں شرکت ہے، اس پر بھی میرا ایک شعر سنو ؎

قبل آفرینش کے تھا جہان تیرا ہی
بعد آفرینش کے ہے جہان دونوں کا

شرکت کی خواہش کا مضمون اقبال کے کلام میں ملتا ہے ؎

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اور راشد صاحب کا تو کلمۂ شہادت ہی لامساوی انسان ہے۔

انسان کی کبریائی کا کلمہ پڑھنے کا سلسلہ قدیم یونان اور روما میں تو تھا ہی، ریناسانس کے ساتھ یورپ میں اس کا احیاء ہوا۔ انسان پرستی کی حد تک پہنچی ہوئی تعظیم انسان ریناسانس کے ساتھ رونما ہوئی۔ مسیحی متکلمین نے

KUTABKHANA OSMANIA

اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں اپنی خیر سمجھی۔ آزاد خیالی سے شدید مغایرت کو خلاف مصلحت سمجھا۔

یہ کہنا کہ مسیح کو خدا کا ''اوتار'' جاننے کا عقیدہ خود ایک طرح کی انسان پرستی ہے، ان متکلمین کو ناگوار ہے۔ ایسے قول کا جواب ان کی طرف سے یہ ہے کہ اس عقیدے کی تفہیم چند جملوں میں نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے عہد جدید (New Testament) اور مسیحی علم الکلام کی گہری شناسائی درکار ہے۔

یہ ماننا مشکل ہے کہ انسان پرستی کی بات راشد صاحب کو اپنے آپ سوجھی، راشد صاحب یورپ کے دریائے تعقل کے غواص تھے۔

آزاد خیالی یورپ میں یونانی اور رومن انسان پرستی کے احیاء سے آئی اور جب آ گئی تو پھر یہ معنوناً انسان پرستی کی مؤید ہوئی۔ گویا آزاد خیالی اور انسان پرستی کے درمیان امداد باہمی استوار ہو گئی۔

آنے والے زمانے میں مسلمان مفکرین اور متکلمین کے افکار پر انسان پرستی کہاں تک اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ ڈراما ہم تو شاید نہ دیکھ پائیں گے، اگلی نسلیں ہی اس کو دیکھیں گی۔

ضیاء محی الدین نے اپنے والد بزرگوار کی یاد میں جو کالم لکھے ہیں، ان کا ذکر میں نے بعض اصحاب سے سنا۔ تم نے فون پر کہا تھا کہ ان کے تراشے مجھے بھیجو گے، اب تک نہیں ملے۔ تم نہ بھیجو گے تو اور کون بھیجے گا!

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

برخوردار

داؤد

26 March 1999

شفیق دوست، السلام علیکم!

وجیہہ کبھی کبھی مجھے فون کرتا ہے اور کراچی آنے کی دعوت دیتا ہے۔ میں نے اس سے کہا، تم یہاں کیوں نہیں آتے تو اس نے کہا، مجھ میں طیارے کے سفر کی سکت نہیں۔

۱۹۹۶ء کے دسمبر میں میں نے چند گھنٹے اس کے گھر میں گزارے اپنی غزلوں کی بیاض اسے دی، میں رخصت ہو چکا تو اس نے بیاض ایک ناشر کو دکھائی۔ ساڑھے چھ سو صفحوں کی بیاض دیکھ کر ناشر نے کہا۔ ''نثر کے گاہک بہت ہیں، شاعری کے خریدار کم۔ پاکستان کے شاعر آج کل اپنا کلام اپنے خرچ سے چھپواتے ہیں۔'' یہ سن کر وجیہہ نے بیاض کے پہلے تین سو بیس صفحات کی پچاس نفیس کاپیاں بنوائیں اور مجلد کرا کے میرے احباب میں بانٹ دیں۔ ایک نسخہ تمہیں بھی پہنچا ہوگا۔

دسمبر ۱۹۹۶ء میں میں واپس آیا تو بھائی بابر کو سنانے کے شوق میں غزلیں کہتا رہا۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ نئی غزلیں پھر جمع ہو گئیں تو میں نے ان کی فوٹو کاپی وجیہہ کو بھیجی۔ وجیہہ نے مجھے فون کیا اور کہا تمہارا سارا کلام شائع ہو جائے تو مجھے خوشی ہو، میں نے کہا تم ایک دیباچہ اس کے لیے لکھ دو اور اشاعت کی کوشش مجھ پر چھوڑ دو۔

فلوریڈا میں کہی ہوئی غزلیں میں نے اپنی سعادت مند بیٹی سمیرہ کو دکھائیں۔ اس نے کہا دیوان کی اشاعت پر جو خرچہ ہو اس کے لیے پانچ سو ڈالر کا نذرانہ میری طرف سے قبول کرو۔ وجیہہ کو فون پر میں نے یہ خبر سنائی تو اس نے کہا تو پھر پانچ سو ڈالر میں بھی اس کے لیے خوشی سے دوں گا۔

مطلب یہ کہ ایک ہزار ڈالر ناشر کو پیش کرنے کے لیے اللہ نے چھپر پھاڑ کر مجھے دیئے ہیں۔

میرے ہاتھ کا مکمل اور خوش خط نسخہ ۸۰۸ صفحات کا ہے۔ اس میں ساری غزلیں فلوریڈا کی کہی ہوئی ہیں، عنوان اس کا ہے

نئے دکن کا ریختہ

وجیہہ نے اسی عنوان والا ایک مجلد تمہیں بھیجا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ مسودہ کس قدر ستھرا اور خوش خط ہے۔

طباعت میں ضخامت کم کرنے کو یہ لازم ہوگا کہ جس صفحے پر ایک غزل کی کمپوزنگ ختم ہو، اسی صفحے پر اگلی غزل کی کمپوزنگ شروع کر دی جائے۔

ایک کرم مجھ پر اور کرو، میرے مہربان چودھری نیاز احمد صاحب کو وجیہہ کا فرستادہ مجلد دکھا کر ان سے پوچھو کہ انہیں اس پورے دیوان کی اشاعت کی تجویز قبول ہے یا نہیں۔ انہوں نے خوش دلی کے ساتھ میری نثر کی چیزوں کو اپنے سلسلہ مطبوعات میں شامل فرمایا ہے۔ پھر میں اس دیوان کی اشاعت کے لیے کسی دوسرے ناشر سے گفت وشنید کیوں کروں۔ اگر چودھری صاحب راضی ہو جائیں تو میں ایک ہزار ڈالر کے مساوی روپوں کی رقم انہیں پہنچانے کا انتظام کروں۔ اگر غزلیں پسند کی گئیں تو میری نثری کتابوں کی بکری بھی بڑھے گی۔

وجیہہ آج کل اس دیوان کا دیباچہ لکھنے میں مصروف ہے۔ نسخہ ہائے وفا کا دیباچہ مولانا نے لکھا تھا، آج مولانا حیات ہوتے تو دیوان کا دیباچہ لکھتے اور اپنی اکادمی کی طرف سے میرا دیوان شائع فرماتے۔ اب ان کا فرزند احسان کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔

وجیہہ دیباچہ مجھے بھیجے گا تو پورے دیوان کی فوٹو کاپی کے ساتھ اس کا دیباچہ بھی تمہیں بھیج دوں گا۔ دیوان کا مسودہ ۸۰۸ صفحات کا ہے۔

یہ خط جناب چودھری نیاز احمد صاحب کو دکھا دو مہربانی ہوگی۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

تمہارا برخوردار

داؤد

10 June 1999

بے نیاز اعجاز!

یہاں سے پونے دو سو میل دُور ایک قصبہ ہے' کسی نے مجھے بتایا کہ وہاں ایک دکان سازوں کی ہے جس میں ساری دنیا کے ساز فروخت کے لیے فراہم ہیں۔ مجھے ایک اچھا مردانہ طنبورہ درکار ہے۔ پرسوں موٹر دوڑا کر وہاں پہنچا۔ مجھے دو طنبورے دکھائے گئے۔ ایک زنانہ اور ایک مردانہ' مردانہ طنبورہ میں نے تین سو بارہ ڈالر میں خرید لیا۔ بھارت اور پاکستان میں ایسا طنبورہ پانچ ہزار روپوں میں ملتا ہے۔ وہاں سے منگاتا تو دام کم لگتے لیکن کئی مہینے منتظر رہنا پڑتا۔ جلسوں میں گلوکاری کرنی ہو تو طنبورہ گویے کا اپنا ہونا چاہیے۔

طنبورے کی بات چھڑ گئی تو دو ایک باتیں سنگیت کی بھی ہو جائیں۔ آج کل راگ سوہا کا نزہ مجھ پر

مسلط ہے۔ یہ قلندرانہ استغناء کا راگ ہے۔ کانڑے کئی ہیں۔ درباری کانڑہ، ابھوگی، شاہانہ، اڈانا، حسینی، نائکی، سگرئی، ان کی تاثیریں اپنی اپنی ہیں۔ سوہا کانڑہ کی خاص بات یہ ہے کہ ہندو گویا اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔ مسلمان گویا ہی اسے ٹھیک گائے گا۔ برعکس اس کے ابھوگی کانڑے کا حق ہندو گویا ہی ادا کرے گا، مسلمان گویا اس کی روح کو قابو نہیں کرسکتا۔

سوہا کی آستھائی کے بول میں نے پنجابی میں بنائے ہیں:-

اوہ دیاں اوہ ہی جانے سائیں
پردے ست آسماناں دے کون ہٹاوے

انترہ بھی اس کا بناؤں گا۔ کبھی مل بیٹھنا ہوا تو سناؤں گا۔

اور کیا خبر لکھوں۔ یہودی ''تصوف'' (قبالہ) کی ایک کتاب ایک کباڑیے کی دکان سے ایک ڈالر میں مجھے مل گئی۔ آج کل اس کا مطالعہ کر رہا ہوں اور حیران ہوں کہ اسلامی تصوف اور قبالہ اور ویدانت کے محاورے بھانت بھانت کے محاورے ہیں۔ اس کتاب کے چند صفحات کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ ان میں ''روئے الٰہی'' کا اور خصوصاً ''ریشِ الٰہی'' کا ذکرِ مبارک ہے۔

اسلامی تصوف کا محاورہ پوشیدہ نہ رکھا گیا تھا لیکن قبالہ کا محاورہ صدیوں خفیہ رکھا گیا۔ عبرانی سے اس کے ''صحیفے'' کے ترجمے بیسویں صدی میں ہونے لگے اور اب تو اس کی تبلیغ باقاعدہ شروع ہو چکی ہے۔ فلوریڈا کے اس علاقے میں اس کے دو سنٹر ہیں۔ کسی روز اس سنٹر کا رخ کروں گا جو میرے گھر کے قریب ہے۔

بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ایک ہی خط میں ساری لکھ دی جائیں۔ کبھی خط لکھتا ہوں، کبھی فون کرتا ہوں۔ میرے سوا سب لوگ کمپیوٹر والے ہوگئے ہیں۔ سائنس کے مکڑے نے رابطے کا جالا تہذیب کے باغ پر بُن دیا ہے۔ اسی لیے اسے Web کہتے ہیں۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

(اس خط کا تتمہ اگلے صفحے پر ہے)

برخوردار

داؤد

11 June 1999

آج ابھی بستر سے اٹھا ہوں۔ کافی پی رہا ہوں۔ کل جو خط لکھا تھا، ابھی ڈاک میں نہیں گیا، ان سطور کو اس کا تتمہ سمجھ لو۔

پہیلیاں قبالہ ہی میں نہیں۔ دھیان مت (Zen) میں بھی ہیں اور نوسٹک (Gnostic) مذاہب میں بھی ہیں اور بیدلؔ اور غالبؔ کے کلام میں بھی ہیں اور راشدؔ اور ضیاء جالندھری کی شاعری میں بھی۔ پہیلی کا کھیل کٹر پن کا توڑ ہے۔

رازداری کے محاورے بچوں نے بھی نکالے ہیں۔ اپنے بچپن میں ایسا ایک محاورہ ہمارے زیرِ استعمال بھی رہا۔ اس کا قاعدہ ہمارے تایا خادم محی الدین مرحوم نے ہمیں یاد کرایا تھا:-

کم او صلا ط له در سع گت

نسخۂ طریق استعمال اس کا یوں ہے کہ کسی لفظ میں جہاں کاف ہو، اسے بدل کر میم کر دو اور جہاں میم ہو، اسے بدل کر کاف۔ اسی طرح جہاں دال ہو، اسے بدل کر رے کر دو اور رے ہو تو اسے دال، ص ہو تو اسے بدل کر لا۔

مثلاً بڑوں کے درمیان بیٹھے ہوئے کسی بچے کو اپنے ہمجولی سے پنجابی میں یہ کہنا ہے:-

جوتش میں تینوں دسیاے کے نوں دسیں ناں

خفیہ بولی اس کی یوں بنے گی:-

جامش کیں گیناں دے معے ناں ریمیں ناں

چودھری ظفر اللہ کی سسرال کے گھر میں ایک اور قسم کی خفیہ بولی سننے میں آئی۔ اس میں ہر لفظ رے اور ف ملا کر بولا جاتا تھا۔ اس کے قواعد مجھے معلوم نہیں۔

امریکی بچے بھی خفیہ بولی بولتے ہیں، خصوصاً بچیاں۔ اس کا قاعدہ میں نے ایک شاگردن سے پوچھ کر دریافت کیا تھا۔ وہ یوں ہے:- ''دو ماتروں سے زیادہ کا لفظ نہ بولا جائے، ماترے اُلٹا دیے جائیں اور آخر میں ay (اے) کا لاحقہ جوڑ دیا جائے۔''

پہلی مثال:- لفظ ٹرک (Truck) اُلٹ کر آک ٹرے (Ucktray) ہو جائے گا۔

دوسری مثال:- I like travel by train

خفیہ بولی میں یوں ہوگا:-

Iay	Kileay	Veltraay	Ybay	Nairtay
آئی اے	کائی لے	ویل ٹرے اے	آئی بے	نیرٹے

اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں سے پوچھو کہ خفیہ بولی انہوں نے بھی بولی یا نہیں اور اگر بولی تو کس ترکیب سے۔ فلاحت اور بہو سے بھی پوچھو۔

رازدار

داؤد

25 June, 1999

اے اعجاز بٹالے والے! سلام!

تمہارے ایک بٹالوی عزیز لطیف المنان خاں کا خط کل مجھے ملا۔ اس کی کاپی تمہیں بھیج رہا ہوں۔ خط سے معلوم نہ ہوا کہ ان کا کاروبار کیا ہے اور کس ذوق کے آدمی ہیں۔ لطف المنان انوکھا نام ہے۔ اس خاندان کے دیگر ارکان کے نام دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔

ان دنوں طاعت اور عبادت کے مضمون کی سوچ لگی ہے۔ کئی سال پہلے میں نے یہ شعر کہا تھا

پرستش کرنے والوں کی توجہ طفل کی سی ہے
عبادت جس کو کہتے ہیں وہ اکثر دل لگی سی ہے

KUTABKHANA OSMANIA

اپنی نمازیں یاد آ رہی ہیں۔ کس پھرتی سے وضو کیا جاتا تھا۔ کس رفتار سے زیرِ لب سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھی جاتی تھی۔ کس عجلت سے رکوع اور سجدے کیے جاتے تھے۔ دائیں بائیں سلام پھیرتے ہوئے کیسی فراغت محسوس ہوتی تھی۔ نماز ہمیں ہمارے پھوپھی زاد بھائی محمد رفیق نے سکھائی تھی۔ التحیات کا تلفظ اتاحیات ہم نے انہی سے سیکھا۔ اس سبق میں حضورِ قلب کی تفہیم شامل نہ تھی۔

پوجا اور پرستش کی سوچ یوں تو مجھے مدت سے لگی ہوئی ہے لیکن پچھلے دنوں اس سوچ میں ایک سوال آ شامل ہوا۔ وہ یہ کہ مسیحیوں میں حضرت مریم علیہا السلام یعنی مادرِ مسیح کی پوجا کبھی قرار پائی یا نہیں۔ چند روز ہوئے پرانی کتابوں کی ایک دکان میں ایک کتاب دکھائی تھی۔ اس کا عنوان یہ ہے۔

TRUE DEVOTIONS TO MARY

اس کا مصنف ایک کیتھولک ولی مسمی St. Louis De Menfort ہے۔ یہ کتاب مادرِ مسیح کی پوجا کا دعوت نامہ ہے۔

پروٹسٹنٹ گرجوں سے یہ پوجا خارج ہے۔ کیتھولک گرجوں میں مادرِ مسیح کو پوجتے تو ہیں لیکن اس کی الوہیت کو ماننے بغیر اس تامل پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔

لفظ Worship میرے مزاج کا لفظ نہیں۔ لفظ Devotion مجھے اچھا لگتا ہے یعنی میں پجاری قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ دو لفظ اپنی زبان کے مجھے اچھے لگتے ہیں، شوق اور ذکر۔

مجھے کوئی خط لکھے نہ لکھے، مجھے اب اس کی پروا نہیں۔ میں خط لکھنے سے باز نہ آؤں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

تماشائی

داؤد

6 July 1999

دمساز میرے!

میرے ایک دوست نے باصرار چاہا کہ میں اس کے ہمراہ نام آور مغنیہ شیئر (Cher) کا گانا سننے چلوں۔ اس کی خوشی کے خیال سے میں ساتھ ہولیا۔ جلسہ گاہ میں داخل ہوا تو اس میں ایک لشکر سننے والوں کا موجود پایا۔ اکیس ہزار سامعین ہال میں بیٹھے تھے۔ پروگرام سنسنی خیز تھا۔ نغمہ اور رقص کی اودھم نے چھت اڑا کر رکھ دی۔ ٹیلی ویژن پر تو ایسے سینکڑوں پروگرام دیکھ اور سن چکا تھا لیکن سٹیج کے سامنے بیٹھ کر دیکھا اور سنا تو اصلیت معلوم ہوئی۔ مغنیہ نے جلسہ لوٹ لیا۔ رقاصوں اور سازندوں کی سنگت خصوصاً ڈھول تاشوں کی گت سے کانوں کے پردے پھٹتے پڑتے تھے۔ ہال میں درجن سے زیادہ زبردست مکبر الصوت نصب تھے۔ بادلوں کی گرج اس دھما دھم کے آگے ہیچ تھی۔

اس مغنیہ کی گلوکاری کا ایک ریکارڈ بھیج رہا ہوں۔ ایک الگ لفافے میں رجسٹری کرا کے خدا کرے ڈاکیہ مہربان رہے اور لفافہ تم تک پہنچ جائے۔ ریکارڈ ملے تو دو ایک دوستوں کو پاس بٹھا کر سنو اور حضورِ قلب سے حاصل کرو۔

امریکہ کی پوپ میوزک (پوپولر موسیقی) کا تذکرہ ''علامت'' کے لیے لکھوں گا۔ اس جلسے میں جانا ہوا تو یہ خیال آیا۔

ڈاکٹر انصاری کی دعوت قبول فرما کر ۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم نے ہندوستان میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ دلی، علی گڑھ، لاہور، پشاور، لکھنو، بنارس، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی میں اس نے تقریریں کیں اور اس کے اعزاز میں ان سب شہروں میں ضیافتیں ہوئیں۔ موصوفہ نے اس سفر کا حال Inside India کے عنوان سے انگریزی میں شائع کیا۔ اس کا شستہ اردو ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا۔ اس ترجمے کی دو عبارتوں کی نقل بھیج رہا ہوں۔ ایک میں نور جہاں کے گانے کی محفل کا بیان ہے۔ دوسری میں ایک ہندو رقاصہ کے رقص کا۔

تمہاری آمد کا منتظر ہوں۔ فلاحت کو سلام اور سلمان کو دُعا۔

امیدوارِ برکات

داؤد

12 July, 1999

بزمِ رنداں کے خواہاں!

شادؔ عظیم آبادی کی خودنوشت سوانح عمری ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ عنوان شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔ اس کی ترتیب کا کام حضرت نے علی گڑھ کے ایک طالب علم کے سپرد کیا تھا۔ جو مسودہ تیار ہوا اصلاح طلب تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جب بہار کے گورنر تھے تو مسودہ کی انہیں خبر ہوئی۔ انہوں نے اس سے مبیضہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا۔

اس آپ بیتی کی تین عبارتوں کی نقل بھیج رہا ہوں۔

اول: ایک خط مورخہ ۲۱۔ اپریل ۱۹۲۲ء جو شاد نے چھہتر کی عمر میں نواب عماد الملک بلگرامی کو لکھا۔

دوم: شاد کی تحصیلِ علم کا بیان۔

سوم: ان کی تصنیف نوائے وطن کے ہنگامے کی کہانی۔ یہ ہنگامہ برہان قاطع کے ہنگامے کی یاد دلاتا ہے۔

میرزا غالب نے ہندوستانی فارسی گویوں اور لغت نویسوں کی فارسی دانی کو ناقص کہہ کر طوفان اٹھایا۔ شاد نے نوائے وطن میں بغرضِ اصلاح بہار کے مصنفوں اور شاعروں کے اردو محاورہ کے نقائص گنوائے۔ اس کو ان لوگوں نے توہین سمجھا اور مخالفت کی آگ ایسی بھڑکی کہ تقریباً تمام نسخے اس ایڈیشن کے تلف کرنے پڑے۔ چالیس پینتالیس نسخے جو اس اتلاف سے پہلے تقسیم ہو چکے تھے، وہی بچ رہے۔

اگر اس کا کوئی نسخہ ڈھونڈ نکالو اور ایڈٹ کر کے اسے چھپواؤ تو اہلِ زبان کو عبرت ہو۔

اور کیا لکھوں، اب فلوریڈا کے ساحل پر یا دریائے ہڈسن کے کنارے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔ آج شام ہمارا بلند بانگ دوست آفتاب احمد خاں اپنی بیگم کے ہمراہ یہاں آ رہا ہے۔ دو تین روز گفتگو گرم رہے گی۔

منتظر

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

8 September, 1999

ہمدم!

میرا ارادہ یوں تھا کہ ظہیر دہلوی کی "داستانِ غدر" اگلی ملاقات کے وقت تمہاری نذر کروں گا۔ کل اس کی جلد بندھوا کر لایا تو جی میں کہا اعجاز واشنگٹن سے واپس ٹیری ٹاؤن آئے گا تو لاہور کی اڑان سے پہلے اس کے پاس دو ہفتے خالی ہوں گے، بابرہ کے گھر میں تو ساری کتابیں انگریزی کی ہیں۔ کوئی چیز اردو کی وہاں بھیجنی چاہیے۔ دو تین روز اس کتاب سے تمہارا جی بہلا رہے گا۔

مجھے معلوم ہے کہ تم ظہیر کی شاعری کو خوب نہیں کہتے۔ اس کی شاعری نفیس ہے یا نہیں، یہ سوال برطرف۔ میں تو ظہیر کے کردار سے متاثر ہوں۔ مرحوم میر پنجہ کش کا فرزند تھا۔ خود بھی کمال کا خطاط تھا۔ شاعری میں بہادر شاہ ظفر اور ذوق دونوں کا شاگرد تھا۔ یہ سب کچھ تھا اور اس پر تھانیدار بھی تھا۔ دھڑلے والا آدمی تھا۔ حوصلے والا آدمی، مہذب آدمی۔ تمہارے والد مرحوم کا سا کردار رکھتا تھا۔

اچھی جلد بندی پاکستان میں ہوتی ہے۔ امریکہ میں جلد سازی کا پیشہ مفقود ہو گیا ہے۔ چھاپے خانوں میں شایع ہونے والی کتابوں کی جلد بندی اسمبلی لائن کے سرے پر مشین سے ہو جاتی ہے۔ اب یہ کام دستکاری کا نہیں رہا۔

ڈاکٹر جمیل، بابرہ اور فلاحت کو سلام، باقی بروقت ملاقات۔

مشتاق

داؤد

9 September, 1999

مجی اعجاز!

خالدہ ادیب خانم کی تصنیف Inside India کا یہ ترجمہ عبدالوہاب خاں سلیم صاحب نے مجھے عطا فرمایا تھا۔ یہ تمہاری نذر ہے۔ اب جو کتاب میں انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے اس میں مجھے موصوفہ کی اس کتاب سے اقتباس کی ضرورت پڑے لیکن ظاہر ہے کہ اقتباس اصل انگریزی کتاب سے ہوگا۔ اصل انگریزی تصنیف امریکہ کی لائبریریوں میں دستیاب ہے۔

اردو ترجمہ ہاشمی صاحب نے کیا۔ ان کی تحریر کی شستگی کے کیا کہنے!

برخوردار

داؤد

15 September, 1999

مجی اعجاز!

مدت سے میری خواہش تھی کہ تم مولوی قمرالدین بدایونی کی کتاب بزمِ اکبر پڑھو۔ آج کل تم امریکہ میں ہو۔ اس قرب سے آسانی یہ ہے کہ بغیر رجسٹری کے پارسل بھیجا جا سکتا ہے۔ ڈاک کا بندوبست اس ملک میں قابلِ اعتبار ہے۔

اس کتاب کا وہ حصہ بھیج رہا ہوں جو صفحہ نمبر ۷۰ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مولوی قمرالدین احمد صاحب کی ڈائری کا جزو ہے۔ اکبر کے بہت سے اشعار کی شانِ نزول اسے پڑھنے سے ہم پر کھلتی ہے اور اشعار کی تہ میں جو پنہاں اشارے ہیں، ان کی معنویت معلوم ہوتی ہے۔

شکر ہے آندھی اور طوفان کا خطرہ ٹل گیا۔ ادھر کے بگولے بھوتوں سے کم نہیں ہوتے۔ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ آج صبح تک میامی کی اور ہماری طرف کی ساری آبادی سہمی ہوئی تھی۔ بگولا مشرق سے مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فلورڈا کے مشرقی ساحل کے قریب پہنچ کر شمال کی طرف مڑ گیا۔ ایسا نہ ہوتا تو ہمارے گھر کی چھت اڑ جاتی۔ الاماں۔

بقول ظہیر کاشمیری۔ بگولا رقص میں رہتا ہے، صحرا میں نہیں رہتا۔ پچیس تاریخ کو ملاقات ہوگی۔

فلاحت بیگم اگر اب تمہارے پاس ہیں تو انہیں سلام، ڈاکٹر جمیل کی میزبانی یاد آ رہی ہے۔ انہیں اور عزیزہ بابرہ کو بھی سلام۔

شاکر

داؤد

28 September, 1999

انیس و جلیس!

اچھا ہوا آج صبح تمہیں فون کیا۔ پوتی کی ولادت کی خوشخبری بھی ملی اور تمہاری واپسی کی تاریخ بھی تحقیق معلوم ہوئی۔

ڈاکٹر محمد اشرف، پنڈت سندر لال اور مولانا نیاز فتح پوری کے بیان تو تم پڑھ چکے ہو، باقی لکھنے والوں کے محاسبہ ہائے نفس بھی پڑھ لو۔ مجھے تو یوں لگا کہ جی لگا کر انہی تینوں نے لکھا، باقی لکھنے والوں نے کھل کر بات نہ کی۔ بہر حال

ہمایوں نامے دو ہیں۔ ایک جوہر آفتابچی نے لکھا۔ دوسرا ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے۔ میرے پاس حسن اتفاق سے دونوں ہیں۔ گلبدن بیگم والا اگر لاہور میں دستیاب نہ ہوا تو مجھے بتا دینا۔ میں کسی کے ہاتھ اس کی کاپی تمہیں بھیج دوں گا۔

جوہر آفتابچی کے ہمایوں نامے سے ان صفحات کی کاپی بھیج رہا ہوں جن پر ہمایوں کے قیامِ ایران کے حالات ہیں۔

لاہور پہنچ کر پہلے سفر کی تکان اور اڑان خمیازہ دور کرو۔ پھر کسی روز نیاز صاحب کو فون کر کے انہیں میرا سلام پہنچاؤ اور یہ التماس کہ جب پراگندہ طبع لوگ بازار کے لیے تیار ہو جائے تو اس کے صرف دو نسخے رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے مجھے بھیج کر ممنون فرمائیں۔

فلاحت، ڈاکٹر جمیل اور بابر و سلمان کو سلام، پوتی کی ولادت مبارک ہو۔

تمہارا گرویدہ

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

8 October, 1999

مہربان دوست!

کسی زمین میں تنگ بندی کرتے ہوئے کبھی کبھی ایک آدھ اچھا شعر بھی نکل آتا ہے۔ سنو ۔

خدا ہی جانتا ہے کس کو کس مت کی ضرورت ہے

ہم اتنا جانتے ہیں ہم کو ہمت کی ضرورت ہے

تمہاری واپسی کے بعد پرسوں ایک صاحب نے ٹیلی فون کیا اور کہا میں نے جلسے میں اعجاز صاحب کی اور آپ کی تقریریں سنیں۔ میں بٹالوی بھائیوں کے کارناموں سے کچھ ایسا واقف نہ تھا۔ امریکہ میں ایسی معلومات میسر نہیں۔ تیرہ برس کا تھا جب والدین کے ساتھ یہاں آیا۔ سکول اور کالج کی تعلیم یہیں پائی۔ کولمبیا یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ پھر نیو جرسی کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ پریذیڈنٹ کارٹر کی صدارت کے زمانے میں مرکزی حکومت کی نوکری کی۔ اب ریٹائرڈ ہوں۔ دلبستگی کا کوئی سامان نہیں۔ آپ کے پاس اگر اردو کی کوئی اچھی کتابیں ہوں تو مجھے بھیجا کریں۔

دیکھو لو پردیسی یہاں آ کر کیسے وطن مانگتا ہے۔

حضرت آدم کا پڑپوتا باغ عدن مانگتا ہے۔

دو تین دنوں کی ملاقات غنیمت تھی۔ یہ مصرع تم نے سنا ہوگا ۔

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو

ایک پنجابی دوست سے یہ مصرع یوں بھی سنا ۔

غنیمت سمجھ رَل مل بیٹھنے کو

سمجھ کے میم کو سکون یعنی بغیر زیر کے پڑھ کر اس نے مصرعے کو وزن سے گرنے سے بچائے رکھا۔

ان شاء اللہ جنوری کے آخر میں ہفتے عشرے کی زیارت کے لیے پاکستان آؤں گا۔ زیارت اب کے پرائیویٹ ہی رہے تو بہتر ہے تا کہ دوستوں سے باتیں کرنے کو پوری فراغت ہو۔

''نقوش'' کے ایڈیٹر صاحب کو اگر میرا مضمون ابھی دیا نہیں تو یہ مہربانی کرو۔ مسودے کے صفحہ نمبر ۲ کی دوسری سطر میں ایک لفظ ہے ''دستار بند'' اسے کاٹ کر اس کی جگہ ''دستار بستہ'' لکھ دو۔ دستار بند کی ترکیب کئی روز سے کھٹک رہی تھی۔ ٹھیک ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ کل کھٹ سے یاد آ گئی۔ یہ تصحیح بہت ضروری ہے۔

دستار بند اس عبارت میں غلط ہے۔ دستار بند تو اُس ملازم کو کہتے ہیں جو دستار باندھنے کا ماہر ہوتا ہے اور اپنے آقا کی پگڑی درست رکھتا ہے۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

دست بستہ

داؤد

1st November, 1999

دادرس!

میرزا غالبؔ نے ستمبر کے مہینے میں ایک خط لکھا (یاد نہیں کسے لکھا) اس میں ضلع جگت والی بات کی یعنی یہ مصرع:۔

ستمبر ستم برد و آورد داد

میں یہ خط نومبر کی پہلی کو لکھ رہا ہوں۔ چنانچہ کہہ سکتا ہوں ۔

نومبر کی پہلی ہوئی نامہ بر

امریکہ میں تم نے بہت دن گزارے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ یہاں ہیلو وین (Halloween) کا تہوار کس طرح منایا جاتا ہے۔ لفظی معنے اس کے ہیں شام مقدسون یعنی یوم اولیاء (All Saints Day) سے قبل کی شام، یہ شام کل منائی گئی۔ یورپ اور امریکہ کے کیلنڈروں (اور کھلنڈروں) کے حساب سے یوم اولیاء آج ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ نام تو اس کا شام مقدسون ہے لیکن اس کے منانے کی رسوم میں تقدیس والی کوئی بات منانے والوں کے شعور میں نہیں ہوتی۔ مغرب کے سے چھوٹے بڑے سب چڑیلوں اور بھوتوں کے بھیس اور بہروپ کے کھیل کھیلتے ہیں۔ وقتِ غروب آفتاب بچے بھی بھیانک پوشاکیں پہنے ہوئے اور ہاتھوں میں خالی لفافے یا ٹوکریاں لیے ہوئے محلے کے گھروں پر دستک دیتے ہیں۔ اہلِ خانہ دروازہ کھولیں تو بچے بیک آواز کہتے ہیں۔ ''ضیافت ورنہ داؤں'' (Trick -or- Treat) یعنی کچھ مٹھائی ٹوکری میں ڈال دو ورنہ ہم کوئی چال چلیں گے۔ ٹوکریوں میں میٹھی گولیاں ڈال دی جاتی ہیں اور بچے اگلے گھر کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

بھوتوں اور چڑیلوں کے بہروپ میں شام مقدسون کا منانا مظہر العجائب نہیں تو کیا ہے۔ اس کی تہ میں کوئی بات ضرور ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اس طرح ایک شام روح القدس کے وردِ مسلسل سے چھٹی منائی جاتی ہے۔

ینگ نے کہیں لکھا ہے کہ یورپ کے جنگجو اور غصیلے قبائل نے مسیحیت کی تعلیم بردباری قبول کی تو طبیعتوں کے بھوت لاشعور کے پاتال میں جا چھپے۔ اب وہ اس کمین گاہ سے کارفرما ہیں۔

کل شام یہاں شام مقدسون تھی۔ چنانچہ آج یوم اولیاء ہے۔ اصل میں یہ تہوار کیتھولک اور اینگلی کن کلیساؤں کا تہوار تھا لیکن اب سارے اہالیانِ امریکہ اسے مناتے ہیں۔ قند کے کئی پیکٹ بچوں کی ٹوکریوں میں گولیاں ڈال ڈال کر میں نے بھی خالی کیے۔

مضمون کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ صفحہ ۱۲ سے صفحہ ۱۹ تک ملاحظہ فرماؤ تو معلوم ہوگا کہ میں نے مضمون کا ایک حصہ نئے پیرائے میں لکھا ہے۔ امید ہے اب بیان تم کو متوازن لگے گا۔ وہ کاپی جو تم ساتھ لے گئے تھے، پھاڑ ہی ڈالو تو بہتر ہے۔

میں نے جو اضافہ کیا ہے، اس میں (صفحہ ۱۳ پر) شیوا زبانی کی ترکیب استعمال کی ہے۔ (شیوا بیانی بھی کہہ سکتا تھا) شیوا (الف کے ساتھ) لکھا جائے تو اس کے معنی فصیح و بلیغ کے ہوتے ہیں اور ہائے ہوز کے ساتھ

KUTABKHANA OSMANIA

شیوہ لکھیں تو اس کے معنے ہوں گے شعار، ڈھنگ، طور۔ تمہارے گھر میں فارسی کی جو لغت ہے، اس میں دیکھ لو کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں۔

ضیاء محی الدین نیو یارک اور ٹورانٹو میں قرأت کے جلسے جما کر (بقول تمہارے بِلّے لوٹ کر) اپنی بہن رضیہ سے ملنے انڈیانا پہنچا۔ وہاں سے اس نے اچھے موڈ میں مجھے فون کیا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

فریادی

داؤد

11 November, 1999

یار جی!

جنوری ۱۹۹۷ء میں میں تمہارے ہمراہ مکتبۂ سنگ میل گیا تھا۔ وہاں میں نے چودھری نیاز احمد صاحب کی خدمت میں دو چیزیں پیش کی تھیں:۔

پراگندہ طبع لوگ کا مسودہ

باتیں کچھ سریلی سی

پچھلے سال تم نے بتایا کہ موسیقی والی کتاب کا نسخہ مکتبہ میں نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ عاریتہً وہاں سے کوئی لے گیا اور واپس نہیں لایا۔ خیر کوئی مضایقہ نہیں، میرے پاس جو نسخہ ہے' اس سے فوٹو کاپی بنا کر میں نے رکھ لی ہے۔ وقت آنے پر وہ نیاز صاحب کی خدمت میں بھیج دی جائے گی۔

دلی سے یہ کتاب بغیر کسی دیباچے کے چھپی تھی، لاہور کے ایڈیشن کے لیے میں نے ایک دیباچہ لکھا ہے اور اس کے ساتھ ایک خط (ضیاء الصمد کا) بھی برائے اشاعت منسلک ہے۔

ایک ضمیمہ بھی میں نے نئے ایڈیشن کے لیے تیار کیا ہے۔ دیباچہ اور ضمیمہ تمہارے بہلانے کو بھیج رہا ہوں۔ انہیں اپنے پاس رکھو، مکتبہ کو میں پوری کتاب کی فوٹو کاپی مع دیباچہ ضمیمہ مستقیماً بھیج دوں گا۔

اب مجھے انگریزی میں Faith of the Individual کے موضوع پر یکسوئی کے ساتھ کام کرنا ہے، بھائی عاشق نے یہ جو کہا تھا

"مجھے تو شعر نے بچالیا" (یعنی غزل نے)

اس ایک جملے کی شرح ایک پوری کتاب کا موضوع بن سکتی ہے۔ ہمارے ابا جی بھی کہہ سکتے تھے۔

"مجھے اُردو زبان کی محبت نے بچالیا" میں کہہ سکتا ہوں۔ "مجھے آگرہ گھرانے کی محبت نے بچالیا"۔ راشد صاحب نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔ "اصل میں تمہارا خدا وہ ہے جو استاد فیاض خاں کا گانا پسند کرتا ہے۔"

میرا خیال ہے بھائی عاشق کا اور ہمارے ابا جی کا مذہب تغزل تھا۔ ینگ اور فرائیڈ کے چیلوں کو یہ بات ہم نہیں سمجھائیں گے تو کون سمجھائے گا۔

Faith سے میری مراد مشکلات کے مقابلے کا حوصلہ ہے۔ اخلاقیات کے حوالے سے کہا جائے گا، جادۂ خیر پر گامزن رہنے کا حوصلہ۔ یہ حوصلہ کسی میں کم ہوتا ہے' کسی میں زیادہ اور جس میں زیادہ ہوتا ہے وہ بھی

گاہے گاہے لڑکھڑاتا ہے۔

نعمان الحق صاحب نوکری کی تلاش میں تھے۔ ان کے ایک یہودی محسن نے ایک روز ان سے کہا۔

"میں خدا کے وجود کا قائل نہیں ہوں لیکن تمہاری کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔" کیا چشم کشا جملہ ہے! دیکھ لو نفس کی قلابازیاں۔ یہی میری انگریزی کتاب کا موضوع ہوگا۔

اکبر کا یہ شعر تم نے بزم اکبر میں پڑھا ہوگا

مذہب میں پناہ آخر کو ملی اور کفر کی زد سے بچ نکلے
ہر دم ہے یہی اب اپنی دعا اللہ کا ہونا بچ نکلے

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

پراگندہ طبع

داؤد

26 November, 1999

محبی اعجاز!

سنا ہے کہ ان دنوں تمہاری مصروفیت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ کبھی فرصت ہو تو وہ استفسار ملاحظہ کرو جو کراچی سے ایک بزرگ نے مجھے بھیجا۔ اسے پڑھنے کے بعد ان کے نام میرا جواب پڑھو۔

اس بزرگ کا نام محبّ عارفی ہے۔ ان کی عمر اکاسی ہے، انگریزی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ میرا پتہ انہیں مشفق خواجہ صاحب نے دیا۔ چنانچہ میں نے جواب کسی قدر اعتناء کے ساتھ لکھا۔

تمہیں خط لکھنے کا ایک بہانہ یوں ہاتھ آیا، فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

آج جمعہ ہے، کل سنیچر کی صبح تمہیں فون کروں گا۔

متقاعد یعنی

ریٹائرڈ

داؤد

22 December, 1999

رہبر کے رہنما!

تقویم شمسی کا نوروز الفِ ثالث مبارک۔ کیسے بھول جاؤں کہ تم نے مجھے کچھ راستے ایسے دکھائے تھے جن سے میری طبیعت میں ولولہ آیا۔

مدت ہوئی میں نے قاطع بُرہان والا مضمون تمہاری فرمائش پر لکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ علامت میں چھپے گا۔ پھر تمہاری باتوں سے میں نے جانا کہ میرزا غالب کے مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی پر جو کتاب تم نے لکھی ہے، اس میں میرا مضمون بھی شامل کرو گے۔ کیا وہ ارادہ برقرار ہے؟ مجھے معلوم نہیں تمہاری کتاب کا مسودہ ابھی تمہارے پاس ہے یا مکتبہ کو پہنچا دیا گیا۔

پچھلے دنوں میں نے اس مضمون کو پڑھا تو دیکھا کہ اس میں افادات سلیم مصنفہ وحید الدین سلیم اور

نکاتِ سخن مصنفہ حسرت موہانی سے جو اقتباسات ہیں، وہ میں نے اپنے قلم سے نقل نہیں کیے چھپے ہوئے صفحات کی فوٹو کاپیاں کر کے شامل کیے ہیں۔ دونوں کتابوں کی کتابت اور طباعت کیسی ردی اور پر از اغلاط ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اب ہوا ہے۔ پس میں نے ہمت کر کے ان طویل اقتباسوں کو اب اپنے قلم سے نقل کیا ہے اور مسودے کو پھر سے مرتب کیا ہے۔

پرانا مسودہ ردّی کے ٹوکرے میں ڈال دو اور یہ نیا مسودہ (بلکہ مبیضہ) اس کی جگہ محفوظ کر لو۔

مجھے کچھ خبر نہیں کہ بڑے مقدمے کی ذمہ داری سے تمہاری مصروفیت کس حد تک بڑھ گئی ہے۔ آخر فروری یا آغاز مارچ میں میں لاہور آؤں تو ایسا نہ ہو کہ تم عازمِ کراچی ہو جاؤ، کسی اتوار کو فون کر کے خیریت دریافت کروں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

مفقود

داؤد

14 January, 2000

سخن شناس!

پچھلے سال ضیاء جب امریکہ کے مختلف شہروں میں اپنی ڈرامائی قرأتوں کے لیے آیا تھا تو اس نے اپنی بہن رضیہ کے گھر سے (جو انڈیانا میں ہے) مجھے فون کیا اور پوچھا آج کل کس سوچ میں ہو۔ میں نے جواب دیا کہکشاؤں کے منظم رقص اور اس کے پروڈیوسر کی سوچ میں ہوں۔ اس کا پروڈیوسر ضرور دانشمند ہے ورنہ یہ رقص اس قدر بارابطہ اور باضابطہ نہ ہوتا۔

ضیاء نے سن کر کہا ضابطہ کی بات کہکشاں تک ہی ہے یعنی دھرتی تو اندھیر نگری بنی ہوئی ہے۔

پچھلے دنوں شیلے کی ایک نظم پڑھ کر مجھے ضیاء کی بات یاد آئی۔ اس نظم کا عنوان ''سرکشیٔ اسلام'' (Revolt of Islam) ہے۔ اس میں شیلے نے وہی بات کہی ہے جو ضیاء نے کہی:- بادلوں کے گالے کیسے نرم ہوتے ہیں اور چاندنی کتنی دلکشا۔ بے اصولیاں اور بددیانتیاں اور مظالم سب دھرتی پر ہیں۔

امید کا ایک جھونکا جو شاعر نے محسوس کیا، انقلابِ فرانس کے خیال کی دین ہے۔

نظم کا دیباچہ شیلے نے نثر میں لکھا ہے۔ اس میں یہ نہیں بتایا کہ نظم کا عنوان ''سرکشیٔ اسلام'' کیوں رکھا۔

شیلے کے حینِ حیات اس کی بدنامی تو اس کی دہریت کی وجہ سے تھی، اس کے ہم وطن سمجھتے تھے کہ یہ نیچری ہے اور کلیسا کے خلاف باغی ہے۔

ڈیڑھ سو صفحوں کی اس طویل نظم میں اسلام کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے۔ (کینٹو نمبر x کے بند نمبر xxxiv میں) اس بند کو پڑھ کر بتاؤ کہ نظم کے عنوان کا معما اس سے حل ہوا یا نہیں۔

انگلستان میں شیلے کے با اقتدار معاصرین یہ نظم پڑھ کر اس سے ناراض ہوئے۔ اس کے خسر گوڈون نے (جو ایک سوشلسٹ انشا پرداز تھا) اسے خط لکھا کہ نظم میں صداقت اور خلوص کی کمی ہے۔ شیلے نے اس خط کا اپنے خسر کو جو جواب دیا، وہ بھی پڑھ لو اور شیلے کا لکھا ہوا دیباچہ بھی۔ پھر تم سے اس پر گفتگو ہوگی۔

خواہانِ ملاقات

داؤد

15 February, 2000

یارِ غار!

زید نے عمر سے کہا۔ ''او مردود ملعون'' عمرو نے تالی بجا کر کہا ''ان صلواتوں کے قربان جایئے۔'' عمرو کے اس جواب میں طنز ہے۔ مطلب یہ کہ ''تو سمجھتا ہے تیری ان گالیوں سے میں واقعی مردود اور ملعون قرار پایا، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ یہ کہ میں نے گالیاں کھائیں تو میں مردود نہیں ہوا بلکہ مورد و رزد ہوا۔''

یہ مضمون میرے ایک شعر میں یوں ادا ہوا ہے ؎

چپت جس نے بھی کھائی بول اٹھا یہ تو چپاتی ہے
تمہاری مار کو مخلوق نے ضرب المثل جانا

Platts کی ڈکشنری میں ''صلواتیں سنانا'' کے معنی درج ہیں:- گالیاں دینا، اس کے ساتھ ہی بریکٹ میں لکھا ہے:- Ironic یعنی طنزیہ۔

صلواتیں سنانا سے زیادہ مزیدار محاورہ ہے، ملاحیاں سنانا۔ اس محاورے کے پیچھے ضرور کوئی کہانی ہوگی۔ مقتدرۂ اردو (اسلام آباد) نے فسانۂ آزاد کی ایک فرہنگ شائع کی ہے۔ اس میں دیکھو ملاحیاں سنانا میں تلمیح کیا ہے۔

دوسری بات:- قرآن مجید میں معراجِ پیغمبرؐ کا اشارہ صرف سورہ الاسریٰ میں نہیں، سورہ النجم میں بھی مانا گیا ہے۔ اس سورہ کی پہلی اٹھارہ آیات یہ ہیں:-

وَالنَّجمِ إذَا هَوَىo مَاضَلَّ صَاحِبُكُم وَمَا غَوَىo وَمَا يَنطِقُ عَنِ الهَوَىo إن هُوَ إلَّا وَحيٌ يُوحَىo عَلَّمَهُ شَدِيدُ القُوَىo ذُو مِرَّةٍ فَاستَوَىo وَهُوَ بِالأُفُقِ الأعلَىo ثُمَّ دَنَى فَتَدَلَّىo فَكَانَ قَابَ قَوسَينِ أو أدنَىo فَأوحَى إلَى عَبدِهِ مَا أوحَىo مَا كَذَبَ الفُؤَادُ مَارَأىo أفَتُمَارُونَهُ عَلَى مَا يَرَىo وَلَقَد رَآهُ نَزلَةً أُخرَىo عِندَ سِدرَةِ المُنتَهَىo عِندَهَا جَنَّةُ المَأوَىo إذ يَغشَى السِّدرَةَ مَا يَغشَىo مَازَاغَ البَصَرُ وَمَا طَغَىo لَقَد رَأَى مِن آيَاتِ رَبِّهِ الكُبرَىo (آیات نمبر ۱ تا نمبر ۱۸)

ترجمہ:-

(لوگو) ہم کو شہاب ستارے کی قسم جب وہ (آسمان سے) ٹوٹتا ہے کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ تو (راہِ راست سے) بھٹکے اور نہ اپنی خواہشِ نفسانی سے باتیں بناتے ہیں۔ (بلکہ) یہ (قرآن جو پڑھ کر سناتے ہیں) وحی (آسمانی) ہے جو ان پر نازل ہوئی۔ ان کو (جبریل فرشتہ) تعلیم کرتا ہے جس کی روحانی

KUTABKHANA OSMANIA

طاقتیں بڑی زبردست ہیں اور اس کی جسمانی قوت بھی بڑی زبردست ہے کہ جس وقت وہ (آسمان کی ایک طرف اچھی اونچی جگہ میں تھا (اپنی اصلی صورت میں سارے کا سارا) پیغمبرؐ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھر (دونوں میں) دو کمان کی قدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔ اس وقت خدا نے اپنے بندہ (محمدؐ) کی طرف (جبریل کے ذریعے) جو وحی کرنی تھی، سو کی۔ پیغمبرؐ نے جو کچھ دیکھا تھا (ان کے) دل نے اس میں کچھ جھوٹ نہیں ملایا۔ پیغمبرؐ جو جبریل کو دیکھا کرتے ہیں۔ کیا تم لوگ ان سے اس بات پر جھگڑا کرتے ہو (حالانکہ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں کیونکہ) انہوں نے تو (معراج کے وقت) سدرۃ المنتہٰی کے پاس (جہاں نیک بندوں کے رہنے کی) بہشت ہے۔ جبریل کو ایک دفعہ اور بھی (اصلی صورت پر اپنے پاس آیا ہوا) دیکھا تھا جب کہ اس (سدرہ) پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا (یعنی نور) اس وقت بھی پیغمبرؐ کی نظر نہ کسی طرف کو بہکی اور نہ (جگہ سے) اُچٹی۔ کچھ شک نہیں کہ پیغمبرؐ نے اس موقع پر پروردگار کی (قدرت کے) بڑے بڑے عجائب دیکھے۔ (ترجمہ مولوی نذیر احمد کا)

۱۳۔ اور ۱۴۔ مارچ کو ان شاء اللہ مل بیٹھنا نصیب ہوگا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

حیرت اور تشکک پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔

حیرتی (نہ کہ شکی)

داؤد

11 April, 2000

دوست!

حیات خود مختصر ہے۔ غضب یہ ہے کہ ملاقات بھی مختصر رہی۔ اب تم شاہد اور بابرہ سے ملنے آؤ تو ہمارے دکن کی طرف بھی آؤ۔ بافراغت ملاقات امریکہ ہی میں ہوگی۔ خبر ملی ہے کہ بڑے مقدمے کی اپیل کے وکلاء کی ٹیم میں تم شامل ہو۔ یہ معلوم نہیں کہ اپیل کی عدالت کراچی میں ہے یا اسلام آباد میں، خدا کرے اپیل کا نتیجہ بخیر نکلے۔

نفیس غذائیں زندگی میں خوب کھائی گئیں لیکن برفی کے اس ٹکڑے کا جواب نہیں جو تمہارے گھر میں اب کی بار کھایا۔

موسیقی والی کتاب کا مسودہ تمہیں بھیج رہا ہوں۔ تم آج کل بے حد مصروف ہو، چودھری نیاز احمد صاحب کے مکتبہ کو جانے کی فرصت تمہیں نہ ہوگی۔ ان کو فون کر دو کہ مہربانی فرما کر مسودہ تمہارے گھر آ کر وصول کر لیں۔

۱۹۹۶ء کے دسمبر میں جب میں نے مکتبہ میں بیٹھے ہوئے پراگندہ طبع لوگ کا مسودہ انہیں دیا تو اس کے ساتھ ہی موسیقی والی کتاب کا ایک نسخہ بھی دیا۔ تم نے ایک روز فون پر بتایا کہ وہ نسخہ لاپتہ ہو چکا ہے۔ اس صورت سے آگاہ ہو کر گزشتہ سال نومبر میں میں نے رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے کتاب کی مکمل فوٹو کاپی (مع دیباچہ و ضمیمہ) مکتبہ کو بھیجی، مکتبہ میں پہنچ کر مجھے بتایا گیا کہ وہ پارسل موصول نہیں ہوا۔

اب ایک پیکٹ پھر تیار کیا ہے۔ خدا کرے بخیریت تم تک پہنچ جائے۔ قبلہ چودھری نیاز احمد صاحب کو

میرا اسلام نیاز اور ان سے میری گزارش کہ مسودہ جونہی ملے کمپوز کروا دیں۔ پراگندہ طبع لوگ کی پشت پر انہوں نے موسیقی والی کتاب کا اشتہار چھاپ دیا ہے۔ اسے پڑھ کر لوگ پوچھیں گے، کتاب بازار میں دستیاب کب ہوگی۔

اسلام آباد میں چند گھنٹے ضیاء جالندھری کے ساتھ خوش وقت ہوا۔ ضیاء مجھے گوہر کے گھر لے گیا۔ حسنِ اتفاق سے وہاں تجمل بھی عید منانے کے لیے موجود تھا۔ میری ڈبل عید ہو گئی۔ یہ ملاقات ۱۴۔ مارچ کو ہوئی۔ عید الاضحیٰ سے ایک روز پہلے۔

میں جب فون کرتا ہوں تم کہتے ہو۔ ''سائیں حال دیو'' آج منگل ہے۔ سنیچر کو فون کیا جائے گا اور حال دیا جائے گا۔

فلاحت کو سلام۔ سلمان کو دعا۔

بڑ نگے شاہ

20 May, 2000

ہمدم!

پنج تن پاک کی طرح اصحابِ ثلاثہ بھی ایک تلمیح ہے۔ پہلی بار یہ غالباً میرزا غالبؔ کے کسی خط میں میری نظر سے گزری۔ میں نے اردو، فارسی اور عربی کی ڈکشنریوں کو دیکھا۔ کسی ڈکشنری میں اس تلمیح کا اندراج نہ پایا۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ میں نے قیاس سے کام لیا اور یہ جانا کہ اس سے مراد حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ہیں یعنی وہ راشدین جو شیعہ لوگوں کی نظر میں سنیوں کے خاص ہیرو ہیں۔

آج شاہ ولی اللہ کی تصنیف انفاس العارفین کی ایک عبارت میں یہ لفظ سامنے آیا تو میں چونکا۔ اس عبارت میں صریحاً اصحابِ ثلثہ سے مراد حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ ہیں۔

شاہ صاحب اپنے والد ماجد شاہ عبد الرحیم کے فرمودات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

عطیہ سرکارِ دو جہاںؐ

فرمایا کرتے تھے کہ ابتداء میں میں نے چاہا کہ دائمی روزہ اختیار کروں۔ حضرت ختمی مرتب علیہ السلام کی بارگاہ میں متوجہ ہوا تو بچشم حقیقت دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے روٹی عطا فرمائی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خوش طبعی کے طور پر فرمایا۔ الھدایا مشترک ہدیہ مشترک ہوتا ہے۔ میں نے وہ روٹی ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ انہوں نے ایک ٹکڑا لے لیا۔ اسی وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ الھدایا مشترک۔ میں نے پھر روٹی انہیں پیش کی۔ انہوں نے بھی ایک ٹکڑا لے لیا۔ پھر حضرت علیؓ نے فرمایا۔ الھدایا مشترک تو میں نے ان کی بارگاہ میں روٹی پیش کی۔ انہوں نے بھی ایک ٹکڑا لے لیا۔ اسی دوران حضرت عثمانؓ نے فرمایا الھدایا مشترک میں نے عرض کی کہ اگر روٹی اسی طور تقسیم ہوتی رہی تو اس درویش کو کیا حصہ ملے گا؟ آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس موقع پر میں بیدار ہو گیا۔ ایک عرصے تک میں غور و فکر کرتا رہا کہ حضرت ذوالنورینؓ کی باری پر حرفِ عذر کہنے میں آخر کیا نکتہ پوشیدہ تھا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ مثالی صورتوں میں ایسے امور اور وقائع کی مثالوں سے رابطہ مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے طریقہ نقشبندیہ کا تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ تک ہمارا شجرہ نسب پہنچتا ہے اور حضرت علی کی ذاتِ گرامی کے ساتھ والدہ کی طرف سے ہماری نسب اور اصل کا تعلق ہے اور طریقہ نقشبندیہ نیز

دیگر سلاسل صوفیا بھی انہی کی ذاتِ گرامی تک پہنچتے ہیں اور بعض واقعات میں آنجناب کی ذاتِ گرامی سے ہم نے فیوض بھی حاصل کیے ہیں تو یہ معاملہ ان اصحاب ثلٰثہ کی ذاتِ گرامی تک محدود رہنا ضروری تھا جبکہ حضرت عثمان کے ساتھ ان وجوہات واسباب میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

تمہارے شناساؤں میں ندوی اور دیوبندی بزرگ ضرور ہوں گے۔ ان سے پوچھ کر مجھے بتاؤ کہ اصحاب ثلٰثہ سے کونسے راشدین مراد ہیں۔

انفاس العارفین ہی سے ایک دوسری عبارت نقل کرتا ہوں۔ ازراہِ تفنن۔

مقاماتِ اولیاء

فرمایا کہ ایک بار میں حضرت خواجہ قطب الدینؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے گیا۔ یکایک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میری گنہگار آنکھیں اور وجود اس قابل نہیں کہ اس مقدس بارگاہ میں حاضری دیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں مزار مبارک سے متصل چبوترے پر رک گیا۔ اسی دوران آپ کی روحانیت جلوہ گر ہوئی اور مجھے حکم دیا کہ آگے آؤ! میں دو تین قدم آگے بڑھا۔ اسی اثناء میں میں نے دیکھا کہ آسمان سے چار فرشتے ایک تخت اٹھائے ہوئے آپ کی قبر مبارک کے قریب اترے۔ معلوم ہوا کہ اس تخت پر حضرت خواجہ نقشبندؒ ہیں۔ قران السعدین ہوا۔ دونوں شیوخ نے خلوت میں راز و نیاز کی باتیں کیں۔ اس کے بعد حسب سابق فرشتے تخت کو اٹھا کر روانہ ہو گئے اور حضرت خواجہ قطب الدین میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ نزدیک آؤ، میں دو تین قدم اور آگے بڑھا۔ آپ بار بار نزدیک آنے کے متعلق فرماتے رہے اور میں آہستہ آہستہ قریب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت کے بہت نزدیک ہو گیا۔ پھر آپ نے پوچھا۔ شعر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کلام حسنہ حسن و قبیحہ قبیح (شعر بھی منجملہ دیگر کلام کے ہے۔ اس میں جو بہتر ہے، وہ اچھا ہے اور جو مخرب ہے، وہ قبیح ہے) اس پر آپ نے فرمایا۔ بارک اللہ۔

پھر آپ نے دریافت فرمایا۔ خوبصورت آواز کے بارے میں تمہارا نظریہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء (یہ لطفِ ایزدی ہے) آپ نے فرمایا۔ بارک اللہ! لیکن جب یہ دونوں باتیں (شعر و آواز) جمع ہو جائیں پھر؟ میں نے کہا۔ نور علی نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء آپ نے فرمایا، بارک اللہ۔ تم بھی کبھی کبھار ایک دو بیت سن لیا کرو۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت خواجہ نقشبندؒ کی موجودگی میں آپ نے یہ بات کیوں نہیں فرمائی؟ خلافِ ادب تھا! یا مصلحت نہیں تھی! (ان دو باتوں میں سے آپ نے ایک فرمائی) حضرت والد ماجد نے فرمایا، عرصے کی بات ہے۔ صحیح الفاظ یاد نہیں رہے۔

فارسی سے انفاس العارفین کا اردو ترجمہ سید محمد الفاروق القادری نے کیا۔ یہ ترجمہ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ (ناشر: مکتبۃ المعارف۔ لاہور) اگر کتاب ملے اور وقت ملے تو اسے پڑھنے کا مزا لو۔ اس میں صوفیاء ہند کے رہن سہن اور باہمی میل جول کی ایسی معلومات ہیں جو اور کسی کتاب میں نہیں۔

دیکھ لو، کیسے کیسے بہانوں سے میں تمہیں خط لکھتا ہوں، فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

امیدوارِ نجات

داؤد

10 June, 2000

محبی اعجاز!

آج کل تم کراچی جاتے رہتے ہو۔ اب کے وہاں جاؤ تو مشفق خواجہ صاحب کو فون کرو اور ان سے چھوٹے بخاری صاحب کے دیوان کی نقل حاصل کرو۔ میں نے انہیں وسط مئی میں ایک خط لکھا تو اس میں تمہاری اس آمادگی کا ذکر کیا کہ تم مکتبہ سنگ میل کے مالک نیاز احمد صاحب سے اس دیوان کی اشاعت کی بات کرو گے۔

پچھلے مہینے ایک صاحب کا خط موصول ہوا۔ میں انہیں جانتا نہیں تھا۔ انہیں جو جواب میں نے لکھ بھیجا اس کی کاپی تمہیں بھیج رہا ہوں۔ پڑھ کر بتاؤ، میری شرح ٹھیک ہے یا نہیں؟

ظہیر کاشمیری کا شعر مجھے پورا یاد نہ تھا۔ حافظے کا جھنجنا بجا کر میں نے پہلا مصرع چالو کیا۔ ذوق کا دیوان مدوّن کرتے ہوئے آزاد نے یہی حرکت کی تھی۔ تصرف معاف تم نے مجھے اس سے آگاہ کیا۔ اب پہلا مصرع ٹھیک یاد ہے۔

میں ہوں وحشت میں گم میں تیری دنیا میں نہیں رہتا
بگولہ رقص میں رہتا ہے صحرا میں نہیں رہتا

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا

برخوردار

داؤد

8 July, 2000

انجمن آراء!

ع اُڑ کے جلدی ادھر آ، انجمن آرائی کر

نیویارک میں لاہور کا ایک بہترین طبلچی سکونت پذیر ہو گیا ہے۔ ستار خاں اس کا نام ہے۔ عرف اس کا تاری ہے۔ استاد شوکت حسین کا شاگرد ہے۔ پاکستان میں خاصا مشہور ہے۔ ضیا محی الدین اپنے ساتھ کسی گلوکار یا ستاریئے کو لے کر آتا ہے تو ستار خاں سنگت کرتا ہے۔ اس کی موجودگی کی خبر پا کر ہماری بہن کو خیال آیا کہ ڈاکٹر سلیم میر صاحب کے تعاون سے میرے گانے کی ایک محفل ہو۔ مجھے فون کر کے اس نے پوچھا، کونسی تاریخیں اس کے لیے ممکن ہیں۔ میں نے کہا، اعجاز کی آمد پر موقوف ہے۔ آج صبح فون پر تم سے باتیں ہوئیں تو ایسا لگا کہ ابھی تمہارا ارادہ پرتولنے کا نہیں ہوا۔ اگر ارادہ ہو جائے تو بابرہ کو فون کر کے انہیں بتا دینا۔ میں ان سے پوچھتا رہوں گا۔

چار مہینے قبل اسلام آباد میں ضیاء جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ اس کے تپاک اور مہمان نوازی سے جی خوش ہوا۔ گفتگو اردو ہی میں رہی۔ ضیاء مجھے گوہر کے گھر لے گیا تو وہاں تجمل اور گوہر سے میری باتیں پنجابی میں ہوئیں۔ اس نشست میں شرکت کے باعث ضیاء بھی پنجابی پر اتر آیا اور پھر جب گوہر کے گھر سے اٹھ کر ضیاء اور میں ضیاء کے گھر کی طرف چلے تو موٹر کار میں پنجابی جاری رہی اور میرے رخصت ہونے تک پنجابی ہی چلی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ضیاء اپنی بی بی سے پنجابی بولتا ہے یا اردو۔

ضیاء محی الدین کی پہلی بیگم بھوپال سے تھی یعنی اہلِ زبان تھی۔ تیسری بیگم (عذرا) بھی اہلِ زبان سے

KUTABKHANA OSMANIA

ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں سے ضیاء نے اُردو بولی۔ دوسری بیگم اس کی پنجابن تھی۔ اس کے ساتھ بھی اس نے اُردو ہی بولی۔

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں (ساکن اسلام آباد) اپنی بیگم سے (جو اہلِ زبان ہے) اُردو بولتا ہے اور دوستوں سے اُردو یا پنجابی۔ ہمارے دوسرے دوست آفتاب احمد خاں کی بیگم پنجابی ہے۔ یہ دوستوں سے اُردو بولتا ہے اور بیگم سے پنجابی، مرحوم حمید نسیم کے تکلم کا حساب بھی یہی تھا۔

مولانا صلاح الدین احمد کی اُردو بولو تحریک تمہیں یاد ہوگی۔ بتاؤ ان کی یہ تبلیغ کس حد تک کامیاب ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ میاں بی بی دونوں کی مادری زبان پنجابی ہو تو پھر گھر میں پنجابی ہی چلنی چاہیے۔

معلوم نہیں تم کب آؤ گے۔ کاش کہ ملاقات اکثر ہوتی رہتی۔ تم یہ جملہ پڑھ کر شاید کہو

روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

کلیاتِ میر کی جلد دائماً تمہارے سامنے رہتی ہے۔ یہ غزل اس کے صفحہ ۱۹۷ پر ہے۔ کھول کر پڑھو۔ ساری غزل میں کہاوت بننے کے لائق یہی ایک شعر ہے۔

ایک چھوٹی سی تحریر "علامت" کے لیے بھیج رہا ہوں۔ پڑھ کر سعید شیخ صاحب کو دے دو۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

منتظر

داؤد

10 May, 2000

یارِ مہرباں!

انگریزی میں اپنے والدِ مرحوم کی سیرت کی تمہید اس مضمون سے باندھ رہا ہوں کہ مرحوم پنجابی نژاد تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں زندگی گزاری۔ اس زمانے میں کسی کا پنجابی نژاد ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

کرۂ ارض پر پنجاب کا محلِ وقوع (ادھر مشرق میں گنگا اور ہر دوار اور ادھر مغرب میں مشہد اور مکہ اور مدینہ، شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں وادیٔ سندھ سے گزر کر سمندر) پنجاب کی آب و ہوا، پنجاب کا خاص درخت شیشم، پنجابی لوک کہانیاں اور لوک گیت، گورو گرنتھ صاحب، گورو مکھی رسم الخط، سکھ مذہب کا گہوارہ پنجاب، پنجابی نگارشیں، عربی رسم الخط میں، پنجابی میں ادبیات کی قلت اور چنانچہ پنجابیوں کی اردو دوستی، ان سب اسباب سے پنجابیوں کا تاثر۔ کہو یہ موضوعِ سخن ہے یا نہیں؟ ع

آؤ تو پنجاب کی باتیں کریں

پنجابی ہونا اپنا مزا رکھتا ہے۔ وہی زبان جو ماکولات اور مشروبات چکھتی ہے، بولتی بھی ہے اور جو تلفظات اس پر آتے ہیں انہیں بھی چکھتی ہے۔

ہمارے دماغوں میں تین کمپارٹمنٹ ہیں۔ پنجابی، اردو اور انگریزی۔ پنجابی والے کمپارٹمنٹ میں

ڈھیل اور فراغ ہے۔ تکلف، کساؤ اور تصنع کا اس میں دخل نہیں۔ اس میں "اوئے" سے بات شروع ہوتی ہے اور "چھڈو جی" پر ختم۔ اردو کے "اَبے" اور پنجابی کے "اوئے" میں کتنا فرق ہے! "چھڈو جی" کی جگہ "چھوڑو جی" کہہ کر دیکھو فرق محسوس ہوگا۔ ایسا ہی فرق "ہاں" اور "آہو" میں ہے۔

اچھی اردو بولنے والوں کے دو طبقے ہیں۔ بلا تکلف پنجابی لہجے میں اردو بولنے والے اور تکلف کے ساتھ زور لگا کر اہلِ زبان کے لہجے کی نقالی کرنے والے دونوں طرح کے تکلم سے سماں پیدا ہوتا ہے۔ لہجہ سراسر بے تکلف پنجابی ہو اور اردو کا محاورہ پنجابی محاورے سے آمیختہ تو تفریح حاصل ہوتی ہے۔

انگریزی بولنے والے پنجابیوں کے بھی یہی دو طبقے ہیں۔

کسی پنجابی آدمی کی گفتگو اردو میں کسی لکھنوی سے ہو رہی ہو یا انگریزی میں گفتگو کسی انگریز سے ہو رہی ہو تو اسے ٹیپ ریکارڈ کر کے سننا چاہیے۔

شعور کی تہ میں مادری زبان ہی ہوتی ہے۔ جس شعور کی تہ میں پنجابی ہو۔ اس میں فکرِ سادہ کی صلاحیت برقرار رہے گی۔ میرے دوست پروفیسر ہربنس سنگھ صاحب نے نہایت شستہ انگریزی میں سیرت بابا نانک لکھی، اس تصنیف کے اسلوب میں کمال کی سادگی ہے جو پنجابی شعور سے آئی۔

پروفیسر صاحب نے یہ کتاب اپنے دستخط کے ساتھ مجھے عطا فرمائی تھی۔ ایک ایرانی طالب علم مجھ سے مانگ کر لے گیا اور واپس نہ لایا۔

تمہیں یاد ہوگا ہمارے والد صاحب نے دعوت کی شام امام بخش سے کیا کہا تھا:

اوئے کُھنّے پاسیوں

یہ جملہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی موجودگی میں کہا گیا تھا۔

عاتکہ صدیقہ تم سے مل چکی ہے۔ اب اس کی سکونت کیلیفورنیا میں ہے۔ مدت ہوئی اس نے ایم اے کی سند کے لیے مولانا صلاح الدین احمد پر تھیسس لکھا تھا، اب یہ خواہشمند تھے کہ اس کی اشاعت ہو۔ یہ لاہور آ کر تم سے ملے گی، اشاعت کتاب میں اس کی مدد کر کے ثواب حاصل کرو۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

منتظر

داؤد

25 August, 2000

یارِ غار!

پہلے ایک لطیفہ انگریزی میں سن لو۔ تم نے کئی سال لندن میں گزارے۔ ممکن ہے وہاں تم نے یہ لطیفہ سنا ہو۔ میں نے یہ کیمبرج یونیورسٹی یونین کے ایک مباحثے میں ایک مقرر کی زبان سے سنا:

ایک پروفیسر پاگل ہو کر پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔ اسے لیکچر دینے کی عادت تھی۔ پاگل خانے کے سوشل روم میں چند پاگل بیٹھے ہوئے تھے۔ سوشل روم کو کلاس روم سمجھ کر اس نے لیکچر داغ دیا۔ اس کا آغاز یہ کہہ کر کیا:

It is true that we are all here, But are we all there?

KUTABKHANA OSMANIA

ایک اور لطیفہ میں نے امریکہ آ کر انگریزی کی ایک کتاب میں پڑھا جس میں بچوں کی حاضر جوابیاں جمع کی گئی ہیں۔

ایک بچی رنگین پنسلوں سے کاغذ پر نقاشی میں مشغول تھی۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیا کر رہی ہے؟'' بیٹی نے جواب دیا۔ ''خدا کی تصویر بنا رہی ہوں۔'' ماں نے کہا ''خدا کی صورت کسی کو معلوم نہیں۔'' بیٹی نے جواب دیا۔ ''تصویر بنا چکوں گی تو تمہیں صورت معلوم ہو جائے گی۔''

''عارفین'' بھی ایسی باتیں کرتے ہیں، اپنی فطری لاادریت میں ''ادریت'' کے رنگ بھرتے ہیں۔ مراقبے کرتے ہیں۔ انہیں ''منزلِ مقصود'' سوجھتی ہے۔ اس تک پہنچنے کی یعنی سلوک کی منازل سوجھتی ہیں۔ پھر یہ اپنی سوچ اور اپنے تجارب کی تعلیم مریدوں کو دیتے ہیں۔

''عارفین'' کے ''عرفان'' کے تہ خانوں میں لاادریت جاری رہتی ہے لیکن یہ اسے تسلیم کرنے میں محتاط رہتے ہیں۔ البتہ بعض بزرگوں نے ارشاد فرمایا کہ ہماری حیرت ہی عرفان ہے۔ (مثلاً شیخ اکبر ابن العربی نے) یہ فرما کر انہوں نے خاموشی اختیار نہ کی۔ اپنا محاورہ ایجاد کر کے پھیلایا اور درگاہیں قائم کر کے مسند نشین ہوئے۔

فقہا کی پھبتیاں اُڑانے والے لوگ غزل گو ہیں جو اپنے آپ کو صوفی گردانتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ صوفیاء کی پھبتیاں اُڑانے والا کوئی طبقہ پیدا نہ ہوا۔

شاہ ولی اللہ کی کتاب انفاس العارفین میں اولیاء کی کرامات کے قصے پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ اسے پڑھ کر میرے اس قیاس کی تقویت ہوئی کہ تصوف کی اپنی ایک عظیم تنظیم تھی جس میں اوّل تو مرشد تھے (مع شجرہ ہائے روحانی) پھر ان کے سجادہ نشین اور خرقہ یافتہ خلیفے اور پھر ان سب کے بیعت یافتہ مرید، کرامات کو ماننے میں مریدوں کو کوئی تامل نہ تھا۔ باقی رہے خلیفے، وہ مانتے یا نہ مانتے لیکن کرامات کے اشتہار میں ضرور شریک رہے کہ پیری مریدی کا کاروبار اس کے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ پاگل خانے والے پروفیسر سے اگر میرزا غالب کہتے

لاموجود الا اللہ

تو پروفیسر کیا جواب دیتا! شاید کوڈی کہہ کر بھاگ جاتا۔

یہ خط پڑھ چکو گے تو پھر فون کروں گا۔ فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

پاگل پروفیسر

داؤد

6 September, 2000

دمساز!

مدتوں میں سمجھتا رہا کہ ڈی۔ اے۔ وی کالج سے مراد دیانند اینگلو ورنیکلر کالج ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس سے مراد ہے دیانند ایورویدک کالج۔

سوامی دیانند سرسوتی کی سوانح عمری اُردو میں کبھی لکھی گئی یا نہیں؟ اتفاق سے ایک کتاب نظر سے گزری۔ دلائل القرآن۔ بجواب دیانندی افتراء و بہتان۔ اس کے مصنف کا نام ابو محمد امام الدین ہے۔ اس میں

سوامی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا رد ہے۔ دلائل القرآن کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ ستیارتھ پرکاش میں آریہ سماج مت سمجھایا گیا ہے۔ ایک طرف تو اس میں سناتن دھرم سے مناظرہ لڑا ہے اور دوسری طرف قرآن کریم کے مقابلے پر جھنڈا گڑا ہے یعنی دو طرفہ جھگڑا کھڑا ہے۔

دلائل القرآن سے مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ قرآن کریم پر سوامی کے اعتراضات کا پیرایہ غیر مہذب اور بیہودہ ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سناتن دھرم میں سوامی صاحب کو کیا برائیاں اور آریہ سماج میں کیا اچھائیاں نظر آئیں۔ ستیارتھ پرکاش پڑھوں تو کچھ معلوم ہو۔ اس میں سناتن دھرم اور اس کی شاخوں کی تردید ہے۔ بدھ مت اور جین مت اور عیسائی مت کی تردید بھی ہے۔ آخر میں آریہ سماج کے عقائد کا بیان ہے۔

آریہ سماج والے رامائن اور مہابھارت اور وشنو پران اور شو پران کو خاطر میں نہیں لاتے۔ صرف ویدوں کو مانتے ہیں۔

سناتن دھرم کیا ہے، اس کا مجھے کچھ اندازہ ہے۔ آریہ سماج کے عقائد سے تو میری واقفیت سرسری بھی نہیں، اتنا معلوم ہے کہ ان کے ہاں دیوتا انسانی صورتوں میں متصور نہیں ہیں۔ مورتیوں کی پوجا کا سلسلہ نہیں ہے، دیویاں ان کے مت سے خارج ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے لاہور کے فٹ پاتھوں پر دیوانِ داغ اور دیوانِ ظفر کے ساتھ ستیارتھ پرکاش بھی فروخت ہوتی تھی۔ اُن دنوں کبھی خیال نہ آیا کہ یہ کتاب خریدی اور پڑھی جائے۔ آج کل لاہور کی دکانوں میں اس کی دستیابی محال ہو گی۔

ابو محمد امام الدین نے دلائل القرآن کے دیباچے میں بتایا ہے کہ آریہ سماج کی طرف سے سوامی صاحب کی اور ان کے مقلدوں کی تصنیفوں کی زبردست اشاعت ہوئی تو اس کے مقابلے میں ایک سناتن دھرمی ادارہ امرتسر میں بنام ''مفت دھرم پرچار منڈل'' قائم ہوا جو ہر مہینے ایک کتابچہ شائع کر کے مفت تقسیم کرتا تھا۔ ابو محمد امام الدین نے ان مطبوعات میں سے بعض کے عنوان بتائے ہیں۔ مثلاً کلیان ساگر اور سناتن دھرم کے لیے چیتاونی، چیتاونی کا مطلب ہے یاد دہانی، تنبیہ۔

ستیارتھ پرکاش کہیں سے ڈھونڈ نکالو، انگریزی میں آریہ سماج، سناتن دھرم اور برہمو سماج پر یورپین محققین نے اور بھارت میں ہندو سکالروں اور بھکتوں نے بہت کچھ لکھا ہو گا۔ اس کا پتہ لگاؤں گا۔

ابو محمد کی ایک اور تصنیف بعنوان رسالت اور اوتار ہے (دو جلدوں میں) اس کی جلد اوّل میں اوتاروں سے تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ جلد بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔

ع خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

دور از کار

داؤد

محسن فانی کی کتاب دبستانِ مذاہب فارسی میں ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں شاید اس کا ترجمہ کبھی نہیں ہوا۔

KUTABKHANA OSMANIA

11 September, 2000

یارِ مہرباں!

اُستاد سلامت علی کے بیٹے شرافت علی کا گانا یہاں فلورڈا میں ایک ہندو ڈاکٹر کے گھر میں ہوا۔ ایک راگ کا تھوڑا سا الاپ کر کے شرافت نے بلمپت خیال شروع کیا۔ آستھائی اور انترہ کو یاد کی ہوئی ترتیب سے باقاعدہ گایا، پھر تانیں شروع کیں تو آوازِ بلند دعا کی: یااللہ، مدد! اب باقی کام آمد ہے۔

اس روز یقین پختہ ہوا کہ آمد کی ضرورت صرف شاعروں کو نہیں ہوتی، مغنیوں کو بھی ہوتی ہے۔ تم خود قلمکار ہو اور جانتے ہو کہ اچھا مضمون لکھنا بھی آمد پر منحصر ہوتا ہے۔

سعید شیخ صاحب کا پیغام تم نے مجھے پہنچایا تو میں نے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا۔ ان کی فرمائش آمد کی محرک ہوئی۔ فون کر کے انہیں میرا سلام پہنچا دو۔ مضمون پڑھ لو۔ ''علامت'' کے لیے اس کی فوٹو کاپی انہیں کل یا پرسوں بھیج دوں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

رہرورِ راہِ مسدود

داؤد

26 October, 2000

اعجازی!

مولوی شبلی کی علم الکلام کو پڑھتے ہوئے سوچتا ہوں۔ یہی کتاب اگر ۱۹۸۰ء میں یا ۱۹۹۰ء میں پاکستان کا کوئی عالم لکھتا تو مار کھاتا، مولانا نے یہ کتاب پروفیسر آرنلڈ کے سمجھائے ہوئے اصولِ تاریخ نگاری کو اختیار کر کے لکھی تھی یعنی اسباب و نتائج کی واقفیت اور فہم کا اُصول۔

مصر کے علماء (مثلاً ڈاکٹر طٰحہٰ حسین اور محمد ابوزہرہ) نے بھی اسی اصول کے تابع ہو کر لکھا۔ پاکستان کی نسبت مصر کے علمی حلقوں میں نظر کی وسعت زیادہ ہے۔ وہاں کے علماء سلف کی عربی تصانیف اسی سہولت سے پڑھتے ہیں جیسے ہم اُردو اور انگریزی کی تحریریں پڑھتے ہیں۔ اس سہولت کی برکت سے تاریخ کے وسیع اور دراز پس منظر ان کی نظروں میں سمائے ہوتے ہیں اور وہ عقیدوں اور تاویلوں کے تنوع سے گھبراتے نہیں۔

اور مسیحی ممالک میں تو فتویٰ بازی کا زور بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ عقل اور عقیدے کی جنگ ان میں چار سو برس سے جاری ہے۔ ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ان صدیوں میں اسلامی تہذیب کے رہنما، فقہاء، متکلمین اور صوفیاء اور شعراء تھے اور مسیحی دنیا میں فلسفی، ڈرامہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، بت گر، پیکر گر، مصور اور سمغنیوں کے کمپوزر اور سائنس دان بھی زبردست اثر لے کر میدان میں اُترے، ان کی بے باکی اور سرکشی حیران کر دیتی ہے۔

پچھلے ہفتے بوسٹن گیا۔ بوسٹن یونیورسٹی میں دو لیکچر دیے۔ ایک کا موضوع تھا ''لاادریت اور معرفت''، دوسرے کا ''سنگیت اور شاعری میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سنگت''۔ بوسٹن یونیورسٹی کے جس شعبے میں میری نوکری تھی، اس میں میرے رفقاء ریٹائرڈ ہوتے جا رہے ہیں۔ صرف تین ان میں سے وہاں برسرِ کار ہیں، تین چار برسوں میں وہ بھی ریٹائرڈ ہو جائیں گے۔

انگریزی کتاب کے لیے مطالعہ جاری ہے۔ علم الکلام، تصوف اور ادبیات پر نظر دوڑانے میں وقت گزرتا ہے۔ بوسٹن میں جو پہلا لیکچر دیا، اس کے افکار اردو میں لکھ کر ''علامت'' کے لیے بھیج دوں گا گر آ کے سامنے بیٹھ جا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

غائب لیکن موجود

داؤد

6 November, 2000

دوست!

انگریز کے کانوں کے لیے ہماری کلاسیکی گائیکی خوش آیند نہ تھی۔ غزلیہ شاعری بھی اُسے پسند نہ تھی۔ وجیہہ نے مولانا محمد حسین آزاد کی کوئی تحریر کہیں سے ڈھونڈ نکالی ہے جس میں مولانا کہتے ہیں۔ غزل حاکم (یعنی انگریز) کو پسند نہیں۔ اس لیے غزل گوئی ترک کر دینی چاہیے۔

بیسویں صدی کے آخر میں روایتی غزل مر گئی۔ اسے سات سو سال زندہ رکھ کر شاعروں نے قارئین اور سامعین کو شیریں سخنی کے ساتھ اللہ سے بات کرنے کا قرینہ سکھایا تھا۔

شاہ ولی اللہ کی تصنیف انفاس العارفین پڑھ کر معلوم ہوا کہ تصوف کی ایک عالمی تنظیم تھی، مرشدوں سے بیعت اور ان کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم رکھنا اور پھر ریاضت اور نفس کشی۔ طریقت سے توقع تو یہ ہونی چاہیے کہ یہ شریعت کی خشکی کو دور کرے گی۔ اگر طریقت ریاضتوں کی یوگا بن جائے تو پھر نشاط کا امکان کہاں! یہ غزل ہی تھی جسے سن کر اور پڑھ کر اور گنگنا کر معمولی لوگ اپنی روحانیت میں شگفتگی لاتے تھے۔

مولوی رومی کی مثنوی سے زیادہ مزا ان کے دیوان کے اشعار میں ہے۔ صوفیانہ مثنویاں کہنے والے فارسی شعراء حکیم سنائی، عطارؔ اور مولانا جامی غزل گو بھی تھے۔ غزل کہہ کر مزے کی ترنگ میں آتے تھے۔ غزل کی شاعری نہ چشتی ہوتی ہے نہ قادری۔ نہ نقشبندی، میرا ایک شعر سنو

پھبتیاں دو چار کہہ کر یار تازہ دم ہوئے
خوش ہوئے اللہ میاں اور شیخ جی برہم ہوئے

آج کل بو علی قلندر کی سوانح عمری پڑھنے کو میرا دل چاہتا ہے۔ کہیں سے ڈھونڈ نکالو، خود بھی پڑھو اور کسی کے ہاتھ مجھے بھیج دو۔ اگر چھپی ہوئی سوانح عمری دستیاب نہ ہو تو لاہور کے صوفیوں سے ان کے (یعنی بو علی قلندر کے) حالاتِ زندگی معلوم کرو۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

داؤد

19 December, 2000

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی!

یارِ مہرباں!

تبریک نوروز کا کارڈ الگ لفافے میں بھیجوں گا۔ چند سال ہوئے، میں نے چار پانچ کارڈ لاہور بھیجے

KUTABKHANA OSMANIA

تھے۔ وہاں سارے کارڈ موصول نہ ہوئے۔ میں نے فون کر کے پوچھا تو عزیزوں نے کہا، خوبصورت تصویروں والے کارڈ ڈاکیے اپنے بچوں کے لیے اڑا لے جاتے ہیں۔

پچھلی گفتگو میں تم نے اقبالؔ کا ایک فارسی قطعہ سنایا۔ میں نے جھٹ پورا قطعہ نوٹ کر لیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اس کا صرف ایک مصرع یاد رہا ع

کہ پیغام خدا گفتند ما را

اور آخری مصرع کے آخری دو لفظ ''مصطفیٰ را'' فون کروں گا تو پورا قطعہ تم سے پھر سن کر نوٹ کر لوں گا اور یہ بھی کہ یہ اقبالؔ کے کون سے دیوان میں ہے۔

تفسیریں تین گروہوں نے فرمائی ہیں۔ فقہاء، متکلمین اور صوفیا۔ فقہا نے جو کھینچا تانیاں کی ہیں، وہ تمہیں معلوم ہوں گی۔ پاکستان کی عدالتوں میں شریعت کے مسائل درمیان آتے رہتے ہوں گے۔ متکلمین نے جو ساز سُر کیے ان کی تھوڑی بہت واقفیت مجھے ہے اور ان کے اسباب پر میں نے غور کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافت نے جب خلاف ورزی کی اور درباری کی شان اختیار کی تو سیاست کے اور تمدن کے نئے تقاضے درپیش ہوئے۔ تکلف اور سوفسطائیت سے بچ کر رہنا ممکن نہ رہا۔ اہلِ عجم کا تمدن آ شامل ہوا۔ سمجھوتے کے بغیر کام کیسے چلتا۔ بریانی کا نسخہ معلوم ہو جائے تو اغنیا کھچڑی کیوں کھائیں، فتوحات نہ ہوتیں تو عجمی مزاج سے سمجھوتے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ سلطنت وسیع اور شاندار ہو اور تہذیب تکلفات سے بچی رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے!

پر تکلف غذاؤں میں لذت ہوتی ہے (اور انہیں ہضم کرنے کے لیے مزید اراچور ہوتے ہیں) لیکن پر تکلف سوچ میں تشکک اور تعقل کے پیچ و تاب ہوتے ہیں۔

یہ تو قصہ ہے متکلمین کا۔ ان کے مطالعہ سے میری طبیعت پہلے بھی گھبراتی تھی اب اور بھی زیادہ گھبراتی ہے۔ صوفیوں نے جو تاویلیں فرمائی ہیں، ان کی بات کچھ اور ہے۔ وہ نثر میں ہوں یا نظم میں۔ سب شاعرانہ ہیں، عجمی تصوف نے تعقل کی بے چینی کا مقابلہ جم کر کیا۔

اگر قادرِ مطلق کی مرضی ہوتی کہ گناہ اور استغفار کا ڈرامہ نہ ہو تو ابلیس کو معدوم کر دینا اس کے لیے کیا مشکل تھا۔ کتاب الطواسین میں حلاجؔ ابلیس (اور فرعون) کو اپنا گورو مانتا ہے۔ یہ عجمی تصوف ہی تو ہے۔ عربی تصوف تو کہے گا، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ حلاجؔ سے اقبالؔ کی ارادت کی شہادت جاوید نامہ میں موجود ہے۔

عالمِ اسلام لچک ہی سے پھولا پھلا۔ یہ لچک تاویلات اور آزادیٔ تخیل ہی سے آئی۔ آج سے اسی نوے سال پہلے علی گڑھ کے ایک طالب علم نے ایک نظم کہی تھی جو بہت مشہور ہوئی۔ والد مرحوم کو از بر تھے۔ اس کے دو شعر انہوں نے مجھے سنائے تھے

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
دھارے میں سمندر کے بجلی کا خزانہ ہے
دیکھو جو ہمیں ٹوکا، ہم آگ لگا دیں گے

وہ تفسیر ہی کیا جس میں تنگی ہو، کشادگیٔ تخیل اور تاویلات کی آزادی چاہتی ہے۔ ''کھرا'' اسلام چاہیے

تو عہدِ نبویؐ کے احوال واپس لاؤ اور ستو گھولو اور کھجور کھاتے رہو۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے:

You can,t have it both ways

سکہ خالص سونے کا کسی ٹکسال میں نہیں بنا، ہمیشہ ملاوٹ سے بنا، سلطنت والی دنیا میں سکہ ملاوٹ ہی کا چلے گا۔

وہ بزرگان جو عظیم ترین عارف کہلائے، ان کے فرمودات کو قرآن کریم کا آرکسٹرا سمجھ کر ان کا مزا ملّت نے صدیوں لیا۔ سنگت کرنے والے سازندے مغنی کی تانیں ہی نہیں دُہراتے۔ اس میں اپنی طرف سے کچھ ملا کر آرائش کرتے ہیں۔ صحیفے ہماری سوچ سے چھیڑ چھاڑ فرماتے ہیں۔ چھیڑ کے جواب میں چھیڑ کیوں نہ ہو میرا ایک شعر سنو

باتیں تو سنیے حضرت رب کریم کی
دی جا رہی ہے دھمکی عذاب الیم کی!

اقبالؔ نے بھی ایسی جنگل بندی خوب خوب فرمائی۔ شریعت میں آسانی کی راہیں نکالنے کے لیے پہلے تو دھڑا دھڑ حدیثیں گھڑی گئیں، پھر امام ابو حنیفہ میدان میں اترے۔ انہوں نے سہولت کی تدبیریں بچھائیں۔ گتھیاں سلجھائیں اور مشکل کشائیاں فرمائیں۔

عقیدوں میں نرمی لانے کے لیے متکلمین نے تجزیہ کی شاہراہ اختیار کی اور اولیاء نے وحدت الوجود کی۔ شعراء نے مجاز اور حقیقت کے مضمون نکالے اور جلال کو جمال مان کر معاملہ کچھ اور کر دیا۔ ناز اور نیاز کا محاورہ ایجاد کیا۔ پیامِ مشرق کا آغاز اس مصرعے سے ہوتا ہے ع

شہید ناز او بزم وجود است

استاد علی اکبر خاں سرود نواز کبھی کبھی موج میں آ کر راگ مالا بجاتے ہیں۔ ایک راگ چھیڑتے ہیں۔ دو تین منٹ اسے بجا کر پھر ایک اور راگ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد ایک تیسرے راگ کی طرف۔ ایک آدھ منٹ اس کا مزا لے کر چوتھے کی طرف۔ یہ سلسلہ جاری رکھ کر بالآخر اسی راگ کو لوٹ جاتے ہیں جس سے کام شروع ہوا تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ عربوں کا کلاسیکی ساز سنگیت سراسر راگ مالا کی موسیقی ہے۔ ایک ہی راگ میں آدھا گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ گشت کرتے رہنا جو ہمارے سنگیت کی خاصیت ہے۔ عربوں کے ہاں نہیں ہے۔ وہاں خانہ بدوشی والی بات ہے۔ ہمارے سنگیت میں ہندوانہ خانہ نشینی والی۔

مفسروں کی طبیعتوں نے قرآن مجید کو پڑھ کر کہا، اے عشق کہیں لے چل اور اللہ کا نام لے کر ان کے تخیل روانہ ہو گئے۔ تخیل بے مہار اونٹ ہے۔ ملا نصر الدین کو ایک روز ایک ہمسائے نے بے مہار اونٹ پر سوار پایا۔ ملا سے پوچھا ''ملا! کدھر کے ارادے ہیں؟'' ملا نے جواب دیا۔ ''جدھر اونٹ کی مرضی۔''

تجمل کا فون نمبر اور اس کا ایڈریس تم نے دریافت کر لیا ہوگا، فون کر کے تم سے لے لوں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

عہدِ ماضی کا آدمی

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

6 November, 2000

بابا فرید کے مرید!

بابا صاحب کے کلام کا ایک انتخاب میرے پاس ہے۔ بین السطور اس کی شرح بھی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو کلام میری سمجھ میں نہ آتا۔ وارث شاہ کا کلام بھی میرے لیے کافی مشکل ہے۔ گورنمنٹ کالج میں صرف پروفیسر سندھو ہی تھے جو پنجابی شاعری کے رسیا تھے۔ پنجابی میں ڈرامے بھی لکھتے تھے۔ اگرچہ پروفیسر یہ انگریزی کے تھے۔ آیندہ ملاقات میں تم سے بابا فرید کا کلام سنا جائے گا۔

۱۵۔ مارچ تا ۱۸۔ مارچ کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں ایک کانفرنس ہے۔ مبحث اس کا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کی منقبت میں تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ ان کے افکار اور کردار کی کسی کو شکایت بھی تھی یا نہیں۔ شرکت کی دعوت مجھے آئی تو فرمائش کی گئی کہ میں گاندھی اور اقبال کے تعلقات پر مقالہ پڑھوں۔ بھائی عاشق اور سالک صاحب اور مہر صاحب سے استفسار آج ممکن ہوتا تو اس موضوع کے لیے کچھ چٹکلے حاصل ہوتے۔ میں نے کانفرنس کے معتمد کو معذرت کا خط لکھا اور بتایا کہ مہاتما جی اور اقبال کے درمیان نہ ملاقات کی خواہش تھی نہ جھڑپ۔ دوطرفہ تغافل تھا۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات پر مقالہ لکھنا مشکل ہوگا۔

میں نے اپنے اس خط میں اپنی دلچسپی کا ایک موضوع تجویز کیا:۔ ''مہاتما گاندھی اور قومی زبان کا مسئلہ'' اسے کانفرنس کے سیکرٹری صاحب نے پسند کیا۔ اب یہ مقالہ تیار کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس میں سرسید، محسن الملک، ابوالکلام، حافظ محمود خاں شیرانی، پنڈت کیفی، پنڈت نہرو، منشی پریم چند اور ہندو اور مسلمان صحافیوں کی باتیں ہوں گی۔ گزشتہ ادوار اور ان میں سنسکرت، فارسی اور عربی کی حیثیتوں کا ذکر بھی ہوگا۔ اِدھر مولوی یعنی بابائے اردو اور اُدھر مالوی یعنی پنڈت مدن موہن۔

اس مقالے کی تیاری کے لیے مجھے واشنگٹن بھی جانا ہوگا، وہاں لائبریری آف کانگریس میں ہریجن اور ینگ انڈیا کی پرانی فائلیں دیکھنی ہیں۔ ان اخباروں میں ہندی اور اردو کے مسئلہ پر گاندھی جی کے بیانات چھپا کرتے تھے۔

موسیقی والی کتاب کے فائنل پروف پڑھ کر میں نے ۲۸۔ اگست کو رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے مکتبہ سنگ میل کو بھیجے۔ اس کتاب کی طباعت کب ہوگی، نیاز صاحب سے پوچھ لو تو میں تم سے پوچھ لوں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

سائلِ امرود

داؤد

28 December, 2000

رفیقِ شفیق!

''علامت'' کے دو شمارے بابت اکتوبر و نومبر موصول ہوئے۔ ایک میں تمہاری اور گوہر کی نگارشیں ہیں اور دوسرے میں میرا مضمون اور ابوالفضل والی نظم، بڑی مہربانی۔

گوہر نے اور بھی بہت کچھ کیا لیکن مرحوم نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کلیاتِ میرا جی کی اشاعت کا

بندوبست کردیا۔

میرا جی کا بھائی کامی موسیقار تھا۔ وائلن پر جے جے ونتی بجا کر میرا جی کو رُلاتا تھا۔ معلوم نہیں یہی بھائی تھا یا کوئی دوسرا بھائی جس نے ان کی بیاضیں رڈی کاغذ والے کے ہاتھ بیچ کر چونی کی ریوڑیاں کھائی تھیں اور بھائی کو بلانوشی میں مبتلا کردیا تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد تمہیں بائیسکوپ کے اندر جھانکنے کا موقع ملا تو تم نے سارے منظر دیکھ چکنے کے بعد بائیسکوپ والے سے پوچھا۔ ''اور بارہ من کی دھوبن؟'' اس نے تمہیں جواب دیا۔ ''جی وہ نکال دی، وہ ہندنی ہوتی تھی۔'' میرا جی کی تصویر بھی پاکستان کی بائیسکوپ سے نکال دی گئی، اس کی محبوبہ بھی ہندنی ہوتی تھی۔

تم نے کہا، میرا جی پاکستان میں مر رہا ہے، اس پر تعجب کیوں ہو۔ مولوی محمد حسین کی دربارِ اکبری کا جنازہ بھی پڑھا جاچکا۔ دیوانِ حافظ کو ٹھپ کردینے کی بات جو اقبال نے اسرارِ خودی میں چھیڑی تھی، ایران میں امام خمینی نے پوری کردی۔

میرا جی نے اُردو چھوڑ کر ہندی میں شاعری کی ہوتی تو ممکن ہے آج بھارت میں ان کے کچھ نام لیوا ہوتے۔

ان کے کلیات میں جو نظمیں علامتی ہیں، ان کا ذوق تو خواص ہی رکھتے ہیں۔ پس ایسے کلام کا مجموعہ الگ چھپنا چاہیے اور جو کلام ان کا عام فہم ہے، وہ الگ، یہ کام تم آسانی سے کراسکتے ہو۔

پنگھٹ کی سوچ میں، بہنے والا

(بگولا...... صحرا میں نہیں رہتا)

8 January, 2001

رفیقِ شفیق!

اس کتاب کی مصنفہ کا شجرۂ نسب اور اس کے شوہر کا شجرۂ نسب، دونوں صفحہ ۹ پر ثبت ہیں۔ لاہور میں جس سنہری لارنس کا بت تھا اور جس کے نام سے لارنس باغ موسوم ہوا، وہ جون لارنس کا بھائی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مارا گیا۔

مصنفہ جس ہنری لارنس کی بیوی ہے، وہ اس پہلے ہنری لارنس کا پوتا ہے۔ پہلا تھا ہنری کلاں، دوسرا ہنری خرد۔

مصنفہ نے ناول بھی لکھے۔ یہ چوکس دماغ کی لیڈی ہے، جزاؤ انگریزی لکھتی ہے، بہترین الفاظ کا الہام اس کی تحریر میں مسلسل ہے۔

اس نے اردو سیکھنے کی کوشش کی۔ ایک منشی اسے اردو پڑھانے آتا رہا۔ اس کا بیان صفحہ ۴۹ پر پڑھ لو، صفحہ ۶۱ اور ۶۲ پر گانے بجانے کے ایک سین کا بیان ہے۔ دونوں عبارتوں کی فوٹو کاپی بھی ارسال ہے اور ذکر میر کا اردو ترجمہ بھی۔

خواہانِ تندرستیٔ دوست

داؤد

12 January, 2001

اے اعجاز بتانے والے!

تم کو تعطیل کے ان ایام میں استراحت کی ضرورت ہے۔ فون کر کے اس میں خلل کیوں ڈالوں اور کیوں تمہیں تھکاؤں۔ البتہ خط لکھ سکتا ہوں۔ لاہور خط بارہ دنوں میں پہنچتا ہے۔ یہاں تین یا چار روز میں۔

ڈاکٹر سلیم میر صاحب مجھے فون نہیں کر سکے، کوئی وجہ ہوگی۔ جلسے کا جواز تو تبھی ہے کہ تم اس میں تقریر کرو۔ میر صاحب خواہش مند ہیں کہ اکبر، حالی، شبلی اور نذیر احمد کا ذکر چھیڑا جائے اور اگلے زمانے کی یاد منائی جائے۔ ان پر تقریر تم ''منہ زبانی'' کر سکتے ہو۔ یہ نہیں منظور تو کوئی کہانی لکھ ڈالو۔

ہفتے کے دن وقت چاشت تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پنجابی میں اسے ''چھاہ ویلا'' کہتے ہیں۔ کسان کی بیوی اس وقت کھیت کے کنارے شوہر کے لیے چھاچھ اور روٹی لے کر آتی ہے۔ چاشت ناشتے کے لیے بھی آتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، چھاچھ اور چاشت شاید ایک ہی لفظ کے دو تلفظ ہیں۔

دسمبر کے آخر میں اہالیانِ امریکہ کا موڈ تعطیلِ محض کا ہوتا ہے۔ میں بھی اس مہینے کے آخری ہفتے میں مطالعہ سے باز آیا، خالی ہو کر بیٹھا تو تک بندی کرنے لگا۔ پانچ چھ غزلیں تین ہفتوں میں جمع ہو گئیں۔ بھائی بابر کو میں غزل کہتے ہی فون پر سنا دیا کرتا تھا۔ فون پر کہتا ''بھائی جی۔ ہو گئی ایک اور...... سناؤں؟'' وہ اپنا قلم پرے رکھ دیتے اور کہتے۔ ''سنا''

تمہیں چھ غزلیں بھیج رہا ہوں۔ ڈاکٹر جمیل اور ڈاکٹر بابرہ کو سلام، کوئی شعر تمہیں پسند آئے تو انہیں بھی سنا دینا اور کیا کہوں سوائے اس کے کہ می آیم۔

پا بر کاب

داؤد

22 January, 2001

دمساز!

سلام یعنی تمہاری تندرستی کی دعا، سابق میں تمہارا آنا گرمیوں میں ہوتا رہا، نئی دنیا کی جمنا کے کنارے بابرہ کے برکت کدے کے شہ نشین میں بیٹھ کر تم دھوپ سینکا کرتے تھے۔ دھوپ تیز لگی تو بھائی بابر کے سایہ عاطفت میں جا بیٹھے۔ اس سائے کی ٹھنڈک کے کیا کہنے!

اب کے تم جاڑوں میں آئے۔ شہ نشین کو تم نے یخ بستہ پایا۔ دھوپ کا نکلنا ملتوی رہا، بھائی بابر ہوتے تو بہت سا وقت تمہارا ان کے پاس بیٹھ کر گزرتا اور تمہارا جی بہلا رہتا۔ فلاحت کو ساتھ لے کر آتے تو تنہائی سے بچے رہتے۔

دربارِ دُربار میں نے بہن کے گھر میں ساری پڑھ ڈالی۔ صدق جائسی نثر میں تلمیذ الرحمن ہے۔ اس کے فن نگارش کا قائل ہوں اور تمہارے ذوقِ لطیف کا بھی، تم نے اپنی خوشی سے جو جو کتابیں مجھے عطا کی ہیں، سب شہکار ہیں۔

فیض میر بھیج رہا ہوں۔ خط تمہیں مل چکے تو فون کروں۔ ڈاکٹر جمیل صاحب اور ڈاکٹر بابرہ کو سلام۔

تمہارا گرویدہ

داؤد

3 March, 2001

مہربان دوست!

امید ہے دوا سے پورا افاقہ ہو گیا ہوگا اور اب تمہارے سحر و شام معمول پر آ گئے ہوں گے۔ امریکی ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل جاری رکھو یعنی مقدم رہے صحت کا خیال اور مصروفیت میں رہے اعتدال۔

چتا والی کہانی تم نے مکمل کر لی ہوگی۔ پہلے بھی خطوں میں یاد دہانی کر چکا ہوں۔ اب پھر کرتا ہوں کہ اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں سے بے اعتنائی نہ برتو۔ ان کا مجموعہ مرتب کر کے چھپنے کے لیے دے دو اور جو نوشتنی باقی ہے، اسے لکھنے کے لیے وقت نکالو۔ دو صفحے روز لکھے جائیں تو سال میں سات سو صفحے ہو جاتے ہیں۔ سارا کھیل تقسیم اوقات کا ہے۔

سعید شیخ صاحب کی فرمائش تم نے مجھے پہنچائی تھی، ایک مضمون پھر انہیں بھیج رہا ہوں۔ اس کی کاپی تمہارے لیے بھی ارسال ہے۔

فون کر کے احوال پوچھوں گا۔ فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

تمہارا برخوردار

داؤد

26 March, 2001

دمساز اعجاز!

ادب میں جگہ پانے کے لائق بعض چیزیں ہیں جو سینہ بہ سینہ زبانی ہی رہتی ہیں اور ضبطِ تحریر میں نہیں آتیں۔ مثلاً کہاوتیں، ایک اور صنف ہے راگ راگنیوں کے بول۔ میں نے دو سو سے زیادہ بندشوں کے بول جمع کر کے رسالہ مکالمہ (کراچی) کے ایڈیٹر مبین مرزا صاحب کو بھیجے تھے۔ انہوں نے تین قسطوں میں چھاپ دیے۔

ایک نہایت دل آویز صنف ہے لوریاں، اردو اور پنجابی کی بہت سی لوریاں پاکستان کی بیبیوں کو ازبر ہوں گی۔ ان کی جمع آوری کو تمہارے پاس وقت کہاں ہوگا۔ فلاحت بیگم سے پوچھو کہ اس شغل میں انہیں دلچسپی ہے یا نہیں۔ اگر وہ لوریوں کی دریافت میں لگ جائیں اور لوریاں ہاتھ آئیں تو ''علامت'' میں چھاپ دی جائیں بلکہ اخباروں میں اشتہار دے دیا جائے کہ جو جو لوریاں بیبیوں کو یاد ہیں، وہ تمہیں یا سعید شیخ صاحب کو بھیج دی جائیں۔ مجموعہ فراہم ہو جائے تو اس کا دیباچہ تم لکھو اور چھپوا دو۔ فلاحت سے بات کرو، تمہاری طرف سے تشویق ہو تو ممکن ہے یہ خیال انہیں اچھا لگے۔

مہاتما والی کانفرنس برٹش کولمبیا کے شہر وکٹوریہ میں ہوئی۔ وہاں کے دلکش مناظر کا جواب نہیں۔ یہ شہر کینیڈا کے مغربی ساحل کے قریب ہے۔ یہاں وسط مارچ میں بہار کا آغاز ہوتا ہے۔

کانفرنس میں جو مقالے زیرِ بحث رہے، ان کے عنوان سنو:- گاندھی جی امبیدکر کی نظر میں، آغا خاں کی نظر میں، ٹیگور کی نظر میں، رادھا کرشنن کی نظر میں، ساورکر کی نظر میں، سری اروبندو گھوش کی نظر میں، اینی بیسنٹ کی نظر میں اور مسلمان لیڈروں کی نظر میں۔ ''علامت'' کے لیے کانفرنس کی

KUTABKHANA OSMANIA

روداد لکھ کر بھیجوں گا۔

چیونٹی پر ابوالاثر کی جو تحریر تمہارے پاس ہے، وہ نثر میں ہے یا منظوم ہے؟ اگر غیر مطبوعہ ہے تو تمہارے پاس کیسے پہنچی۔ اس کی اشاعت میں دیر کس بات کی ہے؟

حفیظ صاحب کی تربت کے منتقل ہونے کی کہانی ضرور لکھنا۔

فون پر بات ہوگی اور گرمیوں میں ملاقات۔ فلاحت کو سلام اور سلمان کو دُعا۔

ساحل نشیں

داؤد

9 April, 2001

میرے شفیق!

تم سچ کہتے ہو سول سروس کے کرسی نشیں جب متقاعد (یعنی ریٹائرڈ) ہوتے ہیں اور اپنی کرسی اپنے جانشین کے لیے خالی کرتے ہیں تو گھر آ کر صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور آہ بھر کر اہلیہ سے کہتے ہیں، بی بی، کاش کوئی ہوبی ہوتی تو جی بہلتا۔

ریٹائرڈ ہو کر میں بھی چکرایا تھا، بوسٹن یونیورسٹی میں ہر سال پانچ چھ سو طلبہ میرے لیکچر سنتے تھے۔ یونیورسٹی کے کمپاؤنڈ میں جدھر جاتا تھا، شاگرد ہی شاگرد دکھائی دیتے تھے، ریٹائرڈ ہو کر فلورڈا آیا تو معلوم ہوا، ہُو کا عالم کسے کہتے ہیں۔

لیکن ایک سال کے اندر آسمان اور وسعتِ آفاق اور سمندر کی بے کناری سے دوستی ہوگئی۔ گھر کے احاطے میں چند پودے لگا کر انہیں سینچنے لگا۔ کئی ان میں سے اب قامت اور قیمت میں مجھ سے بڑھ کر ہیں۔ یہ بھی اب میرے ہمدم ہیں۔

لیکن قلم کی رفاقت کا جواب نہیں کہ خط بھی اسی سے لکھے گئے اور مضامین بھی اسی سے، قلم کاری نہ ہوتی تو بیکاری ہوتی اور بیزاری ہوتی۔

اس سال بوسٹن اور نیویارک اور شکاگو اور واشنگٹن اور فلاڈلفیا میں برفباری معمول سے زیادہ ہوئی اور سردی بھی ان شہروں میں ایسی پڑی کہ ہر بستی یخ بستہ ہوئی۔ وہاں جوئے شیر ہوتی تو اس کی بستنی بن جاتی (ایران میں آئس کریم کو بستنی کہتے ہیں)

ادھر کی یخ بستگی کی خبریں سن کر فلورڈا کی رہائش غنیمت معلوم ہوئی۔

تمہاری تپیا تقریر کی ہے، میری تحریر کی۔ ہم دونوں کو تعطیل کی ضرورت ہے۔ یہاں آؤ تو پوری فراغت کے ساتھ کچھ وقت اکٹھے گزاریں، لاہور میں تم مخلی بالطبع نہیں ہوتے۔

ایک اور مضمون آج سعید شیخ صاحب کو بھیج رہا ہوں، اس کی نقل تمہارے لیے بھی ارسال ہے۔ فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

بادیہ نشیں

داؤد

21 June, 2001

یارِ مہرباں!

عائشہ کی مرتب کی ہوئی کتاب ڈاک سے نہ بھیجنا۔ جب آؤ گے ساتھ لیتے آنا۔ البتہ اس میں وجیہہ کی جو دو تحریریں ہیں، ان کی فوٹو کاپی بنوا کر مجھے بھیج دو۔ تم نے کہا تھا ان تحریروں میں آیاتِ قرآنی کے حوالوں کی کثرت ہے۔ یہ کیونکر ہوا، اس کی کہانی سنو۔

۱۹۸۷ء میں میں کراچی پہنچا تو وجیہہ سے ملنے گیا۔ اس کے سرہانے مہر صاحب کی دو تصنیفیں دکھائی دیں۔ ''سید احمد شہید'' اور ''سرگزشتِ مجاہدین''۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا، اس قصے میں کیسے پڑ گئے؟ اس نے جواب دیا، نفسیاتِ اسلامیہ کے سمجھنے کے لیے نفسیاتِ جہاد کا مطالعہ ضروری ہے۔

• تحریکِ جہاد کے قائد دو بزرگ تھے۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل۔ ان کی سیرتوں کو سمجھنے کے لیے وجیہہ نے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی تصانیف کو بھی غور سے پڑھا۔ تہ کو پہنچنے کے لیے سیرتِ نبوی کا مطالعہ لازم ہوا۔ قرآن مجید کو پڑھا تو قرآنی قصص الانبیا کا مقابلہ بائبل کے قصص الانبیاء کرنے کا اشتیاق ہوا۔ اس لیے بائبل بھی پڑھ ڈالی۔

جوزف کیمبل کا کہنا ٹھیک ہے کہ بنی اسرائیل جو گذرے ہیں، بڑے جنگجو تھے۔ بائبل سے اسماء حسنیٰ کی فہرست بنائی جائے تو اس میں رب الافواج (Lord of Hosts) شامل کریں گے۔

نفسیاتِ جہاد کی فہم کے لیے وجیہہ نے سیرتِ نبوی کی تفاصیل پر غور کیا ہے۔ چند روز ہوئے اس نے مجھ سے کہا، اس نازک موضوع پر قلم اُٹھاؤں تو اس کے لیے بیان کا پیرایہ کہاں سے لاؤں۔

تفریحاً یہ اردو اور فارسی شعراء کا کلام بھی پڑھتا ہے۔ پرسوں اس نے مجھے فون کیا تو میرزا کا یہ شعر پڑھا

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

اور کہا بتاؤ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے آئیں بائیں شائیں کر کے اپنی خفت چھپانے کی کوشش کی۔ شعر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وجیہہ نے مجھ سے کہا، تمہارے پاس دیوانِ غالب کی جو شرحیں ہیں، ان میں اس شعر کی شرح دیکھ کر مجھے فون کرو۔ میں نے تعمیل کی اور شرحیں پڑھ کر اسے سنا دیں۔ اس نے سن کر کہا، میرزا مشکل گو ہی نہیں مہمل گو بھی تھے۔

شعر کی شرحوں کی نقلیں تمہیں بھیج رہا ہوں۔ ان پر غور فرماؤ۔ اس بہانے تمہیں فون کروں گا اور اس شعر پر گپ ہوگی:۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

شمال کی جانب آسمان پر سات ستارے ہیں۔ ان میں چار ستارے جنازہ ہیں اور تین جنازہ کے اٹھانے والے۔ عرب ان کو لڑکیاں سمجھتے ہیں اور ہندوستان کی عورتیں سات سہیلیوں کا جھمکا کہتی ہیں۔ نام ان کا بنات النعش ہے۔ فرماتے ہیں، دن کو تو وہ آسمان کے پردے میں چھپی رہتی ہیں اور رات کو پردہ سے نکل آتی ہیں یعنی عریاں ہو جاتی ہیں۔

(مراۃ الغالب، شرح بیخود دہلوی)

شعر ۳: بنات النعش قطب شمالی کی طرف سات ستارے ہیں۔ چار کو نعش اور تین کو بنات کہتے ہیں۔

میرزا نے ان ستاروں کو مونث مانا ہے۔ مطلب یہ کہ بنات النعش گردوں دن کو پردوں میں چھپی رہتی ہیں (کیونکہ وہ دن کو دکھلائی نہیں دیتیں۔) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ رات کو برہنہ ہو جاتی ہیں؟

بظاہر اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی لیکن مولانا عبدالباری صاحب نے معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"گویا کہ یہ شعر اپنے معشوق کی طرف خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ بنات النعش بڑی پردہ دار تھیں۔ دن کو منہ چھپائے رہیں مگر شب کو وقت آیا تو اپنا پردہ اٹھایا۔ تم ایسے ہو کہ شب وصل میں بھی مجھ سے شرمائے جاتے ہو۔ حالانکہ یہ کوئی محل نہیں ہے یا یہ کہ یہ ایک عاشقانہ چال ہے کہ معشوق سے کہتا ہے کہ دیکھو تم کہتے ہو کہ معشوقوں کا کام عریاں اور بے پردہ ہونے کا نہیں ہے۔ دیکھو بنات النعش دن میں کیسی چھپی ہوئی تھیں۔ آخر شب کو اگر بے پردہ ہونے کا محل نہیں تو وہ بے پردہ کیوں ہو گئیں؟"

(مطالب غالب۔ سعید الدین احمد)

۳۔ بنات النعش۔ شمال کی طرف سات ستارے نکلا کرتے ہیں۔ عورتیں انہیں سات سہیلیوں کا جھمکا اور سات سہیلیاں بھی کہتی ہیں۔ نیز چار ستاروں کو جنازہ اور تین کو جنازہ اٹھانے والے کہا جاتا ہے۔

میرزا صاحب نے بنات کے لفظ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جس کے معنی لڑکیاں ہیں لیکن اہلِ عرب کے محاورہ میں بنات ابن کی جمع ہے۔ مثلاً ابن العرس کی جمع بنات العرس ہے۔ چونکہ دن کے وقت ستارے نظر نہیں آتے، اس لیے کہتے ہیں کہ آسمان کی سات سہیلیاں دن کے وقت پردے میں چھپی ہوئی تھیں لیکن خدا جانے رات کو ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ بے پردہ ہو گئیں۔

آسی: (۱) اپنے معشوق کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ بنات النعش بڑی پردہ دار تھیں۔ دن کو منہ چھپائے رہیں مگر شب کا وقت آیا تو اپنا پردہ اٹھا دیا۔ تم ایسے ہو کہ شب وصل میں بھی مجھ سے شرمائے جاتے ہو۔ حالانکہ یہ کوئی محل نہیں ہے۔ (۲) ایک عاشقانہ چال ہے۔ معشوق سے کہتا ہے، تم کہتے ہو، معشوق کا کام عریاں ہونے کا نہیں ہے۔ دیکھو بنات النعش دن کو کیسی چھپی ہوئی تھیں۔ آخر شب کو بے پردہ ہوئیں۔ پھر اگر رات بے پردہ ہونے کا محل نہیں تو وہ بے پردہ کیوں ہو گئیں۔

(بیانِ غالب۔ آغا محمد باقر)

مولوی نذیر احمد نے ایک اخلاقی ناول "بنات النعش" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے وجیہہ سے پوچھا، اس عنوان میں کیا تک ہے۔ وجیہہ نے کہا، بنات النعش کے معنے ہیں سہیلیوں کا جھرمٹ۔ میں نے کہا، یہ کیسی سہیلیاں ہیں جو جنازہ اُٹھائے پھرتی ہیں۔

ضیاء محی الدین وجیہہ سے ملنے گیا۔ اس ملاقات کی روداد اس سے سنو۔ سنا ہے کہ ان دنوں ضیاء لاہور میں ہے۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

منتظر

داؤد

1501 N.E, 32 Street
Pompano Beach, Florida 33064
14 August, 2001

دوست!

میرے پاس ایک ضخیم آکسفورڈ ڈکشنری ہے۔ مجمل (Abridged) نہیں بلکہ غیر مجمل (Unabridged) انگلستان کے اہلِ زبان اسے انگریزی زبان کی بائبل مانتے ہیں۔

پچھلے دنوں ٹیلی ویژن پر ایک مکالمہ سنا۔ یہ ایک امریکی میزبان (...بے زبان نہیں، میزبان...) اور ایک امریکی زباندان کے درمیان تھا۔ اسے سن کر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاس جو موٹی آکسفورڈ ڈکشنری ہے، وہ تو کچھ بھی نہیں، مفصل ترین آکسفورڈ ڈکشنری بارہ موٹی جلدوں میں ہے۔

اب ان جلدوں پر ڈکشنری کی صلاح کار کمیٹی نظرِ ثانی کر رہی ہے۔ امریکی علماء اور ادیبوں نے احتجاج کر کے اس کمیٹی کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ اس ڈکشنری میں امریکی انگریزی کے الفاظ بھی شامل کیے جائیں۔ کمیٹی نے اس غرض سے ایک امریکی زباندان کو اپنا مشیر مقرر کیا ہے۔ اس کی عمر بتیس ہے۔ امریکی انگریزی کے الفاظ کی جمع آوری کا کام اس کے سپرد ہوا ہے۔ اس اضافے میں امریکہ کا سوقیانہ محاورہ بھی شامل ہوگا۔ کلاسیکی مزاج کے بزرگوں کو یہ فیصلہ برا لگا ہے۔

قاطع برہان کی بحث میں انگریزی لغت نویسوں کے اس سمجھوتے کا ذکر برمحل ہوگا۔

پچھلے گیارہ برس میں نے جس مکان میں گزارے ہیں، اسے بیچ کر ایک Condominium میں منتقل ہو رہا ہوں۔ اس منتقلی میں شاید ایک دو مہینے لگ جائیں۔ نئی جائے رہائش ایک وسیع احاطے میں ہے۔ جس میں ایک ہزار سے زیادہ Condominiums ہیں۔ احاطہ سرسبز ہے۔ سبزہ زار کی دیکھ بھال احاطے کی انتظامیہ کے ذمے ہے۔ احاطے کے اندر ایک چہل پہل والا کلب گھر بھی ہے۔ دیگر سہولتیں بھی ہیں۔ پچپن سال سے کم عمر کے افراد وہاں Condominium خرید نہیں سکتے۔ چنانچہ اسے بزرگوں کا محلّہ کہہ سکتے ہیں۔ یونیورسٹی وہاں سے قریب ہے۔ اس کی لائبریری سے فائدہ اٹھاؤں گا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے وزیر اعظم ڈزرائیلی کی سوانح عمری ایک کباڑیے کی دکان میں ہاتھ میں آئی۔ اسے پڑھ کر وکٹورین عصر کے لاٹ صاحبوں کی لیاقتوں اور چشموں کی تھوڑی سی شناسائی حاصل ہوئی۔ ڈزرائیلی یہودی الاصل تھا۔ اس نے مسیحیت قبول کی۔ چند ناول لکھے، بڑا بانکا آدمی تھا۔ بھڑکیلے لباس پہنتا تھا۔ وکٹوریہ کے شوہر البرٹ کا انتقال ہوا تو ڈزرائیلی کے اندازِ تعزیت سے ملکہ متاثر ہوئی۔ ملکہ کے زمانے میں سات برس یہ وزیر اعظم رہا۔

میری خبریں تو اب یہی ہیں کہ کیا پڑھا اور کیا لکھا، تمہارا ویزا بن گیا ہوگا، کب آؤ گے؟

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

برخوردار

داؤد

15 October, 2001

دمساز!

آج سے پینتیس چھتیس برس پہلے میرے ایک امریکی شاگرد نے کہا، میں کابل جا رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا، ہو سکے تو وہاں میرزا بیدلؔ کا دیوان میرے لیے خرید لینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ چار جلدوں میں ہے اور ہر جلد کا وزن ڈھائی سیر ہے۔ ہارٹفورڈ میں جب اس سعادت مند نے چاروں جلدیں مجھے لا کر دیں تو میں ضخامت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ورق گردانی کی تو معلوم ہوا کہ چوتھی جلد میں میرزا کی نثری نگارشات ہیں۔

کلیاتِ بیدل کا ایک چھوٹا سا انتخاب مع شرح شائع ہونا چاہیے۔ اسے دیوانِ غالب کی سی مقبولیت حاصل نہ ہوگی لیکن ہمارے ادب کے چمنستان میں ایک کیاری کا اضافہ اس سے ضرور ہوگا۔

تم کہو گے بیدلؔ کے ذکر سے اس خط کا آغاز کیوں ہوا؟ وجہ سنو، کئی دنوں سے مکان کی منتقلی کے لیے اسباب کی چھانٹی کر رہا ہوں اور بیدلؔ کا یہ شعر گنگنا رہا ہوں

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ از اسباب جہاں
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

تم میرے گھر میں فرنیچر بلکہ کباڑ کی افراط دیکھ گئے ہو، یہ کیسے جمع ہو گیا، اس کا قصہ لمبا ہے۔

یہاں کباڑ کے ڈھونے کو میونسپل کا ٹرک ہر مہینے کے دوسرے جمعے کو آتا ہے۔ فالتو فرنیچر گھر کے سامنے ڈھیر کر دوں گا، میونسپل کے مزدور اسے ٹرک پر لاد کر کہیں جا پھینکیں گے۔

تم نے میری منتقلی کی خبر سن کر کہا، نئے مکان میں رہ کر باغبانی کیسے کرو گے؟ جواب یہ ہے کہ باغبانی کے لیے قویٰ کی جتنی توانائی درکار ہے اتنی اب مجھ میں نہیں۔ پھر موڈل ٹاؤن والے گھر کی چمن آرائی والی بات یہاں کیسے ہو۔ وہاں میرے مددگار مالی تھے، علم دین اور خوشی محمد۔ سنگتِ یاراں نہ ہو تو مشغلہ کا لطف آدھا بھی نہیں ہوتا۔

کاغذات کی چھانٹی کرتے ہوئے دو مزیدار گلدستے سامنے آئے۔ معشوقِ کم سن اور حسینوں کا البم۔ دونوں گلدستے ان غزلوں کے ہیں جو زندہ دل مدوّنوں نے طوائفوں سے سن کر جمع کیں۔

معشوقِ کم سن کے صفحہ ۲۴ پر گوہر جان کی اپنی کہی ہوئی ایک غزل ہے۔ گوہر جان کی ماں ملکہ جان بھی کلکتے کی طوائف تھی۔ میرزا داغؔ کی اس سے شناسائی تھی (یعنی ملکہ جان سے) گوہر جان کا باپ کوئی انگریز تھا۔ ملکہ جان کے طالبانِ وصل انگریز بھی تھے۔

تم پوچھتے ہو کوئی نئی خبر؟ لو سنو، ان دنوں سوپر مارکیٹ میں انار دکھائی دیئے۔ ایک خرید کر چکھا تو میٹھا نکلا، روز دو انار خرید کر کھاتا ہوں۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

10 November, 2001

چارہ ساز!

میرا نیا پتہ نوٹ کر لو۔ شکر ہے نئے گھر میں منتقل ہونے کی مہم سر ہوئی۔ آ کر دیکھو گے تو مان جاؤ گے کہ

ریٹائرڈ آدمی کی رہائش ایسے ہی ماحول میں ہونی چاہیے۔ چار مربع میل کے اس احاطے میں ہزار سے زیادہ مسکن ہیں۔ اس میں پھولوں کی کیاریاں برائے نام ہیں لیکن سبزہ خوب ہے۔ ہمسائے ہیں یہاں سب بزرگوار اور ان کی ہمسائیگی خوشگوار۔ سب کے سب سبکدوش، سفید پوش اور خاموش۔ سکوت یہاں ایسا ہے، جس پر تقریر بھی فدا ہو۔ چنانچہ طنبورے اور طبلے کی محفل اس گھر میں ممکن نہیں۔

موڈل ٹاؤن والی بات اس احاطے میں ایک تو یہ ہے کہ اس کے وسط میں ایک شاندار کلب ہاؤس ہے۔ دوسری یہ کہ احاطے کے اندر اندر اس بستی کی اپنی بس سروس ہے۔ کلب ہاؤس میں گاہے گاہے امریکی موسیقاروں کا جلسہ ہوتا ہے۔

ہماری بیٹی کی رہائش اب الگ ہو گئی ہے۔ بوسٹن میں بیس برس اپنے فلیٹ میں رہ کر اسے اپنے ٹھکانے کی عادت ہو گئی۔ اب پھر اس کا چوکا اپنا ہے، اس میں اپنی مرضی کی رسوئی ممکن ہوگی۔ جو چاہے پکائے اور کھائے اور جسے چاہے کھلائے اور پلائے اور انگریزی بول کر بہلائے۔ ہمارے گھر میں تو اردو اور پنجابی کا بول بالا رہے گا اور گھر دھنیا اور ہلدی کی باس والا رہے گا۔

گلستاں میں ایک قطعہ ہے۔

کس نیاید بخانہ درویش (یا کس نیاید بزیر سایہ بوم)
کہ خراج زمین و باغ بدہ
یا بہ تشویش و غصہ راضی شو
یا جگر بند پیش زاغ بند

سنٹرل موڈل ہائی سکول میں میرزا ہادی علی بیگ رامپوری اردو پڑھاتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں نے ایک نظم میں ان کا ایک قصہ بیان کیا ہے۔ جس کے پہلے دو مصرعے یہ ہیں

وطن سے نوکری کی جستجو میں
بنارس کو گئے ہادی علی بیگ

میں شاید آٹھویں یا نویں جماعت میں تھا جب میرزا ہادی علی بیگ صاحب نے ایک روز مجھ سے کہا، اپنے والد صاحب سے میرا سلام کہہ کر ان سے پوچھنا کہ گلستاں کے اس قطعے کے آخری دو مصرعوں کا مطلب کیا ہے؟ اباجی کے بتائے ہوئے معنی سے نہ میری تسلی ہوئی نہ میرزا صاحب کی۔ اس قطعے پر غور کرو، فون کرو گے تو اس پر گفتگو ہوگی۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دعا۔

داؤد

10 December, 2001

چارہ ساز!

نقلِ مکانی کے دنوں میں مجھے کاریگروں کی مدد کی ضرورت پڑی۔ جو گھر چھوڑا ہے، اس کے غسلخانے کی چھت ٹپک رہی تھی۔ ایک ہرفن مولیٰ مددگار نے بڑی مہارت سے اس کی مرمت کی۔ موٹر کار میں کچھ خطرناک نقائص تھے۔ موٹر میکانک نے پوری لیاقت سے ان کی تشخیص کی اور موٹر ٹھیک کر دی۔ پچھلے دنوں داہنے پاؤں کا ایک

KUTABKHANA OSMANIA

ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ ۲۰۰۲ء کو مورخین باستان کہہ کر اس کی تاریخ لکھیں گے۔ جب میری عمر ساٹھ تھی تو میں سوچا کرتا تھا کہ امید نہیں اکیسویں صدی کا نوروز دیکھنا مجھے نصیب ہوگا۔ شکر ہے ہم دونوں ابھی تک متنفس ہیں اور ٹیلی فون پر باتیں کر لیتے ہیں۔

شکر ہے تم نے اپنی نگارشات طباعت کے لیے مرتب کر کے نیاز صاحب کو دے دیں۔ مجھے اشتیاق ہے کہ ان کا مطبوعہ مجموعہ میرے پاس ہو۔ ان میں ضرور بہت سی تحریریں ایسی ہوں گی جو اب تک میری نظر سے نہیں گزریں۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

داؤد

14 November, 1993

بخدمت آغا بابر!

بھائی جی، السلام علیکم

اب کے آپ کے خط میں مہربانی اوج پر تھی۔ طبیعت موج میں تھی۔ میرے سامنے جو سفر ہے، کل ایک ہفتے کا تو ہے۔ کبڈی والی دوڑ ہے۔ چار پانچ دن لاہور میں گزریں گے۔ میامی سے میاں میر، پھر میاں میر سے میامی، اتنی جلدی واپس پہنچوں گا کہ یہاں گرم چائے کی جو پیالی چھوڑ کر جاؤں گا، واپسی پر اسے گرم ہی پاؤں گا۔ کہتے ہیں آنحضرتؐ سات آسمانوں کا سفر کر کے واپس آئے تو ان کا تکیہ ٹھنڈا نہ ہو پایا تھا۔ اس میں کچھ گرمی ابھی باقی تھی۔

آپ نے غلام حسین مہاراج کے درشن میں ہم کو شریک کر لیا۔ آپ کے بیان سے اندازہ ہوا کہ مہاراج کم سخن آدمی ہیں۔ اس کی وجوہ مجھے معلوم نہیں۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پاکستان میں مربیوں کی کمی ہے۔ شریعت تو کہتی ہے کہ تالی بجانا بھی ممنوع ہے (عربی میں تالی بجانے کو صفق کہتے ہیں)

کتھک کے کلاکار منہ سے بات نہیں کرتے۔ زمین پر پیر مارتے ہیں۔ طبلہ نہیں بجاتے، پوری دھرتی بجاتے ہیں، پاؤں کی تھاپ کہے جاتی ہے۔ سب کچھ یہیں ہے، آگے کچھ نہیں ہے۔

پطرس کی تربت کا پتہ آپ نے نکالا، وہ سٹیج کی برادری کے آدمی تھے۔ یہی تعلق آپ کو وہاں لے گیا۔ اپنا اپنا ذوق ہے۔ اقبال کے لیے نظام الشائخ اور حضرت مجدد کے مزاروں میں کشش تھی، میں مجنوں کی قبر کی تلاش میں ہوں، تربت کی تلاش، دراصل قربت کی تلاش ہے۔

ارجمند

19 January, 1994

بخدمت آغا بابر!

بھائی جی، السلام علیکم

ایسا بیاہ جس میں دولہا بابر ہے اور دلہن سکندر، فتح کا جشن ہوگا۔ آر سی مصحف سے پہلے ہی آپ کا سینہ چراغاں کا میلہ تھا۔ شادی نے آپ کو اور بھی آباد کیا جبھی تو آپ نے شادی کو ایسی سرخوشی سے یاد کیا۔

KUTABKHANA OSMANIA

ناخن ٹھوکر سے اکھڑ گیا۔ ڈاکٹر نے جراحی کا کمال دکھایا۔ پاؤں کو ٹیکا لگا کر ناخن کا آپریشن کیا، علاج سے آرام بھی پایا اور مزا بھی اس لیے کہ پاؤں پر یہ مہربانی ایک لیڈی ڈاکٹر نے فرمائی۔ ایسے چارہ ساز نہ ہوں تو کام کیسے چلے۔

اپنے استاد کی نصیحت سن کر تم نے نیکیوں کا تہیہ کیا۔ پیشہ بھی مشکل کشائی کا اختیار کیا۔ وکالت کے علاوہ بھی محتاجوں پر مہربانیاں کرتے رہے، مدد کر کے دعائیں لینے میں برکت ہے۔

افتخار جالب صاحب کی تصنیف لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر پڑھ کر میں نے انہیں جو خط لکھا، اس کی کاپی بھیج رہا ہوں۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

چارہ جو

داؤد

اسلام آباد سے افتخار عارف صاحب کے دو سرکاری عنایت نامے موصول ہوئے۔ دونوں ۲۶۔ اکتوبر کو لکھے گئے ایوارڈ کے چیک اب تک مجھے نہیں ملے۔ معلوم نہیں ایوارڈ کی رقم کتنی ہے۔

29 December, 2001

اعجازی!

ہفتے اور مہینے اور سال کیسی تیزی سے گزرتے ہیں۔ ادھر سوموار اور ادھر جمعہ، جھٹ پٹ، فٹافٹ۔

نیا سال جن احوال کو لے کر آ رہا ہے ان کا خیال رکھتے ہوئے خوشی والی تبریک ٹھیک نہیں۔ برکت اور امان کی دُعا البتہ مناسب ہے۔

نقل مکانی کی مہم میں کاغذات کی چھانٹی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ بعض ایسی چیزیں پھر دکھائی دیں جن کی یاد اپنے آپ کبھی نہ آتی، آج سے چودہ سال پہلے ضیاء محی الدین کے برادر نسبتی زین العابدین نے مجھ سے ایک مضمون لکھوایا تھا۔ زین نے ضیاء کی سیرت نمائی کے لیے ایک کتاب مرتب کر کے چھپوائی تھی۔ اس میں متفرق تحریریں تھیں۔ میرے چند خطوط ضیاء کے نام اور ضیاء کے متعدد خط ناہید کے نام۔ میرا یہ مضمون اس کتاب میں شامل کیا گیا۔ ضیاء کو یہ کتاب اچھی نہ لگی۔ مشتملات کا انتخاب اسے پسند نہ آیا، چھاپے کی اغلاط بھی اس میں بہت تھیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کا نسخہ تمہیں بھیجا گیا یا نہیں۔

اگر "علامت" بدستور نکلتا ہے تو یہ مضمون جناب سعید شیخ صاحب کو پہنچا کر ثواب حاصل کرو۔ انہیں میرا اسلام، فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

داؤد

357 Tilford Q, Century Village East

Deerfield Beach, Florida 33442

9 January, 2002

اعجازی!

نوروز یعنی یکم جنوری کو گزرے نو روز ہو گئے۔ اس سے پہلے مروجہ کیلنڈر کا الف ثانی گزشتہ ہو گیا۔

آپ کی فرمائش ہے کہ اردو کی چند آپ بیتیوں کی باتیں شامل کر کے "خدوخال" کی پہلی جلد کی تمہید لکھوں۔ تعمیل سے انکار کروں تو برکت سے محروم رہوں۔ فرمائش بسروچشم، یہ فرمائش تجدید اعزاز ہے۔

اعجاز کو ایک خط لکھا۔ اس کی کاپی ملاحظہ کے لیے ملفوف ہے اور وہ غزل بھی جو ٹیلی فون پر آپ کو سنا چکا ہوں۔

اطہر زیدی صاحب کے خط کا جواب موضوعات کی فہرست کے ساتھ واپس ملا۔ موضوعات میرے ذہن میں یکجا نہ رہے تھے۔ اب پھر یکجا ہوئے، بلمپت لے میں لکھنا شروع کروں گا۔ پھر شاید درت کا وقت بھی آئے۔

مسعود محمود سے ٹیلی فون پر احوال معلوم کرنے کی کوشش جاری ہے۔ زلزلہ سے فون کے بندوبست بدل گئے ہیں۔ اب تک رسائی نہیں ہو سکی۔ خدا خیر رکھے۔

والسلام مع الاکرام

بہر حال کوشاں

9 June, 1994

بھائی جی، السلام علیکم!

آج جمعرات ہے اور جون کی نو تاریخ۔ پہلی جون کا بھیجا ہوا انبۂ دکن آٹھ روز میں بھی آپ کو نہ پہنچا۔ خدا کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

دیکھیے یہ معما کس طرح حل ہوتا ہے۔ کیا ہوا، شاید ٹرک کے ڈرائیور نے اپنی معشوقہ کو ہی آم کھلا دیئے۔

داغ کو نظام نے انبۂ دکن کا ایک ٹوکرا بھیجا۔ اس کے شکریے کو داغ نے انبۂ دکن کی تعریف میں چند اشعار کہے۔ جو انتخاب بھیج رہا ہوں، اس میں یہ اشعار شامل ہیں۔

اگر آئندہ سال میں یہیں ہوا تو فصل کے دنوں میں ترسیل کی بہتر صورت نکالی جائے گی بلکہ امید یہ ہے کہ آپ یہیں آ کر درخت سے توڑ کر دعوتِ انبہ میں شریک ہوں گے۔

نہ جانے کہاں کھو گیا چل کے انبہ
کہ آنے کو ہے اب تو اک اور شنبہ
خوشی چھین لی مجھ سے ان ڈاکوؤں نے
ہے آنکھوں پہ پٹی تو کانوں میں پنبہ

منزہ کو دعا

30 June, 1994

بخدمت آغا بابر صاحب

بھائی جی، السلام علیکم!

ایک چھوٹی سی کہانی اور۔

حافظے میں بھانت بھانت کا آدمی مقیم ہے۔ بعض اوقات ان میں سے کوئی سر نکال کر کہتا ہے، ہیلو۔

میں کہتا ہوں، ہاں ہاں تو بھی میری زندگی میں آیا تھا۔ تیرے ساتھ بھی بیٹھک ہوئی تھی، اتفاقاً۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، کیا ہے جو اتفاقاً نہیں ہوا۔

دیکھیے میں اتفاقاً فلورڈا میں آ گیا جس شدت کا حملہ تنہائی کا ہوا اتنے ہی زور سے قلم چلانے کی تحریک ہوئی۔

اتفاق سے جو کچھ ہوا، اس کی ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ کپلنگ کا ایک امریکن لڑکی پر عاشق ہو جانا، اس کے ہمراہ امریکہ چلے آنا۔ ریاست ورمونٹ کے ایک قصبے میں مکان بنوا کر رہنا۔ اس لڑکی کے اعزہ سے کپلنگ کی ان بن۔ اس امریکی بیوی کے ہمراہ واپس انگلستان جانا۔

کپلنگ کی ملاقات ہارٹفورڈ میں مارک ٹوین سے بھی ہوئی۔ بلا اطلاع وہ مارک ٹوین کے گھر پہنچا۔ دستک دی، امریکہ کا سید انشاء باہر آیا تو کپلنگ نے کہا "میں رڈیارڈ کپلنگ ہوں۔" گفتگو کیا ہوئی، اس کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں۔

4 August, 1994

بھائی جی، السلام علیکم

چند جھونکے آئے اور اپنے ساتھ پھولوں کی پتیاں اڑا کر لائے۔ تقریظ کا سامان مہیا ہو گیا۔ قارئین تو کتاب پڑھنے کو بے تاب ہوتے ہیں، تقریظ، ایک ضمنی چیز ہوتی ہے۔

میں نے یہ سطور آمد کے عالم میں لکھی ہیں۔ اس مجموعہ کے ابواب میں نے قسط وار بھی پڑھے تھے۔ سارے باب اب یکجا ملے تو ترتیب سامنے آئی۔ یہ کتاب کلاسیکی ہے، اپنے رنگ کی آبِ حیات، حرفِ آغاز کی فرمائش سے میں مشرف ہوا۔

ڈاکٹر جمیل واپس آ چکے ہوں گے، ان کے ہاتھ اعجاز نے ایک لفافہ میرے لیے بھیجا ہے، دیکھوں اس میں کیا ملفوف نکلتا ہے۔

تقریظ کی دو کاپیاں ارسال ہیں۔ ایک اپنے پاس رکھیے، ایک لاہور بھیجی جائے۔ بشرطیکہ آپ کو پسند آئے۔

باغِ اُردو کا مالی

27 August, 1994

بھائی جی، السلام علیکم!

قومی زبان پہنچا، مہربانی۔ سارا پڑھ لیا، شیلف پر رکھ دیا۔ سید عابد علی عابدؔ، صرف از راہ تخلص عابد تھے۔ ان کی طبیعت کا رنگ، عبادت کا نہ تھا۔ وہ سوٹ پوش شاعر تھے۔ (وکیل بھی تو تھے) میرا خیال ہے کہ ان کی اچھی نثر تقریر میں تھی، تحریر میں نہ تھی۔ ان کی ایک کتاب "انتقاد" میں نے پڑھی۔ نہ سر نہ پیر۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہنا کیا چاہتے ہیں۔ غزل شاید وہ اچھی کہتے تھے۔ میں نے تو ان کا غزلیہ کلام بھی کم ہی دیکھا۔

ان کی دختر کی نظم جو بطور نمونہ آپ نے اخبار کے کالم میں شامل کی، واقعی اپنے رنگ کی چیز ہے۔ اس بیٹی کی طباعی باپ کی طباعی سے بہتر ہے۔ یہ بی بی آزاد بھی ہے اور سگھڑ بھی۔ عابد صاحب آزاد زیادہ تھے، سگھڑ کم۔

KUTABKHANA OSMANIA

میرے مکاتیب کی کتاب کا تعارف اعجاز نے لکھا۔ آورد سے لکھا۔ لکھنے والا خود ہی اس کو لکھ کر مطمئن نہ ہوا۔ میں نے اسے تشویق کے لیے دو صفحے لکھ کر بھیجے۔ ان کی فوٹو کاپی ملفوف ہے۔

''کلچر کی کھچڑی'' اگر باسی نہیں ہو چکی تو مجھے بھیج دیں۔

22 February, 1995

بھائی جی، السلام علیکم!

ٹیلی فونی مشاعرہ خوب گرم رہا۔ دو تین ماہ برپا رہا۔ آپ کی داد سن کر ہر بار یوں لگا کہ پورا مجمع داد دے رہا ہے۔

آغا غلام اکبر خاں مرحوم نے آپ کو شعر گوئی سے روک دیا، یہ فرما کر کہ نر آدمی تو نثر لکھتا ہے۔

ہمارے والد مرحوم وجد میں آ کر فارسی اور اردو کے اشعار برمحل پڑھا کرتے تھے لیکن اپنے پتر کے عاشقانہ کلام سے انہیں ڈر لگا۔ میر تقی کے والد میر تقی اپنے خرد سال بیٹے کو اپنے گھٹنے پر بٹھا کر کہا کرتے، بیٹا عشق کرو۔ دیکھیے کیسے کیسے باپ دنیا میں ہوئے ہیں اور کیسے کیسے پُتر۔

آپ غزل گوئی سے باز رہے لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ آپ کا حافظہ پھڑکتے ہوئے فارسی اور اُردو اشعار کا خزانہ ہے۔ بھائی عاشق اور اعجاز کو بھی اچھے اشعار بکثرت از بر ہوئے۔

شبنم شکیل کی فرمائش ایسے وقت آئی کہ مجھ میں لکھنے کی سکت کم تھی۔ اللہ کا نام لے کر قلم اٹھایا تو ہاتف کو متوجہ ہونا پڑا۔ مضمون کے بعض حصے فون پر آپ کو سنا چکا ہوں۔ پورا مضمون ارسال ہے۔

بزنگے شاہ

7 October, 1995

بھائی جی، السلام علیکم!

''حضوریٔ قلب''، مضمون بھی ہے اور کہانی بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اومکار ناتھ ٹھاکر کی دیسی ٹوڈی سن کر آپ کو حضوریٔ قلب حاصل ہوئی ہو گی۔ شب دیگ کی دعوت میں بھی حضوریٔ قلب کے حاصل ہونے کے امکان ہوتے ہیں۔ بہترین قوالی اور بہترین Jazz، ان دونوں کے کیا کہنے! اصل میں حضوریٔ قلب لفظ ہی مبہم سا ہے۔ اصل چیز تو بے خودی ہے۔ سُر ہی سُر میں، اس حد تک کہ خود فراموشی مکمل ہو جائے۔ میں نے ایک غزل میں کہا تھا

مطرب کہاں ہے سامنے جب نغمہ چھا گیا
کیا کام ہے نگاہ کا اب درمیانِ جذب!

''تسلیمات'' کے آئندہ شمارے ان شاء اللہ سب Ramble کے لیے وقف ہوں گے۔ وقتاً فوقتاً آپ کو پہنچتے رہیں گے۔

آج صبح اعجاز سے فون پر کافی باتیں ہوئیں۔ کل دو روز کے لیے وہ پھر راولپنڈی جا رہا ہے۔ لاہور ہائیکورٹ کی اب تین شاخیں پاکستان کے دوسرے شہروں میں قائم ہو گئی ہیں۔ اعجاز کی آمد و رفت کا ایک نیا سلسلہ جاری ہے۔

جو تازہ غزل آپ کو پسند آئی تھی، ارسال ہے۔

12 December, 1995

بھائی جی، السلام علیکم!

حمید نسیم صاحب کو کل خط لکھا تو بیس صفحے ہو گئے۔ طوالت سے طبیعت گھبرائی، کئی حصے اس کے نکال دیئے، بارہ صفحے باقی رہے۔ بہت سوچ کر لکھا، اگر ان سے ملاقاتیں ہوئی ہوتیں تو اتنا سوچنا نہ پڑتا۔

۱۹۹۵ء میں ٹیلی فونی مشاعرہ بھی ہوا اور فون پر گفتگوئیں بھی اس طرح ہوئیں جیسے آمنے سامنے بیٹھ کر ہوتی ہیں۔ ان کے ٹیپ ریکارڈ بنتے اور دوستوں کو لاہور بھیجے جاتے تو سننے والے مان جاتے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ایسے برجستہ مکالمے کبھی نہیں ہوئے۔ ٹیلی فون بازی لے گیا۔

گلگشت جاری ہے، اس کے ساتھ ساتھ کرسمس اور نوروز کی تبریک کے کارڈ لکھے جائیں گے۔ نوروز کی تبریک کے اُردو میں اور کرسمس کی تبریک کے انگریزی میں، قلم دائیں سے بائیں بھی چلے گا اور بائیں سے دائیں بھی۔ اگر چینی زبان سیکھی ہوتی تو اوپر سے نیچے بھی چلتا۔

8 January, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

سفید کاغذ آج گھر میں نہ ملا۔ ہرے ورق پر لکھ رہا ہوں۔ یہ اسلامی رنگ ہے۔ سبزہ زار کا رنگ ہے۔ اللہ کی پسند کے دو رنگوں میں سے ہے (دوسرا نیلا ہے) آسمان اور سمندر نیلے ہیں۔ نباتات سبز، پھول سو رنگوں کے ہوتے ہیں، پتے ہمیشہ ہرے ہوں گے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک، ہری جھنڈی امان کی جھنڈی ہوتی ہے، ہری ہی کہتی ہے، بے خطر گزر جاؤ۔

افتخار نسیم کی شاعری پڑھ کر میں سوچتا رہا، اس پر کچھ لکھوں یا نہ لکھوں۔ دیوانِ حافظ کھول کر فال دیکھی، اس شعر پر نظر پڑی

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی
تا راہرو نہ باشی کے راہبر شوی

یہ شعر میرے سوال کا گول مول جواب تھا لیکن ''بکوش'' میں مجھے اذن کی دُھونی سنائی دی۔ میں نے اس شعر کو ہری ہی سمجھا اور مضمون لکھنے کو قلم اٹھایا۔

اب طوطی کا مسودہ پڑھوں گا۔ دو ہفتے اس میں لگیں گے۔ طوطی بھی ہری ہوتی ہے۔ حسنِ اتفاق اس کو کہتے ہیں۔ اپنے مضمون کی کاپی مجھے بھیجیے گا۔

ہم جنس
داؤد رہبر

25 January, 1996

بھائی جی،

السلام علیکم! بڑے غلام علی خاں صاحب کے گانوں کا ایک ٹیپ کل آپ کو بھیجا، دو ٹیپ اور بھیج رہا ہوں۔ ان میں خاں صاحب کے گانوں کے علاوہ ان کے فرزند منور علی خاں کا گانا (جداگانہ) بھی ہے۔ آخر میں

KUTABKHANA OSMANIA

KUTABKHANA OSMANIA

یگانہ بھصر استاد نثار حسین خاں صاحب کی چند چیزیں ہیں۔ آپ اور استاد فیاض خاں دونوں بڑودہ کے دربار میں ملازم تھے۔ نثار حسین خاں صاحب کا گھرانہ رامپور گھرانہ (یا سہسوان گھرانہ) کہلاتا ہے۔ اس کے اسلوب میں آگرہ گھرانے والی کچھ باتیں بھی ہیں لیکن درحقیقت یہ قلندرانہ اسلوب ہے۔

2 February, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

بڑے غلام علی خاں صاحب کے فرزند منور علی خاں کا ایک اور گانا ڈبے سے نکلا۔ دو فیتے ارسال ہیں، ان پر اس گانے کے علاوہ اور چیزیں بھی ہیں۔

ملک ارجن منصور اور کیسر بائی دونوں اُستاد اللہ دیا خاں کے شاگرد تھے۔ خاں صاحب خاندانی گویّے تھے۔ انہوں نے گائکی کا اپنا گھرانہ قائم کیا جسے ہارمونیم گھرانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ راگ کی تعلیم کے لیے ہارمونیم بڑا کارآمد ساز ہے۔ اللہ دیا خاں صاحب نے شاگردوں کو مختلف راگ سکھاتے ہوئے اسے کئی برس ہولے ہولے بجایا تو ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ دھما چوکڑی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن چین کا راز تو آہستگی میں ہے، آہستگی کو انہوں نے اصول بنالیا۔ اس سے ایک نیا اسلوب نکلا اور ایک نیا گھرانہ قائم ہوا۔

خیال گائکی کے دیگر گھرانوں میں بڑا خیال (یعنی بلمپت خیال) بیشتر بلمپت اِکتالے میں یا جھومرا تال میں گایا جاتا ہے۔ اللہ دیا خاں صاحب نے بلمپت ان تالوں میں نہ گائی۔ بلمپت کے لیے انہوں نے ٹہلتی ہوئی یعنی آہستہ لے کی تین تال اختیار کی۔ گھرانوں کے فرق ایسی ہی باتوں سے ہوتے ہیں۔ ملک ارجن منصور اور کیسر بائی بھگتی رس کے نمائندے ہیں۔

اُستاد اسد علی خاں آگرہ گھرانے کے ممتاز گائک تھے۔ ٹھیٹھ آگرے کے اسلوب میں گاتے تھے۔ طبیعت انہوں نے جنگجو نہ پائی تھی۔ انہیں گائکی کا شاہ غوث علی قلندر سمجھ لیجیے۔

ان کے گانے کے بعد ٹیپ پر تلونڈی گھرانے کی دھرپد ہے۔ یہ بڑا نٹ کھٹ گھرانہ ہے۔ ان کے ہاں آلاپ میں ''تیں تیں تیں تیں'' کی تکرار سن کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ اس تیں تیں کا مطلب ہے تو تو۔ بابا نانک علیہ الرحمۃ تلونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔

آپ کی عبادت میں ضمیر تیں (یعنی تو) کا زبان پر لانا بکثرت ہوا۔ اسی سے ''تیں'' کی تکرار تلونڈی والوں کے آلاپ میں شامل ہوئی۔ یہ بات اور کسی گھرانے کے آلاپ میں نہیں پائی گئی۔ یہ سارا گانا سن کر ان باکمالوں کے ریاض کی داد دیجیے اور ہاں، یہ دُھرپدیے آلاپ میں بار بار ''تیرو نام'' بھی لاتے ہیں۔ یہ ورد بھی بابا صاحب کے دین ہیں۔

اب راجن ساجن مصرا (مشرا) کی سنیے۔ یہ دو بھائی مل کر گاتے ہیں جیسے فتح علی خاں اور امانت علی خاں مل کر گاتے تھے۔ ہندوستان میں پچھلے دنوں راجن ساجن بازی لے گئے تھے۔ ایک جلسے کی فیس ان کی تیس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ہے۔ اپنی شاندار حویلی میں رہتے ہیں جس کے ساتھ جلسے کے لیے خاصا بڑا ہال بھی ملحق ہے۔ یہ لوگ مشرا (یعنی آمیختہ) کہلاتے ہیں۔ ان کے اجداد نے اسلام قبول کیا لیکن ہر قسم کی شادیوں سے اولاد مخلوط ہوگئی یعنی نومسلموں کے پوتے نواسے پھر ہندو ہوگئے۔ راجن ساجن سارنگی کے زبردست کلاکار

پنڈت گوپال مشرا کے بیٹے ہیں۔ بڑے غلام علی خاں صاحب کی ٹکر کے لوگ یہی ہیں۔ بنارس میں رہتے ہیں جو ہندوؤں کا بیت المقدس ہے۔ دونوں بھائی ڈٹ کر گوشت کھاتے ہیں۔

ٹیپ کے آخر میں ایک گانا مالینی راجُرکر کا ہے۔ کچی عمر میں اس نے آج سے آٹھ دس سال پہلے گایا اور بڑی تیاری سے گایا۔ اب ترقی کر کے یہ کہاں پہنچی ہے، مجھے معلوم نہیں۔

بابرہ کے گھر میں دریائے ہڈسن کے کنارے بیٹھ کر آپ یہ گانے سنیے، زندہ باد ٹیکنالوجی۔

مقرر کے نام کا اعلان تقریر سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ مقرر تقریر ختم کر کے کبھی نہ کہے گا۔ ''میں شورش کاشمیری ہوں'' یا ''میں عطاء اللہ شاہ بخاری ہوں'' مکتوب نویسی میں مجھے خط کے آخر میں دستخط کرتے ہوئے اب جھجک سی ہوتی ہے۔ مخاطب کو معلوم ہی ہے کہ نامہ کس نے لکھا، حمید نسیم صاحب نے ''میں'' کی بجائے ''وہ'' لکھنا پسند کیا۔ مجھ کہ ایک منا ہوا آدمی ہوں، اپنے آپ کو ''وہ'' کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

12 February, 1996

بھائی جی!

السلام علیکم! امریکہ میں بیٹھے ہوئے اپنے عصر کی منتخب گائکی سے آپ کو لطف اندوز کرانا کیسا اچھا مشغلہ ہے! اچھا ہوا آپ نے بتادیا کہ آپ کا سامعہ ستار کی آواز کا مشتاق نہیں ہے۔ آپ نہ بتاتے تو میں ستار کے دو تین فیتے بھی آپ کے لیے تیار کرتا۔ اچھا ستار نہ سہی، بندو خاں صاحب، حامد حسین اور نتھو خاں کی سارنگی تو آپ کو پسند ہوگی۔ وہ بھی ان استادوں کی چیزیں بھی میرے پاس ہیں۔

پنڈت بھیم سین جوشی

زبردست گائکی بھیجی جارہی ہے۔ دو فیتے جواب ارسال ہیں' ان میں ایک تو پنڈت بھیم سین جوشی کا ہے۔ چند ماہ قبل یہ فلورڈا بھی آئے۔ جس یونیورسٹی کی سیر کو آپ میرے ساتھ گئے تھے، اس کے ایک ہال میں ان کا جلسہ ہوا۔ انہیں سننے کی آرزو پوری ہوئی۔ جب گا چکے تو ان سے تھوڑی سی گفتگو بھی ہوئی۔ بہتر سال اب ان کی عمر ہے۔ ان کے گلے کا ولولہ اب بھی زوروں پر ہے۔ ان کا خاندان مدراس کی طرف کا ہے۔ کرناٹک کی گائکی کو چھوڑ کر انہوں نے شمالی ہندوستان کی گائکی اپنائی۔ کسب کمال میں کمال کر دکھایا۔ شمال کے پنڈتوں کو مات کر دیا۔ استاد عبدالکریم خاں کے خلیفہ تھے سوائی گندھرو جی اور سوائی گندھرو کے خلیفہ ہیں بھیم سین جوشی، ان کے گورو کی گائکی کمزور تھی اور اس میں القاء کی کمی تھی۔ بھیم سین کی طبیعت میں اپج بھی ہے اور ریاض بھی انہوں نے خوب کیا، ان کا گلا پھلجھڑی ہے۔ سلمہ ستارے کی جگمگ ان کے گانے میں ہے، تلک کامود اور دُرگا ان کے مزاج کے خاص راگ ہیں۔ مرکیاں ان راگوں میں اچھی لگتی ہیں۔

نیاز احمد خاں

استاد نیاز احمد خاں کو ہندوستان کے راگدار لوگ مانتے ہیں۔ ان کے میراثی دوست انہیں مولانا نیاز کہتے ہیں۔ اس کے پیچھے کوئی کہانی ہوگی جو مجھے معلوم نہیں۔ ان کی گائکی اسی گھرانے کی ہے جس کو عبدالکریم خاں

صاحب نے ورثے میں پایا لیکن یہ عبدالکریم خان کے ہندوانہ بھگتی انداز سے متاثر نہیں ہیں۔ اپنے خاندانی اسلوب کے ہو کر رہے ہیں۔ پراگندگی سے ان کا گانا اسی لیے محفوظ ہے۔

اُلاش کُشالکر

اس مرہٹہ گایک کا صرف ایک گانا میں نے زندگی میں سنا۔ اسی گانے کا ریکارڈ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میرے بھائی محمد ایوب نے اسے آل انڈیا ریڈیو کی نشریات سے کراچی میں بیٹھے ٹیپ کیا۔ یہ گانا سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ نثار حسین خاں صاحب کا شاگرد ہے۔ کھماچ کی یہ چیز بہت پرانی ہے اور میں اسے ریڈیو پر نثار حسین خاں صاحب سے بھی سن چکا ہوں۔ ان کی سکھائی ہوئی تانیں اس شاگرد کے کام میں پہچانی جاتی ہیں لیکن اس مرہٹے کے جوہر قابل نے اُستاد کی سکھائی ہوئی باتوں میں اپنے مزاج کی چاشنی بھی ملائی ہے۔

کمار گندھرو

پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر نے کسی گھرانے کو نہیں اپنایا۔ اپنا سٹائل نکالا۔ یہی بات شری کمار گندھرو میں ہے۔ سنگیت کے ہندو حلقوں کے ہیرو یہی دو ہیں۔ اومکار ناتھ جی کا گانا ملک کی تقسیم سے پہلے زوروں پر تھا۔ خان صاحبان سے ان کا میل جول برائے نام تھا۔ کمار گندھرو نے گھرانہ داری کے خلاف بغاوت کی، کٹر ہندوؤں نے کہا، دھن ہے، شاباش۔ خان صاحبان نے ان کے راگ برتاؤ کو ناقابلِ معافی بدعت سمجھا اور اس پر فقرے کسے اور ان کو فحش گالیاں بھی غیبت میں دی گئیں۔ ایک میراثی طبلہ نواز نے مجھ سے کہا، جس گانے سے مردار کی بو آئے، سمجھ لو کہ ہندو کا ہے۔

کمار گندھرو نے کسی کے ناک بھوں چڑھانے کی پروا نہ کی۔ اپنی بھگتی کا مزا لیا۔ سنگیت میں ہندو مسلم سیاست تقسیم ملک کے بعد اُٹھ کھڑی ہوئی اس سے پہلے سنگیت سبھا میں پریم کا راج تھا۔ بھارت میں آج کل یہ سیاست ایک بلائے بے درماں ہے۔ ہندو عطائی، خاندانی موسیقاروں کے شاگرد بھی ہیں اور حاسد بھی۔ ہنر استادوں سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اُستاد فن کے بہترین گُر ان ہندو عطائیوں کو نہیں سکھاتے۔ آدھی بات بتاتے ہیں، آدھی چھپاتے ہیں۔ ہندو عطائی کالجوں کے گریجوایٹ ہیں اور بنگلوں میں رہتے ہیں۔ خان صاحبوں کی رہائش اب تک عموماً چکلے میں ہے۔ اُستاد امیر خاں مرحوم کی دو بیویاں شادی سے پہلے کسبیاں تھیں، مرحوم اس صدی کے تان سین سمجھے گئے ہیں۔

ان کا گانا بھی آپ کو بھیجوں گا۔

بساطِ موسیقی کا
حاشیہ نشیں

15 February, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

نون کا مشاعرہ ہو چکا، اب ٹیپ ریکارڈ کی سنگیت سبھا جم رہی ہے۔ جن گانے والوں کے گانے

ارسال ہیں، ان کا تعارف بھی چاہیے۔

فیروز دستور

ملک ارجن منصور کا نام ''ہندو مسلم'' ہے۔ فیروز دستور کا نام نہ ہندو ہے نہ مسلم، یہ نام فارسی ہے اور گانے والا پارسی۔ پارسی بمبئی میں اور مالابار کے ساحل کے آس پاس آباد ہوئے۔ فیروز دستور کا گانا میں بمبئی کے ریڈیو سٹیشن سے سنا کرتا تھا۔ یہ صحیح گاتا ہے لیکن وجد میں لانے والی کوئی بات اس کے گانے میں نہیں۔ اس کا گانا آپ کو اس لیے بھیج رہا ہوں کہ یہ پارسی ہے۔ پارسی نے ہندو کا سنگیت اپنایا ہے۔ یہ گانا بھی سنیے۔ زندگی میں دال دلیا بھی چاہیے۔

گرجا دیوی

اس کا جو گانا آپ کو بھیجا جا رہا ہے، میں نے بوسٹن کے ایک جلسے میں ریکارڈ کیا۔ ہر گلوکار کا جی خاص خاص راگوں میں لگتا ہے۔ گرجا دیوی کو جیسا عبور راگ پوریا کلیان پر ہے اور کسی راگ پر نہیں۔ بوسٹن کا یہ جلسہ میں نے کرایا تھا۔ اس رات یہ ایسی ترنگ میں آئی کہ خود بھی یاد کرتی ہوگی۔ اس کی عمر میری نظر کو پچاس اور پچپن کے درمیان لگی۔ صورت اس کی بڑی موہنی لگی۔ دلکشی، تمکنت، سرخوشی، صورت جنت نگاہ، آواز فردوسِ گوش۔ سٹیج پر بیٹھی واقعی دیوی لگ رہی تھی۔ یہ بڑی مخیر شریمتی ہے۔ نائیکوں کے کسی خاندان سے ہے یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ بنارس میں گانے بجانے والی لڑکیوں کی سرپرست ہے۔ بہت خوشحال دکھائی دی۔ اس کا پتی ضرور کوئی صاحب حیثیت ہوگا۔

طبلے پر سنگت اُس رات انند گوپال کی تھی۔ یہ کلکتے کے ریڈیو سٹیشن کا اپنا ملازم کلاکار ہے۔ سینکڑوں معمولی اور غیر معمولی کلاکاروں کے ساتھ بجا کر منجھ گیا ہے۔ اس کی حس وجدان کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ کیا تان آ رہی ہے، یہ بھانپ لیتا ہے اور اسی کی مناسبت سے برجستہ بات نکالتا ہے۔ جنگل بند حاضر دماغی سے بجاتا ہے۔ سنگت میں بے ہنگم توڑے نہیں مارتا، گانے کو سجا دیتا ہے۔ اسی کی سنگت سے گرجا دیوی کی طبیعت میں اس رات ترنگ آئی۔

جب گرجا دیوی سٹیج پر آ کر براجمان ہوئی تو میں نے اپنا جیبی ٹیپ ریکارڈر مین اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اعتراض نہ کیا حالانکہ ایسے پائے کے کلاکار امریکہ کے جلسوں میں اپنا گانا بجانا ٹیپ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ قسمت مہربان تھی، ریکارڈنگ ایسی عمدہ نکلی کہ سٹوڈیو کی ریکارڈنگ کو اس پر رشک آیا۔

گرجا دیوی کے نام میں گرجا کلیسا کے معنوں میں نہیں ہے۔ گر (رے کے نیچے زیر ہے) کے معنی ہندی میں پہاڑ کے ہیں (نیلگری میں ''گر'' کو لوگوں نے ''گری'' کر دیا) کرشن کو گردھر کہتے ہیں کہ اس نے پہاڑ سر پر دھر لیا تھا۔

گرجا (Girija) میں ''جا'' وہی لفظ ہے جو فارسی میں ''زا'' ہو گیا ہے۔ چنانچہ گرجا کے معنی ہیں پہاڑ (یعنی ہمالہ) کی بیٹی۔ گرجا اصل میں پاربتی (پربتی) کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ دیومالا میں پاربتی ہمالہ کی بیٹی ہو کر مذکور ہے۔ یہ پربت والی ہے یعنی پہاڑ والی۔

KUTABKHANA OSMANIA

ڈاگر برادران

میں نے اپنی موسیقی والی کتاب میں ڈاگر بھائیوں کی گائیکی کا تذکرہ لکھا ہے۔ ان کا گانا سننے سے پہلے وہ عبارت پھر سے پڑھیں تو پھر مزا آئے گا۔ ایک بات وہاں لکھنی رہ گئی۔ وہ یہ کہ ڈاگر بھائیوں کے گانے کے ساتھ صرف طنبورے بجتے ہیں۔ سارنگی یا ہارمونیم کی سنگت کبھی شامل نہیں ہوتی۔

دتاتریہ پلسکر

پنڈت وشنو دگمبر سنگیت کا زبردست پرچارک تھا۔ اس نے شمالی ہندوستان میں جا بجا سنگیت کے مہاودیالے کھلوا دیے۔ لاہور میں بھی سنگیت مہاودیالہ اسی نے قائم کیا تھا۔ کبھی کبھی لاہور آ کر اس میں مجمع کو راگ کا سبق دیتا تھا۔ پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر اس کے پروردوں میں تھا۔ وشنو دگمبر جب فوت ہوا اس کے بیٹے دتاتریہ کی عمر بہت ہی چھوٹی تھی۔ اسے ونایک راؤ پٹوردھن نے تعلیم دی۔ باپ گندھرو بزرگ تھا۔ (گندھرو سماوی گلوکار کو کہتے ہیں) لیکن اس کا گانا کمزور تھا۔ بیٹا ہونہار نکلا، بڑی منفرد آواز سے اور شگفتہ اور پرتپاک انداز سے گاتا تھا۔ افسوس یہ بیٹا جوانی ہی میں سورگباشی ہو گیا۔

خود فراموش

17 February, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

آپ کہیں گے داؤد رہبر کو تنہائی نے مار ڈالا۔ یہ پیچھا نہ چھوڑے گا۔ بہت دنوں سے آرزو تھی کہ موسیقی کا ایک اچھا انتخاب آپ کو بھیجوں۔ سو یہ انتخاب پورا ہوا۔ جی چاہا تھا کہ جن آوازوں سے میں نے حظ اٹھایا، ان سے آپ بھی لطف اٹھائیں۔ بس اتنی سی بات تھی۔

پنڈت گوپال مصرا

آنت کی آوازیں یعنی گلوکاری آپ سن چکے، اب تانت کی آواز سنیے۔ ایک خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ بنارس کے مصرا (مشرا) لوگوں کے شجرۂ نسب میں مسلمان کلاکاروں کے نام بھی ملیں گے۔ بنارس کے پنڈت گوپال مصرا کا شمار نایکان زمانہ میں ہوتا ہے۔ راجن ساجن انہی کے بیٹے ہیں۔ پنڈت جی کی سارنگی سنیے اور داد دیجیے۔ دیکھیے انہوں نے گئو ماتا کے دودھ میں شہد ملا کر کیسی نہر بہائی ہے۔ یہ ریکارڈ بنارس کی ایک پرائیویٹ بیٹھک کا ہے۔ بازار میں کسی کو دستیاب نہ ہوا۔

ڈاکٹر راجم

شریمتی راجم میڈیکل ڈاکٹر ہے۔ بنارس میں پریکٹس کرتی ہے۔ پنڈت بھیم سین جوشی نے شمالی ہند کی گائیکی ایسی اپنائی کہ اس میں کرناٹک کے سُر برتاؤ اور لے برتاؤ کی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی۔ وائلن پر ڈاکٹر راجم کے باج میں کرناٹک کے سنگیت کا شائبہ باقی ہے۔ وائلن کا استعمال شمالی ہند کے سنگیت میں صرف پچاس ساٹھ

برس پرانا ہے۔ جنوبی ہند میں اس کا استعمال چار سو برس پرانا ہے۔ میں آپ کو راجم دیوی کا بجایا ہوا گورکھ کلیان بھیج رہا ہوں۔ کرناٹک کے اس راگ سے شمالی ہند کے موسیقار واقف نہ تھے۔ عبدالکریم خاں صاحب متلاشی بزرگ تھے انہوں نے اسے دریافت کر کے شوق سے گایا۔

پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر کی سکونت بنارس ہی میں تھی۔ وائلن کی سنگت کو وہ سارنگی کی سنگت پر ترجیح دیتے تھے۔ راجم نے ان کی سنگت کر کے بہت کچھ سیکھا۔ بوسٹن میں یہ اپنی بیٹی کے ساتھ ششی نایک کے ہاں آئی تھی۔ بیٹی بھی وائلن خوب بجاتی ہے۔

اُستاد امیر خاں

ان کے اسلوب پر میں نے چند سطور موسیقی والی کتاب میں لکھی ہیں۔ ان کی گلوکاری کے شیدائی زیادہ تر راگدار لوگ ہیں۔ خاں صاحب کا راگ گیان غیر معمولی تھا۔ نہایت وضعداری اور مشاقی سے گاتے تھے۔ بلمپت خیال (جسے بڑا خیال بھی کہتے ہیں) ان کا خاص میدان تھا۔ اس میں سوچ کا کام ہوتا ہے۔ بڑے خیال کا خوبی سے گانا طبیعت داری چاہتا ہے۔

ابھوگی راگ کو ہندو گلوکار بہت بہتر گاتے ہیں کہ یہ بھگتی کا راگ ہے۔ دیوی اور دیوتا کو حضورِ قلب سے یاد کر کے اسے گاتے ہیں۔ خاں صاحب نے بھگتی رس لانے کی کوشش کی ہے لیکن بھجن والا والہانہ پن ان کے گانے میں آ ہی نہیں سکتا۔ بہر حال خاں صاحب کو راگداروں نے یگانۂ عصر مانا ہے۔ ان کا گانا سننا چاہیے۔

یہ انتخاب پورا ہوا۔ گاہے گاہے یہ چیزیں سنا کیجیے اور ہمیں دعا دیا کیجیے۔

برخوردار

داؤد رہبر

5 March, 1996

بھائی جی!

السلام علیکم! پرسوں لس کے ڈائریکٹر کا خط ملا، خاطر جمع ہوئی۔ اس کا انتظار دو مہینے رہا۔ تذبذب سے رہائی پائی۔ اب انگریزی میں پانچ لیکچر لکھے جائیں گے۔ سمندِ فکر کو ایڑ لگی ہے۔ زین کسی ہوئی ہے۔ بندہ اس پر سوار ہے۔ گھوڑے کی دوڑ تین قسم کی ہوتی ہے۔ پویا، سرپٹ اور دُلکی۔ میں اس گھوڑے کو پویا ہی چلاؤں گا۔ تانگے کے گھوڑے پویا ہی چلتے ہیں۔ ان شاء اللہ پانچ لیکچر پانچ مہینوں میں لکھے جائیں گے۔ اب قلم بائیں سے دائیں چلے گا۔ ایک کتاب انگریزی میں لکھنے کا بہانہ مل گیا۔

یکے از نیازمندانِ لاہور

22 May, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

دیکھیے کتاب کی اُٹھان، سمعُنی کے کمپوزر اپنی دُھن میں لگے ہوئے ہیں، بتگر پتھر تراش رہے ہیں (یا پلستر پر انگوٹھے چلا رہے ہیں) مصور برش سے نقاشیاں کر رہے ہیں۔ کوزہ گر چکنی مٹی کے پیڑے تھپتھپا رہے ہیں،

کلاکاروں کو خود معلوم نہیں کہ کیا صورتیں اور کیا مورتیں بنیں گی۔ یہ سوچ کر لگے رہتے ہیں، کچھ تو بنے گا۔

گت توڑا طبلے پر ٹھیک بجتا ہے۔ اگر اسے پیشکار سے شروع کریں، پیشکار بجانے سے اضطراب دور ہو جاتا ہے اور بڑھت میں سلیقہ آتا ہے۔ پیشکار کے فارمولے گھرانہ دار طبلچیوں نے اپنے اپنے وضع کیے ہیں۔ اس کا انداز اٹکھیلیوں کا ہوتا ہے۔ دو تین منٹ یہ بجائی جائے تو وجدان مستعد ہو جاتا ہے۔

جو صفحات بھیج رہا ہوں، انہیں پیشکار سمجھ لیجیے۔ اس کے بعد توڑے کا گھوڑا مجھے دوڑانا ہے۔

غلام رسول ازہر مرحوم نے تاثیر مرحوم کی یاد میں جو سطور لکھی ہیں، ان کا فوٹو بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔

بغیر زین کے سوار

داؤد رہبر

5 July, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

رات امریکہ کے یوم آزادی کی آتش بازی ہمارے محلے میں بھی خوب رہی۔ آدھی رات تک پٹاخوں کی ''ٹھاہ ٹھاہ'' اور دھم دھم کانوں کے پردوں سے ٹکراتی رہی۔

میری آتش بازی تو قلم اور کاغذ کی ہے۔ رام لیلا راون کے جلانے پر ختم ہوتی ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں راون نہیں جلایا البتہ تھوڑی سی بت شکنی کی ہے۔ راون کی دیو ہیکل مورتی جب آتش زدہ ہوتی تھی تو مورتی کی بغلوں میں اٹکائے ہوئے پٹاخے چھوٹتے تھے۔ آپ میرا مضمون پڑھ کر دیکھیے کہ اس میں کوئی پٹاخے چھوٹے ہیں یا نہیں؟

پطرس بخاری خود ننگے سر رہتے تھے اور بزرگوں کی پگڑی اُچھالتے تھے۔ یہ انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے۔ کاش اردو میں انگریزی ادیبوں سے ہمارا تعارف کراتے، پھر ہمیں معلوم ہوتا کہ انگریزی خاصہ تناول فرماتے ہوئے کون کون سی نعمتیں انہیں مزیدار لگیں۔

حمید نسیم اور ان کے بھائیوں اور ان کی والدہ کا مختصر تذکرہ جو آپ نے لکھا، میں پڑھ چکا ہوں۔ اس کی فوٹو کاپی بنوا کر رکھ لوں گا اور اصل آپ کو دو تین روز میں بھیج دوں گا۔

11 July, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

بندہ پطرس کا ذکر خیر کرے گا تو اسے دوسرے ادیبوں سے الگ کر کے یاد نہ کرے گا۔ دو چار دوسرے اشخاص کی سیرتیں سامنے لائی جائیں تو پھر فرق معلوم اور محسوس ہوتا ہے۔ بغیر اس کے پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص کس اعتبار سے منفرد ہے۔

غالب غالب غالب سن کر میں نے کہا، ایسا لگتا ہے کہ سب نقادانِ ادب غرارے کر رہے ہیں۔ اس لیے ذوق کو بھی یاد کرنا چاہیے۔ پطرس پطرس پطرس کا وِرد سن کر میں نے کہا، مولوی شفیع کا بول بھی بالا کرنا چاہیے۔

پتھر کے جواب میں اینٹ (پیٹر اور پتھر ایک ہی لفظ ہے)

مؤرخین کو چاہیے کہ ڈراما نگاروں سے متعارف ہوں اور ڈراما نگاروں کو چاہیے کہ مؤرخین سے علیک

سلیک رکھیں۔

بہر حال...... وغیرہ وغیرہ قلم بہت چلا، آج بریک لگائی ہے۔ پہلے ڈاک خانے جاؤں گا، پھر پچھلے پہر موٹر کی خرید کے لیے نکلوں گا۔

''خدوخال'' کے صفحات کی فوٹو کاپی کرالی گئی، یہ اوراق بھی خط کے ساتھ ملفوف ہیں۔

شوریدہ

29 July, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

جو باب خط کے ساتھ ملفوف ہیں، اس میں اس درسگاہ کی باتیں ہیں جس میں چار سال آپ نے بھی گزارے۔ کالج کے دنوں میں ہر طالب علم کو اپنا روزنامچہ لکھنا چاہیے۔ ڈائری نویسی سے جستجوؤں اور گفتگوؤں اور گومگوؤں اور مشکبوؤں کی باتوں کے دفتر فراہم ہو سکتے ہیں۔ افسوس ہم نے طالب علمی کے دنوں میں ڈائری نہ لکھی۔ اگر ڈائری لکھی ہوتی تو وہی شائع ہو جاتی اور گورنمنٹ کالج پر مضمون لکھنے کی ضرورت نہ رہتی۔

پانچ لیکچر انگریزی میں لکھنے کے لیے میرے پاس اب ساڑھے تین مہینے ہیں، موضوع سارے فکر انگیز ہیں۔ دیکھیے دماغ کیسے لڑتا ہے۔

آپ بیتیوں پر مضامین لاہور سے واپس آ کر تازہ دم ہو کر لکھوں گا۔ لاہور سے ضروری کتابیں خرید لاؤں گا۔ شہر میں گھوم کر دیکھوں گا۔ ''نقوش'' کے لاہور نمبر میں فصیل کے تیرہ دروازوں کا ذکر ہے، کچھ ان میں سے باقی ہیں کچھ ڈھے گئے۔ جو باقی ہیں انہیں ہاتھ لگا کر آؤں گا۔

عازمِ زیارات

23 December, 1996

بھائی جی، السلام علیکم!

اعجاز نے بٹالہ جا کر اپنا گھر دیکھا اور اسے ویسے کا ویسا پایا۔ مجھے اب کے وہ موڈل ٹاؤن لے گیا۔ جی بلاک کے نمبر ۱۳۷ کا احاطہ اب چار دیواری ہو گیا ہے اور اس کا ایک آہنی گیٹ ہے۔ نئے مالک کی اجازت سے ہم اس احاطے میں داخل ہوئے۔ جس رقبے میں چودہ کمروں والا دو منزلہ مکان تھا، وہاں اب اس مکان کی ایک اینٹ بھی باقی نہ تھی، صرف سوکھی سوکھی گھاس تھی۔ جامن کا ایک درخت البتہ پہچانا گیا، کھجور کا درخت بچا نہ رہا۔

پراگندہ طبع لوگ کے لیے ایک کہانی اور لکھی جائے گی۔ اس کا عنوان ابھی سوچا ہے۔ ''انہونیاں''۔

دس لیکچر پاکستان میں دیئے گئے۔ نو لاہور میں، ایک کراچی میں۔ دو جلسے گانے کے ہوئے۔ ایک لاہور میں اور ایک کراچی میں۔ لاہور میں ایک شادی کھائی گئی اور تین چار دعوتیں اڑائی گئیں۔ اعجاز کے گھر میں تین چار بار جانا ہوا۔ تناول وہاں بھی ہر بار ہوا۔ میزبانی مہربانی ہو کر نصیب ہوئی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۵۵ میں پاکستان کی زیارت کی اور ایک سفرنامہ بعنوان ''ڈھائی ہفتے پاکستان میں'' شائع کیا۔ میں نے اب کے پاکستان میں تین ہفتے گزارے۔ دیکھیے اس سے ایک سفرنامہ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔

KUTABKHANA OSMANIA

"LINK" میں آپ جو کالم لکھتے ہیں، ان کے دو چار نمونے مجھے ارسال فرمائیں تو لطف آئے۔

آغا غیاث الدین احمد صاحب کا داماد

داؤد رہبر

8 January, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

''خدوخال'' کی بعض عبارتوں نے زبان کا چٹخارہ محسوس کرا دیا۔ دم پخت پلاؤ کی دیگ سے چھوٹتی ہوئی مسالہ دار بھاپ کی مہک قارئین کے نتھنوں نے سونگھ لی۔ یہ کالم جو آپ نے لکھا ہے، اس نے کان کا چٹخارہ محسوس کرایا ہے۔ وہاں مہک تھی یہاں نغمے کی لہک، قارئین کے کان محلذذ ہوں گے۔

تجویزات:-

صفحہ 2، نیچے سے دوسری سطر:-

آپ نے لکھا ہے: کومل سُروں کی ہمراہی میں......

اسے بدل کر لکھئے: مدھر سروں کی ہمراہی میں......

(کومل کا لفظ یہاں غلط فہمی کا باعث ہوگا)

صفحہ 3، نیچے سے چوتھی سطر:-

آپ نے لکھا ہے: تیور سُروں کو اُٹھانے لگی

اسے بدل کر لکھئے: سُروں کو بڑھاوا دینے لگی

(تیور کا لفظ شامل نہ کیجیے۔ یہ یہاں غلط فہمی کا باعث ہوگا)

صفحہ 4، اوپر سے تیسری اور چوتھی سطریں:-

آپ نے لکھا ہے: متانت کے ساتھ جسم اور رُوح میں اتار کر گایا جاتا ہے

اسے بدل دیجیے: متانت کے ساتھ روح داری سے گایا جاتا ہے

صفحہ 9، نیچے سے چوتھی سطر:-

آپ نے لکھا ہے: اس راگ میں تیور اور مدھم دونوں سُروں کا استعمال ہوتا ہے۔ مدھم سر کا استعمال بڑی خوبصورتی سے نبھانا پڑتا ہے۔

اس کو یوں بدل دیجیے: اس راگ میں تیور ما اور کومل ما دونوں لگتے ہیں، ان کے جوڑ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے نبھانا پڑتا ہے۔

صفحہ 9، نیچے سے دوسری سطر:-

آپ نے لکھا ہے: تیور اور مدھم سُر کے بعد جب شدھ سر لگتا ہے تو یہ مقام بڑا اہم اور نازک تر ہو جاتا ہے۔

اس کو یوں کر دیجیے:- ان دو سروں کے بعد جب پنچم سُر لگتا ہے تو عجب سنسنی ہوتی ہے۔

(صفحہ 9 کی یہ درستیاں اصطلاحی ضرورت سے تجویز کی گئی ہیں۔)

KUTABKHANA OSMANIA

صفحہ 9 اور صفحہ 10 پر میں نے چند جملے قلم زد کرنے کی جسارت کی ہے۔ بہ تقاضائے صحتِ اصطلاح، مثلاً آپ نے سارنگ راگ کو سمپورن کہہ دیا۔ حالانکہ یہ سمپورن نہیں ہے۔ سمپورن اس راگ کو کہتے ہیں جس میں سات سُر لگیں، سارنگ پانچ سروں کا راگ ہے۔

سارنگ کو اُستاد لوگ جب بلاول ٹھاٹھ کا راگ کہتے ہیں تو اس کی وجہ اس راگ کی خوبصورتی نہیں ہوتی بلکہ یہ حقیقت کہ اس کے پانچوں سر بلاول Scale سے ماخوذ ہیں۔

یہ تبدیلیاں کردی جائیں تو راگدار لوگ بھی آپ کے کالم کی داد دیں گے۔

باقی باتیں فون پر ہوں گی۔

28 May, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

Jet lag کا اردو ترجمہ ہوگا اُڑان خمیازہ۔ اُڑان خمیازہ جسمانی بھی ہوسکتا ہے اور ذہنی بھی۔ آپ کو صرف ذہنی ہوتا ہے، وہ بھی تھوڑا سا۔ تاہم آخر شادمان کالونی قطب جنوبی ہے اور میری ٹاؤن قطب شمالی۔ وہاں جا کر یہ خواب اور یہاں آکر وہ خواب۔

''سفرنامے'' کا حصہ اوّل آپ پڑھ چکے، دوسرا حصہ حاضر ہے۔ دراصل یہ تحریر ایک نامہ تشکر ہے۔ اپنے میزبانوں کے نام۔

کراچی کے رسالہ ''مکالمہ'' کے ایڈیٹر صاحب کا نام مبین میرزا ہے۔ ''سفرنامہ'' انہیں بھیج رہا ہوں۔

پانچ چھ فوٹو کاپیاں لاہور اور کراچی کے میزبانوں کو بھیجی جارہی ہیں۔

پڑھ کر بتایئے گا، اس میں کچھ ہے یا نہیں۔ موڈل ٹاؤن کے جی بلاک میں ہمارے گھر کا نابود ہو جانا، نصیر خاں کے پوتوں سے ملاقات، اورینٹل کالج اور انجمن ترقی اردو کی تقریبیں، ان کا بیان لکھ کر جی بہلایا اور ہاں ڈھینگرے والے گھر کی کہانی بھی گفتنی اور نوشتنی تھی۔

گورنمنٹ کالج والے فوٹو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

نقش فریادی

داؤد رہبر

6 June, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

سفرنامے کے آخری باب کی ترتیب حسب تجویز بدل دی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے تذکرہ پر آکر سفرنامہ ختم ہوا۔

کراچی میں آفتاب احمد خاں کے سوا اور کوئی نہ تھا جس سے میں اس کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بات کر سکتا۔

ثریا جبیں کے گاہک تو بیسیوں ہوں گے، آپ اس کے گاہک نہیں محسن ہیں۔ آپ کی تحریر ہی سے اس کا نام زندہ رہے گا۔

تارا چودھری کا ذکر میں نے ناہید سے سن رکھا تھا۔ ایک پرائیویٹ فلم میں اس کا ناچ بھی دیکھا۔ میں اس گمان میں رہا کہ یہ ہندو ہے۔ آپ کی تحریر سے اس کے باپ کا نام (عبدالرشید چودھری) معلوم ہوا۔ ناہید کے فن کی خاک پا کچھ اور ہے۔ ایسی پختگی تارا کو حاصل نہ ہوئی۔ حرکات اور سکنات کی نازکی اس کے ہاں نہ تھی۔ اُچھل کود زیادہ تھی۔

''خدوخال'' کے لیے جو تقریظ میں نے لکھی تھی، اس کے شروع میں آپ کے تسمیہ کی حکایت شامل کر کے جلد بھیج دوں گا۔

گانے کی کلاس گھر میں ہوا کرے گی۔ آج شام ایک شاگرد کو بہاگ کا سبق دیا جائے گا۔

عطاء اللہ خاں عطائی

بروزن

علاء الدین خاں علائی

21 June, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

کرنل نجم الثاقب کو تنبیہ کا جو خط آپ نے لکھا، اس کی بلاغت کی داد کون نہ دے گا۔ حافظے کی زنبیل سے نکال کر اسے آپ نے پھر سے زیب قرطاس کیا۔ آپ کی طرف سے یہ خط اظہار خیر خواہی تھا لیکن آپ کے دوست نے اسے پڑھ کر یہی کہا ہوگا ع

شورِ پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا

قسمت کے ہیر پھیر نے اس کا عقد ثریا جبیں سے نہ ہونے دیا، اچھا ہوا یا برا ہوا، یہ اگر مگر کا سوال ہے۔

کلکتے کی طوائف سے ایئر کموڈور مراد کے عقد کا ذکر بیچ میں خوب آیا۔ مراد کی مراد پوری ہوئی، نجم الثاقب تو شہاب ثاقب تھا، ٹوٹا ہوا تارا۔ بعض نام بھی نوشتۂ تقدیر کے نمائندے ہوتے ہیں۔ آپ کے نام سے آپ کی طبیعت میں شہنشاہی آئی۔ میرے نام نے مجھے گویّا بنا دیا۔ لحن داؤدی کا وارث۔

حمید نسیم نے ایک خط میں لکھا کہ خلافتِ راشدہ کا بیڑا مروان بن حکم نے ڈبویا۔ میں نے کہا، اس آدمی کا نام ہی غلط تھا: مروان

بھائی عاشق کے ازدواج کا المیہ شاید ''خدوخال'' میں اب تک شامل نہیں ہوا۔ ممتاز کا نابینا ہو جانا اور اس حال میں اس کی ملاقات بھائی عاشق سے، یہ حکایت نہایت دلگداز ہے۔ کیا یہ لکھی جائے گی؟؟

16 August, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

شکر ہے اعجاز کا خط آپ کو ملا اور ''علامت'' کا پرچہ بھی ملا۔ اُمید ہے دو چار روز میں اس کا خط مجھے بھی ملے گا۔ خدا نے اسے کامران کیا اور شادمان کیا اور ہم پر مہربان کیا۔ کچھی نے اسے دودھ، پوت اور ان اور دھن سب کچھ دیا۔ دوسرے لوگ تو بقول آپ کے دہی کے کٹورے کے لیے پیسے بچاتے ہیں اور خط لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اعجاز کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔

مقدمہ ارسال ہے۔ میرے پاس اس کی فوٹو کاپیاں محفوظ ہیں۔ آپ اس پر نظر دوڑا چکیں تو آپ کو ٹیلی فون کروں اور دریافت کروں کہ کونسی عبارت آپ کے خیال میں محل نظر ہے یا بے جان ہے۔

''علامت'' سے سعید شیخ صاحب کا تبصرہ ''سلام و پیام'' اور میرے قطعات کی فوٹو کاپی مرحمت ہو۔

آج شام یہاں کے ہلٹن ہوٹل میں بھارت کے لوگ آزادی کا پنجاہ سالہ جشن منا رہے ہیں۔ مجھے دعوت نامہ ملا ہے۔ ڈنر کے ٹکٹ کی قیمت پچاس ڈالر ہے۔ میں اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر ہرگز نہ جاتا۔ ایک امریکی صاحب توفیق نے میرے لیے اپنے پاس سے ٹکٹ خریدا ہے، ڈنر کھاؤں گا اور بھاشن سنوں گا۔ بھوجن اور بھجن دونوں کا مزا لوں گا۔

۲۸ جولائی کو صبیحہ کے والد بزرگوار آغا غیاث الدین احمد صاحب نے انتقال کیا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۹۰۰ء تھی، ستانوے برس جیے۔ گزشتہ دسمبر میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔

چل چلاؤ کی دوسری خبر یہ ہے کہ حیات احمد خاں صاحب کی بیگم نے وفات پائی (لندن میں یا شکاگو میں) ان کو تعزیت کا خط لکھوں گا، آپ بھی لکھیں۔

آج برکھا ہو رہی ہے۔ یہ ساون کی بارش نہیں، بھادوں کی بارش ہے۔ بکرمی سمت کی جنتری بھی گھر میں رکھنی چاہیے اور ہجری کیلنڈر بھی۔

باقی باتیں فون پر۔

دکنی

داؤد رہبر

12 June, 1998

بھائی جی، السلام علیکم!

یوں تو ''خدوخال'' کی سابقہ اقساط میں بھی آپ کی آزاد خیالی موجزن ہے لیکن اب کے جو تحریر آپ نے بھیجی ہے، اس میں آپ کے مشرب کا اظہار اچھی طرح کھل کر ہوا ہے۔

اس نگارش میں کیا کچھ نہیں آیا۔ والدین سے محبت کا والہانہ اظہار بٹالہ کے تسمیہ کی کہانی آپ کے اس محبوب شہر میں درگاہ فاضلیہ کی فیض رسانی، نجم حسین سید کے گھر میں شاہ حسین کی کافیوں کی قرأت اور پھر ہارمونیم کا نزول اجلال، پھرنیاں اور چنے کی دال، شاہ حسین اور مادھو لال، سرمد اور ابھے چند کے فراق و وصال۔

کوئی بھی قصہ اس نگارش میں از راہ آورد نہیں آیا۔ آمد ہی آمد ہے، بات سے بات بلکہ گھات سے بات نکلی ہے۔

مشاعرہ ہو چکے تو کہتے ہیں فلاں غزل حاصل مشاعرہ تھی، آپ کی اس نگارش میں حاصلِ تحریر آپ کے اباجی کے دو قول ہیں۔ ایک تو وہ پھبتی جو میاں نذر محی الدین پر ہے:-

''میاں صاحب کی بڑی مصیبت یہ ہے کہ جو ہاتھ ساری عمر لینے والا رہا ہو، وہ ہاتھ دینے والا کس طرح بنے۔''

دوسرا فرمودہ ان کا:-

KUTABKHANA OSMANIA

"حکیم اور ڈاکٹر کے سامنے مریض کو جس طرح لباس اتارنا پڑتا ہے، انسانی باطن کی تمام خباثتیں اور کمزوریاں اسی طرح پولیس کے سامنے بے لباس ہو جاتی ہیں۔"

آپ نے وجد میں آکر یاد کیا ہے کہ آپ کی والدہ مرحومہ آپ کو بارا کہہ کر بلاتی تھیں اور بھائی عاشق کو آقا جان کہہ کر۔ یہ بتانا رہ گیا کہ اعجاز کو وہ کیا کہہ کر بلاتی تھیں۔

انگریز گورنر کی تشریف آوری کے قصے میں یہ جملہ ہے:-

"عقیق کی ہزار دانہ تسبیح پر نظر پڑی جس کے ساتھ قدیم زمانے سے ایک دلچسپ داستان وابستہ چلی آ رہی تھی۔"

اگر یہ داستان آپ کو معلوم ہے تو کیوں نہ اس کا خلاصہ بھی آپ کی اس الف لیلہ میں شامل ہو!

اردو اور انگریزی اخباروں کے کالم بھی میں نے پڑھے۔ ان سب کی فوٹو کاپیاں بنوا کر محفوظ کر لوں گا اور اصل تراشے ایک الگ لفافے میں واپس بھیج دوں گا۔

مسودے کی پروف خوانی بھی ہوئی۔ پنسل سے میں نے حاشیے پر اس کا ثبوت دیا ہے۔

پروف خواں

بلکہ پروف خاں

برخوردار داؤد

26 June, 1998

بھائی جی، السلام علیکم!

تراشے فوٹو کاپی کر لیے گئے۔ آپریشن والی تحریر تو الہامِ تام ہے۔ اسے آپ افسانوں کے مجموعے میں شامل کیجیے ورنہ یہ LINK کی فائلوں میں پڑی رہ جائے گی۔

صفوت علی اور نادر علی کے کالم کا آپ نے منہ توڑ جواب انگریزی میں لکھا تھا۔ سید انشاء کا مستزاد اسے پڑھ کر یاد آیا:-

اے عشق اجی آؤ مہاراجوں کے راجا، ڈنڈوت ہے تم کو شاہ حسین اور سرمد کی روحیں آپ کو دعائیں دے رہی ہیں۔ مادھولال اور ابھے چند کی معشوقی نے تصوف میں جان ڈال دی۔

اعجاز کی آمد کا انتظار ہے، ان شاء اللہ میں بھی پہنچوں گا۔

برخوردار

داؤد رہبر

12 July, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

میر تقی نے آپ بیتی بہتر سال کے ہو کر لکھی۔ اس میں اپنے بچپن کے احوال نہایت اختصار کے ساتھ لکھے۔ اپنے باپ میر متقی کے اقوال کسی قدر تفصیل سے قلمبند کیے۔ ان کی آپ بیتی کا بیشتر حصہ راجاؤں اور نوابوں کے جنگ وجدال کی داستان ہے۔

آپ نے خدوخال اسی کی عمر کو پہنچ کر لکھے۔ آپ کے حافظہ کو معجزہ کہنا چاہیے۔ احوال اور اسماء اور گفتگوئیں سب آپ کے ہاں مستحضر ہیں۔ مورخ عموماً ماہ و سال کے وقائع نگار ہوتے ہیں۔ آپ سحر و شام کے مورخ ہیں۔

ان صفحات میں حسب سابق بات سے بات خوب نکلی ہے۔ بھابی سکندرہ کے پردہ ترک کرنے کا قصہ، ان کی سلطانہ سے دوستی، اعجاز اور گوہر کا رپورٹر بن کر بسارا کو مزہ چکھانا، مجید الملکی کی سکھ بیوی اور کرتار سنگھ دگل کی مسلمان بیوی خدیجہ، اس قصے میں بھابی سکندرہ کا مذکورہ، استاد دامن اور پنڈت نہرو کا آمنا سامنا۔ بھائی ذوالقرنین کے حکم سے مولوی قینچی کی گرفتاری، مسلم ٹاؤن میں پنچولی کی سرگرمیاں، شوکت تھانوی کا آپ سے مسابقہ، شوکت حسین رضوی سے نور جہاں کی شادی اور پھر ان کی طلاق، سید دلدار حسین تھانیدار کو آپ کی ڈانٹ۔

غدر کے بعد امن ہوا تو دلی میں ایک محصول عائد ہوا جس کا نام ٹاؤن ڈیوٹی تھا۔ انگریزی لفظ عامۃ الناس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس کا تلفظ پون ٹوٹی ہو کر زباں زد ہوا، کرفیو کا عرفِ عام کڑ چھو اس کا جواب ہے۔

صفحہ نمبر ۲ کی تیسری سطر پر آپ نے بھابی کے لیے "ہم جلیس و ہمنشینِ حیات" کی ترکیب سوچی۔ میرے خیال میں "میرے گھر کی ملکہ" لکھا جائے تو التباس دور ہو جائے گا۔

پروف خوانی کے عنوان سے میں "تصحیحات" کی جو فہرست بھیج رہا ہوں، اسے ملاحظہ فرمائیں۔ جو تبدیلی معقول لگے، وہی کی جائے۔

آج اعجاز سے ٹیلی فون پر گفتگو مختصر ہوئی۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازے پر اس کے کسی مہمان نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا کہ آپ اس کے خط کے منتظر ہیں۔ اس نے کہا، کل اتوار کو خط لکھا جائے گا اور ڈاک میں ڈال دیا جائے گا۔

پچھلے خط میں نیچے دستخط دانستہ حذف کیے۔ اب کے دانستہ ثبت کیے جا رہے ہیں۔ تخلص تو غزل کے مقطع کی چیز ہے۔ نثر میں مقطع ہوتا ہی نہیں، لیجیے اپنا نام بغیر تخلص کے لکھتا ہوں۔

برخوردار

داؤد

8 October, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

لوئی ما سی نیوں کانفرنس کے سہ روزہ اجلاس گزشتہ اتوار یعنی ۵ اکتوبر کو ختم ہوئے، پرسوں میں واپس آیا۔

بیشتر مقالے فرانسیسی میں پڑھے گئے۔ آپ جانتے ہی ہیں فرانس نون غنے کا ملک ہے۔ میں نے اس کانفرنس کے دنوں میں ایک روز صبح ناشتے کے وقت دو تین فرانسیسی پروفیسروں سے پوچھا، آپ لوگوں کی بولی میں نون غنہ کہاں سے آیا، بچارے اس سوال پر حیران ہوئے۔ کچھ جواب نہ ملا۔

عربی میں گانے کو غناء کہتے ہیں یعنی ناک والی آواز نکالنا۔ ہمارے میراثی ایسی آواز کو نکی کہتے ہیں۔

میں اس سفر سے واپس آیا تو چند رسائل اور مضامین کا ایک پارسل یہاں آیا رکھا تھا۔ یہ علی گڑھ کے

KUTABKHANA OSMANIA

ریٹائرڈ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے مجھے بھیجے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک تحریر انہوں نے آپ کے لیے بھی بھیجی ہے جو میرے اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔ آپ کو ملے تو پروفیسر صاحب کو رسید کا رقعہ لکھ بھیجئے۔ باقی باتیں ٹیلی فون پر ہوں گی۔

برخوردار

داؤد رہبر

28 October, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

فوجی نوکری سے سردار شوکت حیات کو چرچل نے چھٹی کی منظوری جن الفاظ میں دی کمال کا چٹکلا ہے۔ آپ نے ''خدوخال'' میں اسے درج کر کے اس کو محفوظ کر دیا۔ مقامی بات بین الاقوامی بات میں خوب ملائی گئی بلکہ رچائی گئی۔

سر سکندر کی رحلت کے دوسرے روز ایک دوست کے ہمراہ آپ کا عیدن بائی کے ہاں جا پہنچنا۔ ادبیات کے فائدے کے لیے ہی تو تھا۔ آپ وہاں نہ پہنچتے تو یہ دریافت نہ ہوتا کہ بائی جی کی برادری میں لفظ داماد کا استعمال کن معنوں میں ہوتا ہے۔ لاہور کے عمائد کی دامادیاں اس گفتگو سے معلوم ہوئیں۔

بات چرچل سے شروع ہوئی اور بھائی عاشق اور سر سکندر کے اذکار سے کھیلتی ہوئی عیدن بائی کے لذت کدے جا پہنچی اور تازہ جلیبیوں کی مٹھاس پر ختم ہوئی۔ عیدن بائی نے خود اپنی برادری کی جو رشتہ داریاں گنوائیں، ان کا شجرہ بنا کر آپ نے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ یہ آپ کے حافظے کا معجزہ ہے۔

آپ کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے لاہور کے جامن یاد آ گئے۔ انہیں کوزے میں ڈال کر ان پر نمک چھڑکا جاتا ہے اور پھر کوزے کا منہ بند کر کے کوزے کو بے تحاشا حرکت میں لایا جاتا ہے، چھابڑی والا جامنوں کو انجیر کے پتے پر ڈال کر پیش کرتا ہے۔

کانفرنس کے مقالہ کی کاپی بھیج رہا ہوں۔

لائے ہمیشہ آپ تو پاتال کی خبر۔ یہ مصرع آپ کی تحریر سے حاصل ہوا، اس زمین میں غزل کہی جائے گی۔

برخوردار

داؤد رہبر

13 November, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

راشد کے چاروں دیوان میرے پاس ہیں۔ ان چاروں میں جو نظمیں ہیں، ان کے عنوانوں کی فہرستیں بھیج رہا ہوں۔ ''دروازہ کھلا رکھنا'' ان میں سے کسی کا عنوان نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ ان کی کسی نظم کا ایک مصرع ہو۔ ورق گردانی کروں گا، اگر دکھائی دیا تو نظم کا فوٹو بھیج دوں گا۔

پراگندہ طبع

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

14 November, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

خوب ہوا کہ کسی تقریب میں دو کشمیریوں کی ملاقات ہوئی اور آغا اشرف کی تقریر کی تاریخ مقرر ہو سکی ورنہ میر صاحب ٹالتے ہی رہتے۔

تعارف کی عبارت حاضر ہے:-

ڈاکٹر آغا اشرف علی کے اجداد ایران کے مقدس شہر قم کے باشندے تھے۔ جس خاندان سے ان کا تعلق ہے، بیسویں صدی میں کشمیر کے مسلمانوں کا سب سے ممتاز خاندان شمار ہوا۔ ان کے نانا آغا سید حسین ریاست کے ہوم منسٹر تھے۔ نہایت وضعدار شخصیت کے آدمی تھے۔

ریاست کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر آغا سید حسین صاحب نے لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں مکان بنوایا، ہر سال سردیاں لاہور میں گزارتے تھے اور گرمیاں سری نگر میں۔ آغا اشرف صاحب نے جاڑوں کے کئی موسم لاہور میں اپنے نانا کے ساتھ گزارے۔

ماڈل ٹاؤن میں یہ ہمارے دوست داؤد رہبر صاحب کے ہمسائے اور ہمجولی تھے۔ داؤد رہبر نے آج سے پچاس سال پہلے لاہور کے رسالہ ''ادبی دنیا'' کے لیے ''کشمیری ہمسائے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں آغا اشرف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

> ''جس روز یہ نانا کے گھر میں وارد ہوتے اطلاع کی ضرورت نہ ہوتی۔ کسی تازہ فلمی گانے کی بے تحاشا تان کڑکتی ہوئی آواز کا گولا بن کر آتی اور ہمیں خبر ہو جاتی کہ پہاڑ سے ہمارا دوست آیا ہے۔ شام کو ہم اپنے احاطے میں ٹینس کھیلتے تو یہ بھی آ جاتے۔ ہمارے احاطے میں سنگتروں کے پیڑ تھے۔ کھیل کے اوقات میں سنگترے کھائے جاتے۔ اشرف سے ہم پوچھتے کتنے سنگترے توڑیں تمہارے لیے؟ گیند پر بلا زور سے ٹھونک کر کہتے بیس پچیس کافی ہوں گے۔''
>
> ''ہمارے گھر میں کنواں تھا، اشرف اس کنوئیں میں جھانک کر ایک اینٹ ضرور اس میں پھینکتے۔ پانی میں اینٹ کا دھماکہ ان کو بڑا لطف دیتا۔''

داؤد رہبر سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں جب آغا اشرف پڑھتے تو وہاں ان کا ڈنکا ایسا زبردست تھا کہ گویا یہ بادشاہ گر تھے، یونیورسٹی یونین کے الیکشن میں جس امیدوار کے یہ طرفدار ہو جاتے، ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ الیکشن ہار جائے۔

انہوں نے علی گڑھ سے (غالباً ۱۹۴۳ میں) فن تاریخ کا ایم۔ اے پاس کیا۔ پھر دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پہلے بچوں کے معلم اور وہیں پھر تاریخ کے پروفیسر ہوئے۔ پانچ سال جامعہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے قرب سے فیض یاب رہے۔ ملک آزاد ہوا تو شیخ عبداللہ نے انہیں کشمیر کی خدمات پر آمادہ کیا۔ کشمیر میں ان کے مناصب کا سلسلہ یوں ہے:-

1. Inspector of Schools
2. Principal, Teachers Training College

3. Professor of Education
4. Director of Education
5. Chairman of the State Board of Education
6. Commissioner for Education.

۱۹۵۰ء میں یہ انگلستان گئے۔ وہاں دو سال Comparative Education کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۶۰ء میں امریکہ آئے۔ Ball State University سے (جو انڈیانا میں ہے) تعلیمات کے میدان میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی (۱۹۶۴ء میں)

انگریزی کے کامیاب شاعر آغا شاہد علی جو یونیورسٹی آف میسے چوسٹس میں پروفیسر ہیں، آغا اشرف صاحب کے فرزند ہیں۔

جلسہ ہو چکے گا تو اس کی روداد سننے کے لیے آپ کو بھی ٹیلی فون کروں گا اور اشرف کو بھی۔

اخبار کے تراشے واپس بھیج رہا ہوں۔ صرف بدھ مت والا تراشا اپنے پاس رکھوں گا۔ اس تبصرے پر آپ سے فون پر گفتگو ہوگی۔

عجیب آدمی

داؤد رہبر

19 December, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

خالدہ ادیب خانم جنوری ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر انصاری کی مہمان ہو کر ہندوستان کی سیر کو آئی۔ دلی، علی گڑھ، لکھنو، بنارس، کلکتہ، لاہور، حیدر آباد اور بمبئی میں اس کے اعزاز میں تقریبیں ہوئیں۔ ضیافتیں، تقریریں، مکالمے، درشن، بھوجن۔ انگریزی میں اس نے سفرنامہ لکھا اور Inside India اس کا عنوان رکھا۔ اس کا اردو ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا۔ ترجمہ "سفرنامۂ ہند" کے عنوان سے ۱۹۳۸ء میں طبع ہوا۔

ترجمہ پڑھتے ہوئے تین عبارتیں ایسی نظر سے گزریں جو آپ کے پڑھنے کے لائق ہیں۔ کلکتہ میں نور جہاں کا گانا، اسی شہر میں کالی دیوی کا مندر اور بمبئی میں ایک ہندو رقاصہ کا ناچ، تینوں کی منظر کشی کا انداز آپ کی تحریروں کا سا ہے۔ کتاب سے فوٹو بنا کر آپ کو بھیج رہا ہوں۔

کل کرسمس کارڈ ڈاک میں ڈالنے کی رسم ادا کرنے سے فارغ ہوا۔ بیس سے زیادہ کارڈ بھیجے گئے۔ ہر کارڈ پر تبریک کے ساتھ تالیف قلوب کے لیے چند سطور لکھیں۔

چھٹیوں میں میری بہن اپنی بیٹی اور داماد اور نواسوں کے ہمراہ آئے گی۔ جنوری میں آغا اشرف کا قدم رنجہ ہوگا۔ باقی خبریں فون پر دی جائیں گی۔

نوروز کی آمد مبارک ہو۔

مناجاتی

داؤد

پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر کو دسمبر میں دو خط لکھے ان کی نقلیں بھی بھیج رہا ہوں۔

15 November, 1997

بھائی جی، السلام علیکم!

ادبی فعالیت کا خراج تحسین مبارک ہو۔ ایوارڈ کی رسم کا حال آپ سے فون پر سنا جائے گا۔

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کا مضمون "علی گڑھ کے شب و روز" میں نے آپ کو بھیجا تھا۔ پرسوں ان کا خط مجھے آیا۔ اس میں لکھتے ہیں۔ آغا صاحب کی طرف سے مضمون کی رسید اب تک نہیں آئی۔

اب انہوں نے آپ کے نام ایک خط مجھے بھیجا ہے کہ میں اسے آپ تک پہنچا دوں۔ ایک رقعہ ان کو لکھ دیجیے ورنہ شاید وہ اس شبہ میں پڑے رہیں کہ میں نے خط آپ تک نہ پہنچایا۔

بھارت میں ان کا مرتبہ بلند ہے۔ اب علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔ کئی اداروں کی کمیٹیوں کے ممبر ہیں اور بڑی بات تو یہ ہے کہ فاضل آدمی ہیں۔ عربی میں ان کی استعداد خوب ہے۔ مولوی عبدالعزیز میمن کے شاگرد رشید ہیں۔

باقی فون پر۔

شوریدہ

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

2 June, 1998

بھائی جی، السلام علیکم!

میں کہ خاکسار ہوں ہر چند کہ پنشن خوار ہوں لیکن آج کل پھر سے ملازمت کا اُمیدوار ہوں۔ چنانچہ عرض گزار ہوں، خانہ نشینی سے اُکتا گیا ہوں۔ کلاس روم کا جویا ہوں، جز وقتی نوکری مل جائے تو گھر سے باہر نکلا کروں۔ عرضیاں تیار کرنے میں لگا رہا۔ ایک لمبی چوڑی عرضی آج مکمل ہوئی۔ اسے ٹائپ کیا۔ میں ایک انگلی سے ٹائپ کرتا ہوں یعنی انگشت شہادت سے۔ کبھی آپ کے سامنے بیٹھ کر ٹائپ کروں تو میری ٹائپنگ کی رفتار دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں۔

شکورن دھوبن والی عبارت آسانی سے مل گئی۔ اس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔

حمیدہ بیگم کے والد صاحب بھی پولیس کے آدمی تھے۔ کوتوال بھی تھے اور ناول نویس بھی۔ آزاد خیال ایسے کہ بیٹیوں کو برقعہ پوشی پر مجبور نہ کیا۔ رات اس کتاب کے پچاس ساٹھ صفحے پھر پڑھے۔

لنک میں آپ کی جو تازہ نگارشیں چھپی ہیں، ان کو پڑھنے کا مشتاق ہوں۔

برخوردار

داؤد

19 August, 1998

بھائی جی، السلام علیکم!

پہلا سوال تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔

داؤد رہبر! تو غزل گوئی سے باز آئی کہ نائی؟

میرا جواب:- میں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا ہوں:- آیم، آیم۔

دوسرا سوال اقبال کا مصرع ہے

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟

اس کا جواب ہے کہ آید، اس لیے کہ ریکارڈر موجود ہیں، آوازیں صوت بند کر لی جاتی ہیں اور سرودِ رفتہ پھر سے سنا جا سکتا ہے۔ میرے پاس بے تکلف بیٹھکوں میں بنائے ہوئے تیس چالیس ٹیپ ہیں۔ اپنی گلوکاری کبھی کبھی سنتا ہوں۔ کل ایک دوست کو بھیجنے کے لیے بعض گانوں کی کاپی بنائی تو ایک کاپی آپ کے لیے بھی بنالی۔

اسے تنہائی میں نہ سنیے گا۔ اعجاز اور بابرہ اور ڈاکٹر جمیل شام کو آپ کے پاس ہوں تو مشین لگا کر گانا سنا جائے۔

پہلا گانا ھمیر کلیان میں ہے، پنڈت ونا یک راؤ پٹوردھن سے میں نے پچاس سال پہلے سنا تھا۔ اس کی نقل میرے گلے سے سنیے۔ اس کے بول کٹر ہندی میں ہیں:-

کرن چھوں رگھو پتی گُن گاہا
لگھومتی موری چرت اَوَ گاہا

ترجمہ:- میں رگھوپتی کی حمد کرنا چاہتا ہوں۔

(اس باب میں) میری سمجھ قاصر ہے اور میرا دماغ غوطے کھا رہا ہے (یہ گانا فلوریڈا میں ٹیپ کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں)

رگھوپتی راجا رامچندر کے پردادا کا نام تھا لیکن یہ رامچندر کے باپ راجا دشرتھ اور خود رامچندر کے لیے بھی مستعمل ہے۔

ٹیپ پر کھماج بھی ہے۔ یہ برمنگھم کے جلسے میں گایا گیا۔ اس وقت میرے گلے کو آپریشن کی ضرورت تھی لیکن میں گانے سے باز نہ آیا۔

سارا ٹیپ ایک ہی نشست میں سنا گیا تو بوجھل ہو جائے گا۔ ایک شام ٹیپ کی ایک طرف سنیں اور دوسری طرف دوسری شام۔

اخبار کا وہ تراشا بھی ملا جس پر اعجاز کی تعریف ہے۔ یہ کالم محمد شان گل نے لکھا ہے۔ کالم کی عبارت میں ایک جگہ اس نے اعجاز سے اپنی قرابت جتائی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کس حساب سے، کالم زوردار ہے۔ پڑھ کر جی خوش ہوا۔

اعجاز کو فلاحت کے ساتھ ہیوسٹن جانا ہے۔ وہ اپنا ٹائم ٹیبل بتائے تو میں طیارہ کی بکنگ کراؤں۔

یہ خط اعجاز کو دکھا دیں۔

برخوردار

داؤد رہبر

14 October, 1994

بخدمت ضیاء محی الدین!

السلام اے سربراہ حلقۂ اربابِ تمثیل و تفنن

سن چکا اوروں کی تو، اب ہماری بات سن، تمہاری زبانِ حال سے یہ شعر کہا گیا

آخر انگلستان را الوداع میگویم
ساقیا نذانم من بعد ازیں چہ می جویم

انگلستان کو این گلستان بھی پڑھ سکتے ہیں، جی چاہے تو یوں پڑھو۔ تمہاری مراجعت سوئے لاہور کوئی معمولی واقعہ نہیں، جاؤ جاؤ، خوش رہو۔ تم سے مخاطب ہوتے ہوئے ہم نے ایک ایسی بحر چنی ہے جو معروف نہیں۔

تھک ہو کر مرا مضراب بھی کرتا ہے تن تن
میں بہک کر کہتا ہوں جب فاعلاتن فاعلاتن
تیری ہجرت کا خدا نے کر دیا پورا زمانہ
مستقل پردیس ہی میں ہے مگر میرا توطن
آنے کا واپس وطن کو اے ضیا بندہ بھی اک دن
آ گیا گر عقل میں اپنی بھی واپس توازن
یاد کرتے رہنا واں تم رہبرا کہہ کر مجھے بھی
[illegible] میں لوگ سب کہتے ہیں زیڈ
بعض شاخوں پر کہتی ہیں یہ دلبر سے "مجھے ٹن"
[illegible] مجھے تو لگتی ہے اے بھائی ٹن ٹن
[illegible] ان کے بیٹھا ہے وہاں اک بندوق لے کر
مجھ کو ہے درکار اے مشاطہ پھر تیرا تعاون
قافیہ گر تنگ ہو جائے تو اک تدبیر یہ ہے
[illegible] شعر میں بیگن کو لاؤ کہہ کے بیگن
اس ترنم میں نہ پڑھنا فارسی اشعار کو تم
صرف اردو کی ان غزلوں میں چلے گی ٹھیک یہ دھن

داؤد رہبر

31 October, 1994

بھائی!

ردیف کے اصلی معنے ہیں سوار دوم جو سوار بان کے پیچھے اونٹ پر بیٹھتا ہے۔ بائیسکل کے کیریر پر بیٹھنے والے کو بھی ردیف کہہ سکتے ہیں۔ اگر ساتھی کو بائیسکل کے ڈنڈے پر آگے بٹھائیں تو اسے ردیف کہنا غلط ہوگا۔

قدیم عرب شاعر ردیف رکھ کر قصیدے نہ کہتے تھے۔ ردیف غالباً المعری نے ایجاد کی۔ اس کا ردیفوں والا عربی کلام لزومیات کہلاتا ہے کہ اس میں رکھا گیا لزوم اس بات کا جو لازم نہ تھی، جیسے نماز کے آخر میں اپنی مرضی کی نفلیں ہوتی ہیں۔ ردیف والی غزل اور ردیف والے قصیدے میں سم اسی طرح آتا رہتا ہے جیسے تال میں بندھے ہوئے گانے میں۔

ردیف موسیقی کی اصطلاح بھی ہے۔ اچھا آلاپ وہ ہوگا جس میں سروں کی ردیفیں قائم کر کے آگے

KUTABKHANA OSMANIA

بڑھیں اور سماں باندھتے جائیں۔

شاعر مشرق نے اواخر عمر میں ردیفوں کے بغیر غزلیں کہنا اختیار کیا۔ ان غزلوں میں کچھ کچھ بات اذان والی ہے۔ آہنگ قدرے قلندرانہ ہے۔ اب وہ ایسے شعر کہنے سے باز آ چکے تھے

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

اب انداز یہ تھا

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

راشد غزل سے تائب ہو گئے تھے۔ توبہ توڑ کر انہوں نے ایک غزل کہی تو شراب سے نہیں ردیف سے پرہیز کیا:

ہلہ ساقیا..........

ان کی یہ غزل نہ معلوم کس مجموعے میں ہے، چاروں مجموعے میرے سامنے رکھے ہیں۔ ان میں نہیں ملی۔ اپنی یاد سے مصرع پورا کرلو۔

تم نے اپنے خط میں لکھا کہ لاہور جا رہا ہوں، اگلی نظم وہاں بھیج دو۔ لو اگلی نظم، یہ ردیف کے بغیر کہی گئی:

غزل کا یہ نہیں ہے بھائی مضموں
نمک ہانڈی میں ڈالا اس قدر کیوں
وہ پہلی گفتگو ہے یاد مجھ کو
وہ بولے کون ہے میں بولا میں ہوں
کچھ اس میں نغمگی ہم نے نہ پائی
سنی ہے ہم نے معشوقوں کی ہوں ہوں
بہت کم لوگوں کو معلوم ہے یہ
کہ اچھے شعر بھی کہتا تھا مجنوں
کہے گا کس مپری ہی میں کوئی
میں کیا ہوں کون ہوں اور کس لیے ہوں
ہے گریہ رک گیا یہ جاننے کو
صدا آئی ہے ہنسنے کی کدھر سوں
کہا اک ڈھولکی نے، حال سب کا
دگرگوں ہے دگرگوں ہے دگرگوں
تھا جنت ہی میں ممنوع یہ دانہ
یہاں تو ڈٹ کے کھایا ہم نے گیہوں

جہاں جاتا ہوں کہتا ہوں میں جی میں
میں ماروں ڈینگ یا اک ڈانگ ماروں
نہیں ہے جن کے گھر میں کوئی کرسی
وہ روٹی بیٹھ کر کھاتے ہیں اکڑوں
کہا میں نے ہی واں الحمد للہ
جب اس نے چھینک ماری کر کے آچھوں
میاں سچ بولنا ایسا ہے آساں
زمیں نیچے ہے اور اوپر ہے گردوں
ادھر بہتے ہیں گنگا اور جمنا
ادھر بہتے ہیں جیحوں اور سیحوں
مرا سر کر کے زخمی نائی بولا
کہو تو پھٹکری میں اس پہ مل دوں
خبر سن کر مرے مرنے کی ترکے
بمشکل کہہ سکا یہ مرغ ککڑوں
سنو اس قافیے کی وجہ مجھ سے
یہ میرے ذہن پر نازل ہوا یوں

کہ میں نے حال ہی میں ایک آپ بیتی کسی اہل زبان کی پڑھی۔ یہ بچارا پورب سے مہاجر ہو کر لاہور آیا۔ ایک روز دودھ دہی کی ایک دکان پر دہی لینے پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر دہی فروش نے کہا۔

اس میں پا دوں؟

اہل زبان نے آہ بھر کر کہا:-

پا دو میاں پا دو

15 December, 1994

اب کے تمہارے خط کا پیرایہ تھا کنایہ، ہم کو لبھایا

شمعِ انجمن لاہور!

بلاول ٹھاٹھ اہل یورپ کے ہاں نہ معلوم میجر ٹھاٹھ کیوں کہلاتا ہے۔ یہ ہمارے سنگیت میں وہ مقام نہیں رکھتا۔ اس ٹھاٹھ کا اپنا راگ بلاول ہے۔ اسے نہ پٹیالے والے گائیں گے نہ آگرہ والے۔ عبدالکریم خاں ہی کا حوصلہ تھا کہ اسے گا گئے۔

اس راگ میں کومل نکھاد شامل کر کے الیا بلاول بنایا گیا تو بات پیدا ہوئی۔

میجر ٹھاٹھ میں تیور نکھاد کو ہٹا کر کومل نکھاد لائیں تو کھماج ٹھاٹھ بنتا ہے اور کومل مدھم کو ہٹا کر تیور مدھم لائیں تو ایمن ٹھاٹھ قائم ہو جاتا ہے۔ تم نے بھی یہی کیا۔ اپنی زندگی میں تیور مدھم لے آئے۔ یہ ہر بت طناز کا

KUTABKHANA OSMANIA

دلپسند سُر ہے۔ اس کا رس لیموں کا رس ہے۔ بلاول راگ محض کھانڈ کا شربت ہے۔ ایمن تو سکنجبین ہے۔

"ان" کو ماروا پسند نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا مزاج اسلامی ہے۔ ماروا تو مہادیو کا نمائندہ ہے۔ آگرے والے اس کو گاتے ہی نہیں (ضمناً عرض ہے کہ تیور مدھم ماروا میں بھی لگتا ہے' خیر۔) (ماروا علی اکبر خاں اور امیر خاں کو بہت پسند ہے۔)

بھائی کسی طرح پوریا سے "ان" کی صلح کرادو۔ فیاض خاں صاحب پوریا ڈٹ کر گاتے تھے اور اسے گا کر پوریاں کھاتے تھے' ڈٹ کر۔ میری کتاب "سُریلی باتیں" کی کتابت کرتے ہوئے کاتب نے ایک لطیفہ آفرین غلطی کی۔ جملہ یہ تھا "تایا ابا نے مجھ سے پوریا کلیان سنا۔" کاتب صاحب نے یوں لکھ دیا۔ "مجھ سے پورا کلیان سنا۔"

شمالی ہند کے اہلِ فن ضد کرتے ہیں اور کہتے ہیں، بلا استثنیٰ ہر راگ کا ایک وادی سُر ہونا چاہیے۔ کرناٹک والے ایسی پابندی سے آزاد ہیں۔ چنانچہ کرناٹک کے سنگیت سے جب راگ ہنس دھنی ہمارے ہاں لایا گیا تو سوال پیدا ہوا کہ وادی کس سُر کو بنائیں۔ ہنس دھنی دھونس کی زد میں آ گیا۔ امیر خاں صاحب نے اسے گایا تو نکھاد کو بہت نمایاں کیا۔ اس سے اس راگ کی شوخی جاتی رہی۔ روشن آرا نے اسے گایا تو پنچم کو نیچ بنایا، اس سے تابانی آئی۔ مجھے تو یہ برتاؤ بہتر لگا۔

میں نے شمالی ہند کے سنگیت میں دو راگ ایسے پائے کہ ان کو بخوبی ادا کرنے کی کسی کو سُر کا وادی بنانا ضروری نہیں۔ ایک باگیشری اور ایک شام کلیان، اہلِ فن یہ رائے سن کر چڑیں گے، چڑتے رہیں۔ خدا نے ہم کو پیدا کیا چڑانے کے لیے۔ ہم نے یہ فرض ادا کیا یا نہیں؟ ہماری طاعت نرالی ہے۔ یہ ہے از راہِ دخل در نا معقولات یعنی' کرنا الٹی بات' نہیں ہو رہی ملاقات۔ یہی سوچ ہے دن رات۔

وہ دیہاتی مسافر موڈل ٹاؤن بس کا تمہیں یاد ہے یا نہیں؟ جو دوسرے مسافروں کو اپنے اپنے سٹاپوں پر پے در پے اترتے دیکھ کر بول اٹھا تھا "اوئے مینوں وی کدھرے لاہنا جے کہ نئیں؟"

"ان" کو اور احباب کو سلام، بوبی کو پیار۔ ان کو بتادو کہ C.V ان کو دو ایک روز میں بھیج دیا جائے گا۔

12 November, 1999

شاہ جی!

طبلہ نواز سنگی ششی نایک سگریٹ بہت پیتا تھا۔ آٹھ سال ہوئے پچاس سال گرم و سرد چکھ کر سرگباشی ہو گیا۔

بوسٹن سے باہر کسی بستی میں دُرگا پوجا کی تقریب تھی۔ یہ مجھے وہاں لے گیا۔ انتظام سری رام کرشن مٹھ کی طرف سے تھا۔ اس مٹھ کی شاخیں بھارت ہی میں نہیں یورپ اور امریکہ میں بھی ہیں۔ بھارت سے اُڑ کر سوامی لوگ ان شاخوں پر آ بیٹھتے ہیں۔

دُرگا پوجا کے پروگرام میں جاپ اور اُپدیش کے لیے اس روز ایک سوامی جی لندن سے آئے ہوئے تھے اور ایک نیویارک سے۔ نیویارک والے سوامی جی دُبلے تھے۔ لندن والے تنومند، رگ وید کا پاٹھ لندن والے سوامی جی نے کیا۔

KUTABKHANA OSMANIA

بھجن اور اُپدیش ہو چکے تو بھوجن کا وقت آیا۔ یکا یک دُبلے سوامی نے موٹے سوامی کی طرف بڑھ کر کہا۔ I am a devotee of the Mother, you know! مطلب یہ تھا یاد رہے کہ میں (مہادیو کا نہیں) کالی مائی کا بندہ ہوں (دُرگا کالی دیوی ہی کا ایک روپ ہے)

یہ جملہ جس لہجے میں بولا گیا، اس سے میں نے قیاس کیا کہ لندن والے تنومند سوامی جی کالی دیوی کے نہیں مہادیو کے نام لیوا تھے۔

اِشتادیوتا اور اِشتادیوی کی اس سہولت کے کیا کہنے۔ اِشتا ہی کا دوسرا تلفظ ہے اچھا۔ اِشتادیوتا یعنی اپنی اچھا، اپنی پسند کا دیوتا۔

بھائی اشتہا نہیں، اِشتا، اِشتا کا رشتہ کل رات میں کافی کی اشتہا لے کر ڈنکن ڈونٹ کی دکان میں جا بیٹھا۔ احمد آباد کا ایک گجراتی خاندان اس دکان کو چلا رہا ہے۔ میں نے گجراتی نوجوان سے پوچھا، کئی ذائقوں کے ڈونٹ بنانے کی ترکیبیں سیکھنے میں تمہیں کتنا وقت لگا۔ اس نے کہا، بیکری کے بڑے کارخانے سے سادہ ڈونٹ بنے بنائے ایک ٹرک پر یہاں آتے ہیں، انہیں چاکلیٹ اور شہد میں ڈبونے کا کام ہم یہاں کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی مغز ماری نہیں، آسان کام ہے۔ گفتگو جاری رہی تو مغز ماری کا لفظ بار بار اس کی زبان پر آیا، ہائے ری مغز ماری۔

پندرہ سال ہوئے میں نے تم سے کہا تھا کہ ۳۱ دسمبر والے کسی جلسہ قرأت میں ولی دکنی کا ریختہ اور چوسر کا انگریزی کلام اوپر تلے پڑھ کر سناؤ۔ اگر اب تک ایسا نہیں کیا تو اب کی بار یہ بھی ہو جائے، کیوں نہ ہو جائے۔ کھماج کی ٹھمریاں تو بہت ہیں۔ اس کے خیال نادر ہیں۔ ایک خیال بندے نے باندھا ہے، اس کے بول سنو۔

آستھائی:۔ جیتے رہو سیاں، ہاں ہاں، جیو جیو
جیتے رہو جی
پیت کی مدھ، ہاں، پیتے رہو سیاں
ہاں ہاں، پیو پیو، پیتے رہو جی۔

انترہ:۔ سب سکھ پاؤ جیون کے
لاکھ دلوں پر راج کرو جی۔

میں نے ستار نواز جمال الدین بھارتیہ کو یہ خیال سنایا تو انہوں نے کہا، یہ چیز مہاراجوں کے آگے گانے کے لائق ہے۔ اب بتاؤ ہم جمہوریت کا بول بالا کیوں کریں؟

تمہارا گھر راگ ایمن کا گھر ہے یعنی ایمن آباد ہے، عذرا کو دُعائے تندرستی، جیتے رہو سیاں

بندہ
اپنے ہی مزار کا مجاور

23 March, 2001

یار!

اعجاز کو جب بھی فون کرتا ہوں، وہ پوچھتا ہے "ضیاء کی کوئی خبر؟" لو اور سنو! تمہارا اصولت کدہ

لاہور میں، اعجاز کا دولت کدہ لاہور میں، میرا خلوت کدہ کہیں اور میں، میں ضیاء کا خبر رساں کس بنا پر سمجھا جاؤں۔ اعجاز کو تمہاری خبر کیا سناؤں تم یہاں آؤ تو چہچہاؤں یا کروں میاؤں میاؤں یا کاؤں کاؤں یعنی کائیں کائیں۔

نظیر اکبر آبادی کے کلیات کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں لاہور سے نکلا تھا۔ وجیہہ نے اس کا ایک نسخہ مجھے ہدیۃً بھیجا ہے۔ کراچی میں فضلی بک مارکیٹ ٹمپل روڈ پر ہے۔ وہاں سے تم بھی یہ کلیات خرید سکتے ہو۔ اس میں تمہیں اپنی قرأت کے لیے چیزیں ملیں گی۔ جیسے انشاء کی دریائے لطافت میں ملی تھیں۔

اکثر تمہارا قیام کراچی میں رہتا ہے۔ کبھی وجیہہ سے ملو، راشد صاحب شاعروں کا شاعر کہلائے۔ وجیہہ رندوں کا رند ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ حافظ اساطیر یونان و ہند ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح واقفِ منطق چرند و پرند ہے۔ واللہ اس وقت ہمارے دیس میں ایسا وسیع النظر اور نکتہ ور آدمی اور کوئی نہیں۔ مطالعہ اس کا بے اندازہ ہے اور حافظہ کمال کا۔ اسے متقاعد (ریٹائرڈ) ہوئے بارہ چودہ برس ہو گئے ہیں۔ خلوت میں اس نے سوائے کتب بینی کے اور کچھ نہیں کیا۔ قصص الانبیاء علیہم السلام اور حکایات اولیاء قدس اللہ اسرارھم پڑھ کر ان پر غور کیا۔ اخوان الصفاء اور اخوان الشیاطین، حضرات اور خواتین، میٹھا اور نمکین، موٹا اور مہین، کبوتر اور شاہین، پھکڑ باز اور متین، جان صاحب اور چرکین، متدین اور بے دین، آن اور این، یعنی سب مضمونوں سے اس کی دلچسپی یکساں ہے۔

اس سے ملو تو وہ تمہیں دیگر ایسے نوادرات کا پتہ دے گا جن کی تمہیں تلاش رہتی ہے۔ مثلاً جعفر زٹلی کا کلام۔

نظیر اکبر آبادی کے کلیات کا پارسل پرسوں موصول ہوا۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے تمہیں یاد کیا۔

عذرا کو سلام، صبیبہ کو پیار، صبیبہ عربی میں دختر کو کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا استعمال میں نے میرزا غالب سے سیکھا۔

خواہانِ خیر و خبر

10 May, 2001

ہمدمِ دیرینہ!

کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟ تمہاری خطاطی نظر نواز ہوئی۔ ''نوادرات'' کا لطیفہ اعجاز سے سن چکا ہوں۔ پنجاب کے دیہاتی مطلب کو مطبل بولتے ہیں، مطلب وہی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں قلفی دراصل قفلی تھی، منہ میٹھا کرنے کو قفل سے قلفی ہو کر نکلی۔

عزیز مکرم نوید ریاض سے خبر ملی کہ تمہارا زیادہ قیام کراچی میں رہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وجیہہ سے تمہاری دوری افسوسناک ہے۔ اس کا پتہ اس خط کے آخر میں لکھ دوں گا۔ تمہارے آنے سے اس کا جی بہلے گا۔ اس کے دوست شکایت کرتے ہیں کہ یہ کسی سے ملتا نہیں، یہ شکایت بے جا ہے۔ وہ ضعیف ہے اور معذور ہے۔

آج کل یہ تغزل پر ایک رسالہ لکھنے میں مشغول ہے۔ اس کی بصارت اب حد سے زیادہ دھندلا گئی ہے لیکن اس کی بصیرت کا اُجالا روز افزوں ہے۔ اس سے مل کر مجھے خط لکھو اور بتاؤ اس سے کیا باتیں ہوئیں۔

تمہاری انگریزی کالم نگاری جاری ہے یا نہیں؟ انگلستان میں ٹیلی ویژن سے تمہارا جو تعلق رہا، اس کی حکایات لکھو، لفاظی سے بچ کر سادہ اسلوب میں لکھو، تمہاری پڑھنت کے ریکارڈ برسوں سنے جائیں گے لیکن جو حکایات لکھو گے، صدیوں پڑھی جائیں گی۔ یہ کام ملتوی نہ کرو ؏

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر

تایا ابا پر جو کالم تم نے لکھا، اس کا تراشا مجھ تک نہ پہنچا۔ میں نے اپنے ابا کی سوانح عمری (بزبان انگریزی) کا ایک خاکہ سوچا ہے۔ مدتوں سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ حافظِ قرآن ضرور تھے لیکن مولویت سے دور تھے۔ ان کا محبوب شاعر خیام تھا۔ یہی ان کا اسلام تھا۔ ان کا تعیش لذیذ غذا تک محدود تھا۔ غیرتی بھی تھے اور حیرتی بھی۔ خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن عمر بھر فارسی شاعری کا شربت رغبت سے نوش فرماتے رہے۔ اپنے مذہب کا اظہار اپنے الفاظ میں نہ فرماتے تھے۔ کبھی کبھی جو پسندیدہ اشعار ان کی زبان پر آتے تھے، انہی سے ان کی طبیعت کی کیمسٹری کا پتہ ملتا تھا۔ تصوف اور تغزل پر ایک شافی تمہید لکھ لوں تو ان کی سیرت پر قلم اٹھاؤں۔ وجیہہ نے تغزل کو ٹھیک سمجھا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ تغزل تین چیزوں سے مرکب ہے:۔ تصوف، تشرب اور تعشق۔ امیر خسرو کے بارے میں کسی استفسار کو جو خط تم نے مجھے لکھا، مجھے نہیں ملا۔ تمہارا خط مجھے ملے اور میں جواب نہ لکھوں، یہ انہونی بات ہے۔

کل میں دکان میں ترکاری خریدنے پہنچا۔ وہاں ترکاریوں کے ڈھیروں کے پاس کھڑا خود کلامی کر رہا تھا۔ میری زبان سے نکلا ہائے ہائے۔ ایک امریکی پاس کھڑا تھا، وہ سمجھا کہ میں نے اسے ہائے (Hi, Hi) یعنی ہیلو کہا۔ چنانچہ جواباً اس نے بھی کہا ہائے ہائے (Hi)

عذرا کو سلام اور دعا، عالیہ کو دعا ہی دعا۔

ایں جانب

7 June, 2001

شاہ جی، کئی راگنیوں کی ایجاد امیر خسرو سے منسوب ہے۔ تم نے اپنے خط میں بہار کا ذکر نہ کیا۔ یہ راگنی بھی ان کی ایجاد مانی گئی ہے۔ اہلِ فن کہتے ہیں یہ راگنی آمیختہ ہے۔ باگیشری، ملہار اور اڈانا سے۔ بہار کا موسم دیر پا نہیں ہوتا۔ پس بہار راگنی بلمپت کے کام کی نہیں۔ درت میں بھی اس کی طوالت سے اکتاہٹ ہوتی ہے۔ پروگرام میں اس راگنی کو شامل کرنے سے فائدہ یہ ہوگا کہ اس کے ضمن میں بھیروں بہار، باگیشری بہار اور شاہانہ بہار کی بات بھی ہو سکے گی۔ بہار کا ایک مشہور خیال بھی امیر خسرو سے منسوب ہے

حجرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال/ پیش خواجہ تم بن ٹھن آئے/ حجرت رسول صاحب جمال/
انترہ:- عرب یار تیرو بسنت منائیو/ سدا رکھیو لال گلال/

راگ یمن کو ہندوستانی سنگیت میں جگہ دینا بھی امیر خسرو سے منسوب ہے۔ ستار کے موجد وہی مانے گئے ہیں لیکن بھائی ستار کی جو صنع ساخت اب ہے، وہ اس زمانے میں کہاں ہوگی! طربوں (Sympathetic Strings) کا اتنا تعدد اس قدیم ستار میں کہاں ہوگا! ہمارے زمانے کی ستار تو تاج محل کی بہن لگتی ہے۔ اس کی

KUTABKHANA OSMANIA

رین کٹی تارے گن گن — دن گنے پتّا پتّا
لوٹ نہیں آئے موہن — بات تکوں جمنا تٹ کا
چھوڑیں گے وہ آ کر کس دن — بیٹھی ہوں میں لے کر مٹکا

خطا کار

1st August, 1996

وجیہہ، دونوں ہاتھوں سے سلام!

تم نے تین بار بے قراری سے فون کر کے مجھے نصیحت کی کہ ہجرت کا دوام اچھا نہیں، واپس آ جاؤ۔

بھائی مراجعت آسان نہیں۔ یہ مکے مدینے والی بات نہیں، مکہ سے مدینہ صرف دو سو میل دور ہے۔ عربی دونوں شہروں میں بولی جاتی ہے۔

میں نے ہجرت کہاں کی، میں نے تو بابا آدم اور اماں حوا کی تقلید میں سقوط کیا۔ سقوط کے بعد اوپر جانا کیسے ہو۔

این سعادت بزور بازو نیست

کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔

میری مستقل مراجعت ناممکن کیوں ہے، کراچی آ کر بتاؤں گا۔ ۱۵۔ نومبر کو ان شاء اللہ لاہور پہنچوں گا۔ دو ہفتے وہاں ٹھہر کر دسمبر کے شروع میں تین روز کے لیے کراچی آؤں گا اور تم سے ملوں گا۔

نیویارک کے ہوٹل والی رات یاد آ رہی ہے۔ جب ہوٹل کے کمرے میں آدھی رات کو طبلچی آیا تھا اور گانا ہوا تھا، پھر رات کے آخری پہر تان زنیا کے باشندوں کے گھر جا کر موم بتیوں کی روشنی میں تم نے تان زنی کی فرمائش کی تھی اور میں نے راگ للت کا آلاپ کر کے دو شلوار پوش مشٹنڈوں کو بھگا دیا تھا۔

ہم سفر

داؤد

17 February, 1997

وجیہہ!

پیری مریدی کا ایک بڑا فایدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پیر کے ارشادات ملفوظات بن جاتے ہیں اور مرید انہیں جمع کر کے شائع کرتے ہیں۔ جو پیر نہیں ہوتا اپنے ملفوظات بچارا خود ہی لکھتا رہتا ہے۔ اس نوع کے ملفوظات میں وہ بات کہاں!

''نیا دور'' کے ایک خاص شمارے میں میرے اپنے لکھے ہوئے ''ملفوظات'' کلچر کے روحانی عناصر کے عنوان سے چھپے تھے۔ (۱۹۹۲ء میں یا ۱۹۹۳ء میں) کراچی کی لائبریریوں میں یہ شمارہ ضرور ہوگا۔ اب یہی نگارش کتابی شکل میں لاہور سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کا مقدمہ میں نے لکھ کر اعجاز کو بھیج دیا ہے۔ مقدمہ کی فوٹو کاپی تمہیں بھیج رہا ہوں۔ آج تمہاری بہن کو ایک خط لکھا، اس کی فوٹو کاپی بھی ملفوف ہے۔

انجمن ترقی اردو اب بابائے اردو روڈ پر نہیں۔ گلشن اقبال کو منتقل ہو گئی ہے۔ وہاں آدمی بھیج کر

پیدائش شاہجہاں کے عہد میں ہوئی ہوگی۔

اور میراثیوں نے یہ گپ بھی ماردی کہ طبلہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ درت خیال محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں ایجاد ہوا۔ چنانچہ وجدان کہتا ہے کہ اس کی سنگت کے لیے اونچے اور کرارے سُر کا طبل یعنی طبلہ اسی عہد میں ایجاد ہوا۔

بھارت کا اصل ساز سارنگی ہے جس کی آواز بہتی ہوئی گنگا ہے۔ مضراب سے بجنے والے یعنی تن تن والے ساز ریگستانی مزاج رکھتے ہیں۔ ریت کے ذرّوں کے رقص والا مزاج۔ ترانہ پروگرام میں ضرور آنا چاہیے۔ بھائی لال کے فرزند غلام حسین شگن کو اچھے ترانے یاد ہیں۔ امیر خسرو کی ایک فارسی غزل کی ردیف ہے تنانا یا ہو۔ اسے بھی دیکھیے۔ ان کی نثری کتاب اعجاز خسروی میں موسیقی پر ایک باب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھیج رہا ہوں۔ اگر جلد چاہیے تو دربار ملی لائبریری سے لے کر اس میں دیکھیے۔ دربار ملی کے مرتب دو ہیں۔ شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی۔

عزیز مکرم نوید کو اداس نہ رہنے دو، انہیں بہلاؤ۔ جمعرات کا گداگر (آج جمعرات ہے)

31 October, 2001

بھائی صاحب!

بے استاد ہونے کے باعث طفلی کے زمانے میں درت اکتالے کی شکل مجھے یوں لگی تھی:۔

دھاگے ترکٹ دھن نادھن دھن
دھاگے ترکٹ تن ناکت تا

اہلِ فن کی صحبت میسر آئی تو اپنی غلطی سے آگاہی ہوئی۔ درت اکتالے کا درست ٹھیکا معلوم ہوا:۔

دھن دھن دھاگے ترکٹ تن نا
کت تا دھاگے ترکٹ دھن نا

بول دھن سے شروع ہوتے ہیں اور اسی پر سم ہے۔

اپنی غلطی سے واقف ہونے سے پہلے بندے نے ایک قطعہ لکھا تھا۔ آج سے دس سال پہلے کاغذوں کے ایک ڈھیر سے برآمد ہوا۔ میں نے تمہیں بھیجنے کے لیے محفوظ کیا لیکن دراز ہی میں پڑا رہا۔ اب پھر اس پر نظر پڑی تو ارادہ پورا کرنے کی توفیق ہوئی۔

اسے پڑھنے میں ماتروں کے حساب پر تھوڑا سا غور لازم ہوگا۔ مثلاً ''چھوڑیں گے وہ'' اس کو تیزی سے چار چھوٹے ماترے بنا کر پڑھیے کہ ان میں اتنا ہی وقت لگے جتنا ''رگھوپتی'' کہنے میں لگا۔ ''بیٹھی ہوں میں'' بھی اسی طرح پڑھیے۔

ٹھیکا درت اکتالہ (بزبانِ ہندی):

کرے ہے جو مکھی بھن بھن — کرے ہے جو بھوں بھوں کتا
کوئی نہیں ان کا ساجن — کوئی نہیں ان کی سنتا
رگھوپتی راجا تم بن — بھول گئی ہنسا سیتا

KUTABKHANA OSMANIA

رسالہ ''اردو'' کے وہ دو شمارے منگوا لو جن میں میرے داغ والے مضمون کی دو قسطیں چھپی ہیں۔ دونوں شمارے آدمی بھیجنے سے پہلے آفتاب احمد خاں کو (کہ اب وہ صدر انجمن ہیں) فون کر دو تو بہتر ہے۔

یہ کہاوت مجھے بہت پسند ہے:- گندہ بروزہ
اگرچہ گندہ مگر ایجادِ بندہ

بندہ

23 June, 1997

شاہ دل وجیہہ!

مجھے شاباش اپنی نثر پر سب سے پہلے مولانا سے ملی اور نظم پر تم سے۔ تم کو میری غزلیں اچھی لگیں، اب نقاد لوگ کچھ بھی کہیں، تمہاری داد مجھے کافی ہے۔ میں نے مشاعرے لاہور میں نہیں پڑھے۔ بوسٹن میں مسندِ مشاعرہ پر چار بار بٹھایا گیا، دو مشاعروں میں تحت اللفظ پڑھا۔ پھر ایک میں اپنے ترنم کو آزمایا۔ چوتھے مشاعرے کی صدارت مجھ سے کرائی گئی۔ میرے پڑھنے کی باری آئی تو میں نے سامعین سے کہا، میں نہ غزل پڑھوں گا نہ نظم۔ میں نے راگوں میں خیال کے بول بنائے ہیں۔ اچھے بول کسی بحر میں نہیں ہوتے، یہ بول بانٹ کے حساب سے کسی تال میں باندھے جاتے ہیں۔ میں نے مالکوس کے خیال کے بول تین تال میں باندھے ہیں۔ سنیے

آستھائی: کوئی نہ جانے کیا اس پار
جگت گورو جی
بتیاں بناو وہو کاہے کو

انترہ: انگل تیر سب چلاویں
ہائے رے گمان تیری کمان

یہ کہہ کر میں نے تختے پر تال دے کر مالکوس کا خیال گا دیا۔ کچھ نہ پوچھو سامعین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ منتظمین البتہ ناراض ہوئے۔ مشاعرہ ہو چکا تو انہوں نے مجھ سے کہا یہ آپ نے کیا کیا۔ مشاعرے کے آداب ایسی حرکت کی اجازت نہیں دیتے۔ میں نے جواب دیا، حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی روح میری اس حرکت سے ضرور خوش ہوئی ہوگی۔

میں تین جلدیں اپنی غزلوں کی تمہارے پاس چھوڑ آیا تھا:-

۱۔ ہنگامہ ہائے خلوت (بوسٹن میں کہی ہوئی غزلیں اور قطعات)
۲۔ نئے دکن کا ریختہ (حصہ اول)
۳۔ نئے دکن کا ریختہ (حصہ دوم)

فون پر تم نے جو اظہار کیے، ان سے متفق ہو کر ان کا خلاصہ لکھتا ہوں:-

(۱) کراچی ہی کے کسی مطبعہ سے طباعت کرائی جائے، سنگ میل والوں کو اس معاملہ میں ڈالنا قرینِ مصلحت نہیں۔

(۲) صرف نئے دکن کا ریختہ (حصہ اول) کے سو نسخے چھپوائے جائیں۔ تیس نسخے دوستوں میں بانٹ

دینے کو کافی ہوں گے۔ ستر نسخے کراچی اور لاہور کے کتب فروشوں کے ہاں فروخت کے لیے رکھوا دیے جائیں۔ قیمت کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ ان شاء اللہ یہ ستر نسخے جلد بک جائیں گے۔ البتہ جلدیں ایسی نظر نواز ہونی چاہئیں کہ شیلف پر دیگر کتابوں کے درمیان پڑی ہوں تو گاہکوں کی نظر ان پر پڑے۔

(۳) طباعت میرے مسودے کی فوٹو کاپی سے ٹھیک رہے گی۔ کتابت اور کمپوزنگ اور پروف خوانی کے جھمیلے سے بچ کر رہنے میں عافیت ہے۔

(۴) آزما کر دیکھنا ہوگا کہ کیسا کاغذ فوٹو کاپی کے لیے مناسب ہے۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ چھاپا ہر ورق کے دونوں طرف ہوگا۔ ایک طرف کی چھپائی دوسری طرف سے جھانک رہی ہو تو الجھاؤ ہوگا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، نئے دکن کا ریختہ (حصہ اول) کے صفحے تقریباً ڈھائی سو ہیں، چھاپا کاغذ کے دونوں طرف ہوگا تو ضخامت آدھی رہ جائے گی۔

(۵) ایک صفحے کی تقریظ (پیش لفظ) لکھ دو اور اس کی کتابت کرا کر شامل کرو۔ مولانا نے نسخہ ہائے وفا کو اپنی تقریظ کے ساتھ چھپوایا تھا۔ غزلوں کی تقریظ تم لکھو اور میرا جی خوش کرو۔

معزّ کو میرا سلام، طباعت کے امور سے انہیں آگاہ رکھو۔

ہوائی ڈاک آج کل دو ہفتوں میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پہنچتی ہے۔ یہ خط تمہیں مل چکے گا تو فون کروں گا۔

شکر ہے کہ ع
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔

داؤد

31 October, 1997

خاطر دار وجیہہ!

سویرے اُٹھ کر میں نے فہرست تیار کی۔ لاہور کے صاحبان یہ ہیں:-

اعجاز حسین بٹالوی، ضیاء محی الدین، نوید ریاض، پروفیسر آفتاب اصغر، پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر، پروفیسر مظفر غفار، انتظار حسین، حیات احمد خاں، غزالہ عرفان، خالد احمد، سہیل صفدر، معز الدین احمد، چودھری نیاز احمد (مالک مکتبہ سنگ میل) سعید شیخ، ڈاکٹر جاوید اقبال، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، جیلانی کامران، نصیر الدین شیخ (تعداد ۱۹)

مقیمانِ کراچی میں سے یہ ہیں:-

آفتاب احمد خاں (صدر انجمن ترقی اردو) ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، مبین میرزا، جمال پانی پتی، محمد ایوب، حمید نسیم (تعداد ۹)

اسلام آباد کے ساکن:- ضیاء جالندھری، افتخار عارف، ڈاکٹر آفتاب احمد خاں (۳)

19+9+3=31

KUTABKHANA OSMANIA

یہ تو پاکستان کے ہوئے۔ ان میں سے سب کے پتے میرے پاس نہیں ہیں۔ سولہ کے پتے مجھے معلوم ہیں۔ یہ پتے ٹائپ کر کے کل یا پرسوں بھیج دوں گا اور جن صاحبوں کے پتے مجھے معلوم نہیں ان تک کتاب پہنچانے کی تدبیر یہی ہو سکتی ہے کہ دوستوں کی معرفت بطور ہدیہ دستی روانہ کیے جائیں۔ اس پر فون پر گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ

امریکہ میں میرے تین دوست، ہندوستان میں چار اور لندن میں دو ایسے ہیں کہ انہیں ادب نواز کہہ سکتے ہیں۔ ان تک پہنچانے کا انتظام میں کسی نہ کسی طرح کر دوں گا۔ ان کی فہرست یہ ہے:-

امریکہ: ڈاکٹر نعمان الحق، ڈاکٹر آغا اشرف علی، پروفیسر چودھری محمد نعیم

بھارت: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بیگم عابدہ احمد، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر مختارالدین احمد

لندن: ایوب اولیاء، اُستاد محمود میرزا۔

پیش لفظ کی عبارت لکھ ڈالو۔ خود لکھنے کے خیال سے گھبراہٹ ہوتی ہے تو کسی کو املا لکھا دو۔ میں اپنے بھائی ایوب کو فون کروں گا۔ وہ تمہارے گھر آ کر چند منٹ بیٹھے تو املا ہو جائے۔ مطبعہ کے لوگ اس کو کمپوز کر کے ایوب کو دکھائیں۔ وہ پروف خوانی کر دے گا۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ کتاب تمہارے پیش لفظ کے ساتھ چھپے۔

کل یا پرسوں ٹائپ کیے ہوئے پتے پر ڈاک میں ڈال دوں گا۔

منت پذیر

داؤد

3 November, 1997

صاحب دل وجیہہ!

فون کی گفتگو سے خوشخبری ملی کہ تمہاری دیا سے پچاس نسخے میری غزلوں کے (نئے دکن کا ریختہ، حصۂ اوّل کے) چھپوائے جائیں گے۔ مجھ پر تمہاری مہربانی موروثی ہے۔

پاکستانی ادب نوازوں کی فہرست حاضر ہے۔ سکانِ لاہور، مقیمانِ کراچی، اعیانِ اسلام آباد اور مہاجرانِ جابجا سب اس میں شامل ہیں۔

صرف چار ان میں سے ایسے ہیں جن کے پتے مجھے معلوم نہیں لیکن ان کے پتے دریافت کرنا مشکل نہ ہوگا۔ مجلد نسخے جب تیار ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے اندر ان کا بانٹنا مقدم ہوگا اور سرحد پار اور سمندر پار موخر۔ لندن اور بھارت والے پتے دریافت کر کے لکھ بھیجوں گا۔ امریکہ میں صرف چار نسخے دوستوں کو بہ ہدیہ پیش کرنے کا خواہشمند ہوں۔ چار نسخے۔ ان کے لیے اور ایک نسخہ اپنے لیے منگاؤں گا۔ میرا برادر ایوب ان کا پارسل بنا کر مجھے بھیج دے گا۔

لاہور، کراچی اور اسلام آباد کے مہربانوں کو نسخے اگر ڈاک سے بغیر رجسٹری کے بھیجے گئے تو گویا اللہ کے حوالے ہوئے یا تو پہنچ گئے یا رہزنوں نے لوٹ لیے۔ اتنے پارسل بنانے کے جھمیلے میں پڑیں ہی کیوں؟ میری رائے ہے کہ ان نسخوں کی تقسیم دستی ہو۔ بس ایک ہی بڑا پارسل سولہ یا سترہ نسخوں کا بنوا کر رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے کسی معتبر دوست یا عزیز کو لاہور بھیج دیا جائے۔ وہاں نسخوں کی تقسیم دستی ہو تو بہتر۔

تم نے ازراہ دلنوازی ایسے چاؤ سے کتاب چھپوائی تو اس کو بحفاظت دوستوں تک پہنچانے کے انتظام

میں انتہائی احتیاط لازم ہے۔ اس بارے میں اعجاز سے مشورہ کر لینا، وہ بے حد مصروف آدمی ہے۔ سارا کام اس پر نہ ڈالا جائے۔ نوید ریاض اور صبیحہ کا بھائی خالد غیاث، یہ دونوں اعجاز کے معاونین بنیں تو بخوبی سرانجام ہو۔

ہم سفر

داؤد

9 February, 1999

وجیہہ!

صبیحہ سے ٹورانٹو میں ملا تو اس نے کہا، وجیہہ نے اب کراچی میں ایک بہت ہی کشادہ گھر خریدا ہے۔ مبارک ہو۔ تم نے فون کر کے اس نئے مسکن کا پتہ مجھے لکھایا۔ خدا کرے، میں نے ٹھیک سنا اور ٹھیک لکھا ہو۔ اسی پتے پر تم کو غزلیات کا حصہ سوم بھیج رہا ہوں۔

سوچ رہا ہوں کہ پورے مجموعہ کی اشاعت کے لیے لاہور کے کسی ناشر کو راضی کروں۔ عزیزم نوید ریاض سے بات کروں گا۔ دیکھو کیا صورت نکلتی ہے۔ طباعت کے مصارف کا نصف ناشر کی طرف سے ہو اور آدھا میری طرف سے تو ممکن ہے ناشر راضی ہو جائے۔

تم سے ایک گزارش ہے۔ پورے مجموعے کی اشاعت کے لیے ایک تقریظ عطا کرو۔ میں جانتا ہوں کہ لکھنے کے خیال سے تمہیں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میری تجویز مانو، میرا برادر محمد ایوب کراچی میں رہتا ہے۔ اس کو فون کر دو اور اس سے ملاقات کا وقت اور مقام مقرر کر لو، تقریظ میں کیا کہا جائے، ملاقات سے پہلے سوچ رکھو بلکہ کچھ نوٹ تیار کر رکھو۔ ایوب کو پاس بٹھا کر تم بولتے جاؤ اور وہ املا لکھتا جائے۔ یہ ترکیب آسان ہے۔

میں نے یہ گزارش پہلے بھی کی تھی، تم نے سن کر کہا تھا ''دیباچہ میں کیا لکھوں، مجھے کوئی جانتا نہیں۔'' یہ عذر میں قبول نہ کروں گا۔ ہمارے بہت سے ادب نواز دوست تمہیں جانتے اور مانتے ہیں۔

ٹالنا نہیں، اس مجموعے کی اشاعت مجھے تمہاری تقریظ کے بغیر منظور نہیں۔ میں اپنے اس خط کی فوٹو کاپی ایوب کو بھیج رہا ہوں۔ اس کا فون نمبر 2216-455 ہے۔ تمہارا فون نمبر اس کو بتا دوں گا۔

اُمیدوار جود

داؤد

24 February, 1999

وجیہہ!

فون کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ تم تقریظ (دیباچہ) میں یادیں بھی لاؤ گے، ہمارے احاطے کا رہٹ تم کو جھٹ یاد آیا اور بھائی رفیق خوب یاد آئے۔ دیکھیں تمہاری یاد اور کہاں کہاں پہنچتی ہے۔ تمہاری شادی کے روز میں تمہارے گھر آیا تھا۔ یہ بھی تمہیں یاد ہے کہ نہیں؟

اُمید ہے صرف یادیں ہی نہ لکھو گے، غزلوں کی داد بھی لکھو گے۔ (داد سے دادیں اسی طرح جمع ہے جیسے لسّی سے لسیاں)

مبصر بن کر بھی کچھ ضرور لکھنا یعنی ان سوالوں کے جواب:- ان غزلوں سے غزل گو کے مزاج کی کوئی خبر

KUTABKHANA OSMANIA

ملی؟ اور ملی تو کیا ملی؟ دوسرا سوال:- ان غزلوں میں پرانے انداز کی باتیں کونسی ہیں اور نئے انداز کی کونسی؟

اور جو جی میں آئے لکھو، تھوڑی سی تحلیلِ نفسی بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔

ایوب کو تم نے فون کر دیا ہوگا، مولانا نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔ ''صبیحہ ایوب اور داؤد کے نام کبھی الگ الگ نہیں لے گی۔ کہے گی میں ایوب داؤد کے گھر جا رہی ہوں یا پھر کہے گی میں ایوب داؤد کے گھر سے آ رہی ہوں۔''

عطیہ کو میرا سلام۔

عدم سے بھی پرے

داؤد

15 April, 1999

وجیہہ!

لندن کا اُردو مرکز مرحوم ہو چکا۔ یہ مرکز الطاف گوہر نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں گوہر نے چاہا کہ میں وہاں آ کر کوئی لیکچر دوں۔ میں نے لیکچر میرزا داغ کی سیرت پر دیا۔ واپس آ کر میں نے داغ کے چاروں دیوان مزے لے کر پڑھے اور ایک طویل مقالہ لکھا۔ انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''اردو'' میں یہ چھپ گیا۔ (قسط اوّل شمارہ جنوری ۱۹۹۳ء۔ قسط دوم غالباً شمارہ ۱۹۹۴ء) آدمی بھیج کر انجمن سے منگا لو۔

فلوریڈا میں جو غزلیں میں نے کہیں داغ کے کلام سے متاثر ہو کر کہیں۔

داغ کے دیوانوں میں حمد اور نعت کو پڑھیں تو ایک دم محسوس ہوتا ہے کہ یہ حمد گو اور نعت گو اصلاً غزل گو ہی ہے۔ داغ کی مثنوی فریادِ داغ کا محاورہ سراسر غزلیہ ہے۔ اس مثنوی کو غزلِ مسلسل کہیں تو بے جا نہیں۔

امیر خسرو کی مثنویوں میں بھی غزلوں کے پیوند ملتے ہیں۔ اس ملاوٹ سے کلام میں نرمی آئی ہے۔

میرا بزمنامہ ایک نیا تجربہ ہے۔ اس میں ترکیب بند کہتے ہوئے جہاں یکا یک کوئی غزل آئی ہے، آمد سے آئی ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بزم اور غزل کے درمیان بہناپا ہے۔ مزے کا مشاعرہ غزلوں ہی کا ہوتا تھا۔ مناظمے میں وہ بات کہاں اور مثنوی تو ذکر کی مجلس کی چیز ہے۔ یار لوگ ہم بزم ہو کر بیٹھیں گے تو یہی کہیں گے

مثنوی یاں نہ سناؤ کہ وہ ہے جوئے سخن
ہے غزل ہی قدحِ میکدۂ کوئے سخن

بزمنامے میں یہ شعر تم نے پڑھا ہوگا

مسدس میں تغزل ہے ملایا اس لیے میں نے
کروں بیداد کا شکوہ تو میں کچھ داد بھی پاؤں

قصیدے کو تشبیب سے اسی لیے شروع کرتے تھے کہ پہلے دل کی بات کہی جائے۔

عشق ہی اَولیٰ، یا مولیٰ

فون کی گفتگو میں میں نے اپنی خواہش ظاہر کر دی تھی کہ کلیات چھاپی جائیں تو دو جلدوں میں شائع ہوں۔ دو رنگین ورق اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ انہیں دیکھ کر میری تجویز واضح ہو جائے گی۔ مراد یہ کہ:-

جلد اوّل کی کمپوزنگ ہنگامہ ہائے خلوت سے شروع ہو اور جہاں یہ ختم ہو، تسلسل نہ ٹوٹے۔ نئے دکن کے ریختے کی کمپوزنگ وہیں سے شروع ہو جائے اور صفحوں کے نمبر آگے چلتے جائیں۔

جلد دوم کی کمپوزنگ بزم نامے سے شروع ہو۔ اس کے بعد مثنوی آسمان پیداست کی کمپوزنگ ہو اور آخر میں سہہ دُل کی۔

میں نے ان سب اجزاء کے جو دیباچے لکھے ہیں، علی الترتیب اپنی اپنی جگہ وہ بھی کمپوز کیے جائیں تو مفید مطلب رہیں گے۔

منظومات کی کمپوزنگ ابھی شروع ہو جائے تو اچھا ہے۔ تمہارے دیباچے کی تکمیل اسے شروع کرانے کو لازم نہیں۔ دیباچوں کی کتابت یا کمپوزنگ بالعموم آخر میں ہوا کرتی ہے۔ ان کے صفحات کے نمبر رومن اعداد میں ہو سکتے ہیں۔ ادھر تم دیباچہ نگاری میں مشغول رہو گے اور ادھر منظومات کی کمپوزنگ ہوتی رہے گی تو وقت بچے گا۔

ایک ہزار ڈالر کے مساوی روپے عنقریب عزیزم نوید ریاض کے توسط سے تمہیں پہنچیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم غنی دوست ہو، مجھ پر ہر طرح مہربان ہو۔ داد بھی دیتے ہو اور دہش بھی کرتے ہو۔

نیو یارک سے ایک صاحب مجھے فون کیا کرتے ہیں۔ ان کا اسم شریف عبدالوہاب سلیم ہے۔ مولانا سے اپنے مراسم جتاتے ہیں۔ فصیح اور معز سے ان کا رابطہ رہتا ہے۔ یہ صاحب پہلے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مامور تھے۔ وہاں کی نوکری چھوڑ کر امریکہ کی کسی لائبریری میں ملازم ہوئے، اب ریٹائرڈ ہیں۔

ایک روز ذاتی کتب خانوں کا ذکر آیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں چھتیس ہزار کتابیں ہیں اور مشفق خواجہ صاحب کی ذاتی لائبریری بھی اس کی ٹکر کی ہے۔ عبدالوہاب سلیم صاحب بولے، پاکستان میں سب سے بڑی ذاتی لائبریری وجیہ الدین احمد صاحب کے خسر بزرگوار کی ہے۔ کیا انہوں نے ٹھیک کہا؟

عطیہ کو سلام

داؤد

16 April, 1999

وجیہہ!

جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے، میرے شغلِ شعرگوئی کے دور پانچ ہیں:-

پہلا دورہ: (غالباً ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۱ء)

سنٹرل موڈل ہائی سکول کے ساتویں یا آٹھویں درجے سے شروع ہوا۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا تو دو دیوان تیار تھے۔ گلِ داؤدی اور لحنِ داؤدی۔ شکر ہے والد مرحوم نے ان کی اشاعت سے مجھے باز رکھا۔ اس لیے کہ وہ کلام بہت ہی کچا تھا۔ میں نے مولانا کو دونوں دیوان دکھا کر کہا۔ ان میں سے آپ جو کچھ اور جتنا چاہیں ادبی دنیا میں چھاپ لیں۔ انہوں نے فرمایا، دوسرے کمرے میں میراجی بیٹھے ہیں۔ نظم کی ایڈیٹری ان کے سپرد ہے۔ دونوں دیوان لے کر میراجی کے کمرے میں پہنچا دو۔ انہوں نے فرمایا، دیوان میرے پاس چھوڑ جایئے، میں

KUTABKHANA OSMANIA

دیکھوں گا۔ اگلے ہفتے میں پھر وہاں جا دھمکا۔ میراجی نے دونوں دیوان دراز سے نکال کر مجھے واپس دیئے اور فرمایا آپ کا خط بہت اچھا ہے۔ تاہم ادبی دنیا کے اگلے شمارے میں میرا یہ قطعہ میراجی کی مہربانی سے چھپ گیا

ہر کامل فن صورتِ غنچہ ہے یہاں بند
مرتا ہے وہ جس دم تو کلی کھلتی ہے گویا
کھلتی ہے کلی پھیلتی ہے باغ میں نکہت
نکہت نہیں شہرت یہ اسے ملتی ہے گویا

امریکہ میں کاغذوں کی چھانٹی کرتے ہوئے گلِ داؤدی اور لحنِ داؤدی کے مسودے دکھائی دیئے۔ اپنا کلام پڑھ کر ہنسی آئی۔ میں نے دونوں دیوان پھاڑ کر ردی کے ٹوکرے میں پھینک دیئے۔

دوسرا دورہ: (اپریل ۱۹۶۹ء تا مارچ ۱۹۷۱ء)

اس دورے کی غزلوں کا مجموعہ سبحۂ صد دل ہے۔ دلی کے جشن غالب میں میری شرکت اب کے غزل گوئی کی محرک ہوئی۔ میرزا غالب کی تربت کی پائینتی چند منٹ خلوت میں بیٹھا رہا۔ واپس امریکہ آیا تو یہ شعر کہا

محفل جاناں میں مجھ تک جام آئے گا ضرور
تربت غالب کا بوسہ کام آئے گا ضرور

تیسرا دورہ: (۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء) مثنوی آسمان پیداست اس میں کہی گئی۔

چوتھا دورہ: (۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۵ء)

ہنگامہ ہائے خلوت کی غزلیں اس میں کہی گئیں۔

پانچواں دورہ: (۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۸ء)

نئے دکن کا ریختہ اس میں حاصل ہوا۔ اسی دورے میں بزمنامہ بھی لکھا گیا اور لاؤ تزو کے مواعظ کا ترجمہ کیا گیا۔

تلمیذ الرحمٰن

داؤد

25 June, 1999

وجیہہ!

اس بات سے میں بہت محظوظ ہوا کہ میری وہ نظم جس کا عنوان "تخلص" ہے، پڑھ کر تم نے جانا کہ واقعی میرا نام میرے دادا نے فضل اللہ تجویز کیا تھا اور یہ کہ میرے بھتیجے گھر میں مجھے چچا فجو کہا کرتے تھے۔ بھائی ہمارے دادا مولوی غلام قادر میری ولادت سے سولہ برس پہلے مرحوم ہوئے۔

یہ نظم میری آپ بیتی کا جزو نہیں۔ اس نظم کی شرح یہ ہے کہ تخلص اختیار کرنے سے شخصیت متبادل ہو جاتی ہے۔ پبلک کی نظر میں متخلص شاعر ایک قسم کا اداکار ہوتا ہے لیکن اس کے گھر والے گھر کے آنگن میں اس کا بہروپ چلنے نہیں دیتے۔ ان کی نظر میں وہ چچا فجو ہی رہتا ہے۔ اب اس نظم کو پھر سے پڑھو۔

تخلص

بزم احباب میں جب ہوتی ہے میری آمد
دیکھ کر کہتے ہیں سب آیئے وحشت صاحب
میرے ماں باپ نے یہ نام نہیں رکھا تھا
جب ہوا میرا تولد تو میرے دادا نے
نام تجویز کیا دے کے دعا فضل اللہ
گھر میں کہتے تھے اقارب مجھے فجو سارے
اب بھتیجوں کی نظر میں میں چچا فجو ہوں
بھائی بہنوں کو ہے معلوم کہ گھر سے باہر
جب نکلتا ہوں تو کہلاتا ہوں وحشت صاحب
جی میں کہتا ہوں کہ یکتا ہوئی خوب اپنی ذات
جب سے اپنایا ہے یہ نام، ہے کچھ اور ہی بات
اس کو اپنانے سے پہلے تھا فقط فضل اللہ
اس کو اپنا کے کوئی چیز بنا ہوں میں بھی
اس کے اعلان میں ہے حسن طلب کی کوئی بات
گویا ہم جنسوں کو اک چھیڑ کی دعوت دی ہے

عنکبوت والی غزل بھی منسلک ہے

یہی ہے مرے حوصلے کا ثبوت
نہیں لگتے اب دیوتا مجھ کو بھوت
ہیں بھکتوں ہی کے بھاگ، جن کو ملے
اچھوتے خیالات ہو کر اچھوت
نہ سید ہوں میں اور نہ ہوں راجپوت
مری ذات ہے غالباً عنکبوت
میں مکڑا ہوں ریشم کا کیڑا نہیں
کہ ڈھونڈا کروں شاخۂ شاہتوت
بفضل خداوند جان آفریں
مری قوت ہے بہتر از لایموت
مرے گھر کی بے پردگی دیکھ کر
کسا ہے کبیرے نے کھڈی پہ سوت

KUTABKHANA OSMANIA

ہے جھونکوں سے جالے کا جھالا بجا
رُکے گی ہوا جب تو ہوگا سکوت

6 July, 1999

وجیہہ!

مسندِ مشاعرہ میرے مزاج کی نشست گاہ نہیں، لاہور میں صرف ایک مشاعرہ میں نے پڑھا۔ یہ گورنمنٹ کالج کے ہال میں ہوا۔ اس میں جو نظم میں نے پڑھی، حلقہ اربابِ ذوق والوں نے نظموں کے ایک انتخاب میں چھاپ دی تھی۔ اس کے بعد تین مشاعرے بادلِ ناخواستہ میں نے بوسٹن میں پڑھے۔ ہر بار مسند پر بیٹھنے سے مجھے وحشت ہوئی۔

۱۹۴۹ء سے لے کر آج تک یعنی پچاس برس میں پاکستان سے باہر رہا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اگر وہاں رہتا تو متواتر غزلیں کہتا اور مشاعرے پڑھا کرتا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ان پچاس برسوں میں میں نے مشاعروں میں شرکت کی ہوتی تو سامعین (اور قارئین) مجھ سے اور میرے کلام سے قدرے مانوس ہو جاتے۔ میں راگ سرائی تو کرتا ہوں لیکن ترنم والی گلوکاری میرے قابو میں نہیں۔ تحت اللفظ پڑھنے والوں میں سے ہوں، شاید اسی لیے مشاعرہ سے اجتناب ہے۔

یہاں امریکہ میں رہتے ہوئے میں نے جو غزلیں کہیں، بزمِ مشاعرہ میں شرکت کی امید پر نہیں کہیں۔ ادب نواز دوستوں سے تعلق تازہ رکھنے کے لیے کہیں۔ تمہیں ان سے دلبستگی ہوئی تو میری امید بر آئی۔ تمہارے اعتناء سے یہ میرے احباب تک پہنچیں گی۔

اعجاز سے ایک روز میں نے کہا تھا میں بلحاظ سخن گوئی کسی شمار میں آؤں یا نہ آؤں، اتنا جانتا ہوں کہ غزل گوئی کی مشق سے میری نثر نویسی کو فائدہ پہنچا ہے۔

میرا جی نے ''ادبی دنیا'' میں میرا جو قطعہ چھاپ دیا تھا، وہ میں نے امسال ۱۶۔ اپریل والے خط میں لکھ بھیجا تھا۔ وہ خط تم کہیں رکھ کر بھول گئے۔ اب اس خط کا فوٹو بھیج رہا ہوں۔

اورینٹل کالج کے پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر صاحب کے ایک استفسار کے جواب میں میں نے دو خط (۱۹۹۷ء میں) انہیں لکھے۔ ان کے فوٹو بھی بھیج رہا ہوں۔

کلیات کی جلد دوم کی ترتیب جو تم نے تجویز کی، وہ یوں تھی:۔

اول سبحۂ صد دل۔ اس کے بعد بزم نامہ اور آخر میں آسمان پیداست۔

میری گزارش مان لو، جلد دوم کی ترتیب یوں رہے تو میرا جی خوش ہوگا:۔

شروع میں بزم نامہ ہو، اس کے بعد مثنوی آسمان پیداست اور آخر میں سبحۂ دل۔

بزم نامہ اور مثنوی سے یہ جلد شروع ہوگی تو پڑھنے والوں کو کچھ جدت اس جلد میں محسوس ہوگی۔

عطیہ کو سلام۔

سعادت مند

داؤد

19 July, 1999

وجیہہ!

کیمبرج میں جب میں نے اپنے مقالے کے لیے مطالعہ کا آغاز کیا تو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں پروفیسر میکڈانلڈ کا مقالہ بعنوان ''اللہ'' پڑھا۔ یہ بتانے کو کہ قرآن مجید سے اللہ کی معرفت کس پیرائے میں حاصل ہوتی ہے، موصوف نے ننانوے ناموں کی وہ فہرست پیش کی ہے جو صوفیاء نے تسبیح کے لیے تیار کی اور جو اسمائے حسنیٰ کی فہرست کہلاتی ہے (قرآن مجید میں اسماء حسنیٰ کے ننانوے ہونے کا قول کہیں نہیں)

فہرست پیش کرنے کے فوراً بعد پروفیسر صاحب کہتے ہیں، آؤ اب دیکھیں اس فہرست کا خلاصہ کیا ہے۔ یہ فہرست ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ حقیقتِ مطلقہ ہے، سرمدی ہے، خود مکتفی ہے، اس کا علم لامحدود ہے اور اس کی قدرت بے انتہاء ہے۔ وہ الحق، الصمد، القیوم، الحی، القدیر، العلیم اور فعال ما یرید ہے۔

مقالہ پڑھ کر مجھے ہنسی آئی۔ ننانوے ناموں کی فہرست کا خلاصہ کرنے کا خیال ہی بے تکا خیال ہے اور پھر یہ خلاصہ اس صورت سے کیا گیا کہ ننانوے میں سے سات نام (الحق، الصمد، الحی، القیوم، القدیر، العلیم اور فعال ما یرید) چن کو آگے رکھ دیئے اور یہ نہ سمجھایا کہ انتخاب کی لم کیا ہے۔

علم الکلام کے مطالعہ سے جلد ہی مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ انہی سات ناموں کی فہرست متکلمین کے ہاں منظورِ نظر ہے۔ پروفیسر میکڈانلڈ کی شناسائی علم الکلام سے اچھی خاصی ہے لیکن قرآن مجید سے ان کی واقفیت سرسری تھی۔ متکلمین کی تصانیف سے متاثر ہو کر انہوں نے ان سات ناموں کو قرآنی الٰہیات کا نچوڑ مان لیا۔

بس یہیں سے میری سوچ شروع ہوئی اور مجھے یہ شعور ہوا کہ متکلمین نے بعض تاریخی اسباب کے زیرِ اثر اللہ کا سبھاؤ بتانے والے ناموں (الرحیم، الودود، العادل، المنتقم وغیرہم) سے واسطہ کم ہی رکھا اور اپنے کلام میں حق (بمعنی حقیقت مطلقہ) کی رٹ لگا دی اور اللہ تعالیٰ کی صمدیت، قیومیت، قدرتِ مطلقہ اور علم لا انتہاء کے مضمونوں ہی پر خیال آرائیاں فرمائیں۔

میں نے الحق، الصمد، القدیر، العلیم اور المرید کے جملہ ایرادات قرآن مجید سے جمع کیے اور ان کے مطالب سمجھنے کے لیے ان ایرادات کے سیاق و سباق پر غور کیا۔ اس سے مجھ پر قرآن مجید کے خطیبانہ اسلوب کی اہمیت واضح ہوئی۔ متکلمین کے ٹھنڈے محاورے اور قرآن مجید کے پرجوش محاورہ کا فرق بھی اس طرح میری سمجھ میں آیا۔ حاصلِ مقالہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا ''وادی سُر'' عدل ہے۔

تھیسس کی فہرست مضامین، اس کا پہلا باب اور اس کا آخری باب، ان کو ملاحظہ کر لو تو تھیسس کے منشاء سے کافی واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

عطیہ کو سلام

جویائے حق

داؤد

21 July, 1999

وجیہہ!

اکادمی پنجاب کی مطبوعات کی نگرانی مولانا فرماتے تھے اور ''ادبی دنیا'' کی طباعت کی دیکھ بھال بھی۔ یہ لیاقت تمہارا ورثہ ہے، اس جادے کے رہبر تم ہو۔ جو کاغذ اس خط کے ساتھ منسلک ہیں، ان پر میری تجویزیں

KUTABKHANA OSMANIA

ہیں۔ اگر پسند آئیں تو انہیں قبول کرو۔

لاہور کے لوگ پھبتی سے باز نہیں آتے۔ مولانا نے بہت چاہا کہ اکادمی کو حکومت کی امداد حاصل ہو اور اس کی عمارت تعمیر ہو اور اس کا عملہ ہو۔ حکومت نے بے اعتنائی برتی تو مولانا نے ہمت نہ ہاری اور اپنی استطاعت کے بل پر اکادمی کو قایم رکھا۔ کافی ہاؤس کے بے فکرے اکادمی پنجاب کو ''اِک آدمی پنجاب'' کہا کرتے تھے۔

ایوب ہسپتال سے واپس گھر آچکا ہوگا۔ کسی روز اسے فون کر کے اس کا حال پوچھ لینا۔

بندۂ خدا

داؤد

3 August, 1999

وجیہہ!

موڈل ٹاؤن میں ہر جمعرات کو سرخ و سفید چہرے والا ایک فقیر بابا در در یہ صدا لگایا کرتا تھا:۔

بھاگ لائی رکھے مولیٰ
خیر ہووے بھلا ہووے
اللہ بچیاں دیاں مراداں پاوے
خیر ہووے بھلا ہووے

جی بلاک کی گردش کے بعد یہ ایچ بلاک میں گھومتا تھا اور پھر تمہارے اے بلاک میں بھی آتا ہوگا۔

اس کی صدا کے یہی بول میں نے راگ ملتانی میں بٹھائے اور ۱۹۸۷ء میں لندن کے ایک جلسے میں گائے۔ اس کی ریکارڈنگ بھیج رہا ہوں۔ اس جلسے میں میں نے جے جے ونتی کے دو خیال بھی گائے۔ یہ بھی سنو۔ لندن سے میں برمنگھم گیا وہاں جو چیزیں گائیں ان میں سے کھماج کی ریکارڈنگ بھی اسی فیتے پر ہے جو تمہیں بھیج رہا ہوں۔

امابعد، کلیات کے لیے ایک چھوٹا سا جزو ہے اور ارسال ہے۔ **تفنن بلاترنم** اس کا عنوان ہے۔

آج سے بارہ تیرہ سال پہلے یعنی بوسٹن کے آخری ایام میں جی چاہا کہ چند آزاد نظمیں کہی جائیں۔ تیس سے زیادہ جدید نظمیں جمع ہو گئیں۔ فلوریڈا آ کر میں نے ان میں سے چند اعجاز کو بھیجیں۔ اس نے رسالہ ''علامت'' کے ایڈیٹر کو دے دیں۔ بعض ''علامت'' میں چھپ بھی گئیں۔ اب چودہ نظمیں اس گلدستے میں سے چن کر بھیج رہا ہوں، اگر انہیں ''کلیات'' میں شامل کرنے کے لائق سمجھو تو جلد دوم کی ترتیب یوں کیوں نہ ہو:۔

۱۔ بزمنامہ
۲۔ مثنوی آسمان پیداست
۳۔ تفنن بلاترنم
۴۔ سبحۂ صد دل

گانا عطیہ کو بھی سنوا دینا، انہیں سلام۔

متقرب

داؤد

4 October, 1999

وجیہہ!

آغا بابر کی برسی کے جلسے میں جو مضمون میں نے پڑھا، اس کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے اس میں لکھا، برسی کی تقریب کی مناسبت سے لکھا۔ اعجاز اس جلسے میں موجود تھا۔ ایک مضمون اس نے بھی پڑھا۔ دونوں مضمون ''نقوش'' کے آیندہ شمارے میں چھپیں گے۔

آج سوموار ہے اور اکتوبر کی چوتھی، تمہاری آنکھ کا آپریشن ہو چکا ہوگا۔ تمہاری بینائی کی بحالی تمہارے چاہنے والوں کو عزیز ہے۔ بینائی پر زور نہ ڈالو۔ جب تک پورا افاقہ نہ ہو، میرے خطوط اور مضمون دوسروں سے پڑھوا کر سنو۔

آج ایک خط صبیحہ کو بھی لکھا۔ اس کی واپسی ۲۷۔ اکتوبر کو ہوگی، باقی باتیں فون پر ہوں گی۔

عطیہ کو سلام

پردہ ساز

داؤد

19 February, 2000

وجیہہ!

شیرانی صاحب کی تاریخ وفات ۱۵۔ فروری ۱۹۴۶ء ہے۔ ان کی وفات کے بعد ہی اختر شیرانی کو ہمارے والد صاحب کے درشن کی خواہش ہوئی۔ ہمارے گھر اختر کی آمد کا ذکر میرے ایک مکتوب میں آیا ہے جو ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو لکھا گیا۔ ''سلام و پیام'' کے صفحہ ۳۸۴ پر وہ ذکر پڑھ لو۔ چاہو تو اس کا اقتباس دیباچے میں شامل کر دو۔

تمہارا کہنا ہے کہ سندھ میں ہل کا بیل باہر سے اندر کی جانب گھومتا ہے اور مرکز پر پہنچ کر کام ختم ہوتا ہے اور پنجاب کے کھیتوں پر بیل اندر سے باہر کو گھومتا ہے۔

یہ میلان بیلوں کے اپنے ہیں یا کسانوں کے؟ ملا نصرالدین کی یہ حکایت تم نے پڑھی ہوگی، ملا ایک صبح اونٹ پر سوار دکھائی دیا۔ دیکھنے والے نے پوچھا، ملا کدھر کے ارادے ہیں؟ ملا نے کہا ''جدھر اونٹ کی مرضی۔''

تصوف کیا چاہتا ہے؟ باہر سے اندر کی جانب گھومنا یا اندر سے باہر کی جانب؟

تاش کے پتوں کی معنویت جو تم نے بتائی، اسے معلوم کر کے جی بہت خوش ہوا۔ مجھے کبھی نہ سوجھتا کہ طنبورے کی طرح یکہ بھی نرگنی کا نمائندہ ہے۔ غرض یہ کہ تم نے نہلے پر دہلا مارا ہے۔

کل تم نے کہا کہ دیباچے کا عنوان انتشاراتِ ناشر ہوگا۔ اشاراتِ ناشر ہو تو کیسا رہے؟

عطیہ کو سلام

پنجاب کا بیل

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

29 March, 2000

وجیہہ!

وہ شعر جس سے تمہارا دھیان اروڑہ ذات کی شاخوں کی طرف گیا یہ ہے

بے گناہی اپنی ثابت ہو گئی
جب کہا ہم نے کہ ہم ہیں چاولے

(یعنی ہم نے شجرِ ممنوعہ کا پھل نہیں کھایا) اس شعر کے نیچے تم نے میرا لکھا ہوا یہ حاشیہ پڑھا ہوگا:۔

''ہمارے اجداد برنج فروش تھے۔ ہماری برادری قصور میں چاولے کہلاتی ہے۔''

میں نے بزمِ غالب مصنفہ عبدالرؤف عروج کو کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا ہے کہ نواب احمد بخش کی وفات ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ اس وقت ان کے بیٹے ضیاء الدین خاں کی عمر چھ سال تھی۔ اس حساب سے بیٹے کی تاریخ ولادت ۱۸۳۱ء ہے۔ میر مہدی مجروح کی تاریخ ولادت اسی کتاب میں ۱۸۳۳ء لکھی ہے۔

غزلوں میں سے تمہارے دیباچے کے کام کے اشعار نکال کر میں نے ایک گلدستہ بنایا ہے۔

باقی باتیں فون پر ہوں گی۔ عطیہ کو سلام

برخوردار

داؤد

6 April, 2000

وجیہہ!

میرا یہ مطلع ایک مزیدار پہیلی ہے۔ ذرا سے غور سے اس کا حل سامنے آجاتا ہے

کوئی بھی حرف اُلٹی شکل کا ہم نے نہیں دیکھا
کبھی جو جا کے آئینے میں مکتوبِ جبیں دیکھا

یہ تو سب جانتے ہیں کہ تحریر آئینے کے سامنے رکھیں تو عکس ہو کر یہ معکوس ہو جاتی ہے۔ پس آئینے میں اگر تحریر الٹی ہوئی نظر نہ آئی تو اس کے معنی ہیں کہ ماتھے کی جس تحریر کا یہ عکس ہے، وہ خود اُلٹی ہے اور عکس میں آ کر سیدھی ہو گئی ہے یعنی ہمارا مکتوبِ جبیں اُلٹا ہے۔

تمہاری فرمائش تھی کہ میں غزلوں میں بعض مضمونوں والے اشعار کی مثالیں لکھ کر تمہیں بھیجوں تاکہ مسودے میں یہ تمہیں ڈھونڈنی نہ پڑیں۔ ان کا ایک گلدستہ بنا کر بھیج چکا ہوں، گلدستۂ دوم اب ارسال ہے۔ مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

دربان، گدگدی، کیمیا، چلم، پان اور پاندان، کبیرا، تاش کے پتے، اختر شیرانی، رازداں، رقیب، اغیار، محتسب، شیرِ مادر، واعظ، ناصح، شیخ، پیرِ مغاں، کنہیا اور گوپیاں، طنبورہ، مہملات، موسیقی

دونوں گلدستوں میں جتنی مثالیں آ گئی ہیں، دیباچے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔ دیباچے میں جو اشعار لانے کو جی چاہے ان پر نشان لگا لو۔ تمہاری لگن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیباچہ منفرد اور فکر انگیز ہوگا،

سرسری تحریر تمہارا شیوہ نہیں۔

عطیہ کو سلام

شاباشی کا طالب

داؤد

2 May, 2000

وجیہہ!

تمہارے پاس کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ ع

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

جب میں تمہارے پاس بیٹھا تھا تو تم کہہ رہے تھے، کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن مضمون کی کوئی سکیم نہیں بن رہی۔ ایک سکیم تمہیں سوجھی تھی تاش کے پتوں والی۔ میرے رخصت ہونے کے بعد ہاتف سے ایک بہتر سکیم تمہیں حاصل ہوئی یعنی طنبورہ پہلے اور آلاپ اور گت بعد میں۔ پاتال پہلے اور تین تال بعد میں، غزغوں پہلے اور ٹکڑوں کوں بعد میں۔ پہلے لاشعوری باتیں اور ظہور اور شعور کی بعد میں۔

اسی سکیم کے اندر تاش کے پتوں کی معنویت کا بیان اپنی جگہ بنا لے گا۔

تین گلدستے تمہیں موصول ہو چکے ہیں۔ پہلے دو گلدستے ان اشعار کے تھے جن میں پان، شیرِ مادر، طنبورہ اور گدگدی وغیرہ کے مضمون آئے ہیں۔ تیسرا گلدستہ متفرقات کا تھا جن میں پیشتر چٹکلے تھے۔ اب تین گلدستے اور بھیج رہا ہوں۔ یہ انتخاب سنجیدہ اشعار کا ہے۔ تمہاری بینائی کی تکلیف کا مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اب میری گزارش مان لو۔ کلیات کے مسودوں کی جلدیں اب شیلف پر رکھ دو اور ان کی ورق گردانی ترک کر دو۔ تمہاری سہولت کے لیے بڑی محنت سے میں نے یہ چھ گلدستے تیار کیے ہیں۔ ان کو اول تا آخر ایک بار پڑھ ڈالو اور جو اشعار اقتباس کے لائق نظر آئیں، ان پر نشان لگا دو۔ افکار کو مرتب کرنے میں اسی طرح آسانی ہوگی۔

صفحہ نمبر ۵ پر جبریل اور ہاتف والی رباعی ہے۔

عطیہ کو سلام۔

برخوردار

داؤد

4 May, 2000

وجیہہ!

محبت اور عشق، یہ دو بول مجھے سریلے نہیں لگتے۔ پیار اور الفت، یہ دو بول میرے کام کے ہیں۔ گانا ہو تو پھر پیت کا بول ٹھیک ہے۔

اب کے تم نے محبت کے مضمون کے اشعار کی فرمائش کی اور میرا ہی یہ شعر مجھے یاد دلایا۔

کہتا میں ان سے زندہ جو ہوتے ابا جان
نام ہمارا کیوں نہیں رکھا محبت خان

KUTABKHANA OSMANIA

پیار والے چند شعر سنو ۔

کس قدر نرم اور ملائم آپ کے یہ گال ہیں
منتظر بوسے کے ہیں، خواہانِ استعمال ہیں

برجستگی تو دیکھو محبت کی، میں نے آج
سرگوشی کرکے چوم لیا کان یار کا

سامنے آئیں مرے کتنی ہی سندر آنکھیں
کیسی حرمت سے مرا پیار انہیں چوم گیا

آئے ہیں سودا بیچنے تم آکے باہر دیکھ لو
شیریں ہیں ہم یا تلخ ہیں، تم آپ چکھ کر دیکھ لو

وہ اپنے آپ کرکے جب بھی سجا کر پیش کرتے ہیں
مئے صافی کا جھٹ ہم ان کو ساغر پیش کرتے ہیں
نہیں ہم کرکے مجرا پیش کرتے ان کو دل اپنا
اُچھل کر، کود کر، اک کھا کے چکر پیش کرتے ہیں

جگل بندی سے جب اپنی ہوئیں اک یار سے باتیں
کہا سب نے کہ یوں کرتے ہیں پیارے پیار سے باتیں

مگر سچ کیوں نہ کہہ دوں کہ آرام تو دوستی اور یاری میں ہوتا ہے ۔

آزاد لوگ اسی لیے باغ و بہار ہیں
عاشق نہیں کسی پہ مگر سب کے یار ہیں

یہ راحت اس کے دم سے ہے، یہ میری غمگسار ہے
تھا عشق اک بلا مگر یہ دوستی ہے زندگی

جناب صدر اک اپنی گزارش یہ ادب سے ہے
کسی پر ہم نہیں عاشق پر الفت ہم کو سب سے ہے

یہ اشعار تو میں نے اپنی غزلوں سے نکالے، کلیات کے دیگر حصوں میں محبت کا مضمون کہاں کہاں آیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ بزم نامہ تو سارے کا سارا اسی مضمون کا ہے۔ اس لیے بزم نامے کو محبت نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔

نکل کر رحم سے بچہ جب اس دنیا میں آتا ہے
تو دھپا مار کر اس کو کوئی اک دم رُلاتا ہے
وہ روتا ہے تو اس کو دیکھ کر سب لوگ ہنستے ہیں
ہنسی کا شور ہی کانوں میں پہلے اس کے جاتا ہے
وہ پی کر دودھ ماں کی چھاتیوں سے پلنے لگتا ہے
اور آنکھیں کھول کر کوئی ادا اپنی دکھاتا ہے
وہ فوراً اُنس والی آنکھ کو پہچان لیتا ہے
کسی کو مسکراتا دیکھ کر وہ مسکراتا ہے
کوئی چمکار کر کرتا ہے اس سے توتلی باتیں
لپک کر کوئی اس کو لے کے گودی میں بٹھاتا ہے
اسے وحشت کی نظروں سے کوئی گر آن کر دیکھے
تو فوراً مار کر اک چیخ وہ ماں کو بلاتا ہے

مثنوی آسماں پیداست میں یہ اشعار ہیں:-

بہار بزم ہے جلوہ ہے اور ضیافت ہے
شگفتگی ہے تلطف ہے اور ظرافت ہے
بہار اُنس کا اور دوستی کا موسم ہے
بہار تازگی مرحمت کا پرچم ہے
ہے التفات کا پیغام ناز فطرت کا
ہے شاخ نرم سے پیدا گداز فطرت کا
اسی زمانے میں ہے مستیٔ کنوں کا لطف
کہ اس میں موج محبت سے ہے جنوں کا لطف
مزا بہار میں ہے بن پئے بہکنے کا
بہک کے جھومنے کا، جھوم کر چہکنے کا
تمام ہست کا حاصل یہ موسم گزراں
فدا ہزار ابدیت برین دم گزراں
عجب نہیں ہے کہ محشر بھی ہو بسانِ بہار
اُٹھیں تو سامنے ہو منظرِ جہانِ بہار

اسی مثنوی کے آخر میں ذیل کی نظم ہے:-

اہلِ اُنس

جو آنکھیں ہو چکیں بیزار اُن پہ جالے ہیں
وہ مسکراتے ہیں اکثر جو اُنس والے ہیں
جہاں ہو اُنس وہاں اعتدال ہوتا ہے
جہاں ہو عشق وہاں اور حال ہوتا ہے
ہر ایک عصر میں مچتی ہے عاشقی کی دھوم

مگر ہمیں نہیں درکار عاشقوں کا ہجوم
جنونِ صورتِ آرام سے ہے بیگانہ
بس ایک دشت کو کافی ہے ایک دیوانہ
اگر کسی کی محبت شدید ہو جائے
تو اس غریب کا ہو گا محاورہ ہائے
و لیکن اُنس کا اظہار مرحبا سے ہے
بہارِ دوستی کی ابتداء صبا سے ہے

اب میرا بھیجا ہوا انتخاب بھی بہت پھیل گیا ہے، اس انتخاب سے انتخاب اب تم پر چھوڑتا ہوں۔

دیباچے میں اقتباسات کی گنجائش محدود ہوگی۔

میرے اس خط کو گلدستہ ہفتم سمجھ لو۔

عطیہ کو سلام۔

برخوردار

داؤد

6 May, 2000

وجیہہ!

پرسوں (۴۔ مئی کو) میں نے گلدستہ ہفتم ڈاک میں ڈالا۔ آج (۶۔ مئی کو) میرا یوم ولادت ہے۔ چوہتر کا ہو گیا۔ دھاگے کو ایک نئی گانٹھ دے کر سالگرہ منانے کا مجھے شوق نہیں۔ چھوٹی بیٹی انیسہ جو ہمارے ساتھ رہتی ہے، سالگرہ کو بڑی بات سمجھتی ہے۔ اس کی خوشی کے لیے آج شام چند ہم شہریوں کی دعوت ہے۔

فون پر اور آمنے سامنے دیباچے کے بارے میں ہماری چند گفتگوئیں ہوئی ہیں۔ ایک روز تم نے کہا۔ ''تم پر نظیرا کبر آبادی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے سن کر کہا۔ ''یہ اثر پذیری نہیں، یہ توارد ہے۔'' پھر ایک روز تم نے کہا۔ ''رشتہ من و تو جس پر مارٹن بیوبر نے زور دیا ہے، تمہاری غزل میں نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے بیوبر کا تم پر اثر ہے۔'' میں نے سن کر کہا۔ ''یہ بھی توارد ہے۔''

ایک روز تم نے کہا۔ ''تمہاری غزل میں تمہاری نسائیت جھلکتی ہے۔'' پھر پچھلے دنوں کہا۔ ''بی بی مریم تمہاری شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔''

اگر تم کہو کہ یہ باتیں سجاؤ کا پتہ دیتی ہیں تو فبہا لیکن دیگر وجوہ بھی تو ہیں۔ میں نے پچاس سال راگ سرائی کی ہے۔ خیالوں اور ٹھمریوں کے بول بیشتر گوپیوں کے بول ہیں۔ لاؤتزو کے وعظ کا ترجمہ میں نے اس لیے کیا کہ وہ مادرِ گیتی کا نام لیوا ہے۔

تمہاری سوچ کی مجال بہت بڑی ہے اور تمہارے مطالعہ کی وسعت غیر معمولی۔ جب تم لکھنے کو قلم اٹھاتے ہو تو سو مضمون اُمڈ کر تمہاری سوچ میں آتے ہیں اور تمہارا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ ضبطِ تحریر میں آ جائے۔ اس لیے کہ تم اپنے خیال کی جدت کو جانتے ہو اور اس سے تمہاری طبیعت میں ہلچل مچی ہوئی ہے اور دیباچے کی

سکیم بدلتی رہتی ہے۔

آج سے تین ماہ پہلے تمہارا خیال تھا کہ دیباچے کا سانچہ تاش کے پتوں کے تلازمات کی سوچ سے تمہارے ذہن میں بن رہا ہے۔

پھر میں نے تمہیں چٹکلوں والے اشعار کا گلدستہ بھیجا تو فون پر تم نے کہا کہ میں اس وقت لاشعور کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ اس سے نپٹ کر پھر تمہاری ڈگڈگی کی طرف آؤں گا۔

پھر پچھلے ہفتے میں نے تمہیں فون کیا تو تم نے کہا، سارتر لاشعور اور شعور کی تفریق کا قائل نہیں ہے۔ وہ صورت ہائے احوال (Phenomena) کی بات کرتا ہے۔ میں تمہاری شاعری میں صورت ہائے احوال کو چھان رہا ہوں۔

کراچی میں تم نے کہا، تمہیں غزل گوئی کے جو شدید دورے پڑتے رہے، ان کے درمیان طویل وقفے آئے۔ اس کی توجیہہ دیباچے میں آنی چاہیے۔

چند روز ہوئے تم نے کہا، میں اس دیباچے میں تمہارے کلام کے محاسن اور اسقام کی بحث نہیں چھیڑوں گا۔ بس یہ دکھاؤں گا کہ یہ شاعر کس کلچر کا فرزند ہے۔

غزل گوئی سے حالی، شبلی اور آزاد کنارہ کش کیوں ہوئے، اس پر بھی تم کچھ لکھنا چاہتے تھے۔

اتنی باتوں کا بیان ایک دیباچے میں کیونکر سمائے گا۔ یہ ایک مستقل تصنیف چاہتا ہے۔ یہ کام دیباچہ لکھنے کے بعد ہو سکتا ہے۔

تمہاری بینائی کی کمزوری کے خیال سے میں گزارش کرتا ہوں کہ دیباچہ مختصر لکھو، اسے دو حصوں میں تقسیم کر دو:-

حصہ اول: یہ طنبورے کے مضمون سے شروع ہو (ہمارا گانا بجانا طنبورے سے شروع ہوتا ہے) اس حصے میں زگن، سجاؤ، لاشعور اور فطری میلانات کی باتیں آئیں۔

حصہ دوم: یہ ڈگڈگی کے مضمون سے شروع ہو۔ بذلہ، بہلاوا اور تماشا۔

تم سے گفتگو کر کے ہی یہ سکیم مجھے سوجھی ہے۔

سبحہ صد دل میں ایک شعر ہے

پلا کر دیکھ لو جب چاہو اک جام
میں باہر نالہ ہوں اندر لطیفہ

تم کہو گے ''اس شعر میں اخفا ہے، درحقیقت تم باہر لطیفہ ہو اور اندر نالہ۔''

دیباچا اس شعر کی تاویلات سے بھی شروع ہو سکتا ہے۔ لاشعور اور شعور کی بات اسی سے چھڑ سکتی ہے۔

اب فون پر باتیں ہوں گی۔ عطیہ کو سلام

مقفّی پھر بھی بے تکا

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

19 May, 2000

وجیہہ!

گلدستۂ اوّل اور گلدستۂ دوم کے اشعار کو ملا کر اور ان کے مضامین کا اشاریہ شروع میں لگا کر میں نے تمہیں ایک گلدان بھیجا۔ اس کا سرورق رنگین تھا اور اس کا عنوان

معاونِ دیباچہ

گلدستۂ سوم جو بھیجا تھا، اس کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں چٹکلے تھے، دوسرے میں متفرق اشعار۔

پھر ایک پلندا بھیجا۔ اس میں تین گلدستے یکجا تھا: چہارم، پنجم اور ششم۔ اس پلندے کا سرورق سرخ تھا اور عنوان: تین اور گلدستے:

سنجیدہ مضامین والے اشعار کا انتخاب

اس انتخاب کے صفحہ ۳۶ پر یہ شعر ہے

اس قیدِ من و تو سے تنگ آؤ گے تم اک دن
رکھا نہ اگر تم نے کچھ واسطہ ایشاں سے

اور اس کے صفحہ ۱۶ پر یہ شعر ہے

دوئی کے توڑ کو لازم ہے تیسرا کوئی
نہیں رقیب تو بودا ہے رشتۂ من و تو

بزمنامہ: سارے کا سارا اسی خیال کے اظہار کے لیے لکھا گیا، اس کا ساتواں بند یوں شروع ہوتا ہے:-

جو ہوویں صرف دو موتی تو مالا کیسے حاصل ہو
بنے پھر راگ سُر جب تیسرا اک آ کے شامل ہو
ادھر قوسِ قزح ہفت رنگ ہو کر مسکراتی ہے
کہ پانی پر سمندر کے کئی رنگوں کی جھلمل ہو
اِدھر طاؤس کی ڈنڈی پہ سُر کے سات پردے ہیں
کہ ہر اک تار اس کا گانے کی سنگت کے قابل ہو

دوئی کا توڑ ہندومت میں برہما، وشنو اور شو کی تثلیث سے ہوا اور تین کی بین بجی، مسیحی مت کی تثلیث اپنی ہے۔ دونوں متوں میں اک دوئی دوئی کی تال متروک ہوئی، اور اک تیا تیا کی تال مبروک۔

اُمید ہے دیباچہ اب قریب التکمیل ہوگا۔ محبت کے مضمون والے اشعار کا انتخاب (گلدستۂ ہفتم) بھی تم کو بھیج دیا تھا۔

تمہارا یہ فیصلہ خوشخبری ہے کہ اقتباسات بس اتنے ہوں گے کہ انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ اقتباس کے معنی ہیں آگ لینا، چلم تو پانچ چھ انگاروں سے بھر جاتی ہے۔

بائرن کی نظم ڈون جوان کے چند بند صبح اُٹھ کر پڑھتا ہوں۔ اسے پڑھ کر گنگناتا ہوں:-

چل چل رے نوجوان

کبھی یہ نعرہ لگاتا ہوں:- بلّے جوانا

عطیہ کو سلام

تمہارا برخوردار

داؤد

12 June, 2000

وجیہہ!

گئے جو سجدے میں سب مقتدی تو چپکے سے
امام چلتا بنا کھول کر درِ محراب

(سبحۂ صد دل، صفحہ ۱۱۲)

یہ شعر کہتے ہوئے میرا شعور تمثیل آفرینی کر رہا تھا:-

محراب میں ایک چور دروازہ ہے۔ صرف امام کو اس کا علم ہے۔ نمازی سر بسجدہ ہوئے تو امام صاحب وہ دروازہ کھول کر کھسک گئے۔ شعوری سطح پر مراد اتنی تھی کہ یہ امام لوگ (یا واعظ لوگ) دوسروں کو طاعت گزاری میں لگا کر خود نجانے کدھر بھاگ نکلتے ہیں۔

یہ شعر کہتے ہوئے محراب اور امام کے تلازمات میرے لاشعور میں کیا تھے، میں نہیں جانتا۔ جو تاویل ان کی تمہیں سوجھی میرے لاشعور میں تھی یا نہیں، تم ہی بتاؤ۔

تم نے میری غزلیں پڑھ کر میرا ''گریز'' تشخیص کیا تو دو شعر یاد آئے

کچھ عاشقی میں بوسۂ لب کا نہیں ہے کام
صوفی کو ہے خبر کہ نہیں ہے دہان جذب

(سبحۂ صد دل۔ صفحہ ۷)

دیگر

پیا جاتا ہے نگاہوں ہی سے رس گنبد کا
ذکر کرتے نہیں ارباب ہوس گنبد کا

(سبحۂ صد دل۔ صفحہ ۴۴)

ان شعروں کی تاویل تم سے سنوں تو اپنے کہے ہوئے کا کچھ اور مزا پاؤں۔

مہمل گو

داؤد

18 June, 2000

وجیہہ!

اب یعقوب کی کرم فرمائیوں کی کہانی سنو۔ ''نسخہ ہائے وفا'' میں ایک کہانی چمن آرائی کے عنوان سے ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ میرا شوق باغبانی کیسے شروع ہوا۔ ہمارے گھر کے احاطے میں داخل ہوتے ہی بائیں

KUTABKHANA OSMANIA

جانب گھاس والا ایک رقبہ تھا۔ اس میں امرودوں کے تین درخت تھے۔ ان سے صحت مند پھل کبھی حاصل نہ ہوا یعنی جب امرود پکنے پر آتے تھے تو ان میں کیڑے پڑ جاتے تھے۔ میں نے خوشی محمد مالی سے کہا، یہ تینوں درخت چپکے سے کاٹ کر پھینک دے۔ پھر ہم مل کر لان کو پھولوں کی کیاریوں سے سجائیں گے۔

خوشی محمد نے تینوں درخت گرمیوں میں ایک روز پچھلے پہر کاٹ دیئے۔ بعد قیلولہ یعقوب نے باہر نکل کر درخت غائب پائے تو بڑے زور سے احتجاج کیا اور چاہا کہ میں ڈانٹا جاؤں، خیریت رہی کہ والد صاحب کی ڈانٹ سے میں محفوظ رہا۔ انہیں ان درختوں کا بے فائدہ ہونا معلوم تھا۔

خوشی محمد اے بلاک کی نرسری سے پھولوں کے پودوں کی پنیری خرید لایا۔ میرے ساتھ مل کر اس نے چار کیاریاں تیار کیں۔ اینٹ، چڑیا، پان اور حکم کے ڈیزائن کی۔ (تاش کے پتوں سے ماخوذ شکلوں کی) ان میں پنیری جڑ دی گئی اور نہر کے پانی سے یہ سیراب ہوئیں۔

یعقوب نے غصے میں چاروں کیاریوں کی پنیری اکھاڑ کر پھینک دی۔ دو تین روز بعد نئی پنیری لائی اور جڑی گئی۔ یعقوب نے پھر وہی حرکت کی۔ میں نے خوشی محمد سے کہا، گھبراؤ نہیں اور پنیری لاؤ۔ اب کے پنیری صف آرا ہوئی تو یعقوب نے ہار مان لی۔ اس کے احتجاج کو سن کر والد صاحب چپ ہی رہے۔ انہوں نے غیر جانبداری کی چپ سادھ لی تھی۔

گورنمنٹ کالج میں یعقوب کا ایک سکھ ہم جماعت اوتار سنگھ رکھی تھا۔ یہ موڈل ٹاؤن میں رہتا تھا (سرکلر روڈ کے اندر اس کے بھائیوں نے ڈسپنسری کھول رکھی تھی۔ ایف بلاک اور بی بلاک کے بس سٹینڈوں کے درمیان) بھارت کی سول سروس میں ترقی پا کر اوتار سنگھ پارلیمنٹ کا سیکرٹری ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ یہ انگریزی کا بہت قابل انشاء پرداز تھا۔

بوسٹن میں یہ مجھ سے ملنے آیا۔ یعقوب کا ذکر آیا تو بولا۔ ''لڑکپن میں یعقوب کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔ موڈل ٹاؤن والے گھر کے احاطے کو اس نے گلزار بنا دیا تھا۔''

یہ سن کر میں جی ہی جی میں ہنسا یہ سوچ کر کہ یعقوب نے خود ہی اوتار سنگھ کے آگے اپنی باغبانی کی ڈینگ ماری ہوگی۔

دوسری حکایت سنو، پروفیسر عبدالباسط نے موڈل ٹاؤن کی بزمِ ادب کے افتتاح کے لیے اپنے گھر میں میٹنگ کی۔ کل پانچ چھ نوجوان حاضر تھے۔ یعقوب، میں، اشفاق نقوی اور آغا سید جلال (جلی) کا وہاں ہونا مجھے یاد ہے۔ باسط صاحب نے بزم کا منشور پڑھ کر سنایا، ووٹ دیئے گئے اور منشور منظور ہوا۔ پھر باسط صاحب نے کہا، بزم کا پہلا اجلاس اگلے ہفتے ہوگا، اس کا پروگرام طے کر لینا چاہیے۔ بزم کا کوئی رکن اس میں اپنی طبعزاد نگارش پڑھے۔

یعقوب نے مجھے کہنی مار کر سرگوشی سے پوچھا۔ ''وہ مضمون جو تم نے (گورنمنٹ کالج کی) مجلس اقبال کے لیے لکھا ہے، اس کا عنوان کیا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''رسم و راہ'' یعقوب نے اک دم ہاتھ کھڑا کیا اور اعلان کر دیا۔ ''اگلے جلسے میں، میں ایک مضمون پڑھوں گا۔ عنوان ہے رسم و راہ۔''

مجھ سے مسودہ لے کر اگلے جلسے میں یہ مضمون اس نے اپنے نام سے پڑھ دیا، میں منہ دیکھتا رہ گیا۔

میری انشا پردازی کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اس پر یعقوب نے ہاتھ صاف کیا۔ اس اجلاس میں اشفاق

KUTABKHANA OSMANIA

نقوی موجود تھا۔ چند روز بعد میں نے یہی مضمون مجلسِ اقبال کے ایک اجلاس میں اپنے نام سے پڑھا۔ اشفاق نقوی یہاں بھی شریک تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ اس مضمون کا اصل راقم کون ہے۔

یعقوب کی طرف سے مسابقت کے یہ مظاہرے انگلستان اور امریکہ میں بھی ہوتے رہے لیکن اس خط میں دو حکایتیں ہی کافی ہیں، زیادہ مزیدار یہی دو ہیں۔

برادرِ خرد

داؤد

21 June, 2000

وجیہہ!

اچھے سے اچھے فنکاروں کی زندگی سپاٹ بھی ہو سکتی ہے۔ سانپ کے پاس سوائے پھنکار کے کیا ہے! لیکن اس کی سنسنی خیزی میں کس کو کلام ہے۔ اُستاد بندو خاں سارنگی نواز نے اپنی زندگی میں دو کام کیے۔ سارنگی پر ریاض کیا اور چرس نوش فرمائی۔ سارنگی بجی تو چرس رنگ لائی، سننے والے جھوم جھوم گئے۔

امیر خسرو کی سوانح عمری ڈاکٹر وحید میرزا نے (انگریزی میں) لکھی۔ یہ سپاٹ اس لیے رہی کہ معلومات کا جو مسالہ ان کو ملا، اس میں کوئی رنگینی نہ تھی۔ شیخ محمد اکرام کی کتاب آبِ کوثر میں امیر خسرو کا تذکرہ صرف بارہ صفحات کا ہے، اس میں لکھتے ہیں:-

''ان کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان سے ہندوستان آئے تھے اور والدہ ایک نومسلم رئیس کی بیٹی تھیں۔''

(آبِ کوثر، فیروز سنز، لاہور ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۹۷)

''امیر خسرو کو اپنی والدہ سے بڑی محبت تھی اور وہ غالباً ہندو الاصل تھیں۔ امیر کو ہندو مذہب سے خاص واقفیت تھی۔'' (صفحہ ۲۰۲)

اپنے نانا کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ سیاہ رنگت کے تھے

زنسل عارض اسود منم آن نخت معنی

کز اصل خویشتن یک یک نشانے باز دادم من

وہ پان کے بہت شائق تھے۔ چالیس پچاس نوکر ان کے ہاں پان بنانے اور پان کھلانے پر مامور تھے۔ امورِ ملکی میں ان کا طریقہ صلح پسندی کا تھا۔ وہ اس قدر کامیاب سیاستدان تھے کہ ہر ہندو راجا کو اُلٹ کر حکومت کا وفادار یار بنا سکتے تھے۔ ان کے پاس دو سو ترک اور دو ہزار ہندوستانی غلام تھے۔ امیر خسرو کو ان پر بڑا ناز تھا

خساں را ی کنم غرق و گہر را میدہم عبرہ

ازاں ابر سیہ بین طرفہ دریائے کہ زادم من

(فٹ نوٹ، صفحہ ۲۰۳)

میرزا غالب کی پرورش ان کے نانا خواجہ غلام حسین خاں نے کی اور امیر خسرو کی ان کے نانا عماد الملک نے کی۔ ڈاکٹر وحید میرزا کو امیر خسرو کی طفلی اور لڑکپن کی کہانیاں دستیاب نہ ہوئیں۔ حافظ اور سعدی اور امیر

خسرو کی میتوں کو قبروں میں اتارنے کے بعد ان کے عزیزوں اور مریدوں کو توفیق نہ ہوئی کہ مرنے والوں کی بھرپور سوانح عمریاں لکھتے اور ان کی نجی زندگی کی معلومات ہم تک پہنچاتے۔

چنانچہ شیخ محمد اکرام صاحب اتنا ہی لکھ کر آگے چلتے بنے کہ امیر خسرو کی "والدہ ایک نومسلم رئیس کی بیٹی تھیں" اور "غالباً ہندو الاصل تھیں"۔

امیر خسرو کا میل جول اپنے ہندو اقرباء سے ضرور رہا ہوگا۔ اس میل جول کی تفصیلات جمع کر کے کوئی لکھ ڈالتا تو کہانی میں رنگینی آتی۔

ہندوستانی سنگیت کو امیر خسرو نے بہت کچھ دیا۔ یہ ان کی ماں کے ہندو الاصل ہونے ہی سے ہوا۔

امیر خسرو غزل ایسی کہتے تھے کہ غناء کے کام آئے۔ یہ کوئی چھوٹی خوبی نہیں۔ طبل اور رباب اس مطلع کی خبر پائیں تو سنگت کو دوڑے آئیں۔

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

کہا جاتا ہے کہ ستار امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ ممکن ہے یہ درست ہو لیکن آج کی ستار کی صورت ایسی مرصع، آراستہ اور پرتکلف ہے کہ یہ تاج محل کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ جو ستار امیر خسرو نے بجائی، وہ بہت سادہ ہوگی۔

دوسری گپ میراثیوں کے ہاں یہ ماری جاتی ہے کہ طبلہ امیر خسرو کی ایجاد ہے، لاحول ولا۔ طبلے کی جوڑی کی ایجاد محمد شاہی زمانے میں ہوئی۔ اس زمانے سے پہلے دھرپد اور بلمپت (آہستہ) لے کے خیال ہی گائے جاتے تھے، اب درت (تیز رفتار) خیال چالو ہوئے اور او نچے سر کا کرارا باج درکار ہوا تو طبلہ ایجاد ہوا۔

ایک بات کا ماننا البتہ آسان ہے۔ وہ یہ کہ ترانہ شکل کی راگ سرائی امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ ترانہ ستار کے باج کی نقالی کو کہتے ہیں یعنی منہ سے ستار بجانا۔ اس میں یہ مہمل تلفظات گائے جاتے ہیں:-

نا۔تا۔دِر۔دِیم۔اُو۔دا۔دھی۔دِھت۔تی۔لی۔نی۔یللے

اور طبلے کے بول مثلاً کٹ۔تک۔تٹ۔دھم۔کڑ۔تگ۔دھا وغیرہ بھی بیچ میں جڑ دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی فارسی شعر بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

ردیف تانا نا یا ہو والی فارسی غزل اور ترانہ گائیکی کی رشتہ داری ایک امرِ بدیہی ہے۔ میرزا غالبؔ کے ہاں یہ ردیف امیر خسرو کا تتبع ہے۔

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب اپنی کتاب INDIAN MUSLIMS میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو کی غزل بس غناء کے کام کی ہے، مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا، گانے کے لیے اچھی غزل کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جوئندہ

داؤد

26 June, 2000

وجیہہ!

ندیم کا ایک ذکر تو میری مثنوی کے شروع میں آیا ہے

لقب ندیم کا میرے ہے باغبان عدن
ہے اس کے دل میں فقط فکر بندوبستِ چمن
ہمیشہ مجھ سے وہ پھولوں کی بات کرتا ہے
مجھے بھی قائل ذوقِ حیات کرتا ہے
وہ اور میں ثمر فکر و فن کو دیکھتے ہیں
بہم مناظرِ صحنِ چمن کو دیکھتے ہیں

اور غزلوں میں

وہ پرانا نظام دو ہم کو
کچھ ندیمی کا کام دو ہم کو

ہم فن ندیمی کے پرستار جو ٹھہرے
ہو چین جبیں جس پہ وہ ہے کام کی صورت

نکالے جائیں گے جب یہاں سے تو نوکری پھر وہاں کریں گے
ندیم بن کر کیا کریں گے وہاں بھی اہل غضب کی خدمت

ندیم کے اصلی معنے تو ہم پیالہ دوست کے ہیں۔ ایسی دوستی کے لیے ڈکشنری میں منادمت کا لفظ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم لفظ ندیمی کو ترجیح دوگے۔

وہ شعر جس میں تقریظ کا مضمون ہے، یاد نہیں آرہا۔ سبحۂ صد دل اور ہنگامہ ہائے خلوت اور بزم نامہ کے صفحات پر اول تا آخر نظر ڈالی، وہ شعر سامنے نہ آیا۔ اب دکن کے ریختے کی غزلیں دیکھوں گا، مل گیا تو فون کر کے بتا دوں گا۔

یہ شعر میں تمہیں دو تین بار سنا چکا ہوں

نہیں نقاد مانا دل جلا ہے
غزل اک فن نہیں ہے، مشغلہ ہے

نقادوں سے ان تین شعروں میں کلام ہے

ٹپکا ہے جو زباں سے خونِ جگر ہے یہ
للہ ہم پہ حملۂ نقد و نظر نہ ہو

بہت ہے خشک تیرا تبصرہ غزلوں پہ اے ناقد
وہ دردِ دل کی باتیں ہیں، یہ دردِ سر کی باتیں ہیں

KUTABKHANA OSMANIA

نئے دکن کے ریختہ میں دو غزلیں ہیں جن کی ردیف دوستی ہے

اوّل اوّل تھی ہماری دلربا سے دوستی
اس سے جب بگڑی تو کی ہم نے خدا سے دوستی
دوستی میری ہے تم سے جانِ من، من دوستی
بوالہوس کی دوستی تو ہے فقط تن دوستی

اُمید ہے ان گیارہ گلدستوں میں تمھیں ساری مطلوبہ مثالیں مل جائیں گی۔

داؤد

1st July, 2000

وجیہہ!

بارہواں گلدستہ ارسال ہے۔ سارے گلدستے یکجا رکھو۔ ہر گلدستے کے سرورق پر ان مضمونوں کی فہرست لکھ لو جو اس میں شامل ہیں۔ اس طرح سہولت رہے گی۔

میرے پاس سب گلدستوں کی فوٹو کاپیاں محفوظ ہیں۔ صرف گلدستہ ہفتم مل نہیں رہا۔ معلوم نہیں اس کی فوٹو کاپی کیا ہوئی۔

گلدستہ یازدہم میں ردیف ''دوستی'' کی دو غزلوں کے مطلعے میں نے نقل کیے۔ ایک غزل اس ردیف کی اور دکھائی دی

ہو گئی اک شخص سے اپنی اچانک دوستی
دیکھیے جاتی ہے اب یاں سے کہاں تک دوستی

گدگدی کے مضمون کا ایک شعر اور ملا

ستا لو اچھی طرح ہاں ستا لو اچھی طرح
لگے گی چٹکیوں کے بعد گدگدی بہتر

ایک شعر ملائی والا اور ملا

اور کچھ لا نہ سکا بندہ پئے نذرانہ
آپ کے واسطے تھوڑی سی یہ بالائی ہے

ایک شعر اور

میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ بوتل ہے یہ مہنگی
اخوانِ شیاطین یہ کہتے ہیں کہ لی جائے

غزل گوئی کے دورے مجھ پر احیاناً جو پڑے تو وجہ یہ تھی کہ گانے کی سنگت کے لیے کوئی سازندے میسر نہ تھے۔ یہاں فلورڈا میں اتفاقاً ایک بہت ہی عمدہ طبلچی موجود تھا۔ تین سال اس نے میرا ساتھ دیا۔ پھر وہ بمبئی چلا گیا، اس کے جانے کے بعد میں نے غزلیں کہیں۔

دواوین کے مسودے اب پرے رکھ دو، صرف ان گلدستوں سے کام لو۔

خموش ہو جاؤ نکتہ چینو سنو یہ دوہے کبیر کے ہیں
کچھ ان کی تاثیر کم نہ ہوگی تمہاری رُوکھی اگر مگر سے

باقی فون پر، عطیہ کو سلام۔

از نسلِ قرود

داؤد

فلورڈا

29 June, 2000

وجیہہ!

دس گلدستے پہلے بھیجے جا چکے، گیارہواں گلدستہ ارسال ہے۔ اس کی فراہمی کے لیے تینوں دیوان اوّل تا آخر پڑھے۔ میری مثنوی کے یہ اشعار بھی اس گلدستے میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔

ہر اک نے بیاہ کیا کرکے گھر کا چولھا گرم
دلہن بہت ہوئی آسودہ پا کے دولھا گرم
پڑی یہ رسم پڑے ہانڈیوں میں روز نمک
مزے سے نون کے آنکھوں میں آئی اور چمک
نظر نواز نیستاں میں تازہ گنا تھا
وہ اس لیے تھا کہ حلوا ضرور بننا تھا
وہ جب نچوڑا گیا دودھ میں پڑا میٹھا
لگا وہ سب کو بہت بامزا، بڑا میٹھا
بڑھے گی پریت جہاں گڑ کی بھیلیاں ہوں گی
انھی کے گرد اکٹھی سہیلیاں ہوں گی
جو کھیل کود کے گھر آیا کھیت سے لڑکا
تو پکی دال کو ماں نے لگا دیا تڑکا

تڑکا لگانا شاید پنجابی محاورہ ہے، اہلِ زبان بگھارنا کہیں گے۔ تقریظ والا شعر فون پر تمھیں سنا دیا تھا

یہ تقریظ لکھیں گے دے کر دعا
نہ لکھیں گے رہبر میاں تبصرہ

حضرت علیؓ کے ذکر والے شعر گزشتہ گلدستے میں نقل ہوئے۔ دو شعر اور دکھائی دیے

خدا کے شیر تھے وہ اور خاکسار بھی تھے
ابو تراب بھی حضرت علیؓ کو کہتے ہیں
گوپیوں کے بول گاتا ہوں میں وقتِ سرخوشی
جب مصیبت آتی ہے تو یا علیؓ کہتا ہوں میں

KUTABKHANA OSMANIA

جویائے ہمنوا

داؤد

4 July, 2000

وجیہہ!

آج امریکہ کا یومِ آزادی ہے۔ سارا دن ہر شہر میں بینڈ والے جلوس نکلیں گے۔ وقت غروب سرکاری خرچ سے ہر شہر میں آتش بازیاں ہوں گی۔ بوسٹن کی آتش بازی دیکھنے ایک بار میں بھی شاملِ انبوہ ہوا تھا۔ یہاں بڑی آتش بازی میامی میں ہوتی ہے۔ ہمارے گھر سے چالیس میل دور۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں یعقوب کے صرف دو قصے لکھے۔ میرے غزلائے ہوئے مزاج نے اس سے زیادہ لکھنے نہ دیا۔

واسوخت میں عاشق دل کا بخار نکالتا ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو اس کو ندامت ہوتی ہے۔ غزل کا اصول یہ ہے کہ معشوق خفا ہوں تو ہوں عاشقوں کو خفا ہونے کا حق نہیں، جگر نے البتہ کہا ہے

کل وہ تھے خفا ہم سے ، اب ہم ہیں خفا ان سے
کل ان کا زمانہ تھا، آج اپنا زمانہ ہے

میرا شعر تم نے پڑھا ہوگا

تم جو بگڑو گے تو ہم تم سے سوا بگڑیں گے
حق ہمارا بھی ہے اُتنا ہی خفا ہونے کا

چند سال ہوئے۔ میں نے اپنی چند غزلیں ضیاء محی الدین کی بہن رشیدہ سلیم سیمیں کو بھیجیں۔ موصوفہ نے خط لکھ کر مجھے بعض اشعار کی داد دی اور بعض اشعار کے اسقام بتائے۔ ایک شعر ان غزلوں میں یہ تھا

یہی جی چاہتا ہے ان کی گردن توڑ کر رکھ دیں
تبسم جب نہیں کرتے سلام اہل کرم لے کر

اس شعر کو انہوں نے ناپسند کیا اور فرمایا، غزل میں ایسی سخت بات نہیں کرتے۔ انہوں نے ٹھیک کہا لیکن میں نے شعر اسی طرح رہنے دیا۔ اس شعر کو جدید واسوخت کہہ سکتے ہیں۔

آتش باز

7 July, 2000

وجیہہ!

میں نے ایک بھرپور گلدستہ "معاونِ دیباچہ" کے عنوان سے بھیجا تھا جس کے شروع میں اشاریہ بھی لگا دیا تھا۔ اس اشاریے کا فوٹو اس خط کے ساتھ نتھی کر رہا ہوں۔

اُس معاون کے بعد پانچ گلدستے اور بھیجے:-

گلدستۂ ہشتم: من و تو اور ایشاں والے اشعار

گلدستۂ نہم: شمع کا مضمون اور حضرت علی مرتضیٰ کا ذکرِ مبارک

گلدستۂ دہم: ندیم اور تقریظ کے مضمون

گلدستۂ یازدہم: (بہ عنوان نعمت خانہ)

ہانڈی، دیگ، رسوئی، مسالہ، فلفل، اچار، امچور، بالائی، حلوائی، حلوا، ضیافت، مرغوبات، ذائقہ۔

گلدستۂ دوازدہم: دوستی، بالائی، تیر، تلوار، گل و گلزار

دیباچے کے لیے جو اشعار مضمون وار تمہیں بطور مثال درکار ہوئے، سب ان گلدستوں میں جمع ہو گئے ہیں۔ ان میں مضمونوں کا وافر تنوع ہے۔ قارئین کی توجہ اس تنوع کی طرف دلاؤ اور اس انتخابِ اشعار ہی سے نتائج نکال کر دکھاؤ۔ یوں کہ تحلیلِ نفسی میں ایک وضعداری رہے۔ جیسا کہ تم فون پر کہہ رہے تھے کہ "ستر" کے لیے عربی کے الفاظ فاخرہ استعمال کیے جائیں۔ جیسے انگریزی میں لکھنے والے مقطع قلمکار لاطینی الفاظ سے کام لیتے ہیں۔

یہ کیا ضرور ہے کہ حضرتِ حوا والا شعر دیباچے میں آئے۔ ہانڈی والے دوسرے شعر بھی میری غزلوں میں ہیں جو میرے مشاغلِ طباخی کا پتہ دیتے ہیں اور میرے مشاغلِ مطبخ بقول تمہارے "مادر سے لگاؤ" کے نمائندے ہیں، اتنی تاویل کافی ہے۔

غزلوں کے شاعروں کی جسارتوں سے اغماض عام ہے لیکن نثر میں پردہ دری معاف نہیں کی جاتی، اس لیے احتیاط لازم ہے۔

میں کون ہوں کہ تمہیں کچھ بتاؤں۔ میں تو تم سے سیکھتا رہتا ہوں لیکن یہ کتاب ہم دونوں مل کر پیش کر رہے ہیں۔ اس لیے میں محتاط ہوں۔

داؤد

12 July, 2000

وجیہہ!

ٹیلی فون پر سمندر پار سے صدا زنی کی جاتی ہے تو گفتگو میں ایک بھاگڑ ہوتی ہے کہ جو کچھ کہنا ہے بلا وقفہ جلدی جلدی کہہ ڈالو لیکن تمہارے میرے درمیان کئی گفتگوئیں ایسی ہوئیں جن میں اختصار نہ تھا اور جن سے بلاغ شافی حاصل ہوا۔ ان سے مجھے تمہارے ذہن رسا اور تمہارے انوکھے اور رنگین اندازِ فکر کی واقفیت حاصل ہوئی۔ مثلاً تمہارا یہ مشاہدہ کہ اساتذہ کی غزلوں میں روایتی (مانگے تانگے) مضمون بہت ہوتے ہیں اور شاعر کے خاص اپنے وارداتِ قلبی کی باتیں کم۔

انہی گفتگوؤں کے باعث مجھے کل اپنا ایک چھوٹا سا غیر مطبوعہ مضمون یاد آیا جس کا عنوان ہے "میرزا غالب کے دو شعر" مدت ہوئی یہ مضمون میں نے یہاں فلوریڈا آ کر لکھا تھا۔ خیال تھا کہ اشاعت کے لیے کسی رسالے کے مدیر کو بھیجوں گا لیکن یہ دراز میں پڑا رہا۔ اب یاد آیا تو دراز سے نکالا اور تمہیں بھیجنے کے لیے اس کی فوٹو کاپی بنوائی، پڑھ چکو گے تو فون کے ذریعے اس پر باتیں ہوں گی:-

میرزا غالب کے دو شعر

بوسٹن میں ایک سوامی جی وہاں کے ہندوستانی میوزک سنٹر میں گانا سننے آئے۔ جب گانا ہو چکا تو

KUTABKHANA OSMANIA

میرے دوست ڈاکٹر ماتھر نے سوامی سے کہا، اب کچھ اُپدیش ہو جائے۔ سوامی جی نے انگریزی میں جو تقریر کی، اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ''ایغو یعنی نفس سب مایا ہے۔ میں میں کرتے رہنا بے فائدہ ہے۔ کوئی ''میں'' حقیقۃً موجود نہیں۔ جوگ کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ ''انا'' کا فریب توڑ دیا جائے۔''

اُپدیش ہو چکا تو سوامی جی نے فرمایا، کوئی سوال ہو تو بلاتکلف پوچھ لیا جائے۔ میوزک سنٹر کے بانی طبلہ ماسٹر تھے (طبلہ بجاتے رہنے سے خودی مضبوط ہوتی رہتی ہے) انہیں اُپدیش اچھا نہ لگا۔ بولے ''سوامی، تم نے گورو بن کر کہا کہ انا کا اثبات ایک واہمہ پر مبنی ہے۔ جس لہجہ میں تم نے اُپدیش دیا، اس سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ تمہاری انانیت مجھ پر حملہ آور ہے۔'' اس جواب میں طبلے کے سم کی سی قطعیت تھی، سوامی جی چپ ہو کر رہ گئے۔

اگر کوئی جوگی یا صوفی محسوس کرتا ہے کہ ''انا'' فریبِ محض ہے تو بہتر یہی ہے اس خیال کو اپنے ہی پاس رکھے۔ اس کا دعویٰ نہ کرے۔ اس لیے کہ ہر دعویٰ انانیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

میرزا غالب کا ایک شعر ہے

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میرزا کا یہ شعر سن کر ہم سر دھنتے ہیں۔ سر دھننے پر ایمانداری سے غور کریں تو شاید اعتراف کریں کہ سر دھنا گیا اس لیے کہ غور نہ کیا گیا۔

میرزا نے پہلے تو فرمایا ''ہم موحد ہیں'' شواہد کی روشنی میں شرح کی جائے تو شاید یہ کہا جائے کہ میرزا کا مرغوب کلمہ تھا لاموجود الااللہ۔ یعنی وہ توحیدِ وجودی کی طرف مائل تھے اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے آپ کو موحد کہا۔

سوامی کے قول اور میرزا کے قول میں ایک فرق ہے۔ میرزا سے یہ سن کر کہ ''ہم موحد ہیں'' ہم ان سے کہہ سکتے ہیں میرزا، آپ غزل کہتے ہیں۔ غزل تو ہے ہی چھیڑ کا محاورہ۔ غزلوں میں عقیدے کم اور سوانگ زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر ''ہم موحد ہیں'' سے آپ کی مراد ہے ''ہم انا نہیں رکھتے'' تو ہم کو اعتبار کیسے آئے۔ آپ تو بڑی آن تان والے آدمی ہیں۔

''ہم موحد ہیں'' کہنے کے بعد میرزا نے فرمایا ''ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم'' اس سے کیا مراد ہے، صاف سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ میرزا غالب نہایت وضعدار بزرگ تھے۔ ندیمی کے فن کے استادِ یگانہ، رسومِ دربار کی پوری سمجھ بوجھ رکھنے والے۔ فارسی زبان کی رسومِ صرف و نحو کو شاعری کی شریعت سمجھ کر ان کے پابند۔ پھر ان کا یہ فرمانا کہ
''ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم''
ایک ایسا شاعرانہ قول ہے جس پر غور کرنے سے اس پر سر دُھننا بہتر ہے۔ مشاعروں میں سر دُھنے جاتے ہیں، غور نہیں کیے جاتے۔ ممکن ہے میرزا کا اشارہ اس قول سے یہ ہو کہ ہم نماز، روزہ کے پابند نہیں ہیں اور شراب سے پرہیز نہیں کرتے۔

دوسرا مصرع یہ ہے

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ مصرع اس قابل ہے کہ نیو یارک میں موسسہ اقوامِ متحدہ کی ڈیوڑھی میں اس کا کتبہ جڑ دیا جائے۔

ملتوں کے مٹ جانے کا خیال خواب ہی خواب ہے۔ اس مضمون کی قوالی اچھی بن سکتی ہے۔ موسسہ متذکرہ کے ایوان میں قوالی کا جلسہ ہو تو بتانا پڑے گا کہ قوالی کس ملت کی نمائندگی کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کبڈی ہو یا فٹ بال، ٹیموں کے بغیر کھیل نہیں ہو سکتا۔ ٹینس کورٹ کے درمیان ایک جال کورٹ کو دو حصوں میں منقسم کرتا ہے۔ تب کھیل ممکن ہوتا ہے۔ زندگی کے بہت سے کھیلوں میں آمنا سامنا درکار ہے۔ گیند جال کو ٹاپ ٹاپ کر آتا جاتا ہے۔ کھیل کی جان ہے مقابلہ۔

میرزا مقابلہ کی اس حقیقت سے واقف نہ ہوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک موڈ میں آ کر انہوں نے یہ شعر کہہ دیا۔ موڈ کا مزا لے کر سننے والوں نے کہہ دیا، کیسا خوبصورت خیال ہے۔ واقعی خوبصورت تو ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہے کہ کہنے والا ایک ملت کا وفادار رکن نہیں ہے۔ آخر اسی شاعر نے یہ بھی کہا

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

تحریر اور تقریر دونوں میں ہم ایسے اظہار کرتے رہتے ہیں جو صرف کہنے کی باتیں ہیں۔

داؤد

20 July, 2000

وجیہہ!

آج صبح میں نے فون پر تم سے کہا کہ تمہارا

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد ہے

جو اقتباسات بارہ گلدستوں میں تمہارے سامنے ہیں، ان سب پر گفتگو لکھو تو سو ڈیڑھ سو صفحوں کا رسالہ تیار ہو جائے۔ اتنی باتیں چند صفحوں کے دیباچے میں کیسے سمائیں گی؟

تم نے جواب دیا۔ ''ہاں، چھانٹ رہا ہوں۔ فرد فرد کو اب جوڑنا شروع کر دیا ہے۔''

بات یہ ہے کہ تمہارا ذہن رنگا رنگ بتیوں سے چراغاں ہے۔ تمہیں بات سے بات سوجھتی چلی جاتی ہے۔ اس سلسلے کا انت نہیں، اس کی ایک بڑی وجہ تو ہے تمہاری روشنیٔ طبع، دوسری وجہ ہے تمہارے مطالعہ کی غیر معمولی وسعت۔

اب میری تجویز ہے کہ ساری گفتنی دیباچے میں سمیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ اس کے لیے ایک مستقل تصنیف کا تہیہ دل میں رکھو۔ دیباچے کے لیے چھوٹے پیمانے پر ایک نپی تلی تحریر تیار کر دو، اس میں صرف یہ چند باتیں ہوں:-

۱- تمہارے میرے تعلقات کی حکایت بطور تمہید
۲- میری تربیت کے دبستان:- اورینٹل کالج۔ حلقہ اربابِ ذوق اور کیمبرج یونیورسٹی
۳- میری غزل گوئی کے دورے اور ان کے درمیان طویل وقفے۔
۴- میری غزل میں عجمی انجذاب کی بجائے دوستی کا مضمون (جسے تم خلتِ ابراہیمی کہتے ہو)
۵- تماشا (ڈگڈگی)

KUTABKHANA OSMANIA

۶۔ نرگس (طنبورہ)

۷۔ "مادر" سے وابستگی

۸۔ پیوند اور گریز پیہم

۹۔ ٹھیٹ اردو کا خبط۔

تم کہو گے۔ "میرا اسلوب ایسی ترتیب کا پابند نہیں ہو سکتا۔ تحریر میں موڑ آتے رہیں گے اور رخ بدلتا رہے گا۔"

ذرا غور کرو، تم نے کئی بار یہ بھی کہا کہ دیباچہ دس پندرہ صفحوں ہی کا ہوگا۔ حساب لگاؤ کہ یہ نو عنوان جن کی فہرست اوپر درج ہے، ان میں ہر ایک پر دو دو صفحے بھی لکھو تو اٹھارہ صفحے ہو جائیں گے۔ (یہ عنوان تمہاری گفتگو ہی سے میرے حافظے میں جمع ہوئے)

ان عنوانوں کی ترتیب اختیار کرو گے تو دیباچہ دس بارہ دنوں میں مکمل ہو جائے گا۔

پہلے اس کی تکمیل سے فارغ ہو لو، اس کے بعد چند روز آرام کرو اور پھر مزے لے لے کر بلا عجلت اپنے آزاد اسلوب سے ایک کتاب تصنیف کرو، ایک بھرپور کتاب کی تصنیف سے تمہاری اُپج اچھی طرح سامنے آئے گی اور اس کی دھوم مچے گی۔

عطیہ کو سلام

غت ربود

داؤد

25 July, 2000

وجیہہ!

ایک دن فون پر تم کو نئی نئی باتیں سوجھیں تو میں نے کہا، یہ باتیں قلمبند کرنے کے لائق ہیں۔ تم نے کہا۔ "تم سے باتیں کرتے ہوئے میری طبیعت جولانی پر آتی ہے۔ اکیلے میں لکھنے کی رغبت مجھ میں نہیں۔"

اب سوچتا ہوں کاش کہ میں نے تمہاری گفتگوؤں کی ڈائری لکھی ہوتی، اب جبکہ تم نے دیباچے کے لیے قلم اٹھانا شروع کیا ہے، ایسی ڈائری کتنی مفید ہوتی!

تاش کے پتوں والا سانچہ تو تمہارے ذہن میں ہے ہی، اب یہ دیکھنے کا مجھے اشتیاق ہے کہ اس سانچے کے اندر تم اپنے افکار کو اور تاویلات کو کس طرح سمیٹتے ہو۔

عنوانوں کی جو فہرست پچھلے دنوں میں نے بھیجی، اسے بھیجنے کے بعد تین چار اور عنوان یاد آئے:۔

(۱) بانسری:

تم نے ترقی اور تفریح والا مضمون پڑھ کر مجھے فون کیا تھا اور پوچھا تھا کینیڈا میں تم نے کیا مضمون پڑھائے؟ میں نے بتایا تھا، اُردو ادبیات اور تاریخ مسلمانانِ ہند۔ یہ سن کر تم نے کہا تھا "تفریح والا مضمون لکھ کر تم نے اُردو والوں کو اپنی بانسری سنائی (یعنی انہیں بہلایا) اور کینیڈا میں اردو ادب پڑھایا تو گویا وہاں کے طلبہ کو بانسری سنائی۔"

(۲) بیساختگی نہ کہ عملِ چغتائی:

آج سے دو سال پہلے تم نے دو تین دفعہ مجھ سے کہا، تمہاری شاعری عملِ چغتائی نہیں یعنی اس میں بے ساختگی ہے، بناوٹ والی بات نہیں۔

(۳) خود کلامی:

کئی مہینے ہوئے تم نے فون پر کہا "تمہاری غزل میں مارٹن بیوبر والی "من و تو" بہت ہے، تم اس سے متاثر معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا، یہ تو ارڈ ہے۔

پھر پچھلے دنوں تم نے میرے داغ والے مضمون میں میرا یہ جملہ پڑھا "دنیا بھر کی شاعری میں گفتگو کی شاعری غزل ہی ہے۔" اسے پڑھ کر تم نے مجھ سے کہا "غزل میں جو گفتگو ہوتی ہے، لگتا تو یوں ہے کہ دوسروں سے ہے لیکن درحقیقت وہ شاعر کی خود کلامی ہوتی ہے۔"

(۴) خواہان ایشان (یعنی گریزاں)

میرے ہاں ایشان کے مضمون کو تم "گریز" سے تعبیر کرتے ہو (اس پر کچھ لکھنا چاہو تو بزمناے پر ایک نظر دوڑاؤ۔)

عنوانوں کی جو فہرست میں نے بھیجی تھی اس کی نقل بھیج رہا ہوں۔ اس میں یہ چار عنوان میں نے بڑھا دیئے ہیں۔

اس بات کی داد دو کہ تمہاری باتیں مجھے یاد رہیں۔

عطیہ کو سلام

غت ربود

داؤد

14 August, 2000

وجیہہ!

وہ شخص کیسا قیافہ شناس تھا جس نے تمہارے موڈل ٹاؤن والے گھر میں رات کو لالٹین تمہارے چہرے کے پاس لا کر تمہارا چہرہ دیکھا تھا اور دیکھ کر کہا تھا "اس بچے کو برٹرنڈ رسل والے سکول میں تعلیم کے لیے لندن بھیج دیجیے۔"

تمہارے ہاں سوچ کی اُڑان جو کبھی ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ جاتا ہوں، یہ بات تم میں وسعتِ مطالعہ اور کثرتِ مشاہدہ سے آئی ہے اور تم غواص دریائے معانی بھی ہو۔ یہ بات تم نے علم النفس کے مطالعہ سے پائی ہے۔ یہ بات حلقہ اربابِ ذوق کو معلوم ہونی چاہیے کہ میراجی اپنی نظموں کی تاویلات کے لیے تم سے رجوع کیا کرتے تھے۔

تمہاری سوچ تحلیلِ نفسی کی سطح پر ہوتی ہے۔ اس سطح پر میں نہیں سوچ سکتا۔ مثلاً میرے اس مصرع کو پڑھ کر کہ

ہو گئے بالغ کوئی کرتا نہیں اب گدگدی

KUTABKHANA OSMANIA

تم نے جھٹ کہہ دیا، اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ اب کھڑا نہیں ہوتا، ایسی تاویل تمہی کو سوجھے گی۔

تمہارے دیباچے کا سانچہ سوچ کر میں نے ایک تحریر تیار کی ہے۔ اس میں گلدستوں میں سے چن کر جو اقتباسات میں نے شامل کیے ہیں، دیباچے کے لیے اتنے ہی کافی ہوں گے۔ اس کے شروع کے سات صفحے ضرور تمہارے کام آئیں گے۔ گلدستوں والے ڈبے میں یہ تحریر بھی محفوظ کرلو۔

لحن آمادہ

داؤد

27 August, 2000

وجیہہ!

اگر میں کہوں کہ میری زندگی ریاضت کی زندگی رہی ہے تو یہ مبالغہ ہوگا۔ معمولی مزدور جو اینٹیں ڈھونے کا کام کرتے ہیں اور مزارعین جو سال میں دو دفعہ ہل چلاتے ہیں، ان کی مشقت کے مقابلے میں میری محنت کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور قلمکاری کو دیکھا جائے تو اس میں بھی میں نے کوئی تپسیا نہیں کی۔ بوسٹن کے ایک کتب فروش کے ہاں میں نے والٹیئر کی نگارشات کا ایک سیٹ دیکھا، بانوے جلدوں میں۔ (کاش یہ سیکنڈ ہینڈ سیٹ جو پچاس ڈالر میں بکاؤ تھا، میں نے خرید لیا ہوتا۔) مختلف زبانوں میں کیسے کیسے پرگو شاعر اور کیسے کیسے پرنویس نثر نگار ہو گزرے ہیں۔

جوانی میں جم کر اگر میں نے کسی فن میں ریاض کیا تو وہ راگ سرائی کا فن ہے۔ ساٹھ ستر راگ صحیح خوانی کے ساتھ گا سکتا ہوں اور ان میں اتنی ہی تعداد میں میں نے خود خیال کی بندشیں بنائی ہیں لیکن اس ریاض کو بھی میں ریاضت نہ کہوں گا، لگن البتہ کہوں گا۔ اس لگن میں مشقت نہ تھی، تفریح تھی۔

میری مکتوب نویسی تمہیں معلوم ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں تمہیں جو خط لکھے، سب کی فوٹو کاپیاں میرے پاس ہیں، کل انہیں پڑھ کر لطف اندوز ہوا۔ ''سلام و پیام'' کی اشاعت ۱۹۹۳ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سات برسوں میں اتنے خط لکھے کہ ''سلام و پیام'' کی جلد دوم کا مسالہ موجود ہو گیا۔

جو کچھ کیا مزا لے کر کیا، دیکھو میں نے اپنی منظومات کے مسودے کیسے صاف ستھرے بھیجے، نثر کے مسودے جو لاہور بھیجے، وہ بھی اتنے ہی ستھرے تھے۔ میں جب اشاعت کے لیے لکھتا ہوں، پہلے خطِ شکستہ میں اس کا ڈرافٹ تیار کرتا ہوں اور پھر مبیضہ لکھا جاتا ہے یعنی دُہری محنت ہوتی ہے لیکن صاف ستھری تحریر بھیج کر مجھے راحت ملتی ہے۔

کلیات کی طباعت شروع ہوئی تو اس میں بھی لگن رہی۔ پہلے مسودے کے انڈکس بنائے، پھر ہر گلدستہ جو بنایا، اس کے لیے تینوں دیوان پڑھے۔ پھر پروف آنے شروع ہوئے۔ تین بار ۲۶۷ صفحات کے پروف پڑھے، پھر پروفوں سے طباعت کے لیے غزلوں کے انڈکس بنائے۔ تمہاری حوصلہ افزائی سے اور شرکت سے ان کاموں کی توفیق ہوئی۔

تمہاری شفقت ہے کہ بینائی کی معذوری کے باوجود تم نے میری تمام منظومات اور نثری آثار کو شوق سے پڑھا اور طباعت کے انتظام کی نگرانی کی اور دیباچے کو روح دار بنانے کے لیے گیان دھیان میں رہے اور اس کے لیے ریسرچ بھی کرتے رہے۔ مولانا کی روح تم سے کہہ رہی ہے۔ آفرین۔

اُمید ہے میرے اس خط کے پہنچنے تک تمہارا قلم منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوگا۔ اپنے سعادت مند ملازم سے کہو کہیں سے گتے کا ایک بڑا ڈبہ لائے۔ اس میں سارے گلدستے یکجا کر کے ڈبہ صوفے کے قریب رکھ لو۔

تیر اور تلوار کے مضمون میری غزلوں میں کمیاب ہیں، جو ہیں وہ میں نے گلدستۂ دوازدہم میں نقل کر دیے تھے۔

گلدستوں کا ایک انڈکس بھی میں نے تمہیں بھیجا تھا۔ اس سے کام لو تو آسانی ہوگی۔ اس انڈکس کی کاپی پھر بھیج رہا ہوں۔ عطیہ کو سلام۔

تمہارا برخوردار

داؤد

4 September, 2000

وجیہہ!

پطرس کے بھائی ذوالفقار علی بخاری کا ایک شعر بہت مشہور ہے

میں کچھ کچھ دیوانہ بھی ہوں اور کچھ کچھ فرزانہ بھی
مجھ پر دونوں تنگ ہوئے ہیں بستی بھی ویرانہ بھی

شاید میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے، تحلیل نفسی کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ یہ تضادات کی ٹوہ لیتی ہے۔ میری حیاتِ مستعار میں اور میرے کلام میں اور میرے قول و فعل میں اگر تمہیں تضادات دکھائی دیے ہیں تو شوق سے اپنی تحریر میں ان کا پتہ دو، بشریت کے شواہد تضادات ہی تو ہوتے ہیں (اور مہملات بھی) مہملات کی ایک اور مثال کا تم مزا لوگے

خود شناسی نہیں ہے خود سازی
نہیں دشوار انتخاب لقب

(سبحہ صد دل)

لقب سے میری مراد اس شعر میں تخلص ہے یعنی میں نے رہبر تو رکھ لیا اور یہ خود سازی کی ایک ناکام کوشش تھی۔ یہ خود سازی، خود شناسی سے بہرہ مند نہ تھی۔ ہاں شیر خواری کا ایک شعر اور یاد آیا

خیال شیریں کے ہیں شغل تیشہ کاری کے
نہ واپس آئیں گے ایام شیر خواری کے

(سبحہ صد دل)

کولوکیم (Colloquium) میں میرے مقالے پر جو ہنگامہ ہوا، اس کی روداد آج سے کئی برس پہلے میں نے انگریزی میں لکھی تھی، وہ ارسال ہے۔

عطیہ کو سلام۔

طفلِ ناداں

داؤد

19 September, 2000

وجیہہ!

بدن کا حسن ہے سب مستعار چہرے سے
نظر نہ جائے گی نیچے ہماری گردن سے

اس شعر میں ترفع کا جواد عاہے، دیکھیں اس کا تجزیہ تم کیا کرتے ہو۔ انجذاب سے گریز کی ایک اور مثال آج یاد آئی

کچھ عاشقی میں بوسۂ لب کا نہیں ہے کام
صوفی کو ہے خبر کہ نہیں ہے دہانِ جذب

یہ شعر سبحہ کُصد دل میں ہے، میرا خیال ہے کہ سازی غزل میں تمہاری دلچسپی ہوگی۔ اس لیے کہ اس میں ردیف ''جذب'' ہے۔

کیسی ہشیار تھی جو لعبت چیں مجھ پہ گری
یعنی کچھ کرکے نشانے میں کمی مجھ پہ گری

یہ شعر بھی تاویل چاہتا ہے۔ اس کی تاویل تم نے مجھ سے پوچھی تھی۔ میں نے دماغ لڑا کر کہا تھا کہ لعبت چیں نے چاہا کہ میں اسے چاہوں لیکن یہ اس کی طرف سے بس ایک چھیڑ تھی۔ اس نے اپنے بچاؤ (اپنے فرار) کی گنجائش رکھی۔

اس شعر پر یاروں کا اعتراض ہوگا کہ کمی کا قافیہ چیں، یہیں اور ہمیں سے ملانا غلط ہے۔ ایسے قافیے کے حق میں میری دلیل یہ ہے کہ کمی کا تلفظ آزما کر دیکھ لو، اس کا تلفظ نون غنے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

بائرن کی نظم DON JUAN میں اس نوع کے قافیے بکثرت ہیں۔

لو، اب ستمبر بھی گزر گیا۔ اب دیباچہ مکمل کر ڈالو، اسے میری بے صبری نہ کہو میری بے تابی کہو۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کلیات کا سہرا کن پھولوں سے تیار ہوا۔

بیتاب دین

وجیہہ!

میرے پاس مصورانِ یورپ کے مشہور عالم شاہکاروں کی ایک کتاب ہے۔ وین گو (VAN GOGH) کی بنائی ہوئی ایک ہی تصویر کا پرنٹ اس میں ہے اور اتفاق سے یہ اسی تصویر کا ہے جس کا تمہیں خیال آیا تھا لیکن یہ تصویر تو سورج مکھی کے گلدستے کی ہے۔ گلِ داؤدی کے گلدستے کی نہیں۔ تصویر کے پہلو میں اس کا جو عنوان چھپا ہوا ہے CHRYSANTHEMUM نہیں ہے SUN FLOWERS ہے۔

گلِ داؤدی کے گلدستے کا کوئی عمدہ رنگین فوٹو بڑی آسانی سے مل جائے گا۔ آج ایک کتب فروش کی دکان میں جا کر باغبانی کے رسالوں کی ورق گردانی کروں گا۔ ان میں گلِ داؤدی کا فوٹو نہ ملا تو کسی گل فروش کی

دکان میں جا کر خود فوٹو کھینچ لوں گا۔ کہو تو اس فوٹو میں مالن کو بھی شامل کر لوں؟

داؤد۔

30 September, 2000

وجیہہ!

فون کی پچھلی گفتگو سے معلوم ہوا کہ دو مضمونوں کے اشعار برائے مثال تمہیں درکار ہیں:۔ (۱) چھونا اور (۲) الٹا ہونا۔ میں فون پر پوچھ نہ سکا، چھونے کی خواہش والے اشعار نکالوں یا چھونے سے گریزاں ہونے والے اشعار؟

پھر یہ پوچھ نہ پایا کہ ''الٹا ہونے'' سے تمہاری مراد کیا ہے؟ میرا اپنا الٹا (ٹیڑھا؟) ہونا یا یار کا الٹا ہونا یا زمانے کا الٹا ہونا؟

میرا حافظہ نہ دوسروں کے کلام کے لیے اچھا ہے نہ اپنے کلام کے لیے۔ گزشتہ دو تین برسوں میں اپنے کلام کے مسودے صاف کرنے، ان کے اشاریے تیار کرنے اور پھر تین بار کلیات کے پروف پڑھنے (اور بارہ گلدستے تیار کرنے) کے بعد اب جی میں کہتا ہوں غزل گوئی یعنی ہذیان کے جو تین چار دورے مجھ پر پڑے، ان کی یاد کہاں تک تازہ کرتا رہوں۔ اب جی چاہتا ہے کہ دوسروں کے فرمودات پڑھوں اور سنوں یا پھر طبلے اور ہارمونیم کی سنگت ملے اور کچھ گانا بجانا ہو جائے۔

بائبل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا کردار جس پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ اس سے اسلامی دنیا کے عامتہ الناس تو درکنار خواص الناس بھی کم ہی آشنا ہیں اور اگر ہوں بھی تو ان روایتوں کو سن کر نعوذ باللہ کہیں گے۔ اسلامی عقیدے میں بر بنائے آیات کلام مجید انبیاء سب کے سب بلا استثنےٰ معصوم ہیں۔ اُمید ہے تم نے اپنی تحریر میں اس کا خیال رکھا ہوگا۔ قرآن مجید میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام غزلیں کہتے تھے۔ اب مطلوبہ اشعار نقل کرتا ہوں:۔

چھونے کا مضمون

جلوہ اک تعبیر دیوار حرم
خلوت اک کیف خیال لمس و مس
ہاتھ میرا چھو گیا اک روز ان کے ہاتھ سے
یوں لگا مجھ کو کہ بجلی کا لگا جھٹکا مجھے
گرتے ہوئے گر ہو انہیں مطلوب سنبھلنا
مل جائے ہمیں ہاتھ پکڑنے کا بہانہ
عمر بھر یار نے چھونے نہ دیا ہاتھ اپنا
ہائے کس عمر میں ہے لمس کی دعوت آئی
مطرب نے ابھی تار سے ہے تار ملایا
تم نے نہیں رخسار سے رخسار ملایا

KUTABKHANA OSMANIA

اُلٹا پن

سیدھا ہونا مرا ہے مشکل
پیدا ہوا میں جناب اُلٹا
یہ راہبر حضور ہے غلط گھڑت کا آدمی
کرے گا اُلٹی بات ہی یہ اُلٹی مت کا آدمی

غت ربود

داؤد

24 October, 2000

وجیہہ!

بوسٹن میں کتابوں کی دو سب سے بڑی دکانوں میں وین گو کی مصوری دیکھی۔ وہاں کے فائن آرٹس میوزیم کے اندر بھی آرٹ کی منتخب کتابیں ایک دکان میں بکتی ہیں۔ وین گو کے آرٹ کے البم تینوں دکانوں میں پائے۔ ان کی ورق گردانی کی اور ان کے اخیر میں جو انڈکس ہیں، ان پر بھی نظر ڈالی۔ گلِ داؤدی (CHRYSANTHEMUM) کا اندراج ان میں نہ ملا۔ سورج مکھی (SUN FLOWER) کی تین چار تصویریں البتہ ہر مجموعے میں ملیں۔

گل داؤدی کی مشابہت گلنار (CARNATION) سے ہے۔ اس کی کوئی تصویر بھی ان مجموعوں میں نہ ملی۔

چنانچہ میں نے باغبانی کے رسالوں سے رجوع کیا۔ ان میں بھی گلِ داؤدی کی تصویریں کمیاب ہیں۔ کل پرانی کتابوں اور رسالوں کی ایک دکان میں پھولوں کی تصویروں کا ایک پرانا مرقع ملا۔ اس میں گلِ داؤدی کا ایک رنگین فوٹو دکھائی دیا۔ یہ اس فوٹو سے کہیں بہتر ہے جو میں نے چند روز پہلے بھیجا تھا۔ کلیات کے گرد پوش کے لیے یہ تصویر اچھی ہے۔ میرا فوٹو شامل کرو تو اسے کتاب کے اندر جگہ دینا۔ گلِ داؤدی کا فوٹو باہر اور میرا فوٹو اندر۔

وین گو (VAN GOGH) کا تلفظ مجھے معلوم نہ تھا۔ اس لیے پچھلے خط میں میں نے فون گوغ لکھ دیا تھا۔

میں بوسٹن کے میوزیم میں پہنچا تو وین گو کی مصوری کی ایک نمائش وہاں جاری تھی۔ اس کے آرٹ کی آج کل دھوم مچی ہوئی ہے۔

اپنے دیباچے میں بتا دینا کہ گرد پوش کے لیے گل داؤدی کا فوٹو کیوں چنا گیا۔

عطیہ کو سلام

مکافات کا طالب

داؤد

28 October, 2000

وجیہہ!

گزشتہ چند روز ٹیلی فون پر جو گفتگوئیں ہوئیں، ان سے معلوم ہوا کہ اب تمہاری سوچ میں پھیلاؤ کی بجائے ارتکاز آ گیا ہے اور تمہاری توجہ جن باتوں پر ہے، وہ یہ ہیں:۔

(۱) تغزل کا آغاز غزل الغزلات سے ہوا جو حضرت سلیمان سے منسوب ہے۔ بائبل کے بیان کی رو سے حضرت سلیمان نے اپنے حرم کو متفرق اقوام کی عورتوں سے بھر لیا تھا۔

(۲) عجم میں تصوف اور تغزل کا پیدا ہونا عربوں کے تسلط سے نپٹنے کے لیے ہوا۔

(۳) غزل اساساً رندی (تشرب اور تعشق) کی شاعری ہے۔ لذتِ گناہ اور خوفِ گناہ اس کے خاص مضمون ہیں۔ عقاید کی جکڑ سے آزادی کی خواہش، احتجاج، برگشتگی اور حیرت۔ یہ احوال ہیں جن کے اظہار کا کام غزل سے لیا گیا ہے۔

(۴) بعض شاعر متکلم ہوتے ہیں۔ بعض خود کلام، تکلم والے غزل گو سامعین کے نباض اور چارہ گر ہوتے ہیں۔ خود کلام غزل گو اپنی شفا کے لیے شعر کہتے ہیں۔ تکلم اور خود کلامی ایک ہی شاعر کے ہاں بھی ہو سکتی ہے۔

میری غزلیں پڑھ کر تم نے نتیجہ نکالا کہ:۔

(۱) داؤد نے زندگی کو "دھرمایا" نہیں "ڈرامایا" ہے۔

(۲) اس کے ہاں پوجا اور عشق سے گریز ہے۔ "اُو" کی بجائے "ایشاں" سے تعلق ہے۔ عاشقانہ شدت نہیں، دوستانہ دھیما پن ہے۔ اس نے آزادی چاہی اور پیوند چاہا۔

(۳) اس کی غزل میں سنجیدہ مضامین کے ساتھ ساتھ مداری پن ہے۔ ڈگڈگی، خیال کی قلابازی اور تفنن۔

(۴) اس نے اپنی شاعری سے معمولی بشریت کی نمائندگی کی ہے۔ اب التماس ہے کہ انہی نکات تک تحریر کو محدود رکھو تا کہ دیباچہ جلد مکمل ہو جائے۔

داؤد

30 October, 2000

وجیہہ!

کیا ہر شاعر کا خاص اپنا ہاتف نہیں ہوتا؟ کیا ہر شاعر کے ہاتف دو ہوتے ہیں؟ ایک جن اور ایک فرشتہ؟ یا ایک ہی ہاتف کبھی جن ہو کر بات بجھاتا ہے اور کبھی فرشتہ ہو کر؟

تخلیقِ آدم کے زمانے میں ابلیس فرشتہ تھا یا جن؟ اللہ تعالیٰ نے سارے فرشتوں کو حکم دیا آدم کو سجدہ کرو، سب نے کیا سوائے ابلیس کے تو گویا ابلیس بھی فرشتوں میں سے ایک تھا، یہاں آ کر آیت کہتی ہے:۔

الاَ ابلیس، و کان من الجن

کان من الجن کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے:۔

"ارے، یہ تو جن نکلا!"

آج صبح تم سے جنوں کی باتیں ہوئیں، کل امریکہ میں ہیلووین یعنی جنات اور چڑیلوں کا تہوار ہے۔ مسیح کے ماننے والے ایک شام روح القدس کی حمد سے چھٹی منائیں گے۔

تمہاری باتوں سے آج صبح جی بہلا۔ حضرت یونس علیہ السلام کا وقتی گریز نبوت سے ولایت کی

KUTABKHANA OSMANIA

طرف اور رسول پاک کا میلان ولایت سے نبوت کی طرف، شیخ الاکبر کی معشوقہ، مولوی معنوی کے معشوق، جنوں کی صفتیں (طاقت اور جنون) ہابیل کے مقتول ہونے پر پیغمبر اولین حضرت آدم علیہ السلام کی مرثیہ گوئی اور اس سے ان کی بشریت کا عیاں ہونا، قبل از اسلام کے مکہ کی وحشت اور آغاز اسلام والے مدینہ کی مدنیت (تمدن) کی سورتوں کی گرمی اور مدنی آیات کی ٹھنڈک، سیرتِ محمدی میں اول اول ولایت کا رنگ زیادہ اور بعد میں نبوت کا رنگ زیادہ۔

یہ مزیدار باتیں تم سے سن کر گھر سے نکلا اور میکڈانلڈ میں آ بیٹھا، یہاں کافی پی رہا ہوں اور تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

کیر کے گارڈ کی مثال بھی اس تحریر میں لاؤ، اس نے بانگ دی تھی کہ حی علی العبودیت اور شاعری سے باز آؤ۔ ادھر اقبال نے فرمایا، عبد ہو کر رہنا ہے تو تصوف سے باز آؤ۔

حضرت یونس کے ذکر سے تمہیں مولانا حالی کا یہ شعر خوب یاد آیا ؎

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

کچھ شعر اس وقت اپنے یاد آ رہے ہیں ؎

کیسے کہیں کہ جاری ہیں شیطاں سے رسم و راہ
پرساں ہیں سارے دوست مزاج شریف کے
(سبحہ صد دل)

میرے ریختے والے دیوان میں ایک غزل ہے۔ پوری غزل لاابالی پن کی قوالی ہے ؎

کہا درویش نے اُٹھ کر، میاں کیا فرق پڑتا ہے
یہاں بیٹھے ہوں یا بیٹھے وہاں، کیا فرق پڑتا ہے
ہے یہ بھی ایک پہنائی، ہے وہ بھی ایک پہنائی
ہو پہلا یا ہو چوتھا آسماں، کیا فرق پڑتا ہے

تمہاری باتیں سن کر مجھ پر کھلا کہ تحلیلِ نفسی طلسم توڑتی ہے اور طلسم باندھتی بھی ہے، اس کا اپنا جادو چڑھ کر بولتا ہے۔

گفتنِ ناگفتہ بہ کی ترکیب عمدہ ہے۔ اسے سن کر مجھے اس کا قافیہ سوجھا۔ سفتنِ ناسفتہ بہ قابل رحم ہیں وہ بیچارے جو سفتنِ ناسفتہ بہ میں مشغول رہ کر زندگی گزار رہے ہیں۔

اس خط کے ساتھ وہ خط بھی ملفوف ہے جو پرسوں لکھا تھا۔

عطیہ کو سلام

تمہارے خرمنِ خیال کا خوشہ چیں

داؤد

1st November, 2000

وجیہہ!

ان دنوں میرے خطوط کا تانتا تمہیں ان اشعار کی یاد دلانے کے لیے لگا رہا جن کو پڑھ کر تم نے مجھے فون کیا اور کہا کہ یہ مفید مطلب ہیں اور دیباچے میں اقتباس کے لائق ہیں۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

دو زیور پہنائے رہبر ہم نے ایک سہاگن کو
مقطع ہے پازیب غزل کی، مطلع اس کا جھومر ہے

تم نے کہا "یہ شعر کہتے ہوئے تمہارے تحت الشعور میں طوائف جلوہ فگن تھی، طوائف آزادی کی نمائندہ ہوتی ہے، اپنی کمائی کھاتی ہے۔"

دوسرا شعر ؎

گلے کا طوق وہ خود بن گئی چلی ہمراہ
جو راہبر نے خریدے وہ ہار مالن سے

تیسرا ؎

گلی سے اچھوتوں کی بچ کر برہمن
تمہیں آنکھ کوئی چمارن نہ مارے

میرے یہ دونوں شعر مجھے سنا کر تم نے کہا "مالن اور چمارن کی سوچ پتہ دے رہی ہے کہ تم مقتدر طبقات کی نازنینوں کے قابو میں نہیں آنا چاہتے۔" وہی گریز اور آزادی کی بات۔

امید ہے یہ شعر تمہاری تحریر میں آ چکے ہوں گے، گلدستوں کے علاوہ میرے خطوط پر بھی نظر دوڑاؤ۔ بعض خطوط میں میں نے وہ اشعار سپلائی کیے ہیں جن کی برائے مثال تم کو طلب تھی۔

گفتنی کے سمیٹنے کو اب تمہاری طبیعت مستعد ہے۔ کچھ عبارت جو تم نے فون پر پڑھ کر سنائی مجھے بہت اچھی لگی۔

عطیہ کو سلام

داؤد

6 November, 2000

وجیہہ!

وہ کون سا شجر تھا جس کے پاس جانے سے اللہ نے آدم و حوا کو منع کیا تھا۔ اس کی بابت امام طبری نے اپنی تفسیر میں چند روایتیں جمع کی ہیں۔ کچھ روایتیں کہتی ہیں یہ درخت سنبل کا تھا، کچھ کہتی ہیں املی (حمر) کا تھا اور کچھ کہتی ہیں گیہوں (بر، حطہ) کا پودا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ کوئی درخت ہے جس کا پھل فرشتے اس امید میں کھاتے ہیں کہ اس کے کھانے سے انہیں حیاتِ جاودانی حاصل ہوگی۔ امام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ گیہوں والی روایت یہود میں مقبول ہے۔

امام صاحب کی اپنی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں کسی نوع کے درخت کی تعیین نہیں تو یہ سوال اُٹھانا

بے سود ہے کہ درخت اِملی کا تھا یا پودا گیہوں کا یا بیل انگور کی۔ آیت کا مطلب بس یہ ہے کہ اللہ کا ایک فرمان تھا جس کی تعمیل نہ ہوئی۔

داؤد

14 November, 2000

وجیہہ!

گلستاں میں ایک حکایت ہے کہ ایک بادشاہ نے مخمور ہو کر با آواز بلند کہا۔

مارا بجہان خوشتر ازیں یکدم نیست
کز نیک و بد اندیشہ واز کس غم نیست

محل کی کھڑکی کھلی تھی۔ باہر ایک درویش برہنہ کو جو سردی سے سکڑ رہا تھا، بادشاہ کی یہ بات سنائی دی۔ پکار کر بولا۔

اے آنکہ باقبالِ تو درعالم نیست
گیرم کہ غمت نیست، غمِ ماہم نیست؟

اس شعر کا دوسرا مصرع استفہامیہ ہے۔ علامت استفہام (؟) نہ لگی ہو تو بعض پڑھنے والے چکرائیں گے۔

میرزا غالب کا ایک شعر ہے۔

شعرِ غالب نبود وحی و نگوئیم ولے
تو و یزدان نتوان گفت کہ الہامے نیست؟

کلیاتِ غالب (فارسی) کا ایڈیشن شیخ مبارک علی نے نکالا تو اس کا دیباچہ مولوی غلام رسول مہر سے لکھوایا۔ مہر صاحب نے اس دیباچے کا آغاز میرزا کے اسی شعر سے کیا ہے۔ ان کے ذہن رسا نے دوسرے مصرعے پر ذرا سا غور کیا تو اس کا استفہامیہ ہونا ان پر کھلا اور اس کے آگے انہوں نے علامت استفہام (؟) لگا دی۔

وحی نبیوں پر اتری، الہام ولیوں کو ہوئے۔ شاعروں کے حصے میں آئی صرف ہاتف کی غنرغوں۔
کلیاتِ غالب کے آخر میں میرزا غالب کی اپنی لکھی ہوئی تقریظ ہے جو اس رباعی پر ختم ہوتی ہے۔

گر ذوق سخن بدہر آئین بودے
دیوان مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر این فنِ سخن دین بودے
آن دین را ایزدی کتاب این بودے

"این فنِ سخن" کی جگہ اگر "این فنِ غزل" پڑھیں تو بات اچھی طرح ہمارے کام کی نکلے۔
ایک روز تم نے میرا یہ قول پڑھ کر کہ "تغزل بجائے خود ایک مذہب ہے" مجھ سے کہا تھا "نہیں، تغزل تو ترکِ مذہب ہے۔" یعنی آزاد خیالی، پھر کل فون پر تم نے کہا "تغزل دین الادیان ہے" یعنی بڑی گنجائش والا دین، پھر تم نے میرزا کا یہ شعر بھی سنایا۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میرزا کی یہ فارسی رباعی اور ان کا یہ اردو شعر دونوں چیزیں دیباچے میں لاؤ تو خوب ہو۔
چودھواں گلدستہ ارسال ہے۔ عطیہ کو سلام۔

ناواجب الوجود
داؤد

9 December, 2000

وجیہہ!

میراجی نے تو تمہیں خود ہی بتا دیا تھا کہ ان کی نظم میں دھار تلوار کی نہ تھی "شلوار" کی تھی۔ اب تم نے مجھ سے پوچھا "تمہیں اپنا یہ شعر کیوں اس قدر پسند ہے۔

کس قدر جنوں آور خواب میں نے دیکھا ہے
عشق کے کہستاں میں شورِ آبشارِ مے"
(سبحہ صد دل)

ہاتف کی غنرغوں کی شرح میں کیسے کروں لیکن کون ہے جس کے دل و دماغ میں آبشار دیکھ کر سنسنی نہیں ہوتی۔ خیال آیا کہ پانی کی دیوانہ وار تندی سنسنی کی انتہا کے لیے کافی نہیں۔ آبشار شراب کی ہو اور کہستانِ عشق سے اس کا سقوط ہو تو تندی اور دیوانگی کا حق ادا ہو۔
ایک اور شعر، یہ بھی سبحہ صد دل میں ہے۔

آنے پہ قیامت کے خم کھول اٹھے سارے
اڑنے لگے ہر جانب انگور کے انگارے

اقبال نے اپنے فارسی کلام میں کہیں فرمایا (شاید اسرار خودی میں) کہ پروانہ وہ نہیں جو شمع کی لو پر جان دے، پروانہ وہ ہے جو شعلے کو نگل جائے۔ اب میرا یہ شعر دیکھو۔

کہا دنیا نے عجب شد دلِ عاشق نہ تپید
گرچہ کچھ لمحے ملے اس کو بہ قلبِ خورشید
(سبحہ صد دل)

یعنی خورشید کے قلب میں چند لمحے رہ کر عاشق بھسم نہ ہوا۔ صحیح و سالم وہاں سے نکل آیا۔ اس کی ہمت نے محال کو ممکن کر دکھایا۔ ایک اور شعر۔

ہمت کو اک لگاؤ ہے فرضِ محال سے
اب تجھ کو دیکھنا چاہیے چشمِ غزال سے

میں اس سوچ کا مزا لیا کرتا ہوں کہ کرۂ ارض مٹی اور پتھر بننے سے پہلے آگ کا گولہ تھا۔ چنانچہ آج

جہاں آبشار نیاگرا کے پانی نیچے کو چھلانگیں مار رہے ہیں، عین وہیں ایک جگہ میں شعلے اُوپر کو چھلانگیں مار رہے تھے اور پھر اس کا الٹ بھی ہوا یعنی پانی پھر آگ میں متحول ہو گیا

ہے آبشار سے زُود، آبیاری سے انگور
اور اس کے دانے کا افشردہ شربت مشہور
ہوئے ہیں آب میں یکجان ناری و نوری
شراب بن کے ہوئی حسرت آگ کی پوری
(مثنوی آسمان پیداست)

اگر چاہو تو اپنا حاشیہ میرے اس خط پر چڑھا کر اسے دیباچے میں نقل کرو۔

عطیہ کو سلام

داؤد

12 December, 2000

وجیہہ!

معلوم ہوا کہ تمہارا قلم آمد سے چلتا ہے، آورد سے نہیں۔ مشہور نظریہ یہ ہے کہ غزل کی روایت تشبیب سے مربوط ہے۔ تمہارے سوا کسی کو خیال نہ آیا کہ غزل گوئی حضرت سلیمان علیہ السلام سے شروع ہوئی۔ حضرت سلیمان کی حنغولانہ سیرت کی چھان بین کے لیے تم نے تفسیروں کو کھنگالا، فصوص الحکم، تفسیر عزیزی اور سطعات سے شواہد کی جمع آوری کی۔ مولانا حالی کا دھیان ادھر نہ گیا۔

اجتماع ضدین کے مضمون والے اشعار کا گلدستہ بنا کر بھیج رہا ہوں۔ تم مجھ سے کہتے ہو، زیادہ مثالیں تلاش نہ کرو۔ دو چار مثالیں کافی ہوں گی۔ میرا حال یہ ہے کہ جب تک تینوں دیوانوں پر اوّل تا آخر نظر نہ دوڑاؤں میری تشفی نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ورق گردانی کرتے ہوئے بہترین مثالیں شروع میں نہیں بلکہ بہت آگے چل کر ملیں۔

راگ بہار کی ایجاد امیر خسرو سے منسوب ہے۔ اس کے ایک خیال کے یہ بول بھی انہی سے منسوب ہیں

آستھائی:- حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال
پیش خواجہ تم بن ٹھن آئے
حضرت رسولؐ صاحب جمال

انترہ:- عرب یار تیرو، بسنت منائیو
سدا رکھیو لال گلال

آستھائی میں حضورؐ سے کہا جا رہا ہے آپ خواجہ (نظام الدین) کے ساتھ دھمال کھیلیے۔ انترے میں خواجہ سے کہا جا رہا ہے تیرا یار عرب ہے۔ اس کے ساتھ مل کر بسنت منائیو اور اس تہوار کے لیے گلال تیار رکھیو۔

اس گلدستے میں تمہیں اس قسم کے چند مضمون بھی ملیں گے۔

دیباچے میں میرا یہ شعر بھی شاید نقل کیا جائے

گانے لگا تو کان میں انگلی دینا میں نے چھوڑ دیا
بچپن میں دیتا تھا میں ہی گھر میں روز اذان، اللہ

عطیہ کو سلام۔

داؤد

1501 N.E. 32 street
Pompano Beach, Florida 33064

14 December, 2000

وجیہہ!

آرٹ کے ذوجنسین (BISEXUAL) نظریے سے تم نے مجھے آگاہ کیا۔ اس نظریے میں ضرور کوئی تک ہے۔ مرد فنکار کا فن اس کی مردانگی کی نہیں اس کے اندر چھپی ہوئی نسوانیت کی تخلیق ہوتا ہے۔ وہ بچہ جو اس کی نسوانیت کے ''رحم'' سے پیدا ہوا۔

پھر تم نے یہ بھی بتایا کہ مرد آرٹسٹ نازنینی کی خواہش رکھتے ہوئے عورتوں سے رقابت رکھتا ہے اور مقابلہ پر تلا رہتا ہے۔

میں نے لندن میں اودے شنکر کا رقص دیکھا تھا۔ نٹ راجا ہو کر جب وہ سٹیج پر آیا تو اس کا روپ اَدھی ناری کا تھا۔ گداز بدن، مہندی سے رنگے ہوئے پاؤں، پازیب سے آراستہ، کانوں میں آویزے، آنکھوں میں کاجل، بالوں کی جھومتی ہوئی لٹیں، رخسار غازہ سے رنگے ہوئے، گلے میں ہار، کلائیوں پر پہنچیاں۔ غرض کہ پورا زیور اور پورا سنگار۔

کنہیا نے رس لیلا میں ایک رادھا ہی کا نہیں نو رادھاؤں کا روپ دھار لیا تھا۔ سنا ہے کہ کئی کرشن بھگت آج بھی رادھا کے رقیب بن کر بندرابن میں جنگل گردی کرتے ہیں، گوپیوں کا زنانہ روپ دھار کر۔

پیلو راگ کی ایک مقبولِ عام ٹھمری کے بول ہیں:-

تم رادھے بنو شام

رادھا یہ نہیں کہتی ''تم رادھا بنو'' بلکہ کہتی ہے ''تم رادھے بنو''
رادھا میں یہ مذکر کا صیغہ ملاتی ہے۔ یہ ''رادھے'' ذوجنسین والی بات ہی لگتی ہے۔ (اگر یہ کہتی ''تم رادھے بنو شام'' تو بھی ٹھیک تھا، کیا خیال ہے؟)

ہمارے ہاں کے ہندو اور مسلمان گویے صدیوں سے گوپیوں کے بول گا رہے ہیں۔ صیغہ مونث متکلم گا کر خوش ہوتے ہیں اور سننے والوں کو خوش کرتے ہیں۔ راگ کا مود کا یہ خیال میں نے نارائن راؤ ویاس سے سنا:-

جانے نہ دوں گی ری مائی
اپنے بلم کو
نین میں کر راکھوں

پلک موند موند کر

اور راگ سارنگ کا یہ خیال اُستاد فیاض خاں سے:-

کر کے بہانہ سوتن سنگ جات
پریم پیا نے موسوں کینی گھات

پریم پیا اُستاد فیاض خاں کا تخلص تھا۔

۲۰۰۰ء ختم ہونے کو ہے۔ اب یہ خوش خبری سناؤ کہ دیباچہ مکمل ہو گیا۔ تم کس آرٹسٹ سے کم ہو، میرا جی اپنی نظموں کی تاویلیں تم سے پوچھا کرتے تھے۔ تمہارے چوکھی ذہن کے کرشمے تمہاری گفتگوؤں سے مجھے معلوم ہوئے۔ تمہارا وجدان سراسر شاعرانہ ہے۔

عطیہ کو سلام

تمہاری باتیں سن سن کر
حضرت سلیمان کا قایل
داؤد

28 January, 2001

وجیہہ!

جامعۃ القاہرہ کے لاء کالج میں شیخ محمد ابوزہرہ شریعتِ اسلامیہ کے پروفیسر تھے۔ قاہرہ کے قیام کے زمانے میں تم نے ان کا ذکر خیر سنا ہوگا۔ ۵۸-۱۹۵۷ء کا ہفت روزہ "مذاکرہ" (COLLOQUIUM) جو پنجاب یونیورسٹی ہال میں ہوا تھا، اس میں شیخ صاحب تشریف لائے تھے، وہاں میں نے ان کی عربی تقریر سنی تھی۔

ان کی ایک تصنیف المذاهب الاسلامیہ کے عنوان سے ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری (صدر شعبہ اسلامیات، زرعی یونیورسٹی، لائلپور) نے اردو میں کیا۔ مذاہبِ اسلامیہ کے عنوان سے یہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

اس کتاب کے حصہ اوّل کا عنوان ہے۔ "سیاسی مذاہب۔ اس میں شیعہ، خوارج وغیرہ کی بحث ہے۔
حصہ دوم کا عنوان ہے: اعتقادی مذاہب۔ اس میں اشاعرہ، جبریہ، مرجئہ، معتزلہ، وہابیہ وغیرہم کی بحث ہے۔"

میں نے جب لکھا "تغزل بجائے خود ایک مذہب ہے" تو میرے ذہن میں لفظ "مذہب" کے معنی وہی تھے جو استاد محمد ابوزہرہ کے ذہن میں تھے۔ استاد موصوف کو ایک باب تغزلین پر بھی لکھنا چاہیے تھا۔

عطیہ کو سلام

داؤد

9 April, 2001

وجیہہ!

کلیات کی طباعت اور جلد بندی اب تکمیل کو پہنچنے والی ہے۔ تمہاری نگرانی اور نگہبانی سے یہ سب کچھ ہوا۔ دیباچے کے شامل نہ ہونے سے لطف میں کمی ہوئی۔ البتہ دیباچہ لکھا تو گیا، پمفلٹ کی شکل میں چھپ کر محفوظ ہو جائے تو روشن خیال حلقوں میں مزے لے کر پڑھا جائے۔

کلیات کی ڈھائی سو جلدوں کی بانٹ اور فروخت کی تدبیر کیا ہوگی، اس پر مشورہ فون پر ہوگا۔

بطور ہدیہ جن دوستوں کو اس کتاب کے نسخے بھجوانے کا میں خواہشمند ہوں، ان کی تعداد پندرہ ہے۔ ان کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ان صاحبوں کو پارسل رجسٹرڈ جائیں تو ان کا موصول ہونا یقینی ہو۔

ترسیل کے اس کام میں جس شخص کی معاونت ہو، اسے کچھ محنتانہ دینا مناسب ہوگا۔ اس محنتانے کی رقم اور رجسٹرڈ پارسلوں کے ارسال (یعنی ڈاک) کے خرچ کی رقم (ایوب کی وساطت سے) میری طرف سے حاضر رہے گی۔

مجھ کو کلیات کا صرف ایک نسخہ امریکہ بھیجا جائے تو کافی ہوگا۔ میرے دوست نعمان الحق صاحب گرمیوں میں کراچی آئیں گے، انہیں عطا کرنے کے لیے بھی ایک نسخہ بچا کر رکھ لینا۔

کتاب کی فروخت کے لیے فضلی اینڈ سنز سے گفت و شنید کی جائے تو ممکن ہے معاملہ بخوبی طے ہو جائے۔ طارق رحمٰن صاحب کی مجھ سے شناسائی ہے، انہیں میرا سلام۔

عطیہ کو سلام۔

بےخبر از منزلِ مقصود
داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

1st July, 2001

وجیہہ!

چھوٹے بخاری (ذوالفقار) اور بڑے بخاری (پطرس) ایک بزم میں یکجا تھا، بڑے نے چھوٹے پر پھبتی کسی:

سگ باش و برادر خرد مباش

چھوٹا بھی پھبتی سے لیس تھا، اس نے منہ توڑ جواب دیا:-

سگ باش و برادرِ سگ مباش

بڑے بخاری صاحب کے انتقال کے بعد محمد طفیل صاحب نے نقوش کا پطرس نمبر نکالا، چھوٹے بخاری صاحب سے انہوں نے مضمون مانگا تو چھوٹے نے بھائی جان کے عنوان سے ایک مضمون لکھ تو دیا لیکن پڑھ کر دیکھو، مضمون کس بے دلی سے لکھا گیا ہے۔

یہ خط ہوائی جہاز کی اُڑان کے دوران لکھ رہا ہوں۔ پطرس نمبر میرے سامنے ہوتا تو میں اس میں سے دو چار جملے یہاں نقل کرتا۔ اس مضمون میں چھوٹے بخاری صاحب فرماتے ہیں، میری آرزو تھی کہ بھائی جان کی مفصل سوانح عمری لکھوں۔ لکھنے بیٹھا تو دو چار صفحوں سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ اس لیے کہ شدتِ غم نے میری سکت سلب کر لی تھی۔

اس اظہار میں صداقت کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھائی جان کی یادوں میں کدورتیں زیادہ تھیں اور خوشیاں کم۔ سوانح عمری لکھنے کے ارادہ میں گرم جوشی نہ تھی۔

پطرس نمبر میں پطرس کے دو چار خط عبدالمجید سالک کے نام شامل ہیں۔ ایک خط میں یہ سالک سے کہتے ہیں، ذوالفقار سے مل کر پوچھیے کہ مجھ سے ان کی رنجیدگی کے اسباب کیا ہیں؟

بھائیوں بھائیوں اور بہنوں بھائیوں کے تعلقات کی نوعیت پر گھریلو (مادری) زبان کی گریمر کا اثر ہوتا ہے۔ تمہاری بہن صبیحہ تم سے ''آپ'' کہہ کر نہیں ''تم'' کہہ کر بات کرتی ہے۔ اس سے تم دونوں کے درمیان بے تکلفی اور ہمجولی پن ہے۔ اگر مولانا صبیحہ کو حکم دیتے وجیہہ سے ''تم'' کہہ کر بات نہ کیا کر ''آپ'' کہہ کر بات کیا کر تو ہمجولی پن درمیان نہ رہتا۔

ہمارے گھر میں منجملہ دیگر قوانین کے ایک قانون یہ نافذ تھا کہ یعقوب اور اسحاق سے ہم ''تسی'' کہہ کر بات کریں۔ بھائی اسحاق صاحب ایوب سے سات برس بڑے تھے، مجھ سے آٹھ برس بڑے۔ الیاس سے نو برس بڑے اور سارہ سے دس برس بڑے۔ بوجی (...... یہ یعقوب کا گھریلو نام تھا......) کا مرتبہ بھی ''جی'' والا یعنی ''تسی'' والا مرتبہ تھا۔ ان دو بھائیوں سے ہمارا ہمجولی پن نہ تھا۔

ایوب، داؤد، الیاس اور سارہ، ہم چاروں کا آپس میں جو ہمجولی پن تھا، وہ ''تو نہ'' (بجائے ''تسی'') کے استعمال سے تھا۔

آج کل کی انگریزی میں ''تسی'' کا مترادف ہے ہی نہیں۔ باپ بیٹے کی عمروں کے درمیان بیس پچیس برس کا فرق بھی ہو تو بھی بیٹا باپ سے ڈیڈ کہہ کر ہی بات کرے گا۔ ڈیڈ جی نہ کہے گا اور دادا کو گرینڈ پا ہی کہے گا، گرینڈ بابا جی نہ کہے گا۔

فرانسیسی، اطالوی، جرمنی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی تکریمی جمع مستعمل ہے۔ انگریزی میں یہ مفقود ہے، ایسا کیوں ہے؟

طیارہ بوسٹن کی جانب پرواز کر رہا ہے، واپس گھر پہنچ کر فون کروں گا۔

بحالِ پرواز

داؤد

18 July, 2001

وجیہہ!

مہاتماجی کے آثارِ قلم بھارت کی حکومت نے نوے جلدوں میں مرتب کر کے بزبانِ انگریزی شائع کیے۔ اس کے بعد تین جلدیں ضمیمہ بنا کر شائع کیں۔ ان ساری جلدوں میں قومی زبان کے مسئلہ پر ان کے بیانات چار سو سے زیادہ ہیں۔ انہیں یکجا کریں تو تین چار سو صفحات کی کتاب بنے۔

میں نے ہارورڈ یونیورسٹی کی لائبریری، میں (جلدوں کے انڈکس کی مدد سے) ان بیانات پر نظر دوڑائی اور تقریباً دو سو صفحات کی فوٹو کاپی بنا کر لایا۔

کینیڈا کی کانفرنس میں میں نے جو مقالہ پڑھا تھا، مشفق خواجہ صاحب کی بھیجی ہوئی ایک کتاب پر مبنی تھا جس میں مہاتماجی کے اکاون بیانات کا اردو ترجمہ ہے جو عشرت علی صدیقی نے کیا ہے۔

ہارورڈ سے جو صفحات کاپی کر کے لایا ہوں، ان کا مطالعہ کر کے مقالے کی ترمیم میں لگا ہوں۔ ایڈیٹر کا تقاضا ہے کہ ٹائپ کیے ہوئے تیس صفحات کا مقالہ اسے یکم اگست سے پہلے مل جائے۔ اس کام سے چھٹی ہو تو اپنی کتاب کا کام شروع کروں۔

تمہاری ٹیلی فونی گفتگوؤں کی جو یادداشتیں میں نے جمع کی ہیں، ان کا خلاصہ تمہیں اگست میں لکھ کر بھیجوں گا۔ تم نے ایک روز کہا تھا کہ گفتگو سے تمہاری طبیعت میں جولانی آتی ہے اور نئے نئے ادراک حاصل ہوتے ہیں، اپنی گفتگوؤں کا خلاصہ پڑھو گے تو تمہیں لطف آئے گا۔

عاتکہ کی کتاب میں تمہارے دونوں مضمون دو تین بار پڑھ چکا ہوں، یہ مضمون بغیر پروف خوانی کے چھپ گئے۔ اغلاط کی نشاندہی کرو تو انہیں پھر پڑھوں۔

تم نے لکھا ہے ''مذہب کے بارے میں [مولانا] برسوں کچھ نہ کہتے تھے۔'' تاہم تم نے ان کے دو ارشاد اپنے پہلے مضمون میں نقل کیے ہیں۔ ایک وہ جو تمہارے اس سوال کے جواب میں تھا جو تم نے ان کی قرآن خوانی کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ ''آپ نے نمازیں شروع نہیں کیں۔'' دوسرا وہ فرمودہ جس میں اقبال کے ایک قطعہ پر رائے زنی ہے اور فاتحین کی باج ستانی پر افسوس کیا گیا ہے۔

مولانا کے مزاج کا پتہ پانے کو یہ دو ارشاد ہی کافی ہیں۔ کتاب کی رونمائی کے جلسے میں صبیحہ نے جو مضمون پڑھا، وہ کہیں چھپا یا نہیں؟ فون کر کے اس سے پوچھو۔ اگر نہیں چھپا تو اس سے کہو اعجاز کو پہنچا دے تا کہ مضمون رسالہ ''علامت'' میں چھپ جائے۔

عطیہ کو سلام۔ ان کی لکھی ہوئی کہانیاں مجھے کب بھیجو گے؟

5 December, 2001

وجیہہ!

اردو کے جدید شاعر افتخار جالب صاحب میری طرح پنجابی الاصل ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں، امریکہ آتے رہتے ہیں۔ مجھے فون کرتے ہیں تو ان کی گفتگو میں کچھ اظہار ہوتا ہے۔ کچھ استفسار۔ اب کے انہوں نے مجھے اپنی تازہ تصنیف کا تحفہ بھیجا۔ اس کا عنوان ہے لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر۔ اس میں نثر بھی ہے اور نظم بھی۔

اسے پڑھ کر میں سوچتا رہا کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس کا تعلق عنوان یعنی قدیم بنجر سے کیا ہے۔ فون پر ان سے پھر گفتگو ہوئی تو میں نے پوچھا قدیم بنجر سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا اس کے معنی تو سب کو معلوم ہونے چاہئیں۔ یہ بندوبست اراضی کی ایک اصطلاح ہے۔ اگلے زمانوں میں زمین کا ایک قطعہ کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا یعنی اس پر ملکیت کسی کی نہ ہوتی تھی اور نہ ہی اس پر کاشت ہوتی تھی۔ لوگ کہتے تھے، یہ ہم سب کی زمین ہے۔ جالب صاحب نے یہ بتا کر کہا، یہ سانجھ ہم کھو بیٹھے ہیں۔

میں نے ان کی کتاب پڑھ کر ان سے کہا، میں کتاب کا وہ حصہ جو قدیم بنجر کے عنوان سے ہے، فوٹو کاپی کر کے اپنے دوست وجیہہ الدین احمد صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ آپ کراچی پہنچ کر وجیہہ صاحب سے ملیے اور اپنے کلام کی شرح ان سے سنیے۔ ممکن ہے یہ تم سے ملنے آئیں۔ تین غزلیں اور بھیج رہا ہوں۔

باقیات کے عنوان سے ایک سو بارہ غزلیں مرتب کر کے عنقریب تمہیں بھیجوں گا۔ نئے گھر میں بسیرا تو ہو گیا ہے، ابھی پڑھائی لکھائی پھر سے چالو نہیں ہوئی۔

KUTABKHANA OSMANIA

ہمارے داماد کو اس کے رفقائے کاروبار نے ایک بڑے عہدے پر فائز کیا ہے۔ اس کا صدر دفتر جنوری سے سنگاپور میں ہوگا۔ ہماری بڑی بیٹی سمیرہ بھی اس کے ساتھ وہیں رہے گی۔ واشنگٹن والا فلیٹ یہ کرائے پر چڑھا کر سنگاپور چلے جائیں گے۔ ۲۱ دسمبر کو دو تین دنوں کے لیے میں واشنگٹن جاؤں گا، ان کی روانگی سے پہلے ان سے ملنا ضروری ہے۔

میرا پتہ نوٹ کرلو۔ نیا فون نمبر تو تمہیں بتا دیا تھا۔

عطیہ کو سلام۔

داؤد

1501 N.E. 32 Street
Pompano Beach, Florida 33064
U.S.A
17 February, 1997

بخدمت صبیحہ غلام جیلانی

صبیحہ بہن!

سلامت رہو، تمہارا کینیڈا سے لکھا ہوا خط مجھے مل گیا تھا۔ اس کا پہلا جملہ یہ ہے:-

"یہ خط مجھے اصولاً بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا۔ اس خط کے جواب میں جو آپ نے جیلانی کی وفات پر لکھا تھا۔"

یہ جملہ پڑھ کر میں نے جی میں کہا، صبیحہ کو یاد نہیں رہا۔ اس نے مجھے تعزیت کے خط کے جواب میں ایک بہت اچھا خط لکھا تھا۔ اس خط کا ایک جملہ مجھے خوب یاد ہے:-

"ہم جنگلوں میں کھیلا کرتے تھے۔"

مجھے یہ بتاؤ کہ اپنے خط میں اب کے تم نے مجھے آپ آپ کہہ کر کیوں خطاب کیا جس ہمجولی کے ساتھ "کیڑی کاڑا" (ہاپوٹاپو) کھیلا ہو اُسے "آپ" نہیں کہا کرتے۔ میں تو اپنے آپ کو بھی آپ نہیں کہتا۔ آئندہ ایسا نہ کرنا، میں کہاں کا بزاوہ ہوں، وجیہہ کو بھی تم کہتا ہوں۔ وجیہہ مجھے "تم" کہتا ہے۔ آج اس سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ "تم" والی گفتگو۔

تم نے کینیڈا سے فون کیا تو گفتگو تھوڑی ہوئی۔ خط بھی تمہارا مختصر تھا۔ تاہم اس سے کچھ باتیں ایسی معلوم ہوئیں جن کی خبر پہلے نہ تھی۔ جیلانی مرحوم کی سیاسی سرگرمی کا ورثہ بیٹیوں کو ملا۔ میں کہوں گا یہ ورثہ انہیں اپنے نانا سے بھی ملا۔ مولانا نے سرِجلسہ ایوب خاں کو بے معنی بات پر ٹوک دیا تھا۔

کینیڈا کی برفباری تم کو سہانی لگی۔ ایک جاڑا وہاں سارا گزار کر دیکھو، برف کے نرم نرم گالے ایک چیز ہیں۔ یخ کے تودے اور چیز۔ اگر سردی راس آئے تو وہاں مستقل قیام کا لطف اٹھاؤ۔

میرے ایک عزیز خالد غیاث کی دوستی معز سے ہے۔ لاہور میں خالد کہتا رہا، میں آپ کو معز کے ہاں لے چلوں گا۔ میں چاہتا تھا یہ مجھے معز کے ہاں لے چلے اور معز مجھے تمہارے ہاں، افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ اب کے

آؤں گا تو لاہور پہنچ کر تم کو ٹیلی فون کروں گا۔

معز سے وجیہہ کے ہاں ملاقات کراچی میں ہوئی۔ کرتے پاجامے میں میں نے معز کو پہلے نہ دیکھا تھا۔ یہ بھائی تمہارا بہت جامہ زیب ہے۔

اب لاہور میں تم سے باتیں ہوں گی۔

خیر طلب
تمہارا بھائی
داؤد

25 October, 1997

صبیحہ بہن!

سلامت رہو۔ جی تو بہت چاہتا ہے تمہیں دیکھنے ٹورانٹو آؤں لیکن مجھے سفر کو نکلتے ہوئے خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں کانفرنس کے لیے نکلا تو ایک نرس پیچھے چھوڑ کر گیا۔ بیوی کو جو دوائیں صبح شام دی جاتی ہیں ان کا اثر ایسا ہے کہ طبیعت چوکس نہیں رہتی۔ تنہا وہ اپنی رکھوالی نہیں کر سکتی۔ شب کو اٹھ کر تازہ ہوا کے لیے دروازہ گھر کا چوپٹ کھول کر سو جاتی ہے۔ گویا یہ گھر اس کا پچاس برس پہلے کے لائلپور والا گھر ہے۔ فرائی پین میں گھی ڈال کر اسے جلتے سٹوو پر رکھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے، اندازہ کرلو کہ اسے تنہا چھوڑ کر کیسے نکلوں۔ بیچاری اب ضعیفہ ہے، اگرچہ مجھ سے چار برس چھوٹی ہے، ہر شخص کی سکت اور تندرستی کے حساب اپنے ہیں۔

ہماری چھوٹی بیٹی انیسہ ہمارے ساتھ رہتی ہے لیکن اس کی ملازمت کے اوقات رات کے گیارہ تک ہیں اور کالج کی کلاسوں کے اوقات رات کے دس بجے تک۔ کالج یہ پیر، منگل اور جمعرات کو جاتی ہے۔ بدھ اور جمعہ کو نوکری کرتی ہے۔ اس غریب کا بیاہ نہیں ہوا، کمپیوٹر سائنس سیکھ رہی ہے۔ سوا سال ابھی اس کے بی۔ اے کے کورس کا باقی ہے۔

ہماری بڑی بیٹی سمیرہ کا بیاہ میرے ایک امریکن شاگرد سے ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ یہ داماد بڑا لائق ہے۔ متفرق تجارتی کمپنیوں کا مشیرِ مالیات ہے۔ بڑا کماؤ آدمی ہے۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام ڈیمن ہے (demon نہیں Damon) یہ وظیفہ یاب ہو کر آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا ہے۔ چھوٹا تین سال میں ہائی سکول سے فارغ ہوگا۔ اس کا نام برانڈن ہے۔ اسے کہتے ہیں انقلاب۔

بخیریت لاہور پہنچو۔ وہاں تمہارے گھر آؤں گا۔ فصیح کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ اسے فون کروں گا۔ معز کا عہدہ تو بڑا شاندار ہے، ٹھاٹ باٹ والا۔ اس سے کہو، اس پر جما رہے اور وقت آنے پر ریٹائر ہو۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اگر کوئی لگن یعنی ہوبی نہ ہو تو شب و روز یکایک خالی خالی ہو جاتے ہیں اور پھر دفتر کی کرسی یاد آتی ہے۔ میرا پیغام انہیں دینا کہ قبل از وقت مقررہ ملازمت نہ چھوڑیں۔

وجیہہ نے تمہارے گھر آ کر ڈاڑھی اڑا دی۔ شاید اس عمل کے لیے نائی بلایا ہوگا۔ اب تم نے بتایا کہ کراچی پہنچ کر پھر رکھ لی۔ ایسا رنگین مزاج آدمی اور خوامخواہ بابا بنا ہوا ہے۔ مولانا نے تو ڈاڑھی نہ رکھی تھی۔

تمہارے تایا کی البتہ ڈاڑھی تھی۔ تمہارے نانا شیخ ابراہیم کی بھی ڈاڑھی تھی لیکن تراشی ہوئی۔ وہ بڑے خوبصورت اور وضعدار آدمی تھے۔

یہاں ٹورانٹو میں اور پھر لاہور میں تمہاری اولاد اور اولاد الاولاد کو دعا اور پیار۔

تمہارا ہم جماعت

داؤد

4 October, 1999

میری ہم جماعت، بہن صبیحہ، سلام!

ٹورانٹو میں دو ڈھائی گھنٹوں کی ملاقات کی یاد ایک خواب کی طرح ہے۔ اوٹوا میں میرا گانا ہوا، مجھے اُمید تھی کہ وہاں سامعین کی صف اوّل میں تم کو موجود پاؤں گا اور تم مجھے دیکھ اور سن کر جی میں کہوگی، یہ عربی پڑھنے والا بندہ تانیں مارنے والا میراثی کیسے بن گیا؟

اگر آئندہ سال پھر تمہارا ارادہ آنے کا ہوا تو ٹورانٹو میں اپنے قیام کی تاریخیں اندازاً مجھے چند ماہ پہلے ہی بتا دینا تا کہ میں ٹورانٹو میں گانے کی مجلس کے لیے گفت وشنید کروں۔

آئندہ جنوری میں لاہور اور کراچی جانے کی نیت ہے۔ دو تین روز وجیہہ کے پاس گزارنے کی خواہش ہے۔ اسے اللہ صحت دے، فون پر مجھ سے کہتا رہتا ہے کب آ رہے ہو، پرسوں میں نے اسے فون کیا تو اس نے بتایا پیر کے دن (یعنی آج ۴۔ اکتوبر کو) اس کی ایک آنکھ کا آپریشن ہوگا۔ اللہ کرے اس کی بینائی اچھی طرح بحال ہو جائے۔ ان دنوں کتب بینی کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہیں۔

چند ہفتے ہوئے ایوب کے قلب کا کامیاب آپریشن ہوا۔ البتہ اس کی آنکھوں کو اس سے ضرر پہنچا۔ اب اس کی دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوگا۔

ایوب کی شادی جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس کی بیوی کا نام راحت ہے۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی کا نام زیبا ہے اور چھوٹی کا ثمینہ۔ بڑی پہلے کویت میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اب میاں بی بی لاہور میں رہتے ہیں۔ میاں کی نوکری پیپسی کولا کمپنی میں ہے۔

ایوب کی چھوٹی بیٹی کا بیاہ ابھی نہیں ہوا۔ اس کی صورت بھی پیاری ہے اور سیرت بھی۔ ملازمت سے کمائی کرتی ہے اور ماں باپ کی خدمت کر کے ثواب کماتی ہے۔

سارہ کے ساتھ تو لاہور میں تمہاری ہمسائیگی بھی رہی، اس کے میاں عبدالحمید عرصہ ہوا رحلت کر گئے۔ کچھ عرصہ یہ ایوب کے پاس کراچی میں رہی۔ پھر اپنی بیٹی (ناہید) اور اپنے داماد صابر سلیم کے پاس امریکہ آ گئی۔ نیو یارک کے قریب ان کا ٹھکانہ ہے۔ صابر کی اپنی دکان ہے۔ اس میں یہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی پوشاکیں بیچتا ہے۔

میرے سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق تھے کراچی کے میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے۔ وہاں سے ریٹائر ہو کر کئی سال امریکہ کے ایک میڈیکل کالج میں درس دیتے رہے۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے پچھتر کے ہو کر وفات پائی۔ ان کی بی بی (ہمارے تایا کی بیٹی) رضیہ انڈیانا میں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتی ہے۔

اسحاق سے چھوٹے یعقوب امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر تھے۔ ان کی انگریز بی بی اسی یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی۔ یعقوب ریٹائرڈ ہونے سے پہلے اپنے انگریز خسر سے ملنے انگلستان گئے۔ ۱۹۸۱ء میں وہیں (اٹھاون کے ہو کر) انہوں نے انتقال کیا۔ اولاد سے محروم رہے۔

مجھ سے چھوٹا الیاس تھا۔ اس کی شادی چودھری ظفر اللہ خاں کی پہلی بیگم (بدر) کی چھوٹی بہن زہرہ سے ہوئی۔ زہرہ الیاس سے تیئس برس بڑی تھی۔ الیاس کی عمر چھیالیس تھی جب یہ فوت ہوا۔ اولاد سے یہ بھی محروم رہا۔

اب اکیسویں صدی کے منتظر ہم تین رہ گئے ہیں۔ ایوب، سارہ اور میں۔

زندگی رہی تو یہاں فلورڈا میں دو سال اور ٹھہروں گا۔ اس کے بعد واشنگٹن یا نیو یارک کے قریب کسی چھوٹے شہر میں سکونت ہوگی۔

اگست کے آخر میں اعجاز بٹالوی کے ساتھ نیو یارک میں دو دن گزارے۔ پھر ۲۵ ستمبر کو اس کے برادر آغا بابر مرحوم کی برسی کا جلسہ ہوا۔ اس میں ایک تقریر اعجاز نے کی، ایک میں نے۔ اپنی تقریر کی کاپی تمہیں بھیج رہا ہوں۔

تمہاری واپسی ۲۷۔ اکتوبر کو ہے۔ کسی روز اس سے پہلے تمہیں فون کروں گا۔

گھر میں سب کو دعا۔

تمہارا ہم جماعت بھائی

داؤد

27 November, 1999

صبیحہ، بہن، سلام!

وجیہہ نے مجھے بتایا کہ کھانسی کی تکلیف تمہیں مدت سے ہے۔ لاہور کے علاج سے یہ دور نہ ہوئی۔ خدا کرے یہاں کے علاج سے تمہیں پورا فائدہ ہو اور آرام حاصل ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ میرا گانا تم نے اب تک نہیں سنا۔ پکا گانا سننے کا تمہیں شوق نہیں لیکن میں نے تمہیں استاد چاند خاں کا گانا نہیں بھیجا، خود اپنا گانا بھیجا ہے، دل لگی کے لیے اسے سن ہی ڈالو۔

تم نے بتایا تھا کہ تمہاری نواسی کے پاس جو ریکارڈر ہے، مرمت طلب ہے۔ غالباً اس کی مرمت ملتوی ہوتی رہی۔ میں ایک چھوٹا سا ریکارڈر بھیج رہا ہوں۔ اس پر میرا ٹیپ چڑھا کر سنو، بجانے سے پہلے معلوم کر لینا کہ امریکہ اور کینیڈا کی بجلیاں یکساں ہیں یا نہیں۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ امریکہ اور پاکستان کی بجلیاں یکساں نہیں ہیں اور امریکہ کی مشین پاکستان میں چلانے کے لیے ایک آلہ مزید درکار ہوتا ہے۔

میں نے دو ٹیپ بھیجے تھے۔ ایک میں جو گانے ہیں وہی دوسرے میں ہیں۔ البتہ ترتیب میں تھوڑا سا فرق ہے۔ بس وہ ٹیپ سنو جس پر صرف راگوں کے نام ہیں۔ دوسرا ٹیپ جس پر اور کچھ لکھا ہے، پڑا رہنے دو۔

وجیہہ سے آج صبح باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اس کی جس آنکھ کا آپریشن ہوا تھا، اس کی بینائی اب بہتر ہے۔

ٹیپ کی مشین جو میں بھیج رہا ہوں، اپنی نواسی ہی کے پاس چھوڑ جانا۔ اس نے تمہاری بہت خدمت کی

KUTABKHANA OSMANIA

ہے۔ اسے میری دعائیں جانے سے پہلے فون کر دینا۔

تمہارا بھائی

داؤد

مشین ڈاکخانے سے وصول کرنے کے لیے تمہیں پانچ ڈالر دینے پڑیں گے۔ پانچ امریکی ڈالروں کا نوٹ اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔ وصول کرنے میں دیر نہ کرنا۔

5 September, 1995

بخدمت حمید نسیم صاحب!

مسند نشینِ بزمِ معاصرین حمید نسیم صاحب!

السلام علیکم! آپ نے اپنی آپ بیتی میں ایک مشاعرے کا ذکر کیا ہے جو حفیظ جالندھری مرحوم کے گھر میں منعقد ہوا۔ موڈل ٹاؤن میں ہمارا گھر حفیظ صاحب کے گھر کے متصل تھا۔ ہمارا گھر جس سڑک پر تھا وہ ملبری روڈ کہلاتی تھی۔ اس کے کنارے موڈل ٹاؤن کو آپریٹو سوسائٹی نے شہتوت کے درخت لگا کر اسے یہ نام دیا۔ اسی پر پیلے رنگ کا وہ مختصر سا بنگلہ تھا جسے کرائے پر لے کر حفیظ صاحب نے اس میں انگریز بیوی کو لا کر رکھا۔ حفیظ صاحب کی اپنی کوٹھی جس سڑک پر تھی، اس کا نام جامن روڈ تھا کہ اس کے کنارے پندرہ بیس درخت جامن کے کھڑے تھے۔ جامن روڈ ملبری روڈ کے متوازی تھی۔ حفیظ صاحب کی کوٹھی سرخ اینٹوں والی تھی، اس پر قلعی پھروانے کی ضرورت نہ تھی۔

ایک روز میں کیاریوں کی آبیاری کر رہا تھا۔ آپ ملبری روڈ پر مجھے پیدل چلتے ہوئے دکھائی دیے۔ اپنے قلم کی طرح آپ تیز گام تھے۔ آپ کے ہاتھ میں کوئی پٹاری تھی یا کوئی پیکٹ۔ دیکھ کر میں نے جی میں کہا، یہ حفیظ صاحب کے ہاں جا رہے ہوں گے۔ غالباً میں نے آپ کو اسی مشاعرہ والے روز دیکھا جس کا ذکر آپ کی آپ بیتی میں ہے۔ اس روز آپ نے چاکلیٹ رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا (سفید عمودی دھاریوں والا) آپ کی کتاب کے گرد پوش پر آپ کا فوٹو دیکھ کر میں نے کوٹ پہچان لیا۔

آپ کا اور میرا حلقۂ یاراں دراصل ایک ہی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ لاہور میں آپ سے ہم نشینی نصیب نہ ہوئی۔ ایک بار بھی مل بیٹھتے تو میں تقرب کے درپے ہو جاتا، چمٹ جاتا، آپ کی طرف دوڑتا جیسے دھات کا دانہ مقناطیس کی طرف دوڑتا ہے۔

اعجاز حسین بٹالوی کو معلوم ہے کہ سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں پڑھنے کا مجھے شوق ہے۔ دو سال قبل اس نے آپ کی آپ بیتی مجھے بھجوائی۔ امسال اس نے آپ کی تازہ تصنیف ''پانچ جدید شاعر'' مجھے بھجوائی۔ فون پر اس نے مجھ سے کہا، اس کو پڑھ کر مجھے خط لکھو کہ تمہیں کیسی لگی۔ میں تمہارے خط کی فوٹو کاپی حمید نسیم صاحب کو بھیج دوں گا۔

جدید شاعری سے میری صرف علیک سلیک ہے۔ میرا تو مشرب ہی تغزل ہے جو مجھے ورثے میں ملا

KUTABKHANA OSMANIA

ہے۔ سوچ کر میں نے اعجاز کو فون کیا اور کہا، کیوں نہ اس کتاب کی بجائے حمید نسیم صاحب کی آپ بیتی کا ذکر خیر لکھوں۔ اعجاز نے کہا، ضرور لکھو۔

آپ کی آپ بیتی پڑھنے سے پہلے میں بخاری صاحب کی ''سرگزشت'' پڑھ چکا تھا۔ آپ کی کتاب میں چھوٹوں اور بڑوں سے موانست اور محبت چھلکتی ہے۔ اس کے برعکس بخاری صاحب نے ''ماتحتوں'' کا ذکر کم ہی کیا ہے۔ اپنے مولد یعنی پشاور کی سیر بھی ہم کو نہیں کرائی۔ آپ نے امرتسر کے زمانے کی یادیں خوب لکھی ہیں۔

کتاب کے آخر میں اپنی والدہ ماجدہ کی یاد میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بے حد موثر ہے۔

ان دو آپ بیتیوں کا موازنہ ذہن میں متحرک ہوا تو چند اور آپ بیتیوں کے خیال آئے۔ خصوصاً جوش، مفتون، میر تقی، ظہیر دہلوی، شورش کاشمیری، سالک وغیرہم موازنہ کا دائرہ پھیل گیا۔ اب تہیہ کیا ہے کہ دس بارہ آپ بیتیوں سے اقتباسات جمع کر کے باتوں سے باتیں نکالوں اور ایک کتاب تیار کروں۔ یہ مشغلہ ناممکن کی جستجو کے مطالعہ ہی سے سوجھا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے دو سال چاہئیں۔

آپ کے اشغال موسیقی بالتفصیل آپ کی آپ بیتی کو پڑھ کر معلوم ہوئے۔ آپ کو شاید معلوم ہے کہ سرور نیازی صاحب کا تعلق ظہور آذر صاحب کے والد بزرگوار سراج الدین آذر صاحب سے فرزندانہ قسم کا تھا۔ آذر صاحب دو تین بار انہیں لے کر ہمارے گھر آئے۔

آپ کے کار ہائے خیر میں سب سے اچھا مجھے یہ لگا کہ آپ نے اُستاد اُمید علی خاں کو بے تحاشا تان بازی سے روکا۔ انہوں نے آپ کی بات مانی اور ان کی گلوکاری مہذب ہوگئی۔ استاد عاشق علی خاں کے ساتھ مل کر انہوں نے للت کا خیال گایا تھا۔ اس کا ریکارڈ سن کر والد صاحب نے کہا، یہ گانا نہیں، بلیوں کی لڑائی ہے۔

لندن میں ریکارڈوں کی ایک دکان سے اُستاد اُمید علی خاں صاحب کا ایک ریکارڈ مجھے ملا۔ اس پر ایک طرف انہوں نے ترون راگنی گائی ہے۔ دوسری طرف درباری، دونوں چیزیں انہوں نے بہت سنبھل کر گائی ہیں۔ یہ آپ کے مشورے کا نتیجہ ہے۔

ترون کا گانا میرے لیے مشکل ہے۔ اس کو سری راگ سے الگ رکھنے میں مجھے دقت پیش آتی ہے۔ (سری راگ میں تیور مدھم لگاتے ہیں۔ ترون میں یہ محذوف ہے)

ترون کی آستھائی کے شروع میں جو بول ہیں (ایری میں جاگی) ان کو میں نے سری راگ کے لیے اپنایا اور چند شبد اور لگا کر بندش درست کی اور اسے آزمایا۔ ازراہِ ریاض اسے گھر میں بیٹھ کر گایا۔ اپنی گلوکاری کا ٹیپ نمبر II جو میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ اس پر پہلا گانا اسی بندش کا ہے۔

امریکہ میں گھریلو بیٹھکیں گانے بجانے کی برسوں ہوتی رہیں۔ چند مرتبہ میں نے اپنا برا بھلا گانا نہایت سستے اور معمولی ٹیپ ریکارڈروں پر ریکارڈ بھی کیا۔

اپنے شفیق دوست ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے ہاتھ اپنے ریکارڈ کیے ہوئے گانوں کا ایک انتخاب جلدی میں تیار کر کے آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ یہ گھریلو ریکارڈنگ سٹوڈیو کے معیار کی نہیں۔ سنگت بیشتر عطائی طبلہ نوازوں نے کی۔ سارنگی اور ہارمونیم کی سنگت بھی شاذ ہی نصیب ہوئی۔

ٹیپ نمبر I کراچی کی ایک نشست کا ہے۔ ضیاء محی الدین کی بہن ثریا نے اپنے گھر میں میرا گانا استاد

بلند اقبال خاں صاحب کو سنوایا۔ خاں صاحب محظوظ ہوئے۔ بڑی داد دی، کیوں نہ دیتے، بڑا دل رکھتے ہیں حوصلے والے بزرگ ہیں۔ یہ ٹیپ جے جے ونتی کا ہے۔ اسے میں نے آگرہ گھرانے کے اسلوب میں گایا ہے۔ اسی گھرانے کی گائیکی پر میں نے ریاض کیا۔

کراچی میں طبلے کی سنگت کے لیے عیدو میاں آئے تھے۔ ایک بوسیدہ پڑے والا طبلہ لے کر انہوں نے سوچا ہوگا امریکہ سے عطائی آیا ہے۔ اس لیے ڈگی ہی کافی ہوگی۔ کاش کہ وہ کرارے طبلے پر سنگت کرتے۔ آگرہ کی گائیکی کے لیے سُر بھرنے والے ہمنوا بھی درکار ہوتے ہیں۔ یہ کمی بھی وہاں تھی۔

ٹیپ نمبر II پر گانے مختلف اسلوبوں کے ہیں۔ بوسٹن یونیورسٹی میں بیس برس میں نے اپنے سنگیت کا کورس پڑھایا۔ مختلف گھرانوں کے حساب سے آواز لگانے کے نکات سمجھانے کو بھانت بھانت کی گائیکی کی نقالی کی۔ آپ سن کر محظوظ ہوں گے۔ دیکھ لیجیے عطائی کو قدرت سے کیا عطا ہوا۔ تلمیذ الرحمٰن گویے میں وہ بات نہیں ہو سکتی جو تلمیذ الرحمٰن شاعروں میں ہوتی ہے۔ گانا گھرانہ داری چاہتا ہے جو اُستاد کی چلمیں بھرے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ آپ کی تندرستی کی دُعا کرتا ہوں۔

ضیاء جالندھری کو میرا سلامِ محبت پہنچا دیں۔

محروم آدمی

داؤد رہبر

1st March, 1996

شفیق و مہربان بھائی حمید نسیم صاحب!

السلام علیکم! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کی تصنیف ناممکن کی جستجو کی بابت ایک مضمون لکھ کر آپ کو فروری کے آخر میں بھیج دوں گا۔ کل (لیپ کے) فروری کی آخری تاریخ تھی۔ (ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے والے نے کل کہا ۲۹ فروری کو پیدا ہونے والے کی سالگرہ ہر چار برس کے بعد آتی ہے) مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ البتہ اس کا لکھنا جاری ہے۔ ان شاء اللہ مارچ میں اس کی دو قسطیں بنا کر آپ کو بھیجوں گا۔ جس روز آپ کو میرا یہ خط ملے گا، اس کے ایک ہفتہ بعد پہلی قسط آپ کو مل جائے گی۔

میرے پچھلے خط سے آپ کو معلوم ہوا کہ میں بیسویں صدی کی منتخب آپ بیتیوں پر ایک تصنیف میں مشغول ہوں۔ آپ کے کرم نامے کے آنے سے پہلے میں نے اس تصنیف کے لیے بطور تمہید چند صفحے لکھے تھے۔ خیال یہ تھا کہ انتخاب کی جو کتاب اس صدی میں سب سے پہلے شائع ہوئی، اس پر پہلے لکھوں گا۔ پھر تاریخ وار ایک ایک آپ بیتی کا مطالعہ کر کے مضمون لکھتا جاؤں گا۔ اس حساب سے مضامین کی فہرست یوں بنتی تھی:-

(۱)	ذکرِ میر مصنفہ میر تقی میرؔ	
(۲)	داستانِ غدر مصنفہ ظہیرؔ دہلوی۔	تاریخ اشاعت ۱۹۱۵ء
(۳)	ناقابلِ فراموش مصنفہ دیوان سنگھ مفتوں۔	تاریخ اشاعت ۱۹۵۷ء
(۴)	سرگزشت مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک	تاریخ اشاعت ۱۹۶۳ء
(۵)	سرگزشت مصنفہ ذوالفقار علی بخاری	تاریخ اشاعت ۱۹۶۶ء

(۶)	یادوں کی برات، جوش ملیح آبادی	تاریخ اشاعت ۱۹۷۰ء
(۷)	نامۂ اعمال، محمد یامین خان	" ۱۹۷۰ء
(۸)	تحدیثِ نعمت، چودھری ظفر اللہ خاں	" ۱۹۷۱ء
(۹)	کاروانِ حیات، مشتاق احمد خاں	" ۱۹۷۴ء
(۱۰)	آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی	" ۱۹۸۳ء
(۱۱)	کاروانِ زندگی، مولانا سید ابوالحسن ندوی	" ۱۹۸۳ء
(۱۲)	شام کی منڈیر سے، ڈاکٹر وزیر آغا	" ۱۹۸۶ء
(۱۳)	کھوئے ہوؤں کی جستجو، شہرت بخاری	" ۱۹۸۷ء
(۱۴)	میری زندگی کے پچھتر سال، مولانا اعجاز الحق قدوسی	" ۱۹۸۸ء
(۱۵)	ناممکن کی جستجو، حمید نسیم صاحب	" ۱۹۹۰ء
(۱۶)	خاطرات، ظفر حسن ایبک صاحب	" ۱۹۹۰ء
(۱۷)	ہمسفر، بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری	" ۱۹۹۵ء

آپ کے کرم نامے کو پڑھ کر میں نے تاریخ وار ترتیب کا خیال ترک کر دیا اور آپ کی تصنیف اور بخاری صاحب کی ''سرگزشت'' کو سرِ فہرست رکھ دیا۔ باتیں ہی لکھنی ہیں، کوئی تحقیقی مقالہ تو نہیں لکھنا۔ اس ترتیب میں بھی مزا ہے۔

اس نئی ترتیب سے تمہید اور نہج پر نئے سرے سے لکھنی لازم ہوئی۔ مُبصر لوگ سمجھتے ہیں کہ آمد کی ضرورت شعر گوئی ہی کو ہوتی ہے۔ نثر نویسی کو نہیں ہوتی۔ میرا تجربہ کچھ اور کہتا ہے۔

گزشتہ دو مہینوں میں سوچ یکسو نہ رہ سکی۔ بوسٹن یونیورسٹی کی ایک ''پروفیسرہ'' نے آٹھ سو صفحوں کا ایک مسودہ بھیج دیا۔ اس کی یہ کتاب لاؤتزو کے بارے میں ہے۔ موصوفہ نے میری تجویز سے لکھی۔ چین کی تاریخ میں حکیم لاؤتزو کا مقام کیا ہے۔ اس پر ایسی مفصل کتاب یورپ کے کسی محقق نے نہیں لکھی۔ مصنفہ جرمن ہے لیکن پیدا چین میں ہوئی اور وہیں اس نے پرورش پائی۔ چینی اور جاپانی کے پڑھنے میں اسے اتنی ہی سہولت ہے جتنی مولوی شبلی کو عربی اور فارسی پڑھنے میں تھی اور آپ کو اور مجھے انگریزی پڑھنے میں ہے۔ موصوفہ نے خط لکھ کر کہا تم مسودہ پڑھ کر جلد اپنی رائے لکھو۔ میں چاہتی ہوں کہ ناشر سے پہلے تم اس پر نظر ڈالو۔

جنوری اور فروری میں میں یہ مسودہ بھی دیکھتا رہا اور آپ بیتیوں والے مضامین کی تمہید کی سوچ میں بھی رہا۔ کتاب کا عنوان اور اس کی اُٹھان، گت توڑا کی پیشکار اور (خیال سے پہلے کا) آلاپ، یہ سب چیزیں طبیعت کی تازگی چاہتی ہیں۔ تمہید کی نگارش کل مکمل ہوئی۔ اس کا مبیضہ بنا کر ایک ہفتے کے اندر اندر آپ کو بھیج دوں گا۔ ان شاء اللہ خدا کرے آپ کو پسند آئے۔ اس کے بعد ناممکن کی جستجو کی باتیں لکھنا شروع کر دوں گا اور بعد اس کے بخاری صاحب کی سرگزشت کی باتیں ہوں گی۔ ریڈیو برادری کے دو سربراہوں کا تذکرہ اوپر تلے اچھا رہے گا۔

تمہید آپ کو بائیس یا تئیس مارچ کو مل جائے گی۔ جونہی ملے مہربانی فرما کر ضیاء کو ''علامت'' کے لیے

KUTABKHANA OSMANIA

دے دیجیے گا۔ضیاء کو میرا اسلام محبت، اللہ آپ کا سایۂ عاطفت آپ کے پروردوں پر قایم رکھے۔

مشتاقِ دید

داؤد رہبر

4 March, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم! یکم مارچ کا خط آپ کو مل چکا ہوگا۔ ''تمہید'' بھیج رہا ہوں۔ آپ بیتیوں کی کتاب کی بسم اللہ اس سے ہوئی۔ اس کے بعد اب چار قسطوں میں آپ کی اور چھوٹے بخاری صاحب کی آپ بیتیوں کی باتیں آمیختہ کر کے لکھنی شروع کی ہیں۔ ان چار قسطوں کے مجموعے کا عنوان یہ رکھا ہے:-

''ریڈیو برادری کے دو سربراہوں کی آپ بیتیاں''

چار قسطوں میں سے پہلی ان شاء اللہ مارچ کے آخر میں آپ کو مل جائے گی۔ میرے قلم کی دوڑ اب اتنی تیز نہیں رہی۔ ہر قسط کے لکھنے میں پندرہ دن لگیں گے۔ بھاگڑ میں لکھی ہوئی تحریریں بھی اتنی راحت بخش نہیں ہوتی جتنی آہستگی سے لکھی ہوئی چیز۔

مہربانی فرما کر ضیاء کو میرا اسلام محبت پہنچا دیجیے اور اس کے ساتھ یہ ''تمہید'' انہیں دے دیجیے۔ آپ کو اور انہیں پسند آئے تو یہ ''علامت'' میں چھاپ دی جائے۔ میرا جی بہت خوش ہوگا اگر یہ ''تمہید'' اور اس کے بعد چاروں قسطیں ''علامت'' میں چھپ جائیں۔

آپ کی صحت و عافیت کی دُعا کرنے والا بھائی

داؤد رہبر

16 March, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم! آپ کی صحت و عافیت کی دُعا کرتا ہوں۔ کراچی میں امن کی بحالی کی دُعا بھی کرتا ہوں۔ وہاں میرے ایک بھائی رہتے ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں بینک سے ایک بڑی رقم کسی ضرورت سے نکلوائی۔ رات کو لٹیرے دروازہ توڑ کر ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ ریوالور ان کی کنپٹی پر رکھ کر دھمکی دی۔ ساری رقم اور بیوی کا زیور لے کر چمپت ہوئے۔

''تمہید'' کے اوراق اس مہینے کی پانچویں کو یہاں سے روانہ کیے گئے ہیں۔ بیس مارچ کو وہ لفافہ آپ کو مل جانا چاہیے۔ یہ دوسرا لفافہ مارچ کے آخر میں آپ کو ملے گا، ان شاء اللہ۔

جن آپ بیتیوں پر لکھنے کا ارادہ ہے، ان کی فہرست آپ کو بھیج چکا ہوں۔ معاصرین کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں سے مجھے دلچسپی اپنے عصر پر غور کرنے کی غرض سے ہے۔

جو مضمون آج بھیج رہا ہوں، آپ اس کو پڑھ لیجیے۔ اب بخاری صاحب کی ''سرگزشت'' کو چند روز کے لیے پرے رکھ کر اگلا مضمون ''ناممکن کی جستجو'' کے بارے میں لکھوں گا۔ انہی دو کتابوں کے تذکرہ میں بات سے بات نکلنے کا سلسلہ ایسا چلے گا کہ پانچ چھ قسطیں اسی کی ہو جائیں گی۔

آج سنیچر ہے۔ آیندہ جمعرات کو مجھے بوسٹن جانا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ موسیقی میں ایک امریکن بی بی ہندوستانی سنگیت کا درس دیتی ہے۔ اس نے دعوت دی ہے کہ آ کر کلاس کو بتاؤ کہ ہر راگ کا اپنا رس کیونکر ہوتا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہر چند نائیکوں نے ہر راگ کا ایک خاص رس مانا ہے لیکن رس درحقیقت گلوکار کے گلے اور مزاج سے یا ساز کے باج سے آتا ہے۔ مارواسرود پر بجے تو بھیانک رہتا ہے۔ ستار پر بجے تو ملائم اور نازک ہو جاتا ہے۔ عبدالکریم خاں صاحب نے راگ بسنت کو اُداس کر کے رکھ دیا نزاکت اور سلامت نے اُداس راگوں کو تہائیوں سے جھکڑ کر کے رکھ دیا۔

سلسلۂ مضامین کی اگلی قسط بوسٹن سے واپس آ کر دو تین ہفتوں میں بھیجوں گا۔ ضیاء کو سلامِ شوق، ان کو مضمون دکھا کر پوچھ لیجیے گا کہ یہ ''علامت'' کے لیے ٹھیک ہیں یا نہیں۔

سنا ہے کہ آپ نے آغازِ شباب میں مشاعرے پڑھنا شروع کیے تو آپ کے کلام اور آپ کے ترنم کی دھوم مچ گئی۔ کیا آپ کے اس ترنم کی کوئی ریکارڈنگ ریڈیو پاکستان کے ذخائر میں محفوظ ہے؟ اگر ہے تو اسے ٹیپ پر منتقل کرا کے ٹیپ مجھے عطا فرمائیں۔

آپ کا نام لیوا بھائی

داؤد رہبر

11 April, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، آپ کا محبت نامہ ملا تو میں بوسٹن جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک ہفتہ وہاں گزار کر ۲۵ مارچ کو واپس آیا۔ سوچا کہ ایک قسط مضمون کی اور لکھ لوں تو چٹھی کی ترسیل اس کے ساتھ ہی ہو۔

خط سے معلوم ہوا کہ کراچی گنجان ہو کر آپ کے حق میں بیابان ہو گیا۔ شاید یہ نتیجہ ہے اپنے مالوف شہر لاہور سے دور رہنے کا۔ آپ فرمائیں گے لاہور بھی اب وہ لاہور نہیں رہا، یہ مجھے تسلیم ہے۔ ہائیکورٹ اور یونیورسٹی ہال کے درمیان پہنچ کر دو سال پہلے مجھے عبرت ہوئی۔ ٹریفک کا وہ حال کہ الامان، پیدل چلنے والے اور رکشا ڈرائیور اور موٹر ڈرائیور سب لحہ بہ لحہ اپنے بچ نکلنے پر حیران۔ موڈل ٹاؤن کی طرف گیا، کوئی سڑک آسانی سے پہچانی نہ گئی۔

بوسٹن اور نیویارک اور شکاگو میں دھواں بہت رہتا ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں غبار اور دھواں تو نہیں لیکن رطوبت بہت ہے۔ ہر موسم میں سطحِ زمین سے ایک میل اوپر دھندی چھائی رہتی ہے۔ رات کو صرف گنتی کے چند تارے دکھائی دیتے ہیں۔ پچھلے مہینے ایک رات آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی تو اتفاق سے دب اکبر دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی نظر قطب کی طرف گئی۔ میں نے جی میں کہا، شکر ہے سرزمین اور سہی۔ آسمان تو وہی ہے۔

اردو میں جو کچھ لکھتا ہوں اس لیے ہے کہ پردیس میں کچھ بات دیس والی آ جائے۔ نصف الملاقات ہی ہو جائے۔ میرے مضمون کھلی چٹھیاں ہیں، آپ بیتیوں کی باتیں لکھنا ایک بہانہ ہے دوستوں سے گفتگو کا۔ اگلی قسط ارسال ہے۔ کتاب کی اُٹھان آپ نے دیکھ لی۔ اب بات سے بات نکلے گی۔ خدا کرے بڑھت ٹھیک ہو اور دوستوں کو یہ سلسلہ پسند آئے۔

KUTABKHANA OSMANIA

کسی شخصیت کا خاکہ لکھنے پر طبیعت مائل نہیں۔ خاکہ تو یوں ہوتا ہے جیسے چوکھٹے میں کسی کے سر، گردن اور دھڑ کا فوٹو جڑ دیا گیا ہو۔ خاکہ میں شخصیت اکیلی کر دی جاتی ہے۔ اس لیے میں چھوٹے بخاری صاحب کی ''سرگزشت'' اور آپ کی آپ بیتی کی باتیں ملا جلا کر لکھ رہا ہوں۔ اس سے چہل پہل رہتی ہے۔ انہی دو کتابوں میں اتنی وسعت ہے کہ عجب نہیں ان کی باتوں سے دس بارہ قسطیں اس نگارش کی ہو جائیں۔ اقتباس حسبِ ضرورت شامل ہوتے رہیں تو امید ہے ایک کتابچہ بن جائے گا۔

یہ سلسلہ جب ہو چکے گا تو سردار دیوان سنگھ مفتوں اور مولانا عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی تصنیفوں پر چند قسطیں لکھوں گا، ان شاءاللہ۔ یہ تینوں صحافی تھے۔ چنانچہ تمہیداً صحافت کی سرگرمیوں اور ہنگاموں کے بارے میں کچھ کہنے کا موقع ملے گا۔ میری نیت نہ تبصرہ کی ہے نہ حواشی سے لدے ہوئے مقالہ کی۔ کوشش یہی ہے کہ گفتگو کا رنگ رہے۔ خیال گائیکی کی سی برجستگی۔

آپ کے اظہار سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور شہرت بخاری کی آپ بیتیاں پڑھ کر آپ کو مزا نہ آیا۔ میں نے اپنی فہرست میں انہیں شامل اس لیے کیا ہے کہ مجھے اقسام طبائع کا محسوس کرنا اور کرانا مطلوب ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے میری ملاقات پچاس برس پرانی ہے۔ کاش ان سے ملتا رہتا اور انہیں محفلِ سماع میں گھسیٹ کر لے جاتا۔ یہ عادتاً دروں بیں آدمی ہیں۔ مغربی نقادوں کا اثر ان پر بہت ہے۔ ان کی پہلی تصنیف کا عنوان ''مسرت کی تلاش'' ہے۔ آپ کی نظر سے ضرور گزری ہوگی۔ یہ کتاب آج سے پچپن سال پہلے لکھی گئی۔ پچپن سال بعد انہیں مسرت حاصل ہے یا نہیں، اس سوال پر غور کرتے ہوئے کچھ لکھنے کو قلم اٹھاؤں تو غم اور خوشی کی باتیں کرنے کا ایک بہانہ مل جائے گا۔

گفتگو لکھنا مجھے اس لیے راس آیا کہ اس میں موضوع کا شکنجہ نہیں ہے۔ جملہ معترضہ کا اسے لکھتے ہوئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عربی میں الجاحظ اور المبرد گفتگو لکھ گئے۔ آزاد کی ''آبِ حیات'' میں بھی نقادی کم ہے اور گفتگو زیادہ۔ یہ صنف زندہ رکھنی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ نے باتیں کی ہیں۔ اسی کے اثر سے شیخ شیراز نے ''گلستاں'' لکھی۔ گلستاں بھی گفتگو ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی اعجاز نے برسوں پہلے بھیجی تھی، میں نے پڑھی۔ اس کی کوئی بات اب حافظہ میں نہیں سوائے ایک فوٹو کے جو طہران میں کھینچا گیا۔ اس میں یہ راشد صاحب کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ کتاب مجھ سے کوئی مانگ کر لے گیا اور واپس نہ لایا۔ بیگم حمیدہ اختر کی کتاب ''ہمسفر'' بھی اعجاز نے عطیۃً بھیجی۔ یہ شاہکار کتاب ہے۔ بابائے اردو کی ''بہو'' نے کمال کر دیا۔ ''نیلی چھتری'' کے مصنف کی بیٹی نے کمال کر دیا۔

مارچ میں بوسٹن جا کر دوستوں سے مل آیا۔ نومبر میں ان شاءاللہ لاہور آؤں گا۔ کیا اچھا ہو کہ آپ دو ہفتوں کے لیے لاہور تشریف لے آئیں تاکہ ملاقاتیں اچھی طرح ہوں۔ لمس (LUMS) کی کلاسوں کو مجھے سات لیکچر دینا ہیں۔ کراچی آنے کا ارادہ بھی پکا ہے لیکن وہاں دو تین روز سے زیادہ ٹھہر نہ سکوں گا۔ بیوی کی بیماری ایسی ہے کہ طویل قیام پاکستان میں اس سال ممکن نہ ہوگا۔ آپ کا مسکن مبارک بہر حال مجھے دیکھنا ہے۔

ان شاءاللہ ہر مہینے ایک قسط سلسلہ مضامین کی بھیجتا رہوں گا۔ ''علامت'' میں چھپتی جائیں تو بہترین

بات ہے۔ ضیاء کو سلام اور پیار۔ پروردگار آپ کو تندرست رکھے اور شہر کی بدامنی دور فرمائے۔

والسلام
ملاقات کا منتظر
داؤد رہبر

27 April, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، میرے مضمون کی رسید آپ کا محبت نامہ ہو کر موصول ہوتی ہے۔ اس کو میں انعام سمجھتا ہوں۔ اعجاز نے میرے مکاتیب کی کتاب کے لیے تقریظ لکھی ہے۔ میں نے فون کر کے اس سے پوچھا، اس میں تم نے کیا لکھا ہے؟ جواب ملا کتاب چھپ کر تمہیں پہنچے گی تو تقریظ پڑھ لینا۔ میں نے اصرار کر کے کہا، کچھ تو بتاؤ۔ اس نے کہا، میں نے تقریظ میں لکھا ہے کہ خط اب کون لکھتا ہے۔ اب تو ٹیلی فون کا زمانہ آ گیا ہے۔ میں نے کہا فن فون زنی نے فن گفتگو کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔

مقامی نمبر ملا کر کسی ہم شہر دوست سے لمبی گفتگو ہو سکتی ہے۔ سمندر پار فون کیا جائے تو عجلت سر پر سوار رہتی ہے۔ اختصار لازم ہوتا ہے، اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی۔

سلسلہ نگارش کی تیسری قسط ارسال ہے۔ ذہن اب وزنی افکار کا متحمل نہیں رہا۔ آپ بیتیوں پر میں کوئی تبصرہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ یہ شغل دوستوں سے باتیں کرنے کا اور دوستیاں تازہ رکھنے کا ذریعہ ہے۔

سالِ رواں میں صرف آپ کی اور بخاری صاحب کی آپ بیتیوں کے بارے میں اقساط لکھنے کا تہیہ ہے۔ لاہور کی لمس یونیورسٹی نے پانچ لیکچروں اور دو سیمیناروں کے لیے مجھے مدعو کیا ہے۔ یہ لیکچر انگریزی میں لکھ کر لے جاؤں گا۔ لیکچر پبلک کے لیے نہیں ہیں۔ یونیورسٹی کے ایک کورس سے وابستہ ہیں اور کلاس روم میں طلبہ کو دیئے جائیں گے۔

دو سیمیناروں میں البتہ چند ادیب دوستوں کو یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی جائے گی۔ لیکچروں کا ٹائم ٹیبل بالتفصیل ابھی مجھے معلوم نہیں۔ غالباً نومبر کے آخر اور دسمبر کے آغاز میں ہوں گے۔ سیمیناروں میں آپ بھی تشریف لائیں تو رونق افزائی ہوگی۔

آج میں پھلوں کی دکان سے ایک گنا پانچ فٹ لمبا لے کر آیا۔ یہ ایک ڈالر میں ملا۔ تیز چھری سے اسے چھیلا اور اس کی گنڈیریاں بنا بنا کر چوستا رہا۔ گنڈیری پر سنگترے کا چھلکا رگڑ دیں تو اس کا ذائقہ نہایت لطیف ہو جاتا ہے۔ فلورڈا میں گنا اس قدر پیدا ہوتا ہے کہ سارے ملک کی کھانڈ کے لیے کافی ہے۔

امریکیوں کو گنڈیری چوسنے پر آمادہ کرنا کارِ ثواب ہوگا۔ میں یہاں ۱۹۵۹ء میں آیا۔ اس زمانے میں امریکی لوگ مرچ کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ اس کے استعمال کو فروغ میرے سامنے ہوا۔ تیس برس پہلے اس ملک کی پاپولر گلوکاری میں تان شامل نہیں تھی۔ اب یہ لوگ تان مارنے لگے ہیں۔ یہ تان شمالی افریقہ اور شرقِ اوسط کے مغنیوں کی سی ہے۔ ہماری طرف کے گویوں کی تان سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ اسرائیل اور لاطینی امریکہ کی موسیقی کا اثر بھی یہاں کی پاپولر موسیقی پر ہونے لگا ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

نطق ان کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

لَمس یونیورسٹی کے ناظمِ اعلیٰ کا پیغام ۱۹۹۵ء کے آغاز میں مجھے پہنچا، ہم تم کو چند لیکچروں کے لیے لاہور بلانا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب لکھا، میں اپنی بیوی کا تیماردار ہوں۔ لاہور صرف ایک ہفتے کے لیے آ سکتا ہوں۔ تین چار لیکچروں کا ٹائم ٹیبل ایک ہفتے کے اندر اندر کا بن سکے تو حاضر ہوں۔ انہوں نے لکھا کہ لیکچر یونیورسٹی کے ایک خاص کورس سے منسلک ہوں گے۔ دو ہفتوں کے لیے آؤ تبھی تمہارے لیکچر کورس کے ٹائم ٹیبل میں ٹھیک بیٹھیں گے۔

بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں دو ہفتے لاہور میں ان کا مہمان ہو کر رہوں گا۔ پانچ لیکچر مجھے دینے ہوں گے اور ان کے علاوہ دو سیمیناروں میں شرکت کرنی ہوگی۔

میری نیت پکی ہے کہ تین چار دن کراچی میں بھی گزاروں گا۔ پاکستان میں اٹھارہ اُنیس روز گزار کر واپسی کے لیے طیارہ سوار ہونا ہوگا۔ میری مجبوری ایسی ہی ہے۔ دسمبر ۱۹۹۳ء میں ایک لیکچر دینے لاہور پہنچا۔ وہاں صرف چار روز ٹھہر کر واپس آ گیا۔ میری بیوی کس حال میں ہے، اعجاز سے پوچھ لیجیے گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب بھی اس کا حال یہاں دیکھ گئے ہیں۔ وہ بھی بتا سکتے ہیں، بیوی کی بیماری ذہنی ہے اور مزمن ہے۔ اس کی تفصیل کیا لکھوں، یہی کہنا کافی ہے کہ کوڑی۔

آپ کا پچھلا خط پڑھ کر محسوس ہوا کہ اب سفر کے خیال سے آپ کی طبیعت گھبراتی ہے۔ نومبر میں لاہور کے سفر پر آپ کی طبیعت مائل نہ ہوئی تو میں اپنی قسمت کو تسلی دینے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال کراچی میں آپ کے گھر میں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔ آپ کو آپ کے گھر میں دیکھے بغیر دیس کی یاترا پوری نہ ہوگی۔ میری گزارش کی تہ میں یہ خواہش تھی کہ ملاقاتیں سرسری نہ ہوں، جم کر ہوں اور اعجاز کی شرکت کے ساتھ ہوں۔ لَمس کے دو سیمیناروں میں آپ بھی موجود ہوں تو لطف آئے۔

لَمس والوں نے ابھی لیکچروں اور سیمیناروں کی تاریخیں طے نہیں کیں۔ جونہی ان کی اطلاع مجھے ملے گی، میں خط لکھ کر آپ کو بتا دوں گا۔

ناولوں اور افسانوں کے تبصرہ کی کتاب لکھنے کا خیال مبارک ہو۔ پروردگار آپ کی توانائی برقرار رکھے۔

دُعا گو اور طالبِ دُعا

آپ کا بھائی

داؤد رہبر

19 June, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، میرے گھر کے قریب میکڈانلڈ نام کا ریستوران ہے۔ ہر روز صبح دس بجے میں ٹہلتا ہوا یہاں آتا ہوں۔ کاغذ اور قلم ساتھ رکھتا ہوں۔ کافی کا پیالہ پی کر قلم چلاتا ہوں۔ یہ خط یہیں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔

پانچویں قسط کا مسودہ کل تیار ہوا۔ آج خط اور مضمون ڈاک میں ڈال دوں گا۔

باقی قسطوں کے عنوان جو میں نے سوچ رکھے ہیں، یہ ہیں:-

ان شاء اللہ ہر مہینے کے آخر میں ایک قسط بھیجتا رہوں گا اور آخری قسط نومبر میں اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ ضیاء کو میرا محبت بھرا سلام۔

آپ کی صحت اور عافیت کی دُعا کرتا ہوں۔

ملاقات کا متمنی

داؤد رہبر

20 May, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم! ۲۷۔ اپریل کا میرا خط قسطِ سوم کے ہمراہ آپ کو مل چکا ہوگا۔ چوتھی قسط کل مکمل ہوئی۔ تمہید اور اس کے بعد ان چار قسطوں کا لکھنا قدرے مشکل تھا۔ باقی ابواب میں جو باتیں آئیں گی، ان کا تعلق آپ کی اور بخاری صاحب کی پبلک زندگی سے اور امورِ ادبی سے ہے۔ ان کا لکھنا نسبتاً آسان ہوگا۔

ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے طریقِ تدریس کا تعارف جو آپ کی کتاب میں ہے، بے مثل ہے۔ واقعی کسی برگزیدہ استاد سے تلمذ رہا ہو تو اہلِ قلم شاگردوں کو چاہیے کہ استاد کے درس کے چند واقعات لکھنے کو قلم اٹھائیں۔ مولانا شبلی اور مولانا محمد حسین آزاد دونوں پروفیسر تھے۔ ان کے کسی شاگرد کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کی تدریس کی چند حکایات قلمبند کر دیتا۔

آپ نے پروفیسر تیجا سنگھ کی ایک حکایت لکھی ہے کہ لفظ NUNCLE نے اس صاحبدل کے تارِ جاں کو چھیڑ کر کس عالم میں پہنچا دیا۔ یہی باتیں تو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ارادت مند مہربانوں کے خاکے لکھتے ہیں تو صرف ان کے اوصافِ حمیدہ گنواتے ہیں۔ ان کے ملفوظات نقل نہیں کرتے۔ نہ کوئی قصہ کہتے ہیں۔ رئیس احمد جعفری صاحب نے اپنے نانا ریاض خیرآبادی کی سوانح عمری میں لکھا ہے مرحوم کی گفتگو زعفران زار تھی۔ آنگن میں بیٹھ کر مزے کی باتیں کرتے تھے۔ لطیفے پر لطیفہ، مثال ایک بھی نہیں دی۔

گورنمنٹ کالج میں پطرس کے سینکڑوں شاگرد ہوئے۔ سب متفق ہو کر کہتے ہیں۔ ان کا ہر لیکچر پھلجھڑی ہوتا تھا۔ قصہ ایک بھی نہیں سناتے۔ ''نقوش'' کے پطرس نمبر میں صرف کنہیالال کپور کی تحریر میں پطرس کے اسلوبِ درس کا تعارف ہے لیکن نہایت مختصر۔ یہ بھی حکایتوں کے بغیر ہے۔

ایک روز خیال آیا ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں تاثیر صاحب کی داستانِ حیات کا خلاصہ ضرور کسی نے لکھا ہوگا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تاثیر صاحب کی بیگم سے انگریزی میں مضمون لکھوایا گیا اور اس کا اردو ترجمہ کرا کے رسالے میں چھاپا گیا۔ بیگم نے تو بس یہی لکھا ہے کہ تاثیر صاحب کیسے اچھے شوہر تھے۔ تاثیر صاحب کی طبیعت کے جوہر کیا تھے۔ بلقیس تاثیر کیا جانے! طفیل صاحب کو چاہیے تھا تاثیر صاحب کا تذکرہ آپ سے لکھواتے۔

پطرس، تاثیر، سالک اور چراغ حسن حسرت سب چہچہانے والے لوگ تھے۔ کاش اردو کا کوئی باز ویل ہوتا اور ان کی گفتگوؤں کی ڈائری لکھا کرتا۔ تان سین اپنا گانا اپنے ساتھ لے گیا۔ گفتگو کے ان اُستادوں کا

(۱) اورینٹل کالج (لاہور) کے گرامی اساتذہ جن سے بخاری بھائیوں نے کوئی واسطہ نہ رکھا۔

(۲) انگریزی ادبیات کا استاد پطرس کلاس روم میں

(۳) بخاری بھائیوں کے باہمی تعلقات

(۴) چھوٹے بخاری صاحب کے مراسم معاصرین سے۔

(۵) حمید نسیم صاحب کے مراسم معاصرین سے۔

(۶) حمید نسیم صاحب کا امرتسر

(۷) چھوٹے بخاری صاحب اور حمید نسیم صاحب کا شغفِ موسیقی

(۸) وضع قطع: مشرقیت اور مغربیت

(۹) دلوں کے حال

ان نو قسطوں میں سے اس سال صرف پہلی قسط لکھ سکوں گا۔ ان شاء اللہ یہ ایک مہینے کے اندر لکھ لی جائے گی اور آپ کو بھیج دی جائے گی۔ باقی آٹھ قسطوں کا لکھنا زیارتِ پاکستان سے واپس آ کر آیندہ جنوری میں شروع کروں گا۔ لاہور کے لیے پانچ لیکچر انگریزی میں لکھنے کا کام اب یکسوئی چاہتا ہے۔ (خیاطی ایک ہی سوئی سے کی جاتی ہے)

ضیاء جالندھری کو میرا اسلام اور پیار۔ اُمید ہے نومبر میں چہار درویش یکجا ہو کر اپنی اپنی کہانی کہیں گے۔ آفتاب احمد خاں جواب ماشاء اللہ صدرِ انجمن ترقی اردو ہو گئے ہیں، امریکہ اپنے بیٹے کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ بوسٹن سے انہوں نے فون کیا، آج رات انہیں میں فون کروں گا۔ اچھی طرح باتیں ہوں گی اور دیس کی خبریں ملیں گی۔

اس قسط کے صفحہ نمبر ۷ پر میں نے اپنے دوست آغا اشرف علی کا ذکر کیا ہے، یہ اپنی بیوی کے علاج کے لیے امریکہ آئے ہوئے ہیں۔ یہ سرینگر میں کئی ماہ تاثیر صاحب کے میزبان رہے۔ مجھ سے انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تاثیر صاحب کے قیام کشمیر کی کچھ یادیں لکھ کر مجھے بھیجیں گے۔ دیکھیے وعدہ کب پورا کریں۔ ان کی بیوی کو سرطان کا عارضہ ہے۔ اللہ خیر کرے۔

"ناممکن کی جستجو" کا دوسرا ایڈیشن چھپے تو اس کے آخر میں اشاریہ کا اضافہ مفید ہوگا۔

آپ کے گھر میں سب کی صحت و عافیت کی دُعا۔

آپ کا بھائی

داؤد رہبر

11 July, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، پانچویں قسط آپ کو مل چکی ہوگی۔ اس خط کے ساتھ چھٹی اور ساتویں قسطیں اکٹھی بھیجی جا رہی ہیں، ان میں جو کچھ کہا گیا ہے، میرے عندیے میں موضوع سے ہٹ کر نہیں ہے۔

ہمارے گھر میں ایک دیہاتی ملازم تھا۔ میراں بخش اس کا نام تھا۔ چلتے پھرتے یہ پنجابی گنگنایا کرتا تھا:-

ظالم لوکی شیریں تیرے شہر دے

(اس کے گانے میں "ظالم لوکی" کا تلفظ "زل ملوکی" ہو کر آیا کرتا تھا)

کیسے بیساختہ بول ہیں، عاشق صرف صاف نہیں کہتا کہ شیریں! تو جفا پیشہ ہے۔ اس کی بجائے کہتا ہے شیریں! تیرے شہر کے لوگ ظالم ہیں۔

میں نے پطرس پر لکھنے کو قلم اٹھایا تو شہر لاہور کے بیسیوں دوسرے ساکنین بھی یاد آئے۔ پطرس کا تذکرہ میں نے ان کے تذکرہ سے الگ رکھ کر لکھنا نہ چاہا۔

بخاری بھائیوں کا میل جول کن سے تھا۔ پانچویں قسط میں یہ بتایا، بخاری بھائی کتراتے کن سے تھے، یہ بھی دیکھنا چاہیے۔

ساتویں قسط میں میں نے مولوی شفیع صاحب کا تذکرہ جو اتنا لمبا لکھا، اس سے یہ دکھانا مطلوب نہیں کہ یہ پطرس سے برتر آدمی ہیں۔ میں نے تو یہ دکھانا چاہا ہے کہ یہ بھی ہمارے دور کے رتن تھے۔ ان کی اپنی شان تھی۔ پطرس کی اپنی البتہ پطرس والا سوانگ ان میں نہیں تھا۔

گورنمنٹ کالج میں ہمارا ایک ہم جماعت محمد حسین تھا۔ اپنے شوق سے مصوری کیا کرتا تھا۔ کسی آرٹ سکول یا کسی استاد سے سیکھے بغیر طبعزاد نقاشی کرتا تھا۔ صوفی تبسم صاحب اس کے اس ہنر سے واقف ہوئے۔ انہوں نے جب بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تو چاہا کہ یہ تصویروں کے ساتھ چھپیں۔ محمد حسین کو ساتھ لے کر یہ بڑے بخاری صاحب کے بنگلے میں پہنچے۔ محمد حسین سے بخاری صاحب کی گفتگو یوں شروع ہوئی:-

بخاری: بی۔ اے کر چکے ہو، اب کیا ارادہ ہے؟

محمد حسین: ایم اے کروں گا۔

بخاری: کس مضمون میں؟

محمد حسین: انگریزی میں کرنے کا ارادہ ہے۔

بخاری: سبحان اللہ، کیا عمدہ مضمون چنا ہے تم نے!

اس سے کسے انکار ہے کہ انگریزی کے آنے سے ہمارے اردو ادب نے نیا رنگ پکڑا اور نئی اصناف پیدا ہوئیں لیکن اس کے آنے سے اردو اور فارسی اور عربی کی جو تحقیر کالجوں میں ہوئی، اس سے بے حد دکھ ہوتا ہے۔

اپنے فنون کی "کمتری" اور یورپ کے فنون کی "برتری" کا احساس گریجوایٹوں میں اس قدر ہے کہ ملٹن اور بائرن کی نظمیں سن کر کہیں گے یہ شیمپین ہے اور سنائی اور نظامی کے اشعار سن کر کہیں گے یہ ستو ہیں۔

امریکہ کے کوہستانی علاقوں کے دیہات میں بینجو بجائی جاتی ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی (اور مصری اور ایرانی) لڑکے لڑکیاں یہاں ٹیلی ویژن پر بینجو کا باج سن کر سر دُھنتے ہیں۔ کابل کے ربابی کے رباب کا ریکارڈ سنتے ہیں تو بے لطف ہوتے ہیں، تف ہے۔

اور خود امریکیوں کی ذہنیت یہ ہے کہ رئیس خاں کی ستار اور ذاکر حسین کا طبلہ سنیں گے تو ان کی موسیقی کے کمال اور اس کی پختگی کو کھسیانے ہو کر بادلِ ناخواستہ تسلیم کریں گے۔ حوصلہ مندی کے ساتھ نہیں، رشک آئے گا تو اسے چھپائیں گے۔ یہ سب نفسیاتی جنگیں ہیں۔

KUTABKHANA OSMANIA

راشد صاحب ہمارے بہترین سنگیت پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی ترقی پسندی ہی نہیں، ان کی مغرب پرستی بھی تھی۔ کوئی مغرب پرست یا مشرق پرست ہو کر کیوں رہ جائے۔ اللہ المشرق والمغرب ؏

بہر کجا کہ رسیدیم آسمان پیداست

سب بچے جانتے ہیں کہ مزا ٹافی میں بھی ہے، برفی میں بھی۔

آئندہ ایک مہینے میں ایک قسط اور لکھوں گا اور باقی قسطیں لاہور سے واپس آ کر جنوری میں۔ لاہور کے لیکچروں کی تیاری کے لیے اب مطالعہ اور بچار ضروری ہے۔ یہ امر مجبوری ہے۔ جنوری میں تازہ دم ہو کر لکھوں گا تو آمد ہو گی آورد نہ ہو گی۔

پچھلی قسط میں آپ نے ایک گروپ فوٹو کا ذکر پڑھا ہو گا، اصل فوٹو بہت بڑے سائز کا ہے۔ یہی فوٹو چھوٹا کرا کے ادارۂ معارف اسلامیہ کی روداد میں بھی چھاپا گیا ہے۔ وہاں سے اس کی فوٹو کاپی کر کے آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اصل فوٹو کا پرنٹ فوٹو گرافر کی دکان سے بنواؤں گا اور کراچی اپنے ساتھ لے کر آؤں گا اور آپ کو پیش کروں گا۔ ان شاء اللہ

آپ کے گھر میں سب کی تندرستی اور
خیریت کی دعا۔ ضیاء کو خط لکھیں تو میرا
سلام اور پیار بھی لکھیں۔

آپ کا برادر
داؤد رہبر

29 July, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، خدا کرے آپ اور آپ کے گھر میں سب خیریت سے ہوں اور شہر میں امن ہو۔ میں زید سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے، کراچی کے حالات اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ عمرو سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے، حالات بہت خراب ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے پانچویں قسط ۱۶۔ جون کو یہاں سے ڈاک میں ڈالی۔ چھٹی اور ساتویں قسطیں ایک ہی لفافے میں ڈال کر ۱۱ جولائی کو روانہ کیں۔ بدامنی کے دنوں میں ڈاک کے بروقت پہنچتے رہنے کا اعتبار نہیں۔ آپ کا خط آئے تو قسطوں کے وہاں پہنچ جانے کی طرف سے اطمینان ہو۔

حسبِ وعدہ ایک قسط اور بھیج رہا ہوں۔ یہ اور گزشتہ دو تین قسطیں شاید بادی النظر میں ''جملۂ معترضہ'' لگیں لیکن دراصل یہ قسطیں لکھ کر میں نے آئندہ ابواب (بلکہ باقی دس پندرہ آپ بیتیوں سے متعلق ابواب) کے لکھنے کو زمین تیار کی ہے۔ ہر شخص کی حیثیت بہرحال معاصرانہ ہے۔ اسے معاصرین کے درمیان دکھا کر اس کی باتیں کی جائیں تو پھر وہ جیتا جاگتا ہو کر سامنے آتا ہے۔ اپنے عصر کا انسان ہو کر۔

چھوٹے بخاری صاحب کے احوال بڑے بخاری صاحب کے احوال سے متباین ہیں۔ چھوٹے بھائی نے ''سرگزشت'' یہ کہہ کر شروع کی۔ ''میری زندگی کی منجدھار ریڈیو ہے۔'' بڑے بخاری صاحب اپنی روداد میں

لکھتے تو کہتے ''میری زندگی کی منجدھار گورنمنٹ کالج ہے۔'' میں اب جو قسط بھیج رہا ہوں، یہی بات ذہن میں رکھ کر میں نے لکھی ہے۔

بہت سی کتابیں اور رسالے مجھے یہاں دستیاب نہیں۔ آپ کی تصنیف ''تعارف الفرقان'' آپ کے کلام کے دو مجموعے، تاثیر صاحب اور صوفی تبسم صاحب کے کلام کے مجموعے، بخاری صاحب کی وہ انگریزی تقریریں جو انہوں نے اقوام متحدہ کی اسمبلی کے لیے لکھیں۔ فیلڈن کی آپ بیتی وغیرہم۔ لاہور سے یہ چیزیں لے کر آؤں گا تو باقی ابواب کے لکھتے ہوئے معلومات خاطر خواہ ہوں گی۔

لاہور کے پانچ لیکچر انگریزی میں لکھنے ہیں۔ صرف تین مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ اب میں فکرمند ہوں، ان لیکچروں کے لیے سوچ بھی درکار ہے اور مطالعہ بھی۔ برجستہ لیکچر دے کر مجھے زیادہ مزا آتا ہے لیکن لکھ کر لے جاؤں گا تو تلی تلی بات کر سکوں گا۔ پھر یہ خواہش بھی ہے کہ پانچ لیکچروں کا ایک کتابچہ اشاعت کے لیے فراہم ہو جائے۔

مجھے خبر نہیں کہ میری بھیجی ہوئی قسطیں سلسلہ وار ''علامت'' میں چھپ رہی ہیں یا نہیں۔

میری یادیں پچاس پچپن سال پہلے کی ہیں۔ لاہور اور کراچی پر اتنی مدت میں کیسی کیسی رُتیں آئیں اور سانحات نے ذہنیتوں کو کس کس طرح متحول کیا، مجھے کچھ خبر نہیں۔

جو ابواب آپ کو پہنچے ہیں، وہ بھی میری چٹھیاں ہی تو ہیں۔ کھلی چٹھیاں۔ میری خوشی اس پر منحصر ہے کہ آپ انہیں پڑھ کر خوش ہوں۔ بمصداق ؏

ہر کہ از دوست می رسد نیکوست

ضیاء کو سلام اور پیار۔ ان شاء اللہ نومبر میں ان سے بھی ملاقات رہے گی۔ آفتاب احمد خاں امریکہ آئے تھے، فون پر ان سے گپ بازی ہوئی۔ ان کو بھی میرا سلام۔ اللہ آپ کو تندرست رکھے۔

آپ کا ہجراں نصیب بھائی
داؤد رہبر

31 July, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، میں نے ۱۹۔ جون والے خط میں باقی ماندہ ابواب کے نو عنوانوں کی ایک فہرست لکھی تھی، اس میں دو عنوانوں کے اضافہ کا خیال آیا:-

(۱) حمید نسیم صاحب اور چھوٹے بخاری صاحب کی غزل گوئی

(۲) حمید نسیم صاحب کی لکھی ہوئی تفسیر قرآن

شاعری والا باب لکھنے کے لیے آپ کے کلام کے دونوں مجموعے ''دودِ تحیر'' اور ''دستِ جنوں'' درکار ہیں۔ کراچی سے دونوں لے کر آؤں گا۔ ان سے لطف اٹھا کر قلم اٹھاؤں گا۔

ایسا لگتا ہے کہ بخاری صاحب کا دیوان کسی نے اب تک جمع نہیں کیا۔ اس کی جمع آوری پر آپ کسی باہمت نوجوان کو لگا دیں تو ان کا کلام محفوظ ہو جائے۔ مجھے آپ کے اعتناء سے ان کی بیس تیس غزلیں مل جائیں تو

ممنون ہوں گا۔

''تعارف الفرقان'' پڑھنے کا مجھے بے حد اشتیاق ہے۔ ''دبستانِ مذاہب'' جو شاہجہاں کے عہد میں لکھی گئی اور جسے میرزا غالب پڑھا کرتے تھے، آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ اسے بھی تلاش کروں گا۔ مل گئی تو اس کے موقف سے ''تعارف الفرقان'' کے موقف کا موازنہ مفید ہوگا۔

اب آپ سے لاہور اور کراچی میں باتیں ہوں گی، ان شاء اللہ۔ دعائے صحت و عافیت۔

خواہانِ رضائے دوستاں

آپ کا بھائی

داؤد رہبر

9 October, 1996

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، آپ کا ۱۵۔ ستمبر کا خط موصول ہوا۔ اس کے ساتھ ایک سابق خط ۲۳ جولائی کا لکھا ہوا بھی ملفوف تھا جو پتہ نامکمل ہونے کے باعث آپ کو لوٹا دیا گیا تھا۔ کئی روز میری مکتوب نویسی موقوف رہی۔ لاہور کے لیکچروں کے لیے مطالعہ بھی درکار ہے اور سوچ بچار بھی۔ ایک لیکچر لکھ چکا ہوں۔ اس کا عنوان ہے ''تاریخ عالم کا بادشاہی دور'' دوسرے کا موضوع ہے ''ہمارے زمانے میں سلطانیت اور جمہوریت کے کھیل'' یہ موضوع زیادہ مشکل نکلا۔ اس کے لیے دو مہینے دماغ لڑایا کہ اس کی آستھائی کیا ہو اور انترہ کس طرح بندھے۔ دو ماہ کے بعد اب قلم اُٹھایا ہے۔ اس لیکچر کے لیے ایران اور ترکی کی دو سو سالہ تاریخ (انیسویں اور بیسویں صدی) کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ جو کچھ پڑھا اس سے عبرت دُگنی ہو گئی۔

معلوم ہوتا ہے ریٹائر ہونے کے بعد آپ کے مشاغل بیشتر کتب بینی اور قلم و قرطاس ہی کے ہیں۔ تفریح (جسے مولانا مودودی لہو و لعب کہا کرتے تھے) ان میں شامل نہیں رہی۔

بوسٹن میں طبلے کی سنگت میسر تھی۔ یہاں اس سے بھی محروم ہوں۔ البتہ بیوی کی علالت کی وجہ سے مطبخ کا کام میرے سپرد ہے۔ جونہی دماغی تھکن ہوتی ہے پیاز کی بھنائی میں لگ جاتا ہوں، مسالے کی باس میں رچی ہوئی بھاپ جب نتھنوں کی راہ سے مغز کو جاتی ہے تو علم کی خشکی دور ہو جاتی ہے۔

میں لاہور ۱۵۔ نومبر کو پہنچوں گا اور وہاں دو ہفتے ٹھہر کر ۲ دسمبر کو کراچی جاؤں گا۔ تین روز وہاں ٹھہر کر ۶ دسمبر کی صبح مجھے کراچی سے واپس روانہ ہونا ہے۔ کراچی میں میرا قیام میرے برادر محمد ایوب کے ہاں ہوگا۔ یہ مجھ سے ڈیڑھ برس بڑے ہیں۔ پہلی جماعت سے ایف اے کے اختتام تک یہ میرے ہم جماعت رہے۔ پہلے موڈل ٹاؤن ہائی سکول میں، پھر سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں، پھر گورنمنٹ کالج میں۔ یہ تاجر پیشہ تھے، اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

اعجاز اپنے بھائی آغا بابر اور اپنے بیٹے شاہد کے پاس تین ہفتے گزار کر ترسوں امریکہ سے واپس روانہ ہوا۔ ۷۔ اکتوبر کو لاہور پہنچا، اس سے فون پر تین چار بار گپ بازی ہوئی۔

میرے گانے کا جلسہ حیات احمد خاں صاحب کی دختر پروفیسر غزالہ عرفان سلمہا نے یکم دسمبر کی شام

۶ بجے الحمرا نمبر ۳ میں رکھ دیا ہے۔ آپ وہاں بھی تشریف لائیں تو مجھے بے اندازہ خوشی ہوگی۔

آپ کے گھر میں سب کی خیریت اور صحت کی دعا کرتا ہوں۔ لاہور اور کراچی میں ان شاء اللہ آپ سے باتیں ہوں گی۔ ۱۵۔ نومبر سے پہلے اگر آپ ''تعارف الفرقان'' کی پہلی جلد میرے لیے اعجاز کو پہنچا دیں تو بڑا کرم ہوگا تاکہ آپ کی تشریف آوری سے قبل اس کو دیکھ لوں۔

مشتاقِ دید

داؤد رہبر

23 January, 1997

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، تین ہفتے پاکستان میں گزار کر دسمبر کی سات تاریخ کو واپس پہنچا۔ میری غیر حاضری میں میری بیوی کی پرستار میری بہن تھی (پرستار جدید فارسی میں تیمار دار کو کہتے ہیں) بہن کے میاں مرحوم ہو چکے ہیں۔ اب یہ لاہور چھوڑ کر اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ امریکہ ہی میں رہتی ہے۔

ہماری چھوٹی بیٹی یہاں فلوریڈا میں ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔ مجھے پاکستان جانے سے روکتی تھی۔ آخر اس شرط پر راضی ہوئی کہ میں پاکستان سے اس کے لیے ایک خوش پوشاک گڑیا خرید کر لاؤں۔ کراچی سے کشمیری وضع قطع کی ایک گڑیا خریدی گئی۔ واپس پہنچا تو اس نے پوچھا لائے یا نہیں؟ میں نے کہا، نہیں۔ اس نے قیافہ دیکھ کر کہا، جھوٹ کہتے ہو۔ میں نے سوٹ کیس سے نکال کر گڑیا سامنے رکھ دی۔ اس پر اس نے تین ہفتوں کی غیر حاضری کا جرم معاف کر دیا۔

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ ایک مضمون لکھ کر کرم فرماؤں کو بھیجا جائے گا:-

''تین ہفتے پاکستان میں''

اس سفرنامے کا لکھنا ان شاء اللہ فروری کے وسط میں شروع ہوگا۔ فی الحال ایک اور کام کرنا ہے۔ ''نیا دور'' والے مضامین کی کتاب بنا کر لاہور سے اسے چھپوانے کا انتظام اعجاز نے کیا ہے۔ اس کے لیے یہ ایک مقدمہ مجھے لکھنا ہے، اس کا عنوان یہ سوچا ہے۔

''مذہب اور مشرب: فرد کے روز و شب میں مذہب کی کارفرمائیاں''

اس کا خاکہ میرے ذہن میں ہے۔ دس پندرہ دن اسے لکھنے میں لگیں گے۔ یہ لکھ چکوں تو سفرنامے پر قلم اُٹھاؤں۔

''تعارف الفرقان'' کی جلد اول کا آخری حصہ ''عالمی فلسفہ اور مذہب'' میں نے پڑھا۔ نہایت مفید اور عمدہ ملخص ہے۔ گیان اور دھیان کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اسے الگ کتاب کی صورت سے بھی شایع ہونا چاہیے۔ بدھ مت کا تعارف اس میں سرسری ہے اور نہایت ہی مختصر۔ گوتم کی تعلیم کا لہجہ ترغیب خیر کا ہے، ترہیب کا نہیں۔ ''دھمپد'' میں خبردار خبردار کا نعرہ کہیں نہیں۔

آفتاب احمد خاں نے ''تعارف الفرقان'' پر جو تبصرہ لکھ کر شایع کیا، اسے دیکھنے کا آرزو مند ہوں۔ آپ کے گھر میں آپ سے قرب کے جو لمحے نصیب ہوئے، وطن کی زیارت کا حاصل ہیں۔ آپ کے منظوم

KUTABKHANA OSMANIA

اور نثری آثار قلم کے عطیات میرے سامنے میز پر رکھے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہوتا رہے گا اور آپ سے خطوں میں باتیں کرنے کے موضوع ان سے حاصل ہوتے رہیں گے۔

بھابی صاحبہ کو سلام پہنچے اور اس کے ساتھ مہمان نوازی کا شکریہ، بیٹوں اور بیٹی کی صحت اور خوشحالی کی دُعا۔

آپ کا شکرگزار بھائی

داؤد رہبر

14 February, 1997

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ''نیا دور'' والے مضامین (کلچر کے روحانی عناصر) کی کمپوزنگ مکتبہ سنگ میل میں ہو رہی ہے۔ وہاں سے یہ ان شاء اللہ کتاب کی شکل میں شائع ہوں گے۔ اس کے لیے میں نے ایک ''مقدمہ'' لکھا ہے۔ اس کی ایک فوٹو کاپی آج اعجاز کو بھیج رہا ہوں، ایک آپ کو۔ پاکستان سے واپس آ کر دو مہینے سوچتا رہا کہ اس مقدمہ میں کیا لکھوں۔ پچھلے ہفتے کچھ سجھائی دیا تو قلم اُٹھایا۔

اس سال مئی میں اکہتر کا ہو جاؤں گا۔ بفضل الٰہی تندرست ہوں لیکن طول امل کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔ (طولِ عمل سے البتہ چھٹکارا نہیں) کچھ انتظام ایسے کرنے ہیں کہ جب رحلت کروں تو بیوی اور بیٹی پر برا وقت نہ آئے۔

آپ خط لکھیں تو ایک مہربانی یہ بھی فرمائیں کہ ان ہنرمندوں کے نام اس میں لکھ دیں جنہوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے گھر میں سنگت کی۔ طبلے کے اُستاد کا نام اور ہارمونیم کے اُستاد کا نام۔ دو نو ایک پرچی پر میں نے لکھ کر جیب میں محفوظ کیے، وہ پرچی مل نہیں رہی۔

۴۔ اپریل کو بوسٹن کے ایک ہال میں میرا گانا ہوگا، وہاں سنگت ویسی عمدہ نہ ہوگی جیسی کراچی میں نصیب ہوئی۔ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کا گھر دیکھ آیا۔ اب اس کا منظر دل میں ہے۔ اس کی یاد سفرِ پاکستان کی یادوں میں خاص ہے۔ بھابی صاحبہ کو مسافر کا سلام، بیٹوں اور بیٹی کو سلامتی اور خوشحالی کی دُعا۔

آپ کا نام لیوا

داؤد رہبر

21 March, 1997

محترم بھائی جان!

السلام علیکم، نواسی کی شادی مبارک ہو۔ اس کے لیے آپ کو باوجود ضعیفی کے دو طرفہ سفر ریل گاڑی سے کرنا پڑا۔ ریلوے سٹیشنوں پر اگلے وقتوں میں جو میلہ لگا رہتا تھا، وہ بات اب نہیں رہی اور آپ نے تو یورپ، امریکہ اور جاپان کی ریل گاڑیوں پر سفر کیے ہیں۔ ویسا آرام اپنے ہاں کی تیز گام پر کہاں ہے۔ میں نے ۱۹۷۵ء میں کوئٹہ سے زاہدان اور پھر واپس زاہدان سے کوئٹہ ریل گاڑی کا سفر کیا۔ اس میں کیا گزری، کیا بیان کروں، ادھ موا ہو کر واپس کوئٹہ پہنچا۔

گزشتہ دسمبر کے شروع میں پاکستان سے واپس آیا۔ بہترین یادیں ملاقاتوں کی لے کر۔ ان میں گم رہ کر خلوت اور سکوت کو دوست رکھا۔ پچھلے پانچ مہینوں میں لکھنا کم ہوا۔ پڑھنا اور سوچنا زیادہ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، صاف گو ہو کر خیال کو قلمبند کرنے میں آج کل کیسی احتیاطیں لازم ہیں۔ زندگی کے باقی لیل و نہار کا بہترین مصرف کیا ہو، اس کی سوچ لگی ہوئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نگارشیں رسالوں کے لیے لکھوں تو بکھری رہیں گی۔ کسی ایسی تصنیف کا خواب دیکھتا ہوں جو میری ہی نہیں دوسروں کی بھی ''تمنا کا دوسرا قدم'' ہو۔ زمانہ آگے نکل گیا ہے۔ ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔

اگلے دو تین برسوں میں اوقات کو بانٹ کر کام کرنا ہوگا۔ آدھا وقت اردو کے لیے، آدھا انگریزی کے لیے۔ شاید ایک خط میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یورپ اور امریکہ کے محقق آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں سے نابلد رہ کر تقابلی کام کر رہے ہیں۔ اس طرح تشفی کسی کو بھی حاصل نہیں۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ اردو کی آپ بیتیوں میں پرائیویٹ احوال کی تفصیل بہت ہی کمیاب ہے۔ ناولوں میں البتہ ایسی تفصیل ملتی ہے۔ تہذیبوں کی تقابلی تحقیق میں ناول اور سوانح عمری کی بحث ضرور آئے گی۔

آپ کی اور دیوان سنگھ مفتوں اور گیان سنگھ شاطر کی آپ بیتیاں منگتے ہیں اور ہاں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی بھی۔

آج کل ٹالسٹائی کی سوانح عمری دیکھ رہا ہوں۔ وہ ناول نگار بھی تھا اور ڈائری نگار بھی۔ برسوں اپنی ڈائری باقاعدگی سے لکھتا رہا، بغیر اخفا کے۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں اس کی بیوی نے بھی ڈائری لکھی۔ چنانچہ ٹالسٹائی کی زندگی کے احوال کھلی کتاب ہیں۔ ان کے انکشاف غیر معمولی پیمانے پر میسر ہیں۔

اردو کی سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے ذاتی کتاب خانے میں جتنی جمع ہیں، ان کے درشن کراچی میں ہوئے۔ میرے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ جو کچھ میرے پاس ہے، اسی پر اکتفا کروں گا۔

ان دنوں شورش کاشمیری کی آپ بیتی پھر پڑھی اور خیال آتا رہا کہ آپ سے پوچھوں شورش سے آپ کی ملاقات تھی یا نہیں۔ برسوں لاہور سے دور رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے معاصرین کے باہمی مراسم سے بے خبر ہوں۔ جی چاہتا ہے اعجاز سے بھی شورش کے بارے میں پوچھوں۔ آپ بیتی پڑھ کر تاثر ہوا کہ یہ بہادر آدمی تھا۔ مرحوم نے لکھا ہے کہ اس کی نانی برہمن تھی۔ پنڈت جواہر لعل سے اس کے انس کی وجہ مجھے یہی نظر آئی۔ آپ نے خالصہ کالج میں اور شورش نے دیوسماج سکول میں تعلیم پائی۔ ایسی باتیں اب بھارت میں ہوتی ہوں گی۔ پاکستان میں ایسے اختلاط مفقود ہیں۔ مخلوط آبادیوں کی زندگی بہتر ہے یا نامخلوط آبادیوں کی؟ یہ دلچسپ سوال ہے۔

سالک صاحب کی ''سرگزشت'' میں بیشتر تذکرے خواص کے ہیں۔ شورش کی آپ بیتی میں عوام کی بھی بہت سی باتیں ہیں۔

فہم عام (Common Sense) ہم سب کو ودیعت ہے لیکن لگن سب کو نہیں۔ فہم عام سے کام لے کر ہی فرائڈ، ینگ اور ایڈلر نے علم النفس کا ڈول ڈالا۔ لگن پروردگار کے دین ہیں، آپ کی زندگی لگن کی زندگی ہے۔ آپ ان ریٹائرڈ افسروں کی طرح نہیں ہیں جو صبح اُٹھ کر کہتے ہیں یا اللہ دن کیسے گزرے گا۔ کچھ کرنے کو نہیں

KUTABKHANA OSMANIA

اور پھر آپ نے رزقِ حلال پر قناعت کی۔ اسی کی برکت سے آپ میں روحداری ہے۔

''علامت'' میں قسطیں متواتر چھپتی رہیں یا نہیں؟ مجھے کچھ خبر نہیں۔ اب تہیہ ہے کہ ہر مہینے ایک قسط لکھوں اور اس سلسلہ کو مکمل کروں۔

بھائی بابر صاحب ہر سال کسی عزیز کی شادی میں شریک ہونے کو لاہور یا اسلام آباد جاتے ہیں، اعجاز ان کے ہاتھ دو تین کتابیں میرے لیے بھیج دیتا ہے، دیکھیے اب کے کیا لاتے ہیں۔

''علامت'' کے لیے ایک قسط چند دنوں میں بھیجوں گا۔ بیٹوں کو اور بھابی صاحبہ کو اور بہو کو صحت و عافیت کی دُعا۔ اللہ آپ کو تندرست رکھے اور آپ کا خامہ کا غذوں پر دوڑتا رہے۔

آپ کا برخوردار

داؤد رہبر

16 May, 1997

محترم بھائی جان، السلام علیکم!

میں نے اپنے آپ سے آپ کو ہر مہینے دو خط لکھنے کا پیمان کیا تھا۔ اس پیمان کے ایفا میں کوتاہی ہوئی۔ درگزر کا ملتمس ہوں۔ اپریل میں بوسٹن چلا گیا۔ وہاں بوسٹن یونیورسٹی میں ایک لیکچر دیا اور پھر ایک ہال میں گایا۔ اپنے دیرینہ رفقاء کے ساتھ لنچ کھایا۔

وہاں سے پچھتر میل کے فاصلے پر ایک یونیورسٹی ہے جس میں میرے بچپن کے مجھولی آغا اشرف علی صاحب کے دو بیٹے پروفیسر ہیں۔ بڑا بیٹا آغا شاہد علی انگریزی کا شاعر ہے۔ امریکہ کے شعراء میں خاصا معروف ہے۔ اس نے فیضؔ کے کلام کا انگریزی ترجمہ کر کے چھپوایا ہے۔ دوسرا بیٹا آغا اقبال علی کمپیوٹر کے اسرار کا پروفیسر ہے۔

بیگم آغا اشرف علی سرطان کی مریضہ تھی۔ ان کے بیٹوں کے ہمراہ میں عیادت کے لیے ہسپتال گیا۔ مریضہ کی آنکھیں بند تھیں۔ کئی روز بے ہوش رہی۔ اس حال میں بھی کلمۂ شہادت بار بار اس کی زبان پر تھا۔ اسی حال میں رحلت کر گئی۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت کے آرام عطا فرمائے۔ میت کو لے کر یہ سب لوگ سرینگر گئے۔ اقارب کی قبروں کے احاطے میں اسے دفن کیا۔

ڈاکٹر آغا اشرف علی کشمیر میں ڈائریکٹر آف ایجوکیشن تھے۔ اس عہدے پر فائز ہونے سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں اُستاد تھے۔ ذاکر صاحب کے معتقدین میں سے ہیں۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آغا شوکت علی کے چھوٹے بھائی ہیں۔

بوسٹن سے واپس آ کر میں نے پاکستان کی زیارت کی کہانی لکھی۔ پندرہ دن اس کہانی کے لکھنے میں صرف ہوئے۔ مسودہ اس کا صاف کروں گا اور مبیضہ کی فوٹو کاپیاں بنوا کر آپ کو اور دیگر چند احباب کو بھیجوں گا۔

''علامت'' میں چھپنے والے ابواب کی آٹھ نو قسطیں لکھ چکا تو پچھلے سال لاہور کے لیکچروں کی تیاری مزید قسطیں لکھنے سے مانع ہوئیں۔ جتنی قسطیں جناب سعید شیخ صاحب کے پاس چھوڑ آیا ''علامت'' میں غالباً سب چھپ چکی ہوں گی۔ شیخ صاحب مزید قسطوں کے منتظر ہوں گے۔ میرا ذہن اب ان کے لکھنے کے لیے تیار

ہے۔ ان شاء اللہ ہر مہینے ایک باب بھیجتا جاؤں گا تا تکمیل سلسلہ۔

میں نے اپنی ایک سابقہ چٹھی میں بقیہ ابواب کے عنوانوں کی فہرست لکھ بھیجی تھی۔ اب پھر لکھتا ہوں:

(۱) پطرس بخاری صاحب کی بے رُخی اور پنجاب کے اساتذہ سے۔
(۲) بخاری بھائیوں کے آپس میں تعلقات
(۳) چھوٹے بخاری صاحب کے مراسم معاصرین سے
(۴) حمید نسیم صاحب کے مراسم معاصرین سے
(۵) حمید نسیم صاحب کا امر تسر
(۶) حمید نسیم صاحب کا اور چھوٹے بخاری صاحب کا شغف موسیقی
(۷) وضع قطع مشرقیت اور مغربیت
(۸) حمید نسیم صاحب کی اور چھوٹے بخاری صاحب کی شاعری
(۹) حمید نسیم صاحب کی تصنیف ''تعارف الفرقان''
(۱۰) دلوں کے حال

ان میں سے شغف موسیقی والا باب لکھنے کے لیے مجھے چھوٹے بخاری صاحب کی تالیف ''راگ دریا'' پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری کے تذکرہ کے واسطے ان کی چند غزلیں بھی درکار ہیں۔ ''راگ دریا'' اور غزلیں آپ کو کہیں سے مل جائیں تو آپ باحتیاط انہیں اپنے پاس رکھیں۔ انہیں کسی کے ہاتھ منگانے کی سبیل ان شاء اللہ نکل آئے گی۔

طارق رحمان صاحب کو میرا اسلام پہنچے۔ آپ کی تفسیر کی جلد اوّل اور جلد پنجم کے آخری حصوں کو ملا کر دو انہیں کتابی صورت میں چھاپنے پر راضی ہیں۔ یہ بڑی اچھی خبر ہے۔ اس کے لیے تقریظ لکھنا میرے لیے موجب برکت و افتخار ہوگا۔ ہمارے دوست آفتاب احمد خاں پانچویں جلد مجھے پہنچا دیں تو تقریظ لکھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار پاؤں۔

پاکستان کا سفرنامہ ساٹھ ستر صفحوں کا ہے۔ چھپ کر تیس چالیس صفحات کا ہوگا۔ مسودے کی فوٹو کاپی مئی کے آخر میں آپ کو اور دیگر چند احباب کو بھیجوں گا۔ امید ہے پاکستان کے کسی رسالہ میں یہ سفرنامہ چھپ جائے گا۔

بھائی صاحب کو اور بہو کو اور بیٹی اور بیٹوں کو سلام مسافر اور دعائے صحت و عافیت۔

آپ کی شفقت سے خوش برخوردار

داؤد رہبر

13 July, 1998

محترم بھائی جان، السلام علیکم!

آپ کا موقت نامہ ملا۔ معذرت چاہتا ہوں کہ جواب فوراً نہ لکھا۔ متقاعد ہو کر تنہائی مجھے راس آئی تو یکسو ہو کر سوچ بچار کر سکا اور قلم کے ذریعے احباب سے گفتار کر سکا لیکن اب جی چاہتا ہے کہ تحریر بھی کروں اور

KUTABKHANA OSMANIA

تقریر بھی کروں۔ کسی مقامی درسگاہ میں جز وقتی ملازمت مل جائے تو گھر سے باہر نکلا کروں۔ کلاس روم میں لیکچر دوں۔ طلبہ مجھے دیکھیں اور میں طلبہ کو دیکھوں۔ مرضی کی خلوت اور چیز ہے اور مجبوری کی تنہائی اور، تھوڑا بہت ہنگامہ بھی چاہیے۔

آج سویرے آفتاب کا فون امریکہ کے ایک شہر سے آیا۔ معلوم ہوا کہ پرسوں شام وہ یہاں فلورڈا پہنچے گا۔ جتنی دیر میرے پاس رہے گا (...... یہ محاورہ کہیں پنجابی تو نہیں؟ ......) شور مچائے گا اور رونق لگائے گا۔

''راگ دریا'' کی فوٹو کاپی ساتھ لے کر آئے گا۔ اس کی فراہمی آپ کے اعتناء سے ہوئی۔ بے حد ممنون ہوں۔

کاش میں ان بیٹھکوں کا حاشیہ نشین ہوتا جن میں آپ نے اُستاد نذر حسین کو دُھنیں سکھائیں اور ریہرسل کرائے۔ مطربوں کی بیٹھک کے کیا کہنے! قوالی تو پہلے بھی کلاسیکی پائے کی چیز تھی لیکن سازسنگت والی غزل سرائی بھی اب کلاسیکی مرتبے کو پہنچ گئی ہے۔ بحر کی مناسبت سے تال کا چناؤ اور پھر بہلاووں کے ساتھ ہر شعر کے پہلے مصرعے کا اُٹھانا اور دوسرے مصرعے کو ادا کرتے ہوئے خوبی کے ساتھ سم کا ٹھیک لانا، یہ سب اُستادی کی باتیں ہیں۔

''تعارف الفرقان'' (جلد اوّل) کے آخری باب کی جداگانہ شاعت (بہ شکل کتاب) کے لیے تقریظ ان شاءاللہ جولائی کے آخر میں لکھ کر بھیج دوں گا۔ آپ کی تصنیف کے ساتھ اس وابستگی کو وسیلۂ برکت جانوں گا۔

ڈاکٹر نعمان الحق صاحب جو میرا خط آپ کو بوقتِ ملاقات پہنچائیں گے، مولانا منتخب الحق مرحوم کے فرزند ہیں' امریکہ میں یہ میرے مونس اور دمساز ہیں۔

''اسلامی تمدن میں سائنس'' ان کا خاص مضمون ہے۔ ایک امریکی یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ مجاز اور حقیقت دونوں پر آپ کی ان کی خوب باتیں ہوں گی۔

آپ کا گھر مجھے بہت یاد آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کے ساکنوں کو خوش وخرم رکھے۔

آپ کا گرویدہ برادر

داؤد رہبر

8 August, 1998

محترم بھائی جان، السلام علیکم!

آفتاب اپنی بیگم کے ساتھ یہاں آیا۔ دو دن خوب رونق رہی۔ ''راگ دریا'' اس نے مجھے پہنچادی۔ میرے گھر کے شیلفوں پر اسے اردو کی سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں دکھائی دیں تو وہ ان کی طرف لپکا۔ کبھی ایک کتاب کھول کر اور کبھی دوسری کھول کر پڑھنے میں منہمک ہوا۔ میں نے کہا، تم تو انجمن کے صدر ہو، انجمن کی لائبریری میں سب کچھ ہے اور جو وہاں نہیں ہے' کراچی کی دوسری لائبریریوں میں ہے۔ وہاں سے نکلوا کر پڑھ لینا۔ یہاں کتاب ٹھپ دو اور مجھ سے باتیں کرو۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چھوٹے بخاری صاحب نے ایک اور کتابچہ ''آہنگِ موسیقی'' بھی لکھ کر چھپوایا تھا۔ اگر آپ نے دیکھا ہے تو بتائیے کہ اس میں کیا باتیں ہیں۔

آپ سے اُستاد نذر حسین نے جو دُھنیں سیکھیں، ان میں سے دو تین کی ریکارڈنگ کا کوئی ٹیپ مجھے ملے تو اسے سن کر اس انداز سے آشنائی حاصل ہو۔

تقریظ میں نے لکھ کر آج اس کا مسودہ صاف کیا، اُمید ہے کہ آپ کو مناسب لگے گی۔ جلد اوّل کا آخری حصہ پڑھ کر میں بہت مستفید ہوا۔ یونیورسٹیوں میں مذاہب اور تفلسف پر سیمینار جاری ہو تو اس کے نصاب کے لیے آپ کی کتاب عین مناسب ہے۔

اسے پڑھتے ہوئے چند مقامات پر Orphism کے لیے ''عارفیت'' کا لفظ نظر سے گزرا۔ میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ آپ لفظ ''عارفیت'' (صفحہ ۶۷۹ پر) Gnosticism کے لیے بھی لائے ہیں، اس لیے مناسب سمجھیں تو Orphism کا ترجمہ ''عارفیت'' کی بجائے ''آرفیت'' (الف کے ساتھ) کردیں۔ ''عارفی'' اور ''عارفیت'' کا ایراد Orphic اور Orphism کے معنوں میں ان جگہوں پر ہوا ہے:-

صفحہ 654: پانچویں سطر، دسویں سطر، چودھویں سطر، سترھویں سطر، اٹھارہویں سطر، پچیسویں سطر۔

صفحہ 655: گیارہویں سطر، چودھوی سطر، سترھویں سطر، انیسویں سطر۔

صفحہ 667: گیارہویں

صفحہ 605: پر یہ عبارت ہے:-

بابل میں اسٹرز مین کی دیوی تمام دیویوں کی ملکہ تھی اور اس عظیم ماں کی مختلف ناموں سے پرستش کی جاتی تھی۔ یہی عظیم ماں بعد میں شکل بدل کر مسیحیت میں مادرِ خداوند یسوع بی بی مریم بن گئی۔

میرا خیال ہے کہ یہاں بی بی مریم کا ذکر اس پیرائے میں نہ ہو تو بہتر ہے۔

میری تقریظ آپ کی کتاب کے ساتھ چھپے تو اسے اپنا اعزاز سمجھوں گا۔

آپ کے گھر میں سب کی صحت وعافیت کی دُعا کرتا ہوں۔

آپ کا برادر برخوردار

داؤد رہبر

29 September, 1998

محترم بھائی جان، السلام علیکم!

آپ کی طرف سے کرم کی کمی نہیں، باوجود بینائی کی انتہائی کمزوری کے آپ جی لگا کر پورے التفات سے خط لکھتے ہیں۔ آپ کے دو خط پچھلے دنوں ملے۔

میرے اس خط کے کراچی پہنچنے سے پہلے آپ کو یہ خبر مل چکی ہوگی کہ ۲۵ اور ۲۶ ستمبر کے درمیان آخر شب تین بجے ہمارے برادر بزرگ آغا بابر نے انتقال کیا۔ ریٹائرڈ ہو کر مرحوم اپنی بیٹیوں کے پاس آکر رہنے کی غرض سے امریکہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ یہ یہاں آئے تو ان سے ربط اور بھی گہرا ہوگیا۔ ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں اور ٹیلی فون پر پچھلے آٹھ برسوں میں تقریباً ہر ہفتے ان سے گفتگو بھی خوب خوب ہوئی۔ پچاس برس سے زیادہ زمانہ ان سے دوستی رہی، اللہ مغفرت کرے۔

بڑے بھائی کی بیماری کے بڑھ جانے سے مطلع ہو کر اعجاز امریکہ پہنچا تو قلب کے آپریشن کے لیے

KUTABKHANA OSMANIA

تحریر کو پسند فرما چکے ہیں جبھی تو میں حیران ہوا کہ انہوں نے اپنے بھائی کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیوں نہ کیا۔

قیاس ہے کہ اب کے لاہور میں ان کا قیام ایک ہنگامہ تھا۔ سکندرہ مرحومہ کی وفات کے بعد پہلی بار وہ تنہا لاہور پہنچے۔ چنانچہ اب کے ان کے ذہن کا عالم کچھ اور تھا۔ مزید یہ کہ روزانہ احباب کے ساتھ چائے نوشی اور گپ کی بیٹھکیں بھی ہوئیں۔ غور کریں تو ایسے میں پیغام رسانی کا ادھورا رہ جانا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ میں خود پاکستان میں ہوتا تو نہ موئے معاملہ کی گتھی بنتی اور نہ اسے سلجھانے کی ضرورت پیش آتی۔ جھگڑے میں کنگھی سہولت سے پھرتی۔

آپ کی مساحت اور علم پر ایمان لایا ہوں۔ آپ لاہور سے دور نہیں، آپ کی ہدایت پر اعجاز صاحب اور امجد الطاف صاحب کان کیوں نہ دھریں گے۔ سب آپ کے عقیدت مند ہیں۔

نیازمند

داؤد رہبر

6 December, 1993

بخدمت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

میرے محسن و مخدوم ڈاکٹر صاحب

سلام علیکم!

تین کی صبح پونے سات بجے طیارہ سوار ہو کر ڈھائی بجے نیو یارک پہنچا۔ بادی النظر میں پونے آٹھ گھنٹے سفر میں گئے لیکن درحقیقت طیارہ سولہ گھنٹے پرواز کرتا رہا۔ زمان و مکان کا یہ دھوکا یوں ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد [illegible] گھوم رہی تھی، ہوائی جہاز کی اڑان اس کے الٹی طرف کو تھی۔ فضاؤں میں ایسے کھیل بیسیوں ہیں، جیٹ پر [illegible] کی رفتار سے اڑتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ یہ رفتار طیاروں کے اندر نہیں باہر ہوتی ہے۔

Jet Lag کے لیے میں نے اڑان خمیازہ کی ترکیب وضع کی ہے۔ لاہور میں خمیازہ دور نہ ہوا تھا کہ واپسی کا ہوائی سفر شروع ہو گیا۔ اب کے زیارت کل چار دن کی رہی۔ اگر جلسہ بجائے دسمبر، اکتوبر میں ہوتا تو کم سے کم دو ہفتے وہاں قیام کرتا۔ دسمبر میں صرف ایک ہفتے کی چھٹی مل سکی۔

آپ سے نیاز حاصل ہونے کو دوسری باتوں پر تفوق ہے۔ اسلام آباد سے آپ کا تشریف لانا بڑا احسان ہے۔ پھر آپ نے جلسہ میں تعارفی تقریر سے میری حیثیت بنائی۔ سب آپ کی قدر افزائی سے متاثر تھے اور سب سے زیادہ میں متاثر تھا۔

قومی انگریزی اردو لغت کا گراں قدر عطیہ ساتھ لے کر آیا ہوں۔ دیگر ڈکشنریوں کے درمیان اب یہ بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ میرا استفادہ اس سے پیہم رہے گا۔

اعجاز صاحب کے ہاں اور حیات احمد خاں صاحب کے ہاں بھی آپ کی دید سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ دیکھیے فلوریڈا سے واپس بوسٹن منتقل ہونے کی کیا صورت بنتی ہے۔ آپ کو خبر دیتا رہوں گا۔

انگریزی میں ٹوئن بی کے افکار کا تبصرہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کے بعد توفیق ہوئی تو شپنگلر اور ینگ پر لکھوں گا۔ ان تبصروں سے جو کتاب بنے گی، اس سے مقصود یہ ہے کہ ادیان کے تقابلی مطالعہ و مشاہدہ کا جو نہج

خود ہسپتال میں داخل ہوا۔ آپریشن بخیر و خوبی ہوا۔ میں ۱۶۔ ستمبر کو (بھائی بابر صاحب کی وفات سے نو روز قبل) دونوں بھائیوں سے ملنے ٹیری ٹاؤن پہنچا۔ بھائی بابر کے سرہانے دس پندرہ منٹ بیٹھا۔ تخفیفِ درد کی دوا کے اثر سے ان کا حال نیم بے ہوشی کا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں زیادہ بولنے سے باز رہا۔ زیادہ بولتا تو ان کی راحت میں مخل ہوتا۔ اعجاز بھی پاس بیٹھا تھا۔

وہاں سے اُٹھ کر میں اعجاز کے ہمراہ اس کی بھتیجی ڈاکٹر بابرہ کے گھر پہنچا۔ وہاں کھانا کھایا۔ اعجاز کا آپریشن ۲۸ اگست کو ہوا تھا۔ انیس روز گزر چکے تھے۔ اب ہمارا دوست روبصحت تھا۔ دو گھنٹے خوب باتیں ہوئیں۔ اعجاز کو ڈاکٹر کی طرف سے ہوائی سفر کی اجازت ملے گی تو وہ لاہور کو پرواز کرے گا، غالباً دس بارہ روز میں۔

میں نے جو تقریظ بھیجی تھی، اس میں ’اخلاقیاتِ عالم‘ والے ضمیمے کی بابت کچھ نہ لکھا تھا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ ’’تعارف الفرقان‘‘ سے ماخوذ کتاب میں جلد اوّل کے ضمیمے کے ساتھ جلد دوم کا ضمیمہ بھی چھپے گا۔ یہ آگاہی پا کر میں نے دوسرے ضمیمے سے متعلق ایک اضافہ لکھا۔ اب پوری تقریظ ارسال ہے۔ اضافہ صفحہ نمبر ۱۱ سے شروع ہوتا ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ کرے آپ کو پسند آئے اور کتاب میں پوری تقریظ شامل ہو۔

آپ کی تندرستی برقرار رہے اور آپ کا گھر مرجعِ احباب۔

برخوردار

داؤد رہبر

25 May, 1992

بخدمت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

مربی خدامِ ادب محترم ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

یکم مئی کو جو خط میں نے اعجاز بٹالوی صاحب کو لکھا، اس کی فوٹو کاپی جلدی میں ان کے نام والے لفافے میں ملفوف ہو گئی اور اصل خط اس لفافے میں ملفوف ہوا جس پر آپ کا پتا درج تھا۔ دونوں لفافوں کے اندر نفسِ مضمون بہرحال ایک ہی تھا۔ امید ہے اعجاز صاحب نے صورتِ حال کو جان کر ’’علامت‘‘ میں سلسلۂ اشاعت بند کرانے کی تدبیر کر دی ہوگی۔

کل ایک خط اعجاز کو اور ایک سید امجد الطاف کو لکھا۔ دونوں کی کاپیاں آپ کی خدمت میں ارسال کی جا رہی ہیں۔ اُمید ہے امجد صاحب ’’علامت‘‘ میں معذرت کے ایک نوٹ کے ساتھ قارئین کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیں گے اور قسط دوم کی اشاعت ان کے ہاں روک دی جائے گی۔

’’علامت‘‘ کے ہر شمارے کے صفحات اتنے تھوڑے ہوتے ہیں کہ اتنی لمبی تحریر کو باقساط اس میں شائع کرنا یوں بھی خاطر خواہ تدبیر نہیں ہے۔

آغا بابر صاحب ہی نے تو آپ کی فرمائش مجھ تک پہنچائی تھی۔ آپ سے میری جو مراسلت ہوئی، اس کی پوری کہانی ان کے حافظے میں تھی۔ پاکستان جانے سے پہلے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ ’’نیا دور‘‘ کے لیے اس

KUTABKHANA OSMANIA

میری سوجھ میں ہے، وہ انگریزی خواں ارباب دانش کو بھاؤں، وہ اسے قبول کریں یا نہ کریں یہ اور بات ہے۔

"قصہ مختصر" کے آگے اردو میں تحریر جاری رکھنے کے ارادہ سے میں نے موضوعات کی جو فہرست قلم برداشتہ لکھ کر آپ کو بھیجی تھی، افسوس کہ اس کی کاپی میں نے محفوظ نہ کی۔ آپ کے پاس ہے تو مجھے اس کی فوٹو کاپی ارسال فرمائیں، ممنون ہوں گا۔

آپ کے کرم ناموں کے اثر سے میرے دل کی جو کیفیت تھی، اس میں اب آپ کے تبسم اور تکلم کی یاد بھی شامل ہے۔

مجی ڈاکٹر آفتاب احمد خاں سے ملنا ہو تو میرا سلام ازراہِ کرم انہیں پہنچے۔

آپ کے التفات پر نازاں

نیازمند۔ داؤد رہبر

20 March, 1994

بخدمت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

میرے محسن، محبِ محترم، السلام علیکم!

آپ کے کرم نامے کا مجھے انتظار تھا۔ قیاس کہتا رہا کہ آپ اسلام آباد سے باہر تشریف لے گئے ہیں، قیاس درست نکلا۔ ایک عزیز نے لاہور سے فون کیا۔ آپ کا ذکر مبارک آیا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کراچی میں ہیں۔ اب آپ کے خط سے بھی معلوم ہوا کہ آپ کراچی میں تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ ماجدہ کو پورا افاقہ اور توانائی عطا فرمائے۔

لاہور سے دیداروں، ملاقاتوں اور جلسوں کی یاد لے کر آیا۔ لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوگی۔ اسباب کے ایک ازلی سلسلہ نے آپ سے ملایا۔ اس سے برسوں کی محرومیوں کی تلافی ہوئی۔ اب جو آپ سے مکاتبت ہوتی ہے اس سے کام کی تشویق ہوتی ہے اور اُداسی دور ہوتی ہے۔ آپ کو مہربانی کرکے مزا آتا ہے اور مجھے احسان مند ہونے میں لطف۔ آپ کو خدا نے رتبے دیئے کہ آپ علم اور ادب کے خادموں کی پرورش کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں۔ آپ نے اپنی مرتبت کی آن رکھی۔

میرزا داغ کے حرف اور ظرف دونوں کا میں شیدائی ہوں۔ اگر حالات اجازت دیتے تو میں پاکستان اور ہندوستان پہنچ کر دو تین مہینے وہاں قیام کرتا، کتب خانوں اور دکانوں میں رسائل اور کتب تلاش کرتا۔ داغ شناسوں سے گفتگو کرتا۔ حیدرآباد، رامپور اور کلکتہ جا کر ان گھروں، احاطوں اور باغوں کو دیکھتا جن میں داغ کا رہنا اور چلنا پھرنا ہوا اور یوں داغ کی زندگی سے بہتر وابستگی حاصل کرکے قلم اٹھاتا۔ ایسا سفر نہ ہو سکا۔ چنانچہ داغ سے متعلق جو کچھ آثار میرے پاس تھے، انہی کو پڑھ کر لکھنے بیٹھا۔ جو کچھ لکھا گیا، کراچی بھیج دیا۔ وہاں سے اطلاع ملی ہے کہ انجمن کے رسالہ "اردو" کا ایک پورا شمارہ میری اس تحریر کے لیے مخصوص ہوا۔ خبر نہیں وہ شمارہ چھپ کر شائقین ادب کے سامنے آ چکا یا نہیں۔

امریکہ کی وسعت جتاتی ہے۔ اس کا ایک اثر یہ ہے کہ فارغ التحصیل ہو کر تقریباً تمام شاگرد اپنے استادوں سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر کم ہی رابطہ کی تجدید ہوتی ہے۔ میرا قرب زیادہ تر اپنے شعبہ کے رفقاء کار سے رہا۔ ریٹائرڈ ہو کر اگر میں ان سے غافل ہو جاؤں تو وہ بھی مجھے بھول جائیں گے۔

ٹوئن بی، شپنگلر اور ینگ کی تحقیقات کے بارے میں ایک انگریزی کتاب لکھنے کا منصوبہ میں نے اسی

لیے سوچا کہ اس بہانے امریکہ کے دانشگاہی رفقاء سے رابطہ قائم رہے گا۔

میں نے لاہور سے واپس آ کر اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو ایک خط لکھا۔ اس کی چند سطور یہاں نقل کرتا ہوں:-

> "تاریخِ ادیان کے باب میں میری سوچ یوں ہے کہ بغیر لچک، ڈھیل، ملاوٹ اور سمجھوتے کے کوئی مذہب عالمی مذہب نہیں بنتا۔ مثلاً گوتم نے گوشت خوری کو حرام قرار دیا۔ چین اور جاپان میں بدھ مت پھیلا لیکن وہاں گوشت خوری ترک نہ ہوئی۔ گوتم نے تجرد کی تعلیم دی۔ مہاراجا اشوک نے اس اصول کو توڑ کر گرہستیوں پر اس مت کے قبول کا دروازہ کھول دیا۔"

یورپ اور امریکہ میں ادیان کے محققین نے جو کچھ لکھا ہے، عالمی مذاہب کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھ کر نہیں لکھا۔ میں اپنی انگریزی تصنیف میں بڑے (اور اٹل) سمجھوتوں (یعنی Compromises) کا سوال اٹھانے کی نیت رکھتا ہوں۔

انگریزی میں ایسی کتاب لکھ کر چھپواؤں گا تو یہاں کے اہلِ دانش مجھے ازکار رفتہ سمجھنے سے باز رہیں گے۔ ان لوگوں کے تعصبات کو بدلائل چیلنج کرنا ضروری کام ہے۔ ہمارے ہاں تعصبات جوشیلے اور علی الاعلان ہیں۔ یہاں امریکہ میں (اور یورپ میں) تعصبات تہہ دار اور مخفی ہیں۔ ان کی پہچان کرنا اور ان کی پہچان کرانا کارے دارد۔ ہر ملت کا روحانی ورثہ بعض باتوں میں رسا ہے اور بعض باتوں میں قاصر۔ اپنے ورثے کے قاصر ہونے کے اقرار سے سب ڈرتے ہیں۔ یہ بڑی مشکل ہے۔ خدا توفیق دے کہ میں کسی ملت کی دل آزاری کیے بغیر ملتوں کی قابلیتوں اور معذوریوں کی بحث لکھ سکوں۔

مجوزہ موضوعات کی فہرست آپ کے خط کے ساتھ ملی، بے حد ممنون ہوں اور موضوع بھی سوجھیں گے۔ آج کل "انصاف" کا سوال میرے ذہن پر مسلط ہے۔ دیگر سوال بھی ذہن میں ٹپکتے رہتے ہیں۔ مثلاً درگزر، موعظت، صدق۔ میں چاہتا ہوں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا جائے واعظانہ رنگ کا نہ ہو، ادیبانہ رنگ کا ہو۔ نثر میں غزل والی بات پیدا ہو۔ ہم اپنے حال پر رونا ہی نہیں ہنسنا بھی سیکھیں۔ مذاکرہ میں ایسا سماں پیدا کرنا ادیبوں کا کام ہے۔ پنڈت، مولوی اور پادری کے بس کی بات نہیں۔

اب کے لاہور سے واپس آیا تو غزل گوئی کا دورہ پڑا۔ پچاس پچپن غزلیں کہی گئیں۔ یہ تازہ غزلیں آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔

میں نے اعجاز بٹالوی صاحب سے درخواست کی تھی کہ میرا کیا ہوا خطوط غالب کا انگریزی ترجمہ مکتبۂ سنگ میل سے لے کر میرے بھانجے عزیزی نوید ریاض کو پہنچا دیں۔ مجھے اب تک خبر نہیں کہ اس عزیز سے آپ کو یہ جلد موصول ہوئی یا نہیں؟

اللہ آپ کی اور آپ کے اعزہ کی تندرستی بحال رکھے۔ والسلام مع الاحترام۔

نیازمند

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

16 June, 1994

بخدمت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

محب گرامی مشفق و مہربان!

السلام علیکم! سال بھر مجھے داغ کے چوتھے دیوان (یادگارِ داغ) کی تلاش رہی۔ آخر آغا بابر صاحب نے مجلس ترقیٔ ادب کے دفتر سے ایک نسخہ میرے لیے حاصل کیا اور امریکہ لاکر نیویارک سے مجھے بھیج دیا۔ موصول ہوا تو میں نے فوراً پڑھ ڈالا اور اس پر ایک باب لکھ کر ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو بھیج دیا۔ اس التماس کے ساتھ کہ اردو کے آیندہ شمارہ میں بطور تتمہ اس کو شامل فرمائیں۔

اب قلم اُٹھاؤں تو کیا لکھوں، اسی سوچ میں رہتا ہوں۔ موضوعوں کی ایک فہرست بنائی تھی۔ آپ نے بھی ملاحظہ فرمائی۔ اس میں اضافے بھی ہوئے۔ یہ فہرست سامنے رکھی ہے لیکن نثر میں بھی مطلع اور مقطع والا قرینہ چاہیے۔ سلسلہ شروع کرنے کو اب ذہن میں ایک عنوان ہے۔ ''قومی زبان'' میں آپ کا مضمون ''ادب اور عوام'' پڑھ کر یہ عنوان سوجھا: ''خواص اور عوام'' بادشاہی دور کے ختم ہو جانے اور جمہوریت کے آنے کا جو اثر بشری تعلقات پر پڑا ہے، اس سے خواص اور عوام کے طبقات تاش کے پتوں کی طرح اُلٹ پلٹ گئے ہیں۔ ایک کتابچہ اس مضمون سے نکل سکتا ہے۔ خواص کنہیں کہتے ہیں اور عوام کن کو۔ اس سوال کا جواب مثالوں ہی سے دیا جاسکتا ہے اور مثالیں حکایتوں سے فراہم ہوں گی۔ سنجیدہ نویسی کو واعظانہ اور مرشدانہ پیرایہ سے بچائے رکھنے کا اور کوئی طریقہ مجھے سوجھ نہیں رہا۔ تمثیل کے بغیر افکار دلوں کو نہیں لگتے۔ حکایت نکات کو ذہن نشین بھی کرتی ہے اور ''دل نشیں'' بھی۔

امام غزالی کی آشفتگی سماع اور ذکر کی مجالس میں بیٹھ کر دور ہوئی۔ بارہ برس کی کنارہ کشی کے بعد جب آپ کی طبیعت بحال ہوئی اور آپ بغداد واپس آئے تو اہالیانِ شہر اور امیر المومنین نے چاہا کہ آپ پھر مسندِ درس پر بیٹھیں۔ آپ نے کہا، شرط یہ ہے کہ مجھے مناظرہ پر مجبور نہ کیا جائے۔ خلیفہ نے آپ کی اس خواہش کا احترام کیا۔ آپ نے فلاسفہ عصر کی کج بحثی کے توڑ کو تو تہافتہ الفلاسفہ لکھی اور سیدھے سادے مومنوں کا ایمان تازہ کرنے کو احیاء العلوم (احیاء علوم الدین) لکھی جو بحث اور استدلال کی کتاب نہیں بلکہ مجموعہ حکایات ہے۔ مولانائے روم کی مثنوی کا رس بھی حکایتوں سے ہے۔

آپ کا کرم نامہ آیا تو میں نے فوراً اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو فون کیا۔ امید ہے مکتبہ سنگ میل سے آپ کو انگریزی ترجمہ خطوطِ غالب کا ایک نسخہ موصول ہو چکا ہوگا۔ دسمبر میں اس کا ایک نسخہ بھجوانے کا جو انتظام میں نے کیا تھا، اس میں میرے بھانجے عزیزی نوید ریاض نے مستعدی سے کام نہ لیا۔

اُمید ہے آپ کی والدۂ ماجدہ کی صحت اب بہتر ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً کراچی تشریف لے جاتے ہیں۔ کراچی میں اگر آپ کا کوئی مستقل پتہ ہے تو وہ بھی جاننا چاہوں گا کہ اگر کوئی مراسلہ اضطراری ہوا اس کی فوٹو کاپی کراچی بھی بھیجی جاسکے۔

''قومی زبان'' کے بابائے اردو نمبر (۱۹۹۳ء) میں اختر حسین رائے پوری کی بیگم حمیدہ خانم کا مضمون پڑھا۔ مجھے اعجاز بٹالوی صاحب سے خبر ملی ہے کہ اختر حسین صاحب کے دادا (اور شاید باپ بھی) ہندو تھے۔ اختر

حسین صاحب کے بیاہ کی تقریب میں ان کے ماں باپ موجود نہ تھے۔ یہ معماً کیا ہے۔ آپ کی حمیدہ خانم سے گفتگوئیں ہوئی ہیں۔ شاید آپ کو کچھ ٹوہ ملی ہو۔ ''ہم سفر'' شائع ہو تو تفصیل سامنے آئے۔

آپ کی مہربانی کو یاد رکھنے والا

داؤد رہبر

12 July, 1994

بخدمت جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

میرے محسن و مونس، محب گرامی

السلام علیکم! ڈاکٹر نعمان الحق خیر آبادی ثم کراچوی ثم لندنی ثم بوستانی (یعنی ساکن بوسٹن) جس خاندان کے چشم و چراغ ہے، اس کا مثیل اس وقت ہمارے وطن میں کوئی نہیں۔ نعمان صاحب نے اپنے خاندان کی آن رکھی۔ یہ مولانا شبلی کی طرح نعمانی نہیں ہیں۔ یہ خود نعمان ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کی منطق میں شعر کا رس تھا۔ یہ بات نعمان صاحب میں بھی ہے۔

آپ نے کراچی میں نعمان کا بچپن دیکھا، ہم نے بوسٹن میں ان کی جوانی دیکھی۔ فلوریڈا آنے کے بعد پچھلے چار برس برابر فون کے ذریعے اور خطوں کے ذریعے ان سے دوستی تازہ رکھی گئی۔ اب بوسٹن جاتا ہوں تو یہ مجھے اپنے گھر میں ٹھہراتے ہیں۔ خاطریں کرتے ہیں۔ ضلع جگت میں شریک رہتے ہیں۔ بذلہ اور اچھے شعر سے روح کو تازہ رکھتے ہیں۔

اپنے بزرگوں کی طرح مسندِ فضیلت پر بیٹھنے کے حقدار ہو گئے ہیں۔ لندن یونیورسٹی سے انہوں نے پی ایچ ڈی کی سند لی۔ اس کے تھیسس کے لیے کیمیا کی ایک عربی کتاب کو ایڈٹ کر کے اس کا مقدمہ لکھا۔ ان کی یہ کتاب ہالینڈ سے شائع ہو بھی چکی۔ آپ اس پر ایک نظر ڈال کر آفرین سے ان کا دل بڑھائیں گے تو یہ اس انعام سے خوش ہوں گے۔ آپ ان کے والدِ مرحوم کے جاننے والوں میں سے ہیں۔ آپ کا تعلق نعمان صاحب سے معمولی نہیں ہے۔

ڈاکٹر نعمان نے ہارورڈ میں اردو بھی پڑھائی۔ اب یہ یہاں ایک ممتاز دانشگاہ (براؤن یونیورسٹی) میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے ہیں۔ اللہ مبارک کرے اور ان کو ترقیاں دے۔

میں دسمبر میں لاہور کو ہاتھ لگا کر اور وہاں محبت کے چشمے کا شربت پی کر واپس آیا تو غزلیں کہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو غزلیں پانچ مہینوں میں کہی گئیں۔ اس سے پہلے بوسٹن میں کہی ہوئی دو ڈھائی سو غزلیں جمع تھیں۔ نئی غزلیں ملا کر ایک مجموعہ تیار ہوا۔ اتفاق سے نعمان صاحب پاکستان جا رہے تھے۔ انہوں نے یہ مجموعہ آپ تک پہنچانے کی ہامی بھرلی۔ یہ ذریعہ یقیناً بہتر ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت کے باب میں اقدام کا مناسب وقت ابھی نہیں آیا۔ مکتبہ سنگ میل والے میرے مکاتیب کی اشاعت سے فارغ ہو لیں تو غزلوں کی اشاعت کے بارے میں آپ کو عریضہ لکھ کر آپ کی صلاح لوں گا۔

والسلام مع الاکرام

نیاز مند

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

28 September, 1994

کرم فرما فیض رساں محبی ڈاکٹر صاحب دام اقبالکم

السلام علیکم! آج بے تاب ہو کر آپ کو ٹیلی فون کیا۔ نہ کرتا تو بے خبر رہتا۔ یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ اس علاقے کے ڈاک خانے کی بے احتیاطی سے آپ کا کرنامہ کسی غلط گھر پہنچ گیا۔ یہاں سڑکوں اور مکانوں کے نمبروں کا حساب کچھ ایسا ہے کہ ڈاکیہ پورا دھیان نہ رکھے تو چٹھیاں اِدھر اُدھر ہو جاتی ہیں۔ محلے کے لوگ اتنی زحمت نہیں اٹھاتے کہ بھٹکا ہوا خط منزلِ مقصود کو پہنچا دیں۔

آپ کی والدۂ ماجدہ کے انتقال کی خبر سے میرے اداس دل کو دھکا لگا۔

نہیں ہیں دُور کے، ہیں یہ قریب کے ماتم
یہاں بھی پہنچے دیارِ حبیب کے ماتم

آج ۲۸ ستمبر ہے، گویا ان کے گزر جانے کے چار روز بعد آج آپ سے فون پر باتیں ہوئیں۔ تعزیت کے لیے مناسب الفاظ زبان پر نہ لاسکا۔ فون پر میری زبان بہر حال اظہارِ مناسب سے قاصر رہتی ہے۔ وہاں سے غمی کی جو خبریں یہاں پہنچتی ہیں تو اپنے آپ سے کہتا ہوں وہاں ہوتا تو حاضر ہو کر عزاداری کرتا، قبر پر فاتحہ پڑھتا، اپنی اس بیچارگی کا رونا کہاں تک رووٗں۔

میری والدہ کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ ان کی عمر اس وقت اُنتیس تھی۔ میری عمر تین برس سے بھی کم تھی۔ مرحومہ کی صورت میرے لاشعور میں پہنچا کر خدا نے اس صدمہ کو سختی سے بچایا۔ والد صاحب ۵۴ کو پہنچ کر چل بسے (مئی ۱۹۴۸ء میں) کئی مہینے ہراس کی گرفت رہی۔ ایک سال بعد میں انگلستان جا پہنچا۔ مطالعہ کی لگن سے حوصلہ حاصل ہوا۔

نعمان الحق صاحب نے واپس آکر ٹیلی فون کیا اور کہا۔ ”پاکستان میں چند بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر راحت ملی۔ ہمعصروں یعنی جوانوں کے اطوار سے وحشت ہوئی۔“

انہیں اور ان سے بڑھ کر مجھے افسوس ہے کہ اب کے آپ کی زیارت ان کو نصیب نہ ہو سکی۔ نہ کراچی میں نہ اسلام آباد میں، میں نے مجموعہ غزلیات کے ساتھ ایک خط بھی پہنچانے کو انہیں دیا تھا۔ وہ آپ سے ملتے تو ملاقات کا حال مجھے سناتے۔

خدا کا آسرا بڑا آسرا ہے۔ آپ کے مشاغل میں روحداری کے سامان کی کمی نہیں، اللہ آپ کی صحت کا نگہبان رہے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں آپ کی اچھی خبریں پہنچا کریں۔

شریکِ غم
نیاز مند
داؤد رہبر

2 November, 1994

عمیم الوداد محبِ گرامی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم! آپ کے درد بھرے خط کو پڑھ کر طبیعت ایسا جواب لکھنے کی خواہاں ہوئی جس میں ماں کی

محبت کی تڑپ دل میں رکھنے والوں کا تذکرہ ہو۔ ان میں اولیٰ حیثیت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی ہے۔ ماں کے لیے ان کی محبت ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے۔ گوتم تین دن کا شیر خوار بچہ تھا۔ جب موت اس کی ماں کو چھین لے گئی۔ اس کی کھوئی کھوئی نظروں نے خلا میں برسوں ماں کی روح یعنی ترحم کو تلاش کیا۔ (رحم کا منبع رحم ہی ہے)

سری رام کرشن نے کالی مائی میں مادر کائنات کو پہچانا اور اس کی محبت کے گیت گا کر عمر گزاری۔ چین میں مادرِ فطرت کا فرزند لاؤ تزو ہے، ان بزرگوں کی یاد اپنے دل میں تازہ رکھتا ہوں۔

مادرِ فطرت کا قرب مجھے بے حد عزیز ہے۔ اس نے میرے خلاء کو پر کیا اور میرے دل کو آباد رکھا۔ میرے ناز اٹھا کر اور میری بلائیں لے کر مجھے شوخی کے قابل کیا۔ اللہ جل الورید سے بھی قریب تر ہے۔ مادرِ فطرت کا قرب بھی ایسا ہی ہے۔ یہ مہر و ماہ و انجم کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

آج سے برسوں پہلے میں نے ایک مثنوی لکھی۔ ”آسمان پیداست“ اس کا عنوان ہے، اس کے چند اشعار نقل کر کے بھیج رہا ہوں۔

والسلام مع الاکرام۔

شریکِ غم
داؤد رہبر

الف لام میم

یہ نوحہ گر نے کیا بین پیٹ کر چھاتی
مآل کار ہے بس ایک یاد رہ جاتی
بتاؤ دیں کے یارو اس انتظام کی داد
نہ خود وہ آئیں گے آئے گی جانے والوں کی یاد
ہے دردناک کسی گھر میں نورِعین کی موت
ہے ہولناک المناک والدین کی موت
کہ باپ ہوتا ہے سر پر تو سایہ ہوتا ہے
اسی کے لاڈ سے خوش وقت و شاد پوتا ہے
وہ زندہ رہتا ہے جب تک تو ہے کرم رہتا
اسی کی ہستی سے کنبے کا ہے بھرم رہتا
وہ جب مرے گا تو چھائے گی گھر پہ ویرانی
وہ بے بدل ہے کہاں اس کا پائیں گے ثانی
اک اور سانحہ جو یاں نہیں ہے انجانا
ہے جیتی جاگتی مادر کا مردہ بن جانا
جو ماں مرے تو سہم جاتے ہیں در و دیوار
سنائی دیتی ہے خاموش بے بسی کی پکار

KUTABKHANA OSMANIA

پھر اس کی رُوح عزا دار بن کے آتی ہے
اور اس کی یاد ہی غمخوار بن کے آتی ہے
وہ زندہ ہو کے پھر آتی ہے خواب میں اک رات
اور ایسی جھلکی سے بن جاتی ہے معمأ حیات

23 December, 1994

محب گرامی عمیم الاحسان ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

کل کراچی سے میرے برادر محمد ایوب کا خط آیا۔ یہ عمر میں مجھ سے ڈیڑھ برس بڑے ہیں۔ والد مرحوم نے انہیں اور مجھے پرائمری سکول کے پہلے درجے میں ایک ہی روز داخل کرا کے ہم جماعت کر دیا۔ میٹرک تک ہم دونو ہم جماعت رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں بھی یہ صورت برقرار رہی۔ چنانچہ ان کے ساتھ یادوں کی شرکت غیر معمولی ہے۔ ہمارے تین بھائی فوت ہو چکے ہیں۔ ایوب صاحب ہی دُکھ سکھ کے بانٹنے کو اب رہ گئے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا خط آ جاتا ہے۔ ان کا کاروبار ایک زمانہ میں ڈھاکہ میں تھا۔ پھر لاہور کو منتقل ہوا۔ ضیاء محی الدین کے بہنوئی اشرف ریاض مرحوم کے ساتھی ہو کر یہ امروز ٹریڈرز کمپنی کو چلاتے تھے۔ اب ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔

انہوں نے اپنے خط میں کراچی کی ابتری کا حال لکھا۔ یہ خط ۱۱۔ دسمبر کو لکھا گیا۔ اس میں لکھتے ہیں کہ

''فوج آ رہی ہے اور صوبائی حکومت کو برطرف کیا جا رہا ہے۔''

خدا خیر کرے۔ حالات سنبھلنے میں نہیں آ رہے۔ بھارت کی خبریں بھی اسی قسم کی ہیں۔ بمبئی وہاں کراچی کا جواب ہے۔ بلوے اور قتل وہاں بھی پیہم ہوتے رہتے ہیں۔

اس خوشحال ملک (امریکہ) میں بھی طمانیت کہیں نہیں۔ پچھلے تیس برس میں تغیر اتنا ہوا کہ یقین نہیں آتا، یہ وہی امریکہ ہے، عالمی سیاست کی پہرہ داری امریکہ کے ذمے ہوئی۔ یہ حیثیت تو بڑی ہے لیکن مہنگی پڑی ہے۔ یہاں کی اندرونی سیاست کے مسائل بھی اب کٹھن ہیں۔ ناداروں کا میلان جرائم کی طرف ہے۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر عسکری فتوحات اب کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ تاجرانہ جنگوں کا جیتنا خوشحالی کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔

یہ زمانہ فریاد اور دُہائی ہی کا ہے۔ اس کے لیے شاعری نثر نگاری سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس سال نثر لکھنے کے منصوبے میں نے پرے رکھ دیے ہیں۔ ایک ترکیب بند کی ترکیب سے ایک نظم کہنی شروع کی ہے۔ دیکھیے کچھ سجھائی دیتا ہے یا نہیں۔ ایک بند چھ شعروں کا روز کہتا ہوں۔ سال میں تین سو بند ہو جائیں تو آرام کا سانس لوں۔ یہ کام تائید الٰہی ہی سے ہوگا۔ آپ میرے حق میں دُعا فرمایا کریں۔

اس ترکیب بند کا عنوان ''بزمنامہ'' ہے۔ اس کے شروع کے بند جو اب تک کہے جا سکے، آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔ فرصت کے اوقات میں ملاحظہ فرما کر اپنی رائے سے مجھے مستفید فرمائیے۔

میں قافیے کا رسیا ہوں۔ نظم آزاد کا عطائی ہونے کی میں نے کوشش کی۔ اس میدان میں اپنی طبیعت کو بند پایا۔

اللہ کرے کراچی کے اہلِ علم و ادب آپ کو کسی فیض رساں ادارے سے پوری طرح وابستہ رکھ کر آپ کے روز و شب کو فعالیت سے معمور رکھیں۔ انجمن ترقی اردو کا تعلق تو بہر حال ہے ہی، مقتدرہ نے آپ کی رہنمائی میں شاندار کام کیے۔

میں لاہور سے چلتے ہوئے مکتبۂ سنگِ میل سے پچیس تیس نسخے اپنے ایک غزلیہ مجموعہ ''سبحۂ صد دل'' کے رکھوا آیا تھا۔ چونکہ چند ہی نسخے وہاں چھوڑ آیا، اس لیے پچھلے دنوں خیال آیا کہ سارے نسخے بِک جانے سے پہلے ایک نسخہ آپ کو پہنچ جائے۔ امید ہے کہ میرے بھانجے نوید ریاض سلمہ نے یہ نسخہ آپ کو بھیج دیا ہوگا۔ اس کی غزلیں ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان کہی گئیں۔ اپنا یہ پرانا کلام مجھے نسبتہً کچا لگتا ہے۔ تاہم مشقِ سخن سے امریکہ میں باز نہ آیا۔ اردو کی محبت نے شعر کہلوائے۔

اب غزل گوئی چھوڑ کر سنجیدہ نظم کہنے کا وقت آیا ہے۔ ''بزمنامہ'' کے بند جوں جوں قلمبند ہوتے جائیں گے، آپ کو بھیجتا رہوں گا۔

والسلام مع الاحترام

نیاز مند
داؤد رہبر

31 January, 1995

محب شفیق محترم گرامی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

میں نے ۱۸ جنوری کو ایک لفافہ ہوائی ڈاک سے آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اس میں ایک نظم بعنوان ''بزمنامہ'' ملفوف تھی۔ یہ نظم آپ کو مل گئی ہوگی۔

آج میں نے ''بزمنامہ'' کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ اپنی ایک غلطی سے خبردار ہوا، صفحہ ۱۴ پر ایک مصرع ہے ع

براجے تخت پر راجا ہزاروں چوکڑی بھر کے

رات دن انگریزی سنتے رہنے اور اردو نہ بول سکنے کے باعث محاورے میں التباس ہوا۔ چوکڑی مارنا اور چوکڑی بھرنا دو مختلف محاورے ہیں۔ ''چوکڑی بھرنا'' اس مصرعے میں غلط ہے۔ میں نے مصرع بدل کر یوں کر دیا ہے ع

براجے چار زانو ہو کے اپنے تخت پر راجا

سید عابد علی عابدؔ مرحوم کی دختر بیگم شبنم شکیل نے اپنی منظومات کا ایک مجموعہ مجھے بھیجا ہے۔ اس کا عنوان ''اضطراب'' ہے۔ ان کی فرمائش ہے کہ میں اسے پڑھ کر ایک تقریظ لکھوں۔ مضمون تیار ہوگا تو ایک فوٹو کاپی آپ کے ملاحظہ کے لیے آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ آپ کی خیریت کی خبر کا خواہاں۔

نیاز مند
داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

9 October, 1995

میرے قدردان محبِ گرامی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

کل اعجاز حسین بٹالوی سے فون پر باتیں ہوئیں۔ میرے مکاتیب کی اشاعت انہی کے اعتناء سے ہو رہی ہے۔ ستمبر میں انہوں نے پیش لفظ کے پروف مجھے بھیجے (یہ ضیاء محی الدین کی تحریر ہے) پچھلے ہفتے میں نے پروف پڑھ کر ہوائی ڈاک سے واپس بھیج دیے۔ اس کی اطلاع کے لیے انہیں فون کیا، اب ساری کتاب کے پروفوں کی تصحیح دوبارکی جاچکی ہے۔ ان شاءاللہ طباعت اب جلد شروع ہوجائے گی۔

اعجاز صاحب وکیل ہیں۔ کہہ رہے تھے اس پیشے کے آدمی کو سنیاس آشرم نصیب نہیں ہوتا۔ یہ مجھ سے تین برس بڑے ہیں، یعنی بہتر کے ہوگئے ہیں۔

آج امریکہ میں یومِ کولمبس ہے۔ اچھا ہوا کہ شہر کولمبس میں اپنے قیام کی توسیع فرما کر آپ نے اس قوم کو یومِ کولمبس مناتے دیکھ لیا۔

ریٹائر ہونے کے بعد پورا سال نہیں تو کم سے کم چند ماہ مکمل فراغت سے گزارنا مناسب ہے۔ اچھی بات ہے کہ آپ کے بھائیوں نے ازراہِ محبت آپ کو ایک مہینہ اور ٹھیرالیا۔ اس توسیع کا فائدہ مجھ کو یہ پہنچا کہ آپ کی فرمائش کا ایک مضمون اور لکھا گیا۔ یہ آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔

انیسہ ان شاءاللہ جنوری میں بوسٹن جائے گی۔ بعض وجوہ سے ستمبر میں نہ جاسکی۔ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام لکھوارہی ہے۔ بھابی صاحبہ کو میرا بھی سلام۔

آپ کا نیازمند

داؤد رہبر

22 October, 1995

میرے مہرباں شفیق اور قدردان محبِ گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! آپ کی روانگی میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ کولمبس کے بہترین موسم کا لطف بھی آپ نے اٹھایا اور اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کی چہل پہل اور محبت کا مزا بھی پایا۔ آپ کے جانے کے بعد کئی روز ان کی آنکھیں آپ کو اور بھابی صاحبہ کو ڈھونڈتی رہیں گی۔ ادھر کراچی میں آپ کے اعزہ اور احباب آپ کے منتظر ہوں گے۔ اُردو برادری تو ہر جگہ آپ کے شمول کی اُمیدوار رہتی ہے۔

کراچی میں ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور ان کے فرزند ڈاکٹر آصف فرخی صاحب کو میرا سلام پہنچا کر ممنون فرمایئے گا۔ مشفق خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کو بھی۔

میرے گانے کا ٹیپ سنوانے کے لیے اگر آپ دو چار دوستوں کو مدعو فرمائیں تو برمنگھم (انگلینڈ) کے جلسے والا ٹیپ بہتر رہے گا۔ اس پر تقریباً پینتالیس منٹ کا گانا ہے۔ یہی کافی ہوگا۔ دوسرا ٹیپ برا نہیں لیکن اس میں طوالت ہوگی۔

رسالہ ''اُردو'' کے لیے ''یادگارِ داغ'' پر میں نے مضمون پچھلے سال ستمبر میں بھیجا تھا۔ معلوم نہیں اس

سال کوئی شمارہ شایع ہوا یا نہیں۔ اس کی تاخیر کی وجوہ کا مجھے اندازہ ہے۔ وہاں امن کی بحالی مشیتِ ربانی کے ہاتھوں میں ہے۔ دعا ہے کہ آپ بخیر و عافیت وہاں پہنچیں اور اپنے علمی مشاغل کے لیے حالات سازگار پائیں۔

ہم تینوں کی طرف سے آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام۔ خدا حافظ۔

آپ کا نیازمند

داؤد رہبر

خط لکھنے سے پہلے صبح ایک غزل کہی، یہ بھی ملفوف ہے۔

5 December, 1995

تہذیبِ اُردو کے نگہبان، میرے مہربان، محترم ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم!

کولمبس سے آپ کی روانگی سے آدھ گھنٹہ پہلے ٹیلی فون پر آپ سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ میرا آخری خط وہاں بروقت یعنی آپ کی روانگی سے پہلے نہ پہنچ سکا۔ اس کے ساتھ میں نے لفافے میں وہ مضمون بھی ڈال دیا تھا جو پروفیسر عبدالقوی ضیاء صاحب کی فرمائش کی تعمیل میں لکھا گیا۔ اس مضمون کے صفحات کی فوٹو کاپی اب آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔

یہاں آپ کی تشریف آوری ایک خواب کا واقعہ لگتی ہے۔ میں سفر کم ہی کرتا ہوں۔ مکاتبت کے سہارے یہاں بیٹھا ہوں جسے نصف الملاقات کہتے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری سے ساری اُردو برادری کی بہترین نمائندگی ہوئی۔ زاویہ نشینی کے لیے جنوبی فلوریڈا بہترین علاقہ ہے۔ امریکہ کا ''سنیاس آشرم'' یہی ہے۔ ریٹائرڈ لوگوں کے لیے یہاں مکانات تعمیر ہوئے ہیں۔

جو سیاح امریکہ کے شمالی علاقے دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں، ان کی واقفیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ جنوبی ریاستیں مثلاً میکسیکو، ٹیکساس، ایری زونا اور فلوریڈا جو لاطینی امریکہ سے ہمکنار ہیں، اپنا رنگ رکھتی ہیں۔ کیوبا کا جزیرہ بھی یہاں سے بہت قریب ہے۔ لاطینی امریکہ کا براعظم بھی ایک عجیب و غریب دنیا ہے۔ تاریخ عالم کی منجدھار کا خطِ استوا کے شمال ہی میں رہنا خود ایک معما ہے۔ سحر و شام کا تواتر تو خطِ جدی کے آس پاس بھی اسی طرح ہے جس طرح خطِ سرطان کے آس پاس ہے لیکن اِدھر کی الف لیلہ اپنی ہے۔ اِدھر کی طرف رہنمایانِ سیاست کا دھیان اب تک کم ہے۔ ممکن ہے آیندہ صدیوں میں تاریخ پلٹا کھائے اور اِدھر کی اقوام بھی میدان میں آئیں۔ ہسپانوی زبان کے بولنے والوں میں انگریزوں کی سی رعونت اور منک نہیں ہے۔ یہ لوگ بے تکلف بھی ہیں اور حوصلہ مند بھی۔ ہسپانوی زبان میامی پر دھاوا بول چکی ہے۔ کیوبا کے باشندے اِدھر آتے جائیں گے اور فلوریڈا کا علاقہ ذولسانین ہوجائے گا۔ سیاسوں کی پیشگوئی ہے کہ آیندہ پچاس برسوں کے اندر امریکی کانگرس کے ارکان پچاس فیصد ہسپانوی الاصل ہوں گے۔

اچھا ہوا چند سال کرۂ ارض کے اس گوشے میں رہنا نصیب ہوا۔ چاند کو جانے والے طیاروں کا اڈہ بھی میامی سے دور نہیں۔ چنانچہ اقبال کا یہ مصرعہ گنگناتا رہتا ہوں ؎

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں

KUTABKHANA OSMANIA

مشفق خواجہ صاحب نے دو تین ماہ قبل فون پر مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ مجھے خط لکھیں گے۔ اس خط کا منتظر ہوں۔ "یادگارِ داغ" پڑھ کر جو مضمون میں نے لکھا تھا ۱۹۹۴ء کے ماہ ستمبر میں یہاں سے بھیجا گیا۔ اردو کے شمارہ کے چھپ چکنے کی خوش خبری اب تک نہیں آئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کراچی سے بدامنی ابھی دور نہیں ہوئی، خدا خیر کرے۔

بھابی صاحبہ نے میری تصنیفیں ایک عزیز کے سامان کے ساتھ اکتوبر کے آغاز میں کراچی بھجوا دی تھیں۔ دو انگریزی کی، دو اردو کی، ان چاروں میں مہین کتاب "آسمان پیداست" کے عنوان سے ہے۔ یہ اردو کی مثنوی ہے۔ اُمید ہے ان عزیز نے کراچی پہنچ کر یہ چاروں چیزیں باحتیاط آپ کے ڈیسک پر رکھ دی ہوں گی۔

پچھلے دنوں لاہور سے بھیجی ہوئی ایک کتاب موصول ہوئی۔ یہ اُستاد ذوق کی سوانح عمری ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کی تصنیف ہے۔ دہلی سے ساہتیہ اکیڈمی نے شایع کی ہے۔ عنوان اس کا "ذوق دہلوی" ہے۔ علوی صاحب کی لکھی ہوئی ایک کتاب ذوق کی حیات کے بارے میں مجلس ترقی ادب نے شائع کی تھی۔ اس کا صرف اشتہار نظر سے گزرا۔ اس کے حصول میں مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ دہلی کی چھپی ہوئی کتاب تو کتابچہ ہے۔ کل بیاسی صفحات کا، شاید یہ مجلس ترقی ادب والی کتاب کا ملخص ہے۔

"کلیاتِ ذوق" ڈاکٹر علوی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کر کے چھپوائی۔ یہ میرے پاس ہے۔ اچھے وقتوں میں یہ چیزیں میں نے حاصل کر لیں۔ جنوری میں ایک تذکرہ ذوق کا لکھنے کا ارادہ ہے۔ خدا توفیق دے۔ غالب پرستی حد سے بڑھی ہوئی دیکھ کر یہ خیال آیا۔ یہ خیال بھی بار بار آتا ہے کہ محشرِ خیال میں ہر عصر کی پوری بزم سامنے آئے تو مزا ہے۔ فرداً فرداً ان سے رابطہ ہو تو چہل پہل کی صورت نہیں ہوتی۔ ذوق اور اور غالب رقابت کے باوجود ہم بزم تھے۔

انیسہ کل شوریدگی کے حال میں تھی۔ میں بنگلہ دیشی کی دکان سے رس گلے خرید کر لایا تھا۔ دو رس گلے کھا کر انیسہ کا منہ میٹھا ہوا تو مجھ سے انگریزی میں کہنے لگی۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے آدمی ہو۔"

ہم تینوں کی طرف سے آپ کو اور بھابی صاحبہ کو گلزار فلورڈا کا سلام۔

آپ کا نیاز مند

داؤد رہبر

10 February, 1996

عنایت مشرب شفیق و مہربان ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! کولبس سے بھیجا ہوا ایک پارسل چند روز قبل موصول ہوا۔ اس کی آمد کا دن میرے حق میں روزِ عید ہو گیا۔ پانچ جلدوں کا یہ گرانقدر عطیہ بھیج کر آپ نے اُردو کے اس شیدائی کو اپنے عالمِ فکر و ادب کی سیر کی دعوت دی ہے۔ تاریخ ادب اُردو کی جلد دوم کا حصہ اول اس پارسل میں نہ تھا۔ نومبر میں پاکستان آنے کی امید ہے۔ یہ حصہ اول وہاں آپ سے مانگ لوں گا۔ پارسل میں یہ کتابیں تھیں:-

تاریخِ ادب اُردو، جلد اوّل

تاریخِ ادب اُردو، جلد دوم، حصہ سوم

ارسطو سے ایلیٹ تک

نئی تنقید

تنقید اور تجربہ

ان پانچ جلدوں کے صفحات کا میزان کل ساڑھے تین ہزار صفحات کے قریب ہے۔ "تنقید و تجربہ" "نئی تنقید" اور "ارسطو سے ایلیٹ تک" یہ تین کتابیں افکار پر مشتمل ہیں۔ تاریخ ادب اُردو میں بھی خیال افروزی ہر صفحے پر ہے۔ ان کتابوں کو بلپٹ رفتار سے پڑھنا چاہیے۔ آپ کے عالم خیال کی سیر آئندہ مہینوں میں ہوتی رہے گی اور اس سے میری سوچ کی بیٹری چارج ہوتی رہے گی۔ آپ کے سنجیدہ اظہار خیال میں پھڑکتے ہوئے محاورات برابر آتے رہتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر شاہد احمد دہلوی کی نثر یاد آئی۔

یہ مہینہ فروری کا ہے اور سال رواں لیپ کا سال ہے۔ اس لیے چھال مارنے کو جی چاہتا ہے (چھال پنجابی میں چھلانگ کو کہتے ہیں) اتھلیٹک کھیلوں میں رکاوٹوں والی دوڑ (Hurdles) اور بانس کے بل پر ماری جانے والی چھلانگ (Pole Walt) مجھے بے حد پسند ہیں۔ اس میدان کا ایک اور کرتب Hop, Step & Jump کہلاتا ہے۔ اس کا ترجمہ کیا ہوگا؟ اچھل، کود اور چھلانگ؟

پول والٹ کا لفظ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ چند سال ہوئے یونیورسٹی کے کھیلوں کے میلے میں پول والٹ کے مظاہرے کی باری آئی تو فرطِ شوق تماشا سے میں نے ہمنشینوں سے کہا۔ "اب لطف آئے گا، وال پولٹ میری پسند کی چیز ہے۔" میری یاد نے کیسی قلابازی کھائی! پول والٹ کی جگہ وال پولٹ کہہ گیا۔ میرے دوستوں نے محظوظ ہو کر کہا، واقعی وال پولٹ اس چھلانگ کے لیے بہتر لفظ ہے

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

پچھلے دنوں ایک غزل میں نے کہی، اس میں بھی ایسا مضمون آیا ہے

جیب میں رکھے طپنچہ رہ گیا درباں کھڑا
فتح شب عاشق نے پائی پھاند کر دیوار کو

سرکس والے بھی کیا مزے کے لوگ ہوتے ہیں۔

عزیزی نوید ریاض لاہور میں میرے چند لیکچروں کی تقریب کے لیے کوشاں ہیں۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ میں نے ذیل کے موضوع ان کے لیے تجویز کیے ہیں۔

1. Life in the Days of Monarchy
2. The Confusion of Monarchical and Democratic Values in our Times
3. What should a Civilized Human Being read.
4. Greatness and Goodness
5. The Place of Charm in Life.

KUTABKHANA OSMANIA

6. The Crisis of Religion in our Times.

اور یہ بھی کہا ہے کہ اہتمام کرنے والے ان میں سے چار موضوع چن لیں تو میں چار لیکچر لکھ کر لاؤں۔

ارادہ ہے کہ ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۷ء میں اردو نویسی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی کچھ لکھوں۔ یہاں کے اہلِ دانشگاہ یاددہانی کرتے رہتے ہیں کہ تقابلی تحقیقات پر جو کچھ میں اُن سے گفتگو میں کہتا رہا ہوں۔ اسے لکھ بھی ڈالوں۔ تقابلی تحقیقات کی جو سرگرمی میں نے امریکہ اور یورپ میں دیکھی ہے، وہ سوانح عمریوں کے مطالعہ کے بغیر ہوئی ہے۔ اس سے مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ داغؔ کے مشرب کے اسلامی عناصر کیا ہیں اور بائرن کے مشرب کے مسیحی عناصر کیا ہیں اور ٹیگور کے مشرب کے ہندو عناصر کیا ہیں۔ میرے ذہن کے گرما گرم سوال یہ ہیں۔ اپنا زاویہ نظر انگریزی میں سمجھائے بغیر عدم کو سدھاروں تو برسوں کی کاوش رائیگاں جائے گی۔ اُردو لکھ کر مجھے چوگنا مزا ملتا ہے لیکن اس کا کیا کروں کہ میرا سابقہ دو ملتوں کے مفتیوں سے ہے۔ اس سے مجھے نپٹنا ہے۔ الٰہیات پر ''مفتیات'' کا تسلط اس قدر نہیں ہونا چاہیے۔ حیرتی ہو کر بھی آدمی اچھا انسان بن سکتا ہے۔

تاریخِ ادیان کے مورخوں کے ہاں ظرافت کا وہی فقدان مجھے ملا جو بیشتر پیشوایانِ مذاہب کے ہاں ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ زمانے میں روحانیت کا پھولنا پھلنا پاکیزہ ظرافت کی چاشنی کے بغیر نہ ہوگا۔ یہ ضرورت کبھی مار ما کر مجھ سے کہتی رہتی ہے۔ تحریر کی کوئی ایسی صنف نکال جس میں سنجیدگی سنگین ہونے سے بچی رہے۔ میری اُمیدیں ''گفتگو نویسی'' سے وابستہ ہیں، انشائیہ سے نہیں تماشائیہ سے وابستہ ہیں۔

گلزارِ ہست و بود کو دیوانہ وار دیکھ اس مصرع میں ذرا سا تصرف ہو گیا ہے۔ یہ لیپ کے سال کا اثر ہے۔

''تاریخ ادب اردو'' کی چوتھی جلد کا کام جاری ہوگا۔ پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی ''تاریخ ادبیاتِ ایران'' بھی چار جلدوں میں جا کر پوری ہوئی۔ انہوں نے بھی بڑی لگن سے یہ کام کیا۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ پروفیسر براؤن گفتگو کے بادشاہ تھے۔ چپ رہنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی کتاب A Year Amongs the Persians اپنے رنگ کا سفرنامہ ہے۔ ان کی تاریخِ ادبیات میں تبصرہ برائے نام ہے۔ اسی لیے مولانا شبلی نے اس کی عبارتوں کا نمونہ (ترجمے کی شکل میں) سن کر فرمایا تھا۔ ''یہ واقعات کی کھتونی ہے۔'' پروفیسر براؤن والدِ مرحوم کے استاد تھے۔ اس لیے انہیں مولانا شبلی کا یہ قول ناگوار گزرا۔ میرا خیال ہے مولانا نے بجا فرمایا لیکن دیکھا جائے تو مولانا کی ''شعر العجم'' میں بھی شاعروں کے اسلوبوں کا تبصرہ سرسری ہے۔ انتخاب اشعار البتہ خوب ہے۔

آپ کی ''تاریخ ادبِ اُردو'' کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ تنقید کا فن کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ آپ کی تصنیف کی جامعیت کا مرتبہ اوّلیت کا مرتبہ ہے اور اس کے ساتھ ہی گہری سوچ بھی اس میں مسلسل ہے۔ نقد و نظر اس میں چوکس ہے۔ اس کے مطالعہ سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوگا۔

رسالہ ''اردو'' اگلے وقتوں میں باقاعدگی سے سال میں چار بار نکلا کرتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ دو سال ہونے کو آئے، ایک شمارہ بھی نہیں آیا۔ اس تاخیر کی وجوہ کا مجھ کو علم نہیں۔ نور الحسن جعفری صاحب کے انتقال کی خبر سنی۔ اللہ مغفرت کرے۔ ان کے جانشین کا انتخاب ہو چکا ہوگا۔ آپ کے وہاں ہوتے ہوئے اور کسی کا اس کرسی پر بیٹھنا نامناسب لگتا ہے۔ انجمن کو سنبھالا چاہیے۔ آپ اس کے کام کو بڑھا سکتے ہیں۔

ریٹائر ہو کر چار برس پہلے مجھے جو وحشت ہوئی تھی، اب نہیں ہے۔ طبیعت نے خلوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس خلوت میں امن ہے۔ مشاغل میں کامل آزادی ہے۔

انیسہ ہفتے میں چار دن نوکری پر جاتی ہے اور تین دن آرٹ کلاس میں جاتی ہے۔ یہ بیٹی ناداروں کی بچی ہمدرد ہے۔ اس کی برہی سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اب اس کی برہی گھٹتی جا رہی ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے دعا فرمائیے۔ بوسٹن کے شمالی علاقوں میں جو زمہریری سردی اس سال پڑی، اس کی خبر آپ کو بھائیوں کے خطوط سے ملی ہوگی۔ اس کی خبریں سن کر انیسہ نے کہا فلوریڈا کی سنہری دھوپ از بس غنیمت ہے۔

گورنمنٹ کی طرف سے میری بیوی کے نام کا ایک کارڈ پچھلے ہفتے موصول ہوا جس سے توثیق ہوئی کہ یکم اپریل سے اس کے معالجہ کی کفالت تماماً گورنمنٹ کے ذمے ہوگی۔ ایک نرس کی آمد و رفت سے میرا کام ہلکا ہو جائے گا۔

ہم تینوں کی طرف سے آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب، ڈاکٹر آصف فرخی صاحب، مشفق خواجہ صاحب اور حمید نسیم صاحب سے کسی تقریب میں ملاقات ہو تو میرا سلام انہیں پہنچا کر ممنون فرمائیں۔ کتابوں کے عطیہ کا بے حد شکریہ۔

آپ کا نیازمند

داؤد رہبر

8 July, 1996

مہرباں فیض رساں محبِ گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! آپ پچھلے سال اگست میں تشریف لائے تھے۔ اس گھر کے در و دیوار میرے ساتھ مل کر آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ پاکستان سے دوست آتے ہیں تو شمالی علاقوں کی رونقیں دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ کوئی کوئی ہمت والا اورلانڈو کی طرف آ نکلتا ہے اور وہاں سے فون کرتا ہے تو میں اسے یہاں بلاتا ہوں۔

میرے ہم جماعت آفتاب احمد خاں جو اب ماشاء اللہ صدر انجمن ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں بوسٹن اپنے بیٹے سے ملنے آئے۔ دو تین بار فون پر ان سے گفتگو ہوئی۔ اب وہ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ ان کی بیگم ابھی تک بوسٹن میں بیٹے کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔

نومبر میں لاہور آنے کی صورت پکی ہو گئی ہے۔ لمس (LUMS) کے لیے پانچ لیکچر انگریزی میں لکھے جائیں گے۔ یہ لیکچر دو ہفتوں کے اندر دینا ہیں۔ پھر ان شاء اللہ تین روز کے لیے کراچی آؤں گا۔ آپ کے مسکنِ مبارک میں آ کر کشمیری چائے پیوں گا۔

انیسہ آج کل یہیں Computer Graphics کے ایک کورس میں داخل ہے۔ ایک وائلن خرید لائی ہے۔ مجھ سے راگ بھوپالی کے سبق لے کر اسے وائلن پر بجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ آپ کو سلام لکھوا رہی ہے۔

پچھلے دو مہینے بیوی کے علاج اور ہسپتال کے چکروں نے معمول دگرگوں رکھا۔ آپ نے اپنے خطوط کی فوٹو کاپیوں کی فرمائش لکھی تھی۔ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل میں دیر ہوئی۔ جتنے خط ملے ان کی

KUTABKHANA OSMANIA

فوٹو کاپیاں ارسالِ خدمت ہیں۔

بھابی صاحبہ کو سلام، مشفق خواجہ صاحب اور ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور آفتاب احمد خاں صاحب کو بھی سلام۔ کراچی آؤں گا تو گلشنِ اقبال میں آ کر انجمن کی نئی عمارت دیکھوں گا اور اُردو برادری سے ملوں گا، ان شاء اللہ۔

خانہ آباد دولت زیادہ۔

خادمِ اُردو

داؤد رہبر

9 October, 1996

دوستدارِ غریباں اور محسنِ ادیباں ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! سمندر پار کا ٹیلی فون کمال کا کرشمہ ہے لیکن اس پر سمندر پار کی گفتگو کا قاعدہ یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی جلدی کہہ ڈالو۔ آپ سے ٹیلی فون پر جو کہنا اور سننا ہوا، بہت ہی مختصر تھا۔ تاہم شکر ہے آپ کی آواز تو سن لی۔ اب ان شاء اللہ کراچی پہنچوں گا تو آپ کے گھر میں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔

میں ان شاء اللہ ۱۵۔ نومبر کو لاہور پہنچوں گا۔ وہاں دو ہفتے ٹھہر کر ۲۔ دسمبر کو کراچی آؤں گا۔ تین روز وہاں قیام کر کے ۶ دسمبر کی صبح مراجعت کی پرواز ہوگی۔ خواہش تو یہی ہے کہ بہت دن لاہور اور کراچی میں گزاروں لیکن تین ہفتوں سے زیادہ کا انتظام نہیں ہو سکا۔ انیسہ اپنی نوکری سے رات گیارہ بجے واپس گھر آتی ہے۔ اس لیے شب کے پہلے پہر تیمارداری کو نرس آیا کرے گی، نرس کے کام کی اجرت گورنمنٹ کی طرف سے نہیں ہے۔

میرے تین بھائی مرحوم ہو چکے ہیں۔ ایک بھائی (محمد ایوب) بفضلِ الٰہی حیات ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۳ء میں میں لاہور گیا تو کراچی نہ جا سکا۔ بھائی ایوب صاحب گلہ مند ہوئے۔ اب ان کا اصرار ہے کہ میں ان کے پاس ٹھہروں، دن کے اوقات میں بہر حال آپ کی خدمت میں حاضر رہوں گا۔

گانے کی محفل آپ کے برکت کدے میں ہو یا لطف اللہ خاں صاحب کے سٹوڈیو میں، اس کا فیصلہ وہیں ہو سکتا ہے۔ سٹوڈیو کی تجویز مشفق خواجہ صاحب کی طرف سے ہوئی۔ ایک طبلہ نواز اور ایک سارنگی نواز (یا ہارمونیم نواز) کی سنگت درکار ہوگی، بندہ نوازی کے لیے سامعین ہوں گے۔

۳ دسمبر (منگل) اور ۴ دسمبر (بدھ) ہی اس بیٹھک کے لیے ممکن ہیں۔ ۵ دسمبر کی شام تو باتوں کے لیے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ واپسی کی پرواز کا وقت اس کے بعد شب کے آخری پہر میں (ساڑھے چار بجے) ہوگا۔

بھابی صاحبہ کو، مشفق خواجہ کو اور ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو میرا سلام۔ صدرِ انجمن آفتاب احمد خاں صاحب کو آج خط لکھ رہا ہوں۔

گانے کی محفل کے انتظام کے لیے اگر مناسب سمجھیں تو حمید نسیم صاحب سے مشورہ فرما لیں۔ سازندوں سے ان کا میل جول روز کا ہے۔ بلند اقبال خاں صاحب سے تو آپ کی دوستی برسوں کی ہے، وہ بھی مدد کر سکتے ہیں، انہیں بھی میرا سلام۔

احسان مند

داؤد رہبر

9 January, 1997

بخدمت جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب دام اقبالہم

میرے قدردان، میزبان اور نگہبان ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! اواخر دسمبر میں یہاں سے آپ کا ٹیلی فون نمبر ملایا، آپ کا ملازم بولا ''پاپا، گھر میں نہیں ہیں، ۴ جنوری کو فون کریں۔'' ۵ جنوری کو فون کیا تو ملازم بولا ''اس وقت باہر گئے ہوئے ہیں۔''

آپ کی اور بھابی صاحبہ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے سے میرا قلم قاصر ہے۔ التفات، مدارات اور اعزاز میں آپ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میرے گانے کی سنگت کو قابل سازندے میرے ساتھ بٹھائے۔ باذوق احباب کو میرا گانا سنوایا۔ بھابی صاحبہ نے بہترین نفیس خورش سے دسترخوان آراستہ فرمایا۔

آپ کے برکت کدے کو نوادراتِ ادب سے معمور دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا خزانہ عمر بھر کی لگن اور وسیع النظری کے بغیر جمع نہیں ہو سکتا۔

انیسہ آپ کا عطیہ پا کر بے حد خوش ہوئی۔ اس نے آپ کو اور بھابی صاحبہ کو شکریہ کا کارڈ بھیجا تھا۔ خدا کرے آپ کو مل گیا ہو، اب آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہے۔ میری بیوی کا حال قدرے بہتر ہے، علاج اور تیمارداری جاری ہے۔

ایک مضمون عنقریب لکھوں گا بعنوان ''تین ہفتے پاکستان میں'' جب لکھ چکوں گا تو آپ کو بھیجوں گا۔

بھابی صاحبہ کو سلام، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور ان کے فرزند ڈاکٹر آصف فرخی صاحب اور مشفق خواجہ صاحب کو بھی سلام۔ مشفق خواجہ صاحب نے اس رات محفل کے فوٹو کھینچے تھے۔ اگر ان میں سے دو تین میرے فوٹو البم کے لیے مجھے عطا ہوں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ آپ کے گھر والوں کی محفل کی تصویروں سے البم آباد رہے گا۔

گلشنِ نو آفریدہ یعنی فلوریدہ کا ساکن

داؤد رہبر

15 February, 1997

شفیق محترم محبِ گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! آپ کی اور بھابی صاحبہ کی مہربانیوں کی یاد تازہ ہے۔ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ جس گھر میں شاہد مرحوم اور اُستاد بندو خاں مرحوم کے گانے بجانے کی محفلیں ہوا کرتی تھیں، اسی گھر میں مجھے گانا نصیب ہوا۔ اُستاد بندو خاں سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے فن کے وارث امراؤ بندو خاں صاحب کو اپنا گانا سنانے کا موقع ملا اور انہوں نے آگرہ گھرانے کی گائیکی کے کچھ گُر مجھے سمجھائے۔ امراؤ خاں ضیاء محی الدین کی بہن ثریا کو اس کے گھر جا کر گانا سکھایا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بلند اقبال خاں ثریا کے اُستاد ہوئے۔ اب بھی ہفتے میں ایک بار ثریا کے گھر سبق دینے آتے ہیں۔ میں ان کی بہت تعظیم کرتا ہوں۔ آپ سے یہ سن کر محظوظ ہوا کہ آپ انہیں بلندو کہا کرتے تھے۔ بندو کا قافیہ بلندو ہی تو ہے۔

بیوی کی صحت بہتر ہوئی ہے تو اب سوچ رہا ہوں کہ گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کو گانا سکھایا کروں۔ اس

KUTABKHANA OSMANIA

شغل سے لوگوں کا آنا جانا رہے گا تو کچھ رونق ہوگی۔ آج بمبئی کے ایک آدمی کی دکان پر طبلے کی جوڑیاں دکھائی دیں۔ ایک عمدہ جوڑی سوا سو ڈالر میں مل گئی۔ اس کے آنے سے جی خوش ہے۔

میرے دو تین شاگرد ہر سال بوسٹن میں میرے گانے کا ایک جلسہ کراتے تھے۔ اپریل کے شروع میں اس کے لیے جاؤں گا۔ ایک لیکچر بوسٹن یونیورسٹی میں بھی ہوگا۔

اپنی ایک تازہ نگارش بھیج رہا ہوں۔ اس کے پہلے صفحے کی عبارت بتادے گی کہ یہ کس غرض سے تیار ہوئی ہے۔ میں بے حد ممنون ہوں گا۔ اگر آپ اسے ملاحظہ فرمانے کے بعد ایک نئی تقریظ تحریر فرمائیں اور اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو بھیج دیں، یہ تقریظ کتاب کی زینت ہوگی اور اس کی وقعت کو بڑھائے گی۔

مشفق خواجہ صاحب کہیں یہ تو نہیں سمجھے کہ مجھے آپ کے گھر والی محفل کے متعدد فوٹو مطلوب ہیں؟ میں تو ان سے صرف ایک پرنٹ کا سائل ہوں۔ ایک ایسا پرنٹ جس میں بندہ سازندوں کے درمیان بیٹھا ہوا دکھائی دے۔

یہ خیال آپ کو آیا ہوگا کہ میں نے اس خواہش کا خط خود مشفق صاحب کو کیوں نہ لکھا۔ پچھلے تین چار برسوں میں مجھے اپنے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر چند وہ سراپا شفقت ہیں لیکن خطوں کے جواب لکھنے کا انہیں شوق نہیں اور انہی پر کیا منحصر ہے۔ میرے کئی دوست خط کا جواب لکھنے میں باوجود محبت کے کم ارادہ ہیں۔

بھابی صاحبہ کو سلام، انیسہ بھی سلام لکھوا رہی ہے۔ پارٹیوں میں آپ کا عطا کیا ہوا ہار پہن کر جاتی ہے۔

میں نے بیوی سے کہا، تمہیں یاد ہے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ یہاں آئے تھے؟ اس نے جواب دیا۔ ''وہ جو پان کھاتے ہیں؟'' میں نے کہا، ہاں۔ تمہارا سلام ان کو لکھ دوں؟ بولی۔ ''لکھ دو۔''

والسلام

نیاز مند

داؤد رہبر

15 September, 1997

سراسر مہربان، برابر مایل بہ احسان، محبِّ محترم ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! نوازش نامہ خوشی کا جھونکا ہو کر آیا۔ اس کے ملنے کے چند روز بعد لاہور سے اس تازہ تقریظ کی فوٹو کاپی موصول ہوئی جو آپ نے کلچر والے مضامین کی کتابی اشاعت کے لیے رقم فرمائی۔ فوٹو کاپی دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ تقریظ ''علامت'' میں چھپ بھی گئی۔ آپ کی یہ نگارش ایک گراں قدر وثیقہ ہے۔ اسے مہر کی مُہر کہنا چاہیے۔

سنگِ میل کی طرف سے مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ کئی مہینے ہوئے اعجاز صاحب نے فون پر کہا، اس کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تعجیل سے باز رہا۔ اس لیے کہ چودھری نیاز احمد صاحب کے قلب کا آپریشن ہوا اور وہ وقت یاددہانی کے لیے ٹھیک نہ تھا۔ اب آپ کی تقریظ کی فوٹو کاپی ان کو بھیج رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں کہ کتاب کی کمپوزنگ کرا کے پروف مجھے بھیج دیے جائیں۔ دیکھئے کیا صورت ہوتی ہے، پروف خوانی کم سے کم دوبار ہونی چاہیے۔

''علامت'' کے شمارۂ مئی میں میرے قطعات چھپے ہیں۔ ایک مصرع یوں چھپا:-

لو بجھی سی اور دھواں بہت، فانوس سیاہ، چراغ بڑا [حالانکہ مصرع یوں تھا:-

لو بجھی بجھی اور دھواں بہت ....

پھر ایک شعر یوں چھپ گیا:-

جلیل ہے تری اوقات .اور بات بڑی
بھلا ہو ترا ہو میاں حیات بڑی

اس کا دوسرا مصرع اصل میں یوں تھا:-

بھلا ہو تیرا میاں، ہو تری حیات بڑی

پروف خوانی احتیاط سے نہ ہوئی۔ مصرع بے وزن ہو گیا۔ پڑھنے والے سمجھیں گے شاعر بے تالا ہے۔ ''سلام و پیام'' کی عبارتوں میں جہاں کہیں ضلع جگت ہے زیر اور زبر نہ لگنے سے غت ربود ہو کر رہ گئی۔

دلی سے بیگم عابدہ احمد (فخر الدین علی احمد صاحب کی بیگم) یہاں فلورڈا میں اپنی بیٹی ثمینہ بیگم کے پاس ٹھیری ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ تین گھنٹے ان کے ساتھ بہت اچھے گزرے۔ یہ جولائی کی بات ہے۔ انہوں نے فرمایا، دسمبر میں غالب انسٹی ٹیوٹ جشنِ غالب منا رہی ہے۔ میں تمہاری شرکت کی تجویز کمیٹی کے آگے رکھوں گی۔ میں نے کہا، آمین۔ اب تک کوئی خط ادھر سے نہیں آیا۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا تمہارا پاسپورٹ امریکی ہے یا پاکستانی؟ میں نے کہا، پاکستانی ہے۔ بولیں اگر امریکی ہوتا تو بہتر ہوتا۔ کمیٹی کے تذبذب کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔

How Religion Works والا لیکچر میں نے مقالہ نوشتہ کی صورت سے نہیں بلکہ برجستہ دیا تھا۔ اس کے خیالات قلمبند کرنے کی توفیق اب تک نہ ہوئی۔ یہ موضوع سو ڈیڑھ سو صفحات کے ایک کتابچہ کا متقاضی ہے۔ انگریزی میں اس پر لکھنا شروع کیا ہے، عنوان یہ سوجھا ہے:-

We are all in it together

یعنی ہم سب ملتیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب ملتوں کی بھلائی اور برائی آج ہمارے سامنے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ صلحاء کا تعلق ہمارے زمانے میں اپنے دین دھرم سے کس صورت سے ہے اور خبثاء کا کس صورت سے۔ تعلق بہر حال برقرار ہے۔ اس کا تجزیہ مزے کا نکلے گا۔

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ایک چہار روزہ کانفرنس انڈیانا کی ایک یونیورسٹی (Notre Dame University) میں ہو رہی ہے۔ یہ فرانسیسی مستشرق لوئی ماسی نیون کی یاد منانے کے لیے ہے۔ اس محقق نے پینتالیس سال منصور حلاج کی حیات اور آثار کی تحقیق میں گزارے۔ فرانسیسی میں اس نے جو کچھ لکھا، اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر ہربرٹ میسن نے کیا اور یہ چار جلدوں میں پرنسٹن یونیورسٹی پریس سے چھپا۔ میسن صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ ان کی خواہش سے مجھے شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ ایک مقالہ کانفرنس کے لیے لکھ رہا ہوں۔ عنوان یہ ہے:- ''حلاج کے توسط سے ماسی نیون کی فہم قرآن۔''

اس مقالے کی تیاری میں آنکھیں کھلیں، حلاج کے علم و فضل کی وسعت، اس کے عرفان کی گہرائیوں سے کم نہیں۔ اس کی شہادت کا احترام نہ کرنا سنگدلی ہے لیکن اس کے سارے اقوال سے متفق ہونا مشکل۔ مقالے

KUTABKHANA OSMANIA

کے لیے مجھے کانفرنس میں صرف آدھ گھنٹہ دیا جا رہا ہے۔ کانفرنس ہو چکے گی تو ان شاء اللہ مباحث کو پھیلا کر ایک مضمون اُردو میں بھی لکھوں گا۔

آپ نے پوچھا۔ ''موسیقی کے ریاض کا کیا حال ہے؟'' اس سوال سے مجھے یاد آیا کہ بوسٹن میں میرے طبلہ نواز بندہ نواز پنڈت شَشی نایک نے (جو بیچارے بیکنٹھ باشی ہو گئے) ایک روز مجھ سے کہا۔ ''داؤد جی! سویرے اُٹھ کر ہاتھ منہ دھوئیے اور چائے کا ایک پیالہ پی کر ایک گھنٹہ طنبورہ چھیڑا کیجیے۔'' اُستاد جمال الدین ستارئیے بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے سن کر پنڈت جی سے کہا۔ ''کیا باتیں کر رہے ہو! ریاض تو جوانی میں کیے جاتے ہیں!''

ایک اور بات یہ ہے کہ جوانی جا چکے تو ''بزرگانہ'' اسلوب سے ٹھیراؤ کے ساتھ گانا چاہیے۔ تیز اور تند تان آزمائیوں سے بچ کر۔ کراچی میں خورجہ گھرانے کے ایک اُستاد واحد حسین خاں آ کر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ آپ نے شاید ان کا گانا سنا ہو۔ اُڑتی ہوئی تانیں ان کے گانے میں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ مجھے ان کا انداز بے حد پسند ہے۔

آپ تاریخِ ادبِ اردو کی تکمیل میں مشغول ہیں۔ وقت کا اس سے بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ اس میں ریاضت ہے، زندہ رہنے والی تصانیف ریاضت ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ البتہ کام کے بیچ بیچ اس طرح کی تفریح بھی ضروری ہے جیسی کولمبس کے قیام میں آپ کو میسر تھی۔

انیسہ ہفتے میں تین روز کالج جاتی ہے۔ پڑھائی میں اب اس کا جی لگ گیا ہے۔ ماں کو روبہ صحت دیکھ کر حوصلہ مند ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کو بھابی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہے۔ بھابی صاحبہ کو میرا بھی سلام پہنچے۔

میرے خسر بزرگوار پروفیسر آغا غیاث الدین احمد صاحب نے ۲۸ جولائی کو رحلت فرمائی۔ (۹۷ کی عمر میں) اللہ مغفرت کرے۔ بڑی شاندار زندگی گزار گئے۔

پاکستان کا سفرنامہ میں نے ''مکالمہ'' کے ایڈیٹر مبین مرزا صاحب کو بھیج دیا تھا۔ ان کی طرف سے پرتپاک رسید موصول ہوئی۔ اگلا شمارہ کب نکلے گا، مجھے معلوم نہیں۔

آپ کا احسان مند

نیاز مند

داؤد رہبر

21 February, 1998

محبی و مربی محترم ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! میری طرف سے سلام و پیام کا وقفہ اب کے لمبا ہو گیا۔ تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ کوئی نئی تحریر خط کے ساتھ بھیجنے کو تیار نہ تھی۔

جو مقالہ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں، حال ہی میں مکمل ہوا۔ اسے لکھتے ہوئے یہ احساس رہا کہ معلومات کا تو کوئی انت ہی نہیں، ابھی حضرتِ خضر بھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تو ہم کیا اُمید رکھیں۔

حلاج کے قول و عمل سے جو کچھ واقفیت حاصل ہوئی سبق آموز ہے۔ صدیوں ان پر برگزیدگانِ ملت

KUTABKHANA OSMANIA

کی رائے زنی ہوتی رہی۔ سوائے اس کے کوئی کیا کہے کہ رُوحانیت کے سمندر میں فرزانگی اور دیوانگی کے دھارے ہیں، یہ آپس میں ٹکراتے بھی ہیں اور کھیلتے بھی ہیں۔

صبیحہ بیگم کی صحت پہلے کی نسبت بہتر ہے۔ انیسہ کے کورس کالج میں اگلے سال جنوری یا مارچ میں ختم ہوں گے۔

میرے لکھنے پڑھنے کی خبریں یوں ہے کہ آپ جانتے ہی ہیں۔ انگریزی کی نسبت اُردو میں لکھنا مجھے زیادہ مرغوب ہے۔ تاہم دو کتابیں انگریزی میں لکھنے کی سخت خواہش ہے:-

ان کے عنوان یہ سوچ رکھے ہیں:-

1. We are all in it Together
2. Biographical Method of Comparative Religion

پہلی کتاب میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ وراثتِ روحانی سے علاقہ ہر ملت میں صلحاء کو بھی ہوتا ہے اور خبثاء کو بھی۔ اس تعلق کی مثالیں میرے ذہن میں ہیں۔ بعض اپنے تجربے سے اور بعض کتابوں کے مطالعے سے۔

دوسری ملت کے صلحاء سے وحشت کی بنا یہ خوف ہوتا ہے کہ یہ ہمارے بدخواہ ہیں۔ اگر اس سے ہماری جنگ چھڑ گئی تو یہ ادھر سے لڑیں گے اور اپنی ملت کے خبثاء سے یگانگی اس بنا پر رہتی ہے کہ اگر باہر والوں سے جنگ چھڑ گئی تو یہ خبثاء ہمارا ساتھ دیں گے۔ ۱۹۴۷ء کے بلوے اس بات کا ثبوت ہیں۔

اور یہ عندیہ بھی ہر جگہ ہے کہ ہمارے ہاں کے تو خبثاء بھی دوسری ملتوں کے صلحاء سے بہتر لوگ ہیں۔ آخرت میں نجات کے اُمیدوار یہی ہو سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

دوسری کتاب کے لکھنے کی نوبت آئی تو یہ طویل تر ہوگی۔ یہ اُردو اور انگریزی کی منتخب سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں کے بارے میں ہوگی۔ اس میں اقتباسات مع حواشی ہوں گے۔ اس سے یہ دکھانا مقصود ہوگا کہ فرد کا رشتہ اپنے روحانی ورثے سے کیا ہے۔

پہلی کتاب ممکن ہے کہ ایک سال کے اندر لکھ سکوں۔ دوسری کا کام بشرطِ توفیق اس کے بعد ہی شروع ہوگا۔

اس کام کے ساتھ ساتھ اُردو میں کچھ سبک مضمون لکھ کر ''علامت'' کے لیے بھیجتا رہوں گا تاکہ احباب سے رابطہ قایم رہے۔

آپ ''تاریخِ ادبِ اُردو'' کی چوتھی جلد کی تصنیف میں مصروف ہوں گے۔ آپ کے گھر میں علم کے پیاسے بھی آتے ہیں اور اچھے پکوان کے بھوکے بھی۔ یہ بھابی صاحبہ کے دم کی برکت ہے۔ انہیں اور آپ کو ہم تینوں کا سلامِ نیاز۔

مشفق خواجہ صاحب کو بھی سلام، ان سے تصویر مانگنا اب ڈھٹائی تو نہیں کہلائے گا؟

آپ کا گرویدہ

داؤد رہبر

12 July, 1998

میرے محترم محسن مجی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! بہت دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ دل میں لیے بیٹھا ہوں۔ سوچتا رہا کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔ شام وسحر میں کوئی نئی بات ہو تو لکھوں۔ پچھلے ہفتے ''اخبارِ اردو'' کا شمارۂ جون آیا۔ اس میں آپ کی تصویرِ باتنویر دیکھی، آپ مقتدرہ کے سبزہ زار میں پودا لگا رہے ہیں۔ اس کے بعد پرسوں کلچر والی کتاب کے پانچ نسخے چودھری نیاز احمد صاحب کے بھجوائے ہوئے موصول ہوئے۔ یہ کتاب آپ کی فرمائش سے لکھی گئی۔ آپ کے قلم سے تعارف اس میں شامل ہے۔ اس تعارف کی قیمت میری دانشگاہی اسناد کی قیمت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

چھ سات برس تنہائی میں قلمکاری ہوئی۔ اب جی چاہتا ہے کسی مقامی درسگاہ میں جز وقتی نوکری کروں اور ہفتے میں دو تین بار گھر سے نکلا کروں۔ کوشش کر رہا ہوں، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

میرے عزیز اور معزز دوست ڈاکٹر نعمان الحق صاحب (مولانا منتخب الحق مرحوم کے فرزند) عازم کراچی ہیں۔ ان کے ہاتھ سلام نیازمندی کا یہ رقعہ بھیج رہا ہوں۔

بھابی صاحبہ کو سلام، بیوی اور انیسہ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔

آفتاب احمد خاں اور ان کی بیگم پرسوں یہاں آئیں گے۔ ''راگ دریا'' کی فوٹو کاپی آپ نے مرحمت فرمائی۔ بے حد ممنون ہوں۔ آفتاب اسے اپنے ساتھ لے کر آرہے ہیں۔

امیدوارِ دید

داؤد رہبر

3 December, 1998

مشفق و مہربان محب گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! کل شام پارسل موصول ہوا۔ کل پچھلے پہر میامی جا کر پہلی اور دوسری جلد کے ان صفحات کی فوٹو کاپی بنائی جو سابقہ فوٹو کاپی میں شامل نہ تھے۔ اب پورا سٹ میرے پاس بھی ہے اور کل پارسل آپ کو پہنچے گا تو آپ کے پاس بھی ہوگا۔ الحمدللہ، اب مجھے اطمینان ہے۔

آپ کے التفات پر مجھے ناز ہے۔ اپنے امتنان کا اظہار کیسے کروں، آپ کی تشریف آوری ہی میری عید ہے۔

اس وقت ساڑھے چار بجے ہیں۔ ڈاک خانہ پانچ بجے بند ہو جائے گا۔ پارسل لے کر وہاں جا رہا ہوں۔ راتوں رات یہ پارسل کولمبس پہنچ جائے گا۔ کل دوپہر سے پہلے ان شاء اللہ آپ کو مل جائے گا۔

چند تازہ غزلیں بھی بھیج رہا ہوں، ملاحظہ فرما کر سہیل بھائی کو دکھا دیں۔ انہیں اور بھابی صاحبہ کو سلام۔

امیدوارِ بخشش

داؤد رہبر

5 December, 1998

مشفق و مہربان محب گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! کل انڈکس والی جلد یعنی جلد چہارم کی فوٹو کاپی بنا کر لایا۔ آج ڈرامے والی کتاب کی فوٹو کاپی بنائی۔ آج سنیچر ہے۔ ڈاکخانہ دو بجے بند ہو جاتا ہے۔ ڈیڑھ بجے یہ رقعہ لکھ رہا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ انشا پردازی کروں لیکن پارسل ڈاک خانے لے جانا ہے۔ ان شاء اللہ بدھ کے دن آپ کو پارسل مل جائے گا۔ انشاء نہ سہی ان شاء اللہ تو ہے۔

بھابی صاحبہ کو اور سہیل بھائی کو سلام۔

نیازمند

داؤد رہبر

10 December, 1998

محب شفیق گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! کتاب کی جو فوٹو کاپی آپ کے پاس ہے، اس کی جلد بندی کی ایک ترکیب مجھے سوجھی ہے۔ فوٹو کاپی کا ہر ورق فل سکیپ سائز کے ایک ورق پر گوندے سے یوں جمایا جائے کہ بائیں جانب حاشیہ کشادہ رہے۔ سارے اوراق پر یہ آپریشن ہو چکے تو پھر نئے سرے سے فوٹو کاپی مشین پر فل سکیپ سائز کی تین چار مکمل فوٹو کاپیاں بنوا کر مجلد کرالی جائیں۔ ترجمے کی سکیم پر اگر عمل شروع ہوا تو اتنی کاپیوں کی ضرورت ہوگی۔

جملہ صفحات کو تین حصوں میں بانٹ کر ایک ایک حصہ مترجمین کے سپرد کر دیا جائے تو ترجمے کا کام بخوبی ہو سکتا ہے۔ اس کام کا نگراں یعنی ایڈیٹر کون ہو، اس کا فیصلہ علماء کی مشاورت چاہتا ہے۔

''اودھ پنچ'' کی ساری فائلیں انڈیا آفس لائبریری سے حاصل ہو جائیں اور اس کی نظم ونثر کا ایک اچھا خاصا انتخاب دو تین جلدوں میں کسی ادارے کے اہتمام سے چھپ جائے تو ادب کی اُداسی دور ہو۔

اس خط میں ساری گفتنی کیسے آئے! خدا حافظ کہنے کو فون کروں گا۔ بھابی صاحبہ کو اور سہیل بھائی کو سلام۔

نیازمند

داؤد رہبر

16 October, 1999

مشفق و محسن محترمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! اب کے گرمیوں کے آخر میں ہماری بستی کو تین آندھیوں نے دھمکیاں دیں۔ مشرق سے ہماری سمت بڑھتے بڑھتے تینوں یکایک شمال کی طرف مڑ گئیں۔ ان جناتی آندھیوں کا نصف قطر ڈھائی تین سو میل ہوتا ہے۔ ہوا کی رفتار ان کے مرکز میں ڈیڑھ سو میل گھنٹہ ہوتی ہے اور حاشیے پر ستر اسی میل فی گھنٹہ، آندھی کے ہمراہ بے پناہ بارش ہوتی ہے۔ نہیں معلوم کس پیر کی دعا سے ہم ان طوفانوں کی زد سے بچے رہے۔

کل جو آندھی آئی، اس سے ساڑھے تین لاکھ گھر جنوبی فلورڈا کے برقی روشنی اور برقی چولہوں کے

KUTABKHANA OSMANIA

آرام کھو بیٹھے۔ بجلی کے بحال ہونے میں تین چار دن لگیں گے۔ اتنے دن کھانا پکانا کوئلوں کی آگ پر ہوگا

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

والد مرحوم کی ولادت ۱۸۹۴ء میں ہوئی اور وفات ۱۹۴۸ء میں ایم اے انہوں نے علی گڑھ سے ۱۹۱۸ء میں پاس کیا۔ ہر سال آپ گرمیوں کی تعطیل اپنے وطن قصور میں گزارتے تھے اور وہاں راتوں کو پڑھائی دیے کی روشنی میں کرتے تھے۔

میں کہ ان کا خلف الصدق ہوں۔ موم بتی کی روشنی میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔

''نیا دور'' پھر کب جاری ہوگا؟ اگر بارِ دیگر بطور فرمائش آپ کی طرف سے بندہ پروری ہو تو میری نگارش کی کھیتی ہری ہو۔

امریکہ پھر کب تشریف لائیے گا؟ بھابی صاحبہ کو میرا سلام، انیسہ بھی آپ دونوں کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہے۔

نیاز مند

داؤد رہبر

30 January, 2000

محبی و مشفقی بسیار مہربان ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! اپنے برکت کدے میں میری خوشی کے لیے آپ نے کیسی اچھی مجلس آراستہ فرمائی تھی، تین سال تیزی سے گزر گئے۔ چھوٹے چھوٹے سفر امریکہ کے اندر اندر ہوئے۔ کچھ سیاحت اپنے دل کے اندر بھی ہوئی۔ بیشتر وقت خلوت میں گزرا۔ خلوت سے فائدہ اٹھایا۔ مطالعہ زیادہ ہوا۔ مضمون نویسی کم۔ ایک سرگوشی سنائی دیتی رہی ع

خود سمجھ جب جایئے اوروں کو تب سمجھایئے

احساس یہ رہا کہ لکھنے کے لیے معلومات میں ابھی وسعت نہیں۔ مثلاً یورپ میں انسان پرستی (ہیومن ازم) کی تاریخ ایک بحرِ زخار ہے۔ پانچ صدیوں سے اس رجحان کا زور بندھا ہوا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ فرو نہ ہوگا بلکہ دنیا بھر کی اقوام کو بے طرح متاثر کرے گا۔

راشد صاحب نے اپنے ایک مجموعے کا عنوان لامساوی انسان (X is equal to MAN) رکھا۔ مغرب میں اس مضمون کا راگ پچھلی دو صدیوں میں خوب گایا گیا ہے۔ یورپ کے فلاسفہ سے سن کر اسے راشد صاحب نے بھی الاپا۔

تشکک اور برہمی اور سرکشی کے اظہارات ان دو صدیوں میں کھلے بندوں ہوئے۔ مسیحیت کے مفتی ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔

نوبل پرائز جیتنے والے صاحب سر برٹرنڈ رسل نے اپنے بے دین ہونے کے جو اظہار کیے غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ سے انہوں نے نعرہ لگایا کہ خدا کو ماننا بے فائدہ بلکہ مضر ہے اور منافقت کی جڑ

ہے۔ بقول ان کے ہمیں صرف تین اقدار درکار ہیں۔ معقولیت، علم اور محبت۔

یہ معقولیت اور علم ہی کے مبلغ ہو کر رہتے تو اچھا ہوتا۔ محبت کی تبلیغ کا حق انہیں نہیں پہنچتا۔ موصوف سخت غصیلے آدمی تھے۔ بردباری ان میں تھی ہی نہیں۔ ان کے تعلقاتِ بشری ٹھیک ٹھاک نہیں تھے۔ انہوں نے تین بیویوں کو یکے بعد دیگرے طلاق دی۔ کیمبرج میں جب یہ بیوی سے لڑتے تھے تو کالج کے آنگن میں ان کی گرج سب طلبہ کو سنائی دیتی تھی۔

تشکک کے کانٹوں میں الجھ کر رہ گئے۔ طلسم ہوشربا کا لطف ان کی قسمت میں نہ تھا۔

وہ آزادی کس کام کی جس سے معاشرے میں سرکشی اور برہمی مزمن ہو جائے اور احترام برقرار نہ رہے۔ اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہیے۔

کراچی اور لاہور کی سیر کو جی چاہ رہا ہے۔ اس لیے میں نے ہوائی سفر کا ٹکٹ خرید لیا ہے۔ ۹ مارچ کی شام کو ان شاءاللہ کراچی پہنچوں گا۔ اپنے بھائی ایوب صاحب کو میں نے مطلع کر دیا ہے۔ انہی کے ہاں ٹھیروں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا خواہش مند ہوں۔ وہاں پہنچ کر فون کروں گا اور معلوم کروں گا کہ کونسا وقت ملاقات کے لیے ٹھیک رہے گا۔ کراچی میں تین دن ٹھیروں گا۔

آپ نے مجھے بتایا کہ پنڈت کیفی کی کتاب خمسہ آپ نے مجھے عطا فرمانے کو نکال رکھی ہے، بے حد ممنون ہوں۔

مجھے کیفی صاحب کے اس مسدس کا پڑھنا مطلوب ہے جس کا عنوان ''بھارت درپن'' ہے۔ تاجور سامری نے اس کا ذکر کیفی صاحب کی سوانح عمری میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ حالی کے مسدس کی سی مقبولیت اسے حاصل نہ ہوئی۔

کچھ بھی ہو دیکھنا تو یہ ہے کہ پنڈت جی نے ہندو سماج کی کون سی خرابیوں کا رونا رویا ہے۔ پنڈت جی انجمن ترقیِ اردو کے صدر تھے۔ انجمن کے اہتمام سے اس مسدس کا ایک پاکستانی ایڈیشن آنا چاہیے۔ انجمن کی لائبریری میں اس کا نسخہ ضرور ہوگا۔ اگر ہو تو اس کی فوٹو کاپی مجھے عطا ہو تو میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہوگی۔

ڈاکٹر نعمان الحق صاحب نے مجھے بتایا کہ سید ذوالفقار بخاری کا مطبوعہ دیوان انہوں نے لندن کی کسی لائبریری میں دیکھا تھا۔ اس کو بھی میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کراچی میں یہ دستیاب ہو۔

نعمان صاحب سے میں نے کراچی کے ایک بزرگ بابا ذہین شاہ تاجی اور ان کے مجموعۂ کلام و آیات جمال کی بہت تعریف سنی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کراچی میں بابا صاحب کی خانقاہ ہے۔ وہاں سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

منشی پریم چند کی بیوی شورانی نے ہندی میں ایک کتابچہ لکھا تھا ''پریم چند اپنے گھر میں'' معلوم نہیں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا یا نہیں اور اگر ہوا تو آپ تک پہنچا یا نہیں۔

خلاصہ یہ کہ بندہ آپ کے ہاں سے جن چیزوں کا سائل ہے، ان کی فہرست یہ ہے:-

فرہنگِ فسانۂ آزاد، فرہنگِ طلسمِ ہوشربا، بھارت درپن، سید ذوالفقار بخاری کا دیوان، آیاتِ جمال، پریم چند اپنے گھر میں۔ ان میں سے جن چیزوں کی فراہمی آسانی سے ہو سکے، وہی مجھ کو عطا ہوں۔ آپ کی

KUTABKHANA OSMANIA

مصروفیات کا مجھے اندازہ ہے۔

بھابی صاحبہ کو میرا سلام، انیسہ انہیں اور آپ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔

باقی عندالملاقات۔

نیاز مند

داؤد رہبر

12 May, 2000

محب صمیم الوداد عمیم الاحسان گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! میری واپسی کی پرواز لاہور سے نیویارک مستقیمانہ تھی۔ ۱۶۔ مارچ کو دوپہر کے وقت لاہور سے اسلام آباد کی طرف اُڑا۔ وہاں ضیاء جالندھری کے دیدار سے مستنیر ہوا۔ بہت اچھی ملاقات رہی۔ الطاف گوہر کا گھر ضیاء کے گھر کے قریب ہے۔ وہاں بھی گیا۔ گوہر کو سلام کر سکا۔ میرا ہم جماعت تجمل حسین بھی وہاں موجود تھا۔ جھکا گلی سے عیدالاضحیٰ منانے آیا ہوا تھا۔ ملتے ہی اس نے مجھ سے کہا، تمہارا ایک قول مجھے یاد آ رہا ہے۔ ''گھٹیا آمد سے اچھی آورد بہتر چیز ہوتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے پاس آورد نہیں آمد آیا ہوں۔''

اچھا شعر ہی نہیں اچھا مکتوب بھی اچھی آمد چاہتا ہے۔ آج آپ کو خط آمد سے لکھ رہا ہوں۔ یہ آمد یوں ہوئی کہ ٹیلی ویژن پر سویرے ایک افریقی النسل مغنیہ کا گانا سنا جو ان دنوں کا ہِٹ سونگ ہے یعنی اپنے وقت کا ٹلا۔ اس گیت کی آستھائی کے بول یہ ہیں:-

Will you still love me tomorrow?

امریکہ اور یورپ کے میخانوں میں شیشے کی الماری کی سی ایک مشین رکھی ہوتی ہے۔ یہ جیوک بکس (Juke Box) کہلاتی ہے۔ اس میں مقبول عام موسیقی کے بیسیوں ریکارڈ ہوتے ہیں۔ سارے گانے ہٹ سونگ ہوتے ہیں۔ ان کی آستھائیوں کے بول چھوٹے چھوٹے کارڈوں پر چھپے ہوئے شیشے کی اس الماری کے اندر سے دکھائی دیتے ہیں۔ گھنڈی گھماتے جایئے اور کارڈ پڑھتے جایئے۔ جو ہٹ سونگ سننے کو جی چاہے اس پر مشین کو سٹ کر کے ایک کوارٹر (ربع ڈالر) کا سکہ مشین میں ڈالیے، گانا بجنے لگے گا۔

ایک روز میں نے ایک جیوک بکس کی گھنڈی گھما گھما کر آستھائیوں کے بول پڑھے تو مان گیا کہ یہ جیوک بکس واردات قلب کے اشاریے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے غزل گو شاعروں کے دیوان۔ سوچ رہا ہوں چند میخانوں میں جا کر بہت سے بول جمع کروں اور ایک مضمون لکھوں۔

کراچی کے قیام کے اختصار کی معافی کن لفظوں میں مانگوں، آپ کے گھر میں حاضر ہو کر بھابی صاحبہ کو سلام نہ کر سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کوتاہی کی معافی کافی نہیں، اس کی تلافی چاہیے یعنی یہ کہ پھر کراچی آؤں۔ فراریوں کی طرح نہیں بلکہ قراریوں کی طرح اور جم کر ملاقاتیں کروں۔

آپ کی طرف سے مسافر نوازی میں کمی نہ ہوئی۔ وجیہہ الدین احمد اور مشفق خواجہ صاحب کی شرکت سے ڈنر والی شام یادگار رہی۔

مطلوبہ کتب کا تازہ عطیہ آپ سے پا کر شاد اور ممنون ہوا۔ شورانی کی تصنیف کا مل جانا بڑی بات ہے۔ مدت سے اس کی تلاش تھی۔ بھگوان نے میری سن لی اور حسن منظر صاحب کے جی میں ڈال دیا کہ ہندی سے اس کا ترجمہ کریں اور طارق رحمٰن صاحب کو راضی کر لیا کہ میرے کراچی آنے سے پہلے یہ ترجمہ چھاپ دیں۔

کیفی صاحب کا خمسہ بھی بروقت مجھے ملا۔ اس میں بڑے کام کے مضمون ہیں۔ آئندہ سال مارچ میں ایک کانفرنس کینیڈا میں ہوگی۔ ''مہاتما گاندھی سے اسلامیان بھارت و پاکستان کے تعلقات'' پر اس میں مقالے پڑھے جائیں گے۔ مجھے شرکت کا دعوت نامہ پہنچا ہے۔ ''مہاتما گاندھی اور اردو'' میرے مقالے کا عنوان ہوگا۔

میرے کشمیری دوست ڈاکٹر آغا اشرف علی ذاکر صاحب کے ارادت مندوں میں سے ہیں۔ جامعہ میں ذاکر صاحب کے رفیق کار تھے، امریکہ آتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ذاکر صاحب کے ایک پمفلٹ کا پتہ دیا جس کا عنوان یہ ہے:-

اردو، ہندی اور ہندوستانی:
گاندھی جی نے کیا سوچا تھا

یہ پمفلٹ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا، اس کی مجھے ضرورت ہے۔ دیکھا آپ نے میرے حسنِ طلب کا تواتر؟

حیران ہوں کہ پنڈت کیفی صاحب کا مسدس بھارت درپن کہاں سے ملے گا۔ معلوم نہیں انہوں نے اس کے کتنے نسخے چھپوائے۔ ان کا بنگلہ موڈل ٹاؤن میں تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دلی سے انہوں نے والد مرحوم کو لکھا کہ میری ذاتی لائبریری میرے گھر میں ہے۔ اسے فوراً محفوظ نہ کیا تو لٹ جائے گی۔ متروکہ لائبریریوں کو محفوظ کر لینے کا انتظام گورنمنٹ کالج کے پرنسپل پطرس بخاری صاحب کے سپرد ہے۔ آپ انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیجیے تاکہ کتابیں فوراً اٹھوا کر کالج پہنچا دی جائیں۔

والد صاحب مجھے ساتھ لے کر پنڈت جی کے بنگلے پہنچے۔ گھر کے دروازے مقفل نہیں تھے۔ سوائے کتابوں کے سارا اسباب لٹ چکا تھا۔ بخاری صاحب کو باخبر کرنے کے بعد اگلے روز ہم ٹہلتے ہوئے پھر بنگلہ دیکھنے گئے۔ کتابیں غائب ہو چکی تھیں۔ بخاری صاحب سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے حکم سے ٹرک موڈل ٹاؤن بھیجا گیا تھا، ٹرک ڈرائیور نے گھر خالی پایا۔ لٹیرے راتوں رات لائبریری لوٹ کر لے گئے۔ بھارت درپن کے نسخے بھی لٹیروں کے ہاتھ آئے ہوں گے۔

مشفق خواجہ صاحب کو میرا دست بستہ سلام، وہ اعتنا فرمائیں تو بھارت درپن کا پاکستانی ایڈیشن شایع ہو جائے۔

ذوالفقار علی بخاری صاحب کا دیوان بھی چھپ جانا چاہیے۔ اعجاز بٹالوی نے مجھے بتایا کہ مدت ہوئی صوفی تبسم صاحب کے پاس اس دیوان کا ایک نسخہ انہوں نے دیکھا تھا۔ فیض صاحب بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ سوال اُٹھا کہ اس کا دیباچہ کون لکھے، طے یہ ہوا کہ تین دیباچے لکھے جائیں۔ ایک صوفی صاحب لکھیں، ایک فیض صاحب اور تیسرا اعجاز صاحب۔

KUTABKHANA OSMANIA

آج میں نے اعجاز کو فون کیا۔ انہوں نے کہا، مشفق خواجہ صاحب دیوان کی فوٹو کاپی مجھے بھیجیں تو میں بخاری صاحب کی بیٹیوں سے اجازت لے کر چودھری نیاز احمد صاحب (مالک مکتبہ سنگِ میل) سے اس کی اشاعت کی بات کروں۔

امریکہ تشریف لائیں تو ہمارے لیے بھی وقت نکالیں۔ بھابی صاحبہ کو میرا اسلام، انیسہ بھی سلام لکھوا رہی ہے۔ پنجابی، اردو اور انگریزی کو آمیختہ کر کے یہ بھابی صاحبہ سے ایک طبعزاد ریختے میں گفتگو کرتی ہے۔

والسلام مع الاحترام

نیاز مند

داؤد رہبر

15 September, 2000

محبِ مہربان پیکرِ احسان گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم، کرم نامہ ملا۔ رے بالفتح کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ گرم نامہ ملا۔

اگلے وقتوں میں فون کی گھنٹی بجا کرتی تھی۔ اب جو فون بن رہے ہیں، ان سے گھنٹی کی آواز کی بجائے چچہہ قسم کی دھیمی سی آواز نکلتی ہے۔ جب میں فون والے کمرے میں نہیں ہوتا ثقلِ سماعت کی وجہ سے آواز مجھے سنائی نہیں دیتی۔

ایک روز فون کا زمزمہ بجا بیوی کو سنائی دیا۔ میں باورچی خانے میں تھا، مجھے سنائی نہ دیا۔ بیوی نے آواز دے کر کہا، ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا فون ہے نیویارک سے۔ دوڑ کر میں اپنے کمرے میں پہنچا اور فون کا ریسیور اٹھایا، ادھر سے ہیلو کا کوئی جواب نہ ملا۔

میں نے اسی شام سہیل بھائی کا نمبر گھمایا اور پوچھا، کیا ڈاکٹر صاحب ان دنوں نیویارک میں ہیں؟ ان کی بیگم صاحبہ نے کہا، اس سال وہ امریکہ نہیں آئے۔

وجیہہ الدین احمد صاحب نے میرے کلیات کی طباعت کی ٹھان لی اور اس کے لیے کمپوزنگ کرائی۔ تین بار اس کے پروف مجھے بھیجے گئے۔

وجیہہ صاحب بڑے صاحب اسلوب ہیں۔ ان کا اسلوبِ نثر نہایت منفرد ہے۔ ان کے ابا مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے اسلوب سے بہت مختلف۔ اردو اور فارسی ادب اور انگریزی کتب کا مطالعہ ان کا اس قدر وسیع ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ (خصوصاً تحلیلِ نفسی کے فن کی کتب کا) گفتگو میں تبصرہ کرتے ہیں تو سننے والا دنگ رہ جاتا ہے لیکن افسوس کہ انہیں لکھنے کی عادت نہیں۔

انہوں نے کلیات کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کیا تو خوب ریسرچ کی۔ میری جملہ نگارشات کو پڑھا۔ کئی مہینے ہر ہفتے دو تین بار مجھے فون کر کے باتیں پوچھتے رہے اور اپنے افکار سے مجھے لطف اندوز اور حیرت زدہ کرتے رہے۔ یہ بچپن میں ہمارے ہجولی تھے۔ ہمارے موڈل ٹاؤن والے گھر آیا کرتے تھے یعنی میرے احوال اور افتادِ طبع سے خوب واقف رہے۔

لکھنے کے لیے خیالات جمع کر رہے تھے کہ ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ افسوس کہ ایک آنکھ کی بینائی

جاتی رہی۔ دوسری آنکھ سے پڑھ تو لیتے ہیں لیکن بمشکل اس وجہ سے دیباچہ لکھنے میں تاخیر ہوئی۔

چند روز ہوئے فون کر کے انہوں نے کہا، خمریات اور شطحات والی غزل کہنے سے اب غزل گو ڈرتے ہیں۔ میں نے دیباچے کے لیے اب تک جو کچھ لکھا ہے، اس پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب سے میری پرانی دوستی ہے۔ وہ بھی بڑے ذہین مفکر ہیں۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ وزیر آغا صاحب زاہد آدمی ہیں اور وجیہہ صاحب کا مزاج رندانہ ہے۔ ان کی دلچسپی مشکوٰۃ المصابیح سے بھی گہری ہے اور جعفر زٹلی اور نظیر اکبرآبادی کے کلام سے بھی۔ ان کے تبصرے شوخ اور رنگین ہوتے ہیں۔ وزیر آغا صاحب نے اپنی تصنیف و تالیف کے اوائل میں وجیہہ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا تھا۔

کلیات کی طباعت اور جلد بندی ان شاء اللہ چند ہفتوں میں مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں یکسوئی کے ساتھ اپنی انگریزی کتاب کے لکھنے میں مشغول ہو جاؤں گا۔ اس کا عنوان شاید اپنے کسی خط میں آپ کو بتا چکا ہوں:-

Faith of the Individual

عارفوں کے عرفان اور لا ادری کہنے والوں کے احوال اور کرداروں کی بحث اس کتاب میں ہوگی۔ مختلف ملتوں میں یہ قصے یکساں نہیں ہیں۔

آپ کی فرمائش سے جو کتاب میں نے لکھی تھی، اس کی حیثیت اور نوعیت ایک تمہید سے زیادہ نہیں۔ یہ میدان ایسا ہے کہ اس میں گفتنی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ مثلاً ہندومت والا باب لکھتے ہوئے مجھے خیال نہ آیا کہ آریہ سماج اور سناتن دھرم کی تحریکوں پر بھی کچھ لکھا جائے اور رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے فرق پر بھی میں کچھ نہ لکھ پایا۔

کیمیائے سعادت اور کشف المحجوب اور اخبار الاخیار اور (خواجہ فرید الدین عطار کے) تذکرۃ الاولیاء سے اولیائے کرام کے فرمودات اور تصوف کے فارمولے تو معلوم ہوئے لیکن پیروں کے تعلقاتِ بشری کا پورا ڈراما سامنے نہیں آیا۔ پیر لوگ تصوف کی پریکٹس کرتے تھے جیسے وکلاء وکالت کی پریکٹس کرتے ہیں اور ڈاکٹر ڈاکٹری کی۔ اس کاروبار کی معلومات انفاس العارفین (مصنفہ شاہ ولی اللہ) اور تذکرہ غوثیہ میں ملتی ہیں۔ اولیاء کی ازدواجی زندگیاں تو سراسر پردے میں ہیں۔

قدیم زمانے میں لا ادریت (Agnostism) کو ''عرفان'' میں تبدیل کرنے کے سلسلے مسیحی سوسائٹی میں Gnosticism کے نام سے موجود تھے۔ ایسی ہی صورتِ حال مسلمانوں میں تھی، لا ادریت کو ''عرفان'' میں تبدیل کرنے کے لیے طریقت کے نسخے ایجاد ہوئے۔

جدید زمانے میں کسی مسیحی پر لا ادریت مسلط ہو جائے تو وہ وحشت سے دوستی کر لیتا ہے اور برہم ہو کر متداول عقائد کو بے باکی کے ساتھ ٹھکراتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ Mysticism مغربی سوسائٹی میں شکست کھا چکی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرے پر تصوف اب بھی حاوی ہے۔ چنانچہ فیض کی مارکسی شاعری غزلائی ہوئی اور ملائم ہے اور اقبال نے پیرِ رومی کے مرید ہندی ہو کر شاعری کی ہے۔

اور ہندو کی تو بات ہی اور ہے۔ اسے عقائد سے بغاوت درپیش ہی نہیں۔ اس کا مت اسے

KUTABKHANA OSMANIA

ناستک (دہریہ) ہونے کی کھلی اجازت دیتا ہے۔

ایک لطیفہ یہ ہے کہ انگریزی لفظ Gnostic کے معنی ہیں عارف اور سنسکرت کے لفظ ناستک کے معنی ہیں لاادری کہنے والا یعنی دہریہ ع

چلتی کو گاڑی کہیں، بنے دودھ کو کھویا

انگریزی میں کتاب لکھتے ہوئے مجھے مختلف ملتوں کے افراد کی سوانح عمریوں سے مثالیں دینی ہوں گی اور اردو اور فارسی نظم ونثر کے اقتباسات کا انگریزی ترجمہ کرنا ہوگا۔ یکسوئی میسر رہی تو دو برسوں میں اس کام کے مکمل ہو جانے کی اُمید ہے۔

اعجاز بٹالوی صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ مشفق خواجہ صاحب سے بخاری صاحب کا دیوان انہیں مل چکا ہے اور یہ مکتبۂ سنگ میل کی طرف سے شایع ہو جائے گا۔

ایک خوش خبری یہ ہے کہ مختار الدین صاحب کو مسدس کیفی (بھارت درپن) کا نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری سے مل گیا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے اس کی فوٹو کاپی بنوا کر مجھے بھیج دی۔

اس کی طبع اول ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ہوئی، طبع ثانی جس کی کاپی مجھے بھیجی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں کتب خانۂ انجمنِ ترقی اردو جامع مسجد دہلی کی طرف سے شایع ہوئی۔ اس کے شروع میں پبلشر نے ایک نوٹ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ:-

> ''حضرت کیفی کی اس کتاب نے شری میتھلی سرن گپت سے بھارت بھارتی لکھوائی اور ہندی میں وطنیت کی شاعری کی بنیاد رکھی۔ گپت جی نے بھارت بھارتی کے دیباچے میں اس کا اعتراف شکریہ کے ساتھ کیا ہے۔''

بھارت درپن کا تازہ ایڈیشن نکلنا چاہیے۔ اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ بھارت بھارتی کا اردو ترجمہ کوئی باہمت کرے تو وہ بھی چھپنا چاہیے۔

''گاندھی جی اور اردو'' پر مقالہ لکھنے کے لیے جو چیزیں مجھے درکار ہیں، مشفق خواجہ نے کرم فرما کر ڈاکٹر نعمان الحق صاحب کے ہاتھ میرے لیے امریکہ بھجوادی ہیں۔ نعمان صاحب عن قریب ان کا پارسل بنا کر مجھے بھیج دیں گے۔

اب مجھے تین اور کتابوں کے مطالعہ کی خواہش کا بخار چڑھا ہوا ہے:-

(۱) محسن فانی کی دبستانِ مذاہب (بزبان فارسی)

(۲) ستیارتھ پرکاش جو سوامی دیانند سرسوتی نے اردو میں لکھی۔

(۳) بوعلی قلندر کے سوانح عمری (اگر کبھی لکھی گئی)

دبستانِ مذاہب کا انگریزی ترجمہ پہلے امریکہ میں چھپا تھا۔ پھر لاہور میں، امید ہے ذرا سی کوشش سے امریکہ ہی میں مل جائے گا۔ معلوم نہیں اردو میں اس کا ترجمہ کبھی کیا گیا یا نہیں۔ یہ کتاب میرزا غالب کے زیر مطالعہ رہتی تھی اور انہیں مرغوب تھی۔ غالبیات میں اس کے مطالعہ کو جگہ ملنی چاہیے۔

میری بیوی کی صحت بہتر ہے۔ دو دوائیں زیر استعمال ہیں۔ ایک رفع وحشت کے لیے اور دوسری دفع

اضطراب کے لیے۔

انیسہ کی وائلن نوازی جاری ہے۔ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام عرض کرتی ہے۔ بھابی صاحبہ کو میرا بھی سلام، تاریخ ادب اردو کے کام میں ابھی آپ کا انہماک زوروں پر ہے۔ اس کی اشاعت کی خوشی منانے کو کسی روز آپ کے گھر میں طرب کی مجلس ہوگی تو اس میں، میں بھی شریک ہو کر گاؤں گا، ان شاء اللہ۔ ایک تازہ مضمون بھی ارسال ہے۔

والسلام

نیازمند

داؤد رہبر

14 February, 2001

شفیق و مہربان محب گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! کرم نامہ موصول ہوا۔ آپ کی مشغولیت معلوم ہوئی۔ یہ مشغولیت علم کی بھی ہے اور عمل کی بھی۔ پانچ چھ سو صفحات کا ناول لکھنے میں اتنی محنت صرف نہیں ہوتی جتنی اسی ضخامت کی ایک محققانہ اور مورخانہ تصنیف کو درکار ہوتی ہے۔ چوتھی جلد کی تصنیف یقیناً زیادہ محنت طلب ہوگی۔ اس دور میں ادب کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔ موڈرن زندگی اور جدید نظم ونثر کے آنے سے تنقید کے تقاضے بھی کچھ اور ہو گئے ہیں۔

میرے کلیات کے ساڑھے سات سو صفحات کمپیوٹر پر ٹائپ ہوئے۔ ان کے پروف میں نے تین بار پڑھے۔ اس کام کا حاصل کمپیوٹر کے ڈسکوں پر استراحت کے حال میں ہے۔ جیسے ٹیپ ریکارڈر پر گانا خوابیدہ ہوتا ہے۔ وجیہہ صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ یہ ڈسک ان کی الماری میں محفوظ ہیں اور عنقریب پرنٹنگ پریس پہنچادیے جائیں گے۔ دیر کی اور کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ وجیہہ صاحب نے دیباچہ لکھنے کا تہیہ کیا تو پورا سال اس میں لگا دیا۔ میری غزلوں پر قلم اُٹھایا تو تغزل کی نفسیات کی تحقیقات میں پڑ گئے۔ فون کر کے مجھے اپنے افکار کی خبر دیتے رہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دیباچے کے لیے افکار کا خلاصہ لکھنے میں انہیں مشکل پیش آئی۔ اب امید ہے کہ کمپوز کیے ہوئے ڈسک جلد پرنٹر کو پہنچ جائیں گے اور چھپائی شروع ہو جائے گی۔

بوعلی قلندر اپنے رنگ کے مجذوب تھے۔ ان کے نام سے تصوف کا جو گھرانہ منسوب ہے (یعنی قلندری سلسلہ) اسی سے شاہ غوث علی قلندر کا تعلق تھا۔ تذکرہ غوثیہ پڑھ کر میں نے سوچا کہ بیشتر صوفیاء کے ہاں اُداسی ہے اور شاہ غوث علی کی طبیعت میں بشاشت۔ اب یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بوعلی قلندر کی طبیعت کا رنگ کیا تھا۔ ان کا مزار پانی پت میں ہے۔ اس کے مجاوروں کو لکھوں تو شاید کوئی تحریر وہاں سے دستیاب ہو۔

امریکہ میں سکونت کہیں بھی ہو، گلوکاری کے جلسوں کے لیے شہروں شہروں گشت لازم ہوتی ہے۔ اس کے لیے سہولت اور وقت کہاں سے لاؤں۔ ہر سال ایک دو تقریبیں ہو جاتی ہیں۔ گرمیوں میں ایک بیٹھک کینیڈا میں ہوگی۔ زیادہ وقت بہرحال اب انگریزی کی تصنیف کے لیے وقف رہنا چاہیے۔

اعجاز حسین بٹالوی آئے ہوئے تھے۔ جنوری کا مہینہ انہوں نے نیویارک میں گزارا۔ ان کے اعزاز میں ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اس میں میں نے ایک مقالہ پڑھا۔ اس کی نقل آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔

اگلے مہینے مہاتما گاندھی کی یاد میں ایک سہ روزہ کانفرنس کینیڈا کی وکٹوریا یونیورسٹی میں ہوگی۔ ''گاندھی جی اور قومی زبان کا مسئلہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ وہاں پڑھوں گا۔

انیسہ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام عرض کرتی ہے۔ وائلن کا ہفتہ وار سبق لینے موسیقی کے سکول جاتی ہے اور کمپیوٹر کا جادو سیکھنے ایک دوسری درسگاہ کو جاتی ہے۔

فلوریڈا کے اس سنیاس آشرم میں صبیحہ بیگم کے دن آرام سے گزر رہے ہیں۔ شکر ہے کہ ہم دونوں کی تندرستی برقرار ہے۔

گزشتہ دو مہینوں میں تھوڑی سی تک بندی ہوئی، چلتی کا نام گاڑی۔ میری غزل گوئی تفنّنِ محض ہے، مگر کسی شکل میں تو لگاتے رہنا چاہیے۔

دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے۔ آپ امریکہ تشریف لائیں تو فلوریڈا کی سیر اپنے پروگرام میں شامل رکھیں۔ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو ہم سب کا سلام نیاز۔

نیاز مند

داؤد رہبر

357 Tilford Q

Contury Village East

Dearfille Beach, Florida 33442

8 January, 2002

میرے محسن مجی و محترمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! گزشتہ ستمبر میں آپ کا ارادہ امریکہ آنے کا ہوا تو اس کی خبر بھابی صاحبہ سے ملی۔ پھر آپ کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ ارادہ فسخ ہو گیا۔ ستمبر ہی میں وہ سانحہ پیش آیا جس کے اسباب اور نتائج کا سلسلہ طویل ہے۔ پنڈتوں کے حساب سے کلجگ چار لاکھ بیس ہزار برسوں کا جگ ہے۔ اس کے چالیس ہزار سال باقی ہیں۔ اس کے آخر میں وشنو بھگوان کا آخری اوتار آئے گا اور بدی میں اعتدال واپس لائے گا۔ ابھی آ جاتا تو ہمیں کچھ فایدہ ہوتا۔ ادھر کروڑوں لوگ مہدی کی آمد کے انتظار میں ہیں۔

آج ایک خط مشفق خواجہ صاحب کو لکھا۔ اس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔ اب آپ کو جو خط لکھ رہا ہوں، اس کی فوٹو کاپی ان کو بھیج دوں گا۔

ڈاکٹر نعمان الحق صاحب ۳۱ دسمبر کو میرے پاس آئے اور پرسوں واپس فلاڈلفیا چلے گئے۔ ان سے خوب گفتگوئیں رہیں۔ ہیر رانجھا کی بحر کا ذکر باتوں باتوں میں آ گیا۔ انہوں نے پوچھا اس کی تقطیع کیسے ہوگی۔ میں نے کہا، دو طرح ممکن ہے:-

اوّل: متفاعلتن متفاعلتن متفا علتن متفاعلتن

دوم: متفاعل فاعل مفتعلن متفاعل فاعل مفتعلن

تقطیع دوم کے آہنگ میں موسقیت زیادہ ہے۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ بحر وارث شاہ کو اردو اور فارسی شاعری سے ملی یا یہ پنجابی الاصل ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بحر اردو اور فارسی میں کبھی مستعمل نہیں رہی۔ پھر اچانک ایک روز خیال آیا کہ بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل اسی بحر میں ہے جس کا مقطع یہ ہے ۔

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

شاید اکبر الہ آبادی نے بھی اس بحر میں غزل کہی ہے۔

مولانا صلاح الدین مرحوم نے ۱۹۵۹ء میں میرے مضامین کا ایک مجموعہ لاہور سے شایع کیا تھا۔ بعنوان ''نسخہ ہائے وفا'' سنگِ میل والوں نے یہ کتاب پھر چھاپ دی ہے۔ اس کی کمپوزنگ وجیہہ الدین احمد صاحب نے کراچی میں کرائی۔ کمپوزر نے کمپوزنگ کی ڈسک لاہور بھیجی تو دیباچہ طبع اوّل اور دیباچہ طبع ثانی اس میں شامل نہ کیے۔ اس کا افسوس ہے۔

آپ امریکہ کب تشریف لائیں گے۔ میں منتظر ہوں۔ بھابی صاحبہ کے ہمراہ ہمارے نئے گھر کو بھی مشرف فرمائیے۔ بھابی صاحبہ کو میرا اسلام، انیسہ بھی آپ دونوں کو سلام لکھوا رہی ہے۔ اس کے لیے ایک الگ فلیٹ خرید لیا گیا ہے۔ اس کا فاصلہ ہمارے گھر سے ایک فرلانگ ہے یعنی ایک چھلانگ۔

آپ کا نیاز مند

داؤد رہبر

11 February, 1994

بخدمت مشفق خواجہ صاحب!

کرم گستر! السلام علیکم!

جی بہت خوش ہوا۔ آپ نے خط پورے التفات سے لکھا۔ اُردو برادری سے میرے مراسم کی تجدید ہوئی۔ تپاک سے پاکستان میرے حق میں تپاکستان بن گیا۔ فلوریڈا میں یک گونہ تنہائی ہے۔ صرف اردو نویسی کے ذریعے احباب تک میری رسائی ہے۔

آپ کے خط میں ایک لغوی استفسار ہے۔ کیا آپ کا سوال میرے ترجمہ کے خط ۴۹ (بنام میرزا تفتہ) کے حوالے سے ہے؟ یقین جانیے کہ اب میرا علم گھٹتا جا رہا ہے اور سوچ بڑھتی جا رہی ہے۔ فلوریڈا میں میرا قیام عارضی ہے۔ میری ساری اردو کتب بکسوں میں بند پڑی ہیں۔ کلیاتِ غالب کی جلد نہ جانے کس بکس میں ہے۔

میرزا غالب کی جس غزل کی ردیف تانا ہا یا ہو ہے، اس کی فوٹو کاپی سامنے ہو تو کچھ عرض کروں۔ دیکھنا چاہیے کہ امیر خسرو سے پہلے بھی کسی شاعر کے کلام میں یہ نعرہ لگایا گیا یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسے امیر خسرو کی ایجاد سمجھنے میں مجھے چنداں تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ پہیلیاں کہنے کا شوق رکھتے تھے۔ موسیقی میں ان کی طبع زاد لطافتوں کی کمی نہیں۔ ان کی طبیعت میں شوخی ہمیشہ رہی، ضلع جگت کا مزا لیتے تھے۔ بچوں کی طرح مہمل آوازیں نکالنے کا لطف اٹھاتے تھے۔ جبھی تو انہوں نے ترانہ ایجاد کیا جس کے مہمل بول ہیں۔ تا۔ نا۔ تن۔ دا۔ نی۔ دیم۔ در۔ رے۔ اُو۔ یللے۔

ایک اُستاد سے ترانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھ سے یللے کا لفظ سن کر انہوں نے اختلاف کیا اور فرمایا

KUTABKHANA OSMANIA

کہ صحیح ''یاعلی'' ہے۔ فارسی نہ جاننے کی وجہ سے اپنی بات پر اڑ گئے۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ ایسی بات پر جھگڑنے سے حاصل؟

قیاسِ محض سے کام لے کر جو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں میرے دل کو لگنے والا خیال یہ ہے کہ تنا ناہایا ہو لفظ تنہا سے ''مشتق'' ہے۔ امیر خسرو کے اندر جو بچہ ہے، اس سے بعید نہیں کہ وہ لفظ تنہا سے کھیل کرے اور اس سے مہملات نکالنے کا شغل کرے۔

امیر خسرو اور میرزا غالب کی وہ غزلیں جن کی یہ ردیف ہے۔ دیکھوں تو مجھے معلوم ہو کہ تنا ناہایا ہو ان میں آہ ہو کر آیا ہے یا آہاہا ہو کر خوشی کا نعرہ ہے یا دُہائی ہے۔

سوچا جائے تو صوفیاء کے ذکر میں یا ہو بھی اسرار کا سمندر ہے۔ لفظ ''تنہا'' بھی صوفیوں کے کام کا لفظ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کے نعرے ہیں۔ الم، طٰہٰ، یٰسین، رب ہے نام اللہ کا ۱۲۔

آپ نے مجھے محقق جان لیا۔ حالانکہ میں حقہ نہیں پیتا۔

میرے بھانجے نوید ریاض صاحب کو ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب سے ایک گفتگو میں خبر ملی کہ میرزا داغ کی یاد میں میں نے جو کچھ لکھ کر بھیجا۔ وہ ''اردو'' کے آئندہ شمارے میں چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ الحمدللہ، اردو کے شیدائی داغ کو بھلا کر خوش کیسے رہ سکتے ہیں۔

میں نے اُس مضمون کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''نگار'' اور ''فاران'' کے داغ نمبر اور داغ کا چوتھا دیوان ''یادگارِ داغ'' میرے پاس نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اگر کہیں سے دستیاب ہوں۔ (قیمتہً یا عاریۃً) تو اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو خط لکھ کر مطلع فرمائیں۔ اعجاز صاحب کے برادر آغا بابر جواب مستقلاً نیویارک کے ساکن ہو گئے۔ ۲۷ فروری کو ایک مہینے کے قیام کے لیے پاکستان آ رہے ہیں۔ اعجاز صاحب ہی کے ہاں قیام کریں گے۔ وہ بخوشی کتاب اور رسالے واپس آ کر مجھے پہنچا دیں گے۔

''گلزارِ داغ'' ''آفتابِ داغ'' اور ''مہتابِ داغ'' تینوں کو میں نے پڑھا اور ان میں سے اشعار چن کر مضمون میں شامل کیے۔ ''یادگارِ داغ'' پڑھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس دیوان کا کلام کہتے ہوئے داغ میں بزرگی آئی یا نہیں۔

سنا ہے کہ فرمان فتح پوری صاحب کے پاس یہ چیزیں ہیں۔ ممکن ہے انہیں ''نگار'' اور ''فاران'' کے داغ نمبر دینے میں تامل ہو۔ اچھا تو پھر یادگارِ داغ ہی عاریۃً دیں کہ اس کی فوٹو کاپی میرے لیے کر لی جائے ع

رسالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، کتاب تو دے

بیگم کو سلام، اللہ سب کو خوش اور سلامت رکھے۔

بزرگوں کا نام لیوا

داؤد رہبر

1st September, 1994

صدیقِ محترم، السلام علیکم!

میرے مہربان دوست آغا بابر ہر سال پاکستان جاتے ہیں، ان کے برادر اعجاز حسین بٹالوی ان کے

ہاتھ چند رسالے اور کتب میرے لیے بھیجتے ہیں۔ اب کے انہوں نے تین چار چیزیں مجھے پہنچانے کے لیے ان کے سپرد کیں۔ آغا صاحب مئی میں واپس آئے۔ سابق میں وہ امانت کا پارسل آتے ہی میری جانب ڈاک میں ڈال دیا کرتے تھے۔ اب کے ایسا نہ کر سکے۔ وجہ اس کی ہے ضعیفی جو اسّی سے متجاوز ہونے کے بعد آنے لگتی ہے۔ ڈاکخانہ ان کے گھر سے پانچ سات میل دور ہے۔ امریکہ میں یہ موٹر خود نہیں چلاتے۔ کہیں جانا ہو تو برخورداروں اور دوستوں کی موٹروں کی سواری درکار ہوتی ہے۔ تاخیر ہوتی گئی۔ میں فون کر کے یاددہانی کراتا رہا۔ وقفے وقفے سے بعض چیزیں انہوں نے بھیج بھی دیں۔

کل فون پر میں نے ان سے کہا، اعجاز نے خط میں لکھا تھا کہ سر عبدالقادر مرحوم کی ایک تصنیف بھی انہوں نے مجھے پہنچانے کو دی۔ اس کا مجھے انتظار ہے، جلد بھیج دی جائے۔ انہوں نے کہا، سوٹ کیس میں متفرق چیزیں تمہارے نام کی اب تک پڑی ہیں، ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔

سوٹ کیس کھول کر انہوں نے نگاہ گھمائی اور بولے۔ ''یہ رکھی ہے سر عبدالقادر والی کتاب، اس کے ساتھ ہے۔ ایک کتاب حمید نسیم کی اقبال پر اور ایک اور کتاب بھی ہے۔ وہ بھی تمہارے لیے ہے۔ مشفق خواجہ صاحب اس کے مصنف ہیں اور ''تحقیقات'' اس کا عنوان ہے۔ میں نے ادھر اُدھر سے اسے دیکھا ہے، پرلطف کتاب ہے۔ اس کے اندر سے ابھی خواجہ صاحب کا ایک خط بھی نکلا تمہارے نام۔ میں نے لفافہ کھول کر پڑھا نہیں، غفلت ہو گئی۔ کتاب اور خط تین ماہ سوٹ کیس میں پڑے رہ گئے۔ خواجہ صاحب کہتے ہوں گے، اس ہدیہ کی رسید نہ آئی۔ وصول کرنے والے نے کی بے اعتنائی۔ میں تینوں کتابوں کا پارسل کل بنا کر روانہ کر دوں گا۔''

اب میں اس پارسل کا منتظر ہوں، اگر آغا صاحب نے حسبِ وعدہ آج روانہ کر دیا تو چھ سات روز میں ملے گا۔ شکریہ تو میں ابھی ادا کرتا ہوں، آپ کا کرم نامہ پڑھ کر اور کتاب سے واقف ہو کر ایک خط اور لکھوں گا۔

انجمن ترقی اردو سے اب آپ کے تعلق کی صورت کیا ہے؟ سنا ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب علالت اور کمزوری کے باعث ریٹائر ہو گئے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نومبر میں ریٹائر ہو کر مستقلاً کراچی میں آ رہیں گے۔ آپ اور ڈاکٹر صاحب دونوں ناظم آباد کے ساکنین میں سے ہیں۔ ان سے آپ کی ملاقاتیں ہوا کریں گی۔ ڈاکٹر فرخی صاحب اور ڈاکٹر جالبی کو میرا نیازمندانہ سلام پہنچا دیجیے، مہربانی۔ بیگم کو بھی سلام۔

مکتبۂ اسلوب کی اشاعتیں کس رفتار سے ہو رہی ہیں؟ میرے بھانجے عزیزی نوید ریاض نے ای ایم آئی کی ریکارڈنگ ایجنسی خرید لی ہے۔ اس کے کاروبار کا دفتر کراچی میں ہے۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ فون سے آپ کی خیریت کی خبریں حاصل کر کے مجھے پہنچاتے رہیں۔

نیازمند

داؤد رہبر

8 September, 1994

بخدمت گرامی مشفق خواجہ صاحب!

کرم فرما محبی مشفق صاحب!

السلام علیکم! آج ستمبر کی آٹھویں تاریخ ہے۔ آغا بابر صاحب کا بھیجا ہوا پارسل صبح موصول ہوا۔ اس

KUTABKHANA OSMANIA

انداز ہوا کہ میرزا غالب مومن کو کیوں پسند کرتے تھے۔

بیگم کو سلام، اللہ آپ کی تندرستی کا نگہبان رہے۔

آپ کی مہربانی سے شاداں

داؤد رہبر

18 September, 1994

بخدمت مشفق خواجہ صاحب!

کرم فرما صدیق محترم، السلام علیکم!

۸ ستمبر کو میں نے ''تحقیق نامہ'' کے عطیے کے مل جانے کی خوشخبری کا خط لکھا۔ آپ کی ان نگارشات کو پڑھ کر یگانگی اور اخلاص کی راحت حاصل ہوئی۔ گزشتہ ادوار کے محسنوں کی یاد منانے کا سلسلہ ایسی ہی کتب سے جاری رہے گا۔ آپ کے معیارِ تحقیق سے متاثر ہوا۔

امریکہ کی بیشتر شاہراہوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد رفتار کی ہدایت کا بورڈ نصب ہوتا ہے:

زیادہ سے زیادہ رفتار پچپن میل فی گھنٹہ

کم سے کم رفتار پینتالیس میل فی گھنٹہ

پچپن تک کی اجازت کی شہ پا کر تقریباً ہر ڈرائیور پینسٹھ کی رفتار سے موٹر دوڑاتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ امریکہ کے مشرقی ساحل سے اس کے مغربی ساحل تک موٹر دوڑائی (نیویارک تا کیلے فورنیا) تین ہزار تین سو میل۔ راتیں ہوٹلوں میں گزار گزار کر سات روز میں یہ سفر پورا کیا۔ اس کے کئی فاصلے پینسٹھ کی رفتار سے طے کیے۔ راستے میں حیران ہو ہو کر اپنے آپ سے کہتا رہا، مادر تہذیب کے فرزند! یہ رفتار وقار کے منافی ہے۔ آہستہ خرام بلکہ مخرام، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان شاہراہوں پر موٹر آہستہ چلانا خطرے سے خالی نہیں۔ رفتار پینتالیس سے کم ہو جائے تو چالان ہو جاتا ہے۔ قانون کہتا ہے۔ ''ہم قدم یعنی ہم پہیہ ہو کر رہو کہ سب مسافر اپنی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کو بے تاب ہیں۔'' ایسی باتیں ہی تو دیارِ مغرب کے غرائب ہیں۔

براعظموں کے درمیان ٹیلی فون بھی انہی غرائب میں سے ہے۔ اگلے وقتوں میں مراسلت ہوتی تھی، اب مفاونت ہوتی ہے یعنی فون کیے جاتے ہیں۔ تفاون بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ مزے کا لفظ تلافن، ہے جس سے اسم فاعل بنے گا متلافن۔

کل میں آپ سے متلافن ہوا۔ خط لکھ کر ڈاک میں ڈالتا تو پندرہ دنوں میں آپ کو ملتا۔ پھر آپ جواب ڈاک میں ڈالتے تو پندرہ دن اور لگتے۔ تلافن سے بات جھٹ ہوگئی۔ مکاتبت کو لوگ نصف الملاقات کہتے ہیں، تلافن کو کیا کہیں گے؟ یہ سوال ریاضی کا نہیں، فرقت کا سوال ہے۔ غزل کا مضمون ہے

ناپی نہ جا سکے گی فرقت کی رات رہبر
سمجھے ہیں اس کو کیا یہ مسطر بنانے والے

''یادگار داغ'' کو جلدی جلدی پڑھ کر میں نے آخری باب لکھا اور مئی کے آخر میں آپ کو بھیج دیا۔ پچھلے دنوں اس پر نظر ڈالی تو محجوب ہوا۔ اقرار کرنا پڑا کہ مضمون میں، میں نے انصاف سے کام نہ لیا۔ یہی مفروضہ

میں سے دو کتابیں نکلیں۔ آپ کی تصنیف ''تحقیق نامہ'' اور اس کے ساتھ ''مقالات [سر] عبدالقادر'' گھر میں رونق ہوگئی۔ تین ماہ یہ کتابیں نیویارک میں آغا بابر صاحب کے سوٹ کیس میں پڑی رہیں۔

صبح سے آپ کی تصنیف کے باب میں پڑھ رہا ہوں۔ آپ کی اس گرانقدر کتاب میں وسیع المراسم مرحوموں کا تذکرہ ہے۔ اپنے وقتوں میں اُمید، قدرت، حسرت اور ناصر محفلوں کی رونق اور درباروں کے رتن تھے۔ ان کی یادوں کو آپ نے پوری حرمت کے ساتھ تازہ کیا ہے۔ ان کی روحوں سے قارئین کا رابطہ بھی قایم کیا ہے۔ کیاب معلومات کے موتی جمع کر کے ہار پروئے ہیں، آپ کے شوقِ تحقیق کو دیکھ کر شیرانی صاحب یاد آئے۔

احمد دین مرحوم والا مضمون میرا پڑھا ہوا ہے۔ باقی مضامین اس کتاب کے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ احمد دین کی کتاب ''اقبال'' کا اشتہار جب میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے معلوم نہ تھا کہ احمد دین ایک معزز وکیل تھے۔ احمد دین نام کے ایک صاحب ہمارے ہاں وقتاً فوقتاً خالص گھی کا ایک کنستر لے کر آیا کرتے تھے۔ انیس روپے میں وہ کنستر خرید لیا جاتا تھا۔ روپے جیب میں ڈال کر کہتے اور کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بڑے دبنگ آدمی تھے۔ لنگی باندھتے تھے۔ ایک روز گھی بیچ کر رخصت ہوئے تو والد صاحب نے بتایا کہ ان صاحب کا لاہور کے دیگر اہلِ علم کے ہاں بھی آنا جانا ہے اور یہ علامہ اقبال کے ہاں بھی گھی بیچنے جا پہنچتے ہیں۔

احمد دین کی کتاب اقبال کا اشتہار دیکھ کر میں سمجھا، یہ وہی گھی والے احمد دین ہیں۔ پھر چند سال بعد بوسٹن میں ڈاکٹر نعمان الحق صاحب (ابن مولانا منتخب الحق) نے یہ کتاب مجھے دکھائی، میں نے آپ کا مقدمہ پڑھا تو اپنی غلطی پر ہنستا رہا۔

آپ نے اپنے کرمناموں میں میری قلم کاری پر جو تحسین برسائی ہے، اس سے برسوں کی تنہائی اور دوریوں کی تلافی ہوئی ہے۔ اُردو برادری اب ایک عالمی برادری بن گئی ہے۔ الحمدللہ کہ مراسلت اور اشاعت کے وسیلوں سے کام لے کر تعلقات استوار رکھے جا سکتے ہیں۔

''یادگار داغ'' پڑھ کر میں نے ایک باب بطور ضمیمہ لکھا اور ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو بھیج دیا۔ ممکن ہے آپ کی نظر سے گزر چکا ہو۔

آپ کی کشادہ دلی ہے کہ آپ میری ضرورت اور میرے شوق کی کتب مجھے بھیجنے کو آمادہ رہتے ہیں۔ میں بے حد ممنون ہوں۔ فی الحال تو وہی ''فاران'' اور ''نگار'' کے داغ نمبر یاد آ رہے ہیں۔ ایک اور کتاب دیکھنے کا متمنی ہوں۔ یہ پنڈت کیفی کی ''بھارت درپن'' ہے جو انہوں نے ہندو سماج کی ابتری دکھانے کو لکھی تھی۔ مسدس حالی کو پڑھ کر کیفی صاحب کو اس کے لکھنے کا خیال آیا۔ دیکھنا چاہیے کیفی صاحب کی سوچ اس کتاب میں کدھر کدھر گئی ہے۔

ایک اور استفسار میرے ذہن میں کئی مہینوں سے گھوم رہا ہے۔ افلاطون کے مکالموں میں ایک طویل مکالمہ Symposium ہے۔ مکالماتِ افلاطون کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شایع کیا تھا۔ (مترجم شاید سید ہاشمی صاحب تھے) میں جاننا چاہتا ہوں کہ انجمن والے ترجمے میں Symposium کا ترجمہ شامل ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے مستعفی ہونے کی خبر اچھی نہیں۔ بہر حال صحت مقدم ہے۔ کام کی تخفیف بعض اوقات لازم ہو جاتی ہے۔ انہیں اور ان کے فرزند ڈاکٹر آصف سلمہ کو میرا سلام پہنچے۔

پچھلے سال مومن کے اردو قصاید پڑھنے میں آئے۔ ان میں عجیب و غریب تخیل پایا۔ انہیں پڑھ کر

KUTABKHANA OSMANIA

لے کر قلم اٹھایا کہ ہفتاد سالہ ہو کر اُستاد داغؔ بلبل والے زمزمے پر قادر نہ رہے۔ اس میں میں حق بجانب نہ تھا۔ دیوان کو اب آہستہ آہستہ پڑھا تو اُستاد کی اُستادی بہت کچھ سامنے آئی۔ غزلوں میں شوخ رنگ نظر آئے۔ قطعات (مثلاً در صفت ِانبہ دکن، ولی عہد بہادر کا جھولا، گھڑی کے عطیہ کا قطعہ تاریخ) میں داغؔ کی قادر الکلامی جواب نہیں رکھتی۔ غرض کہ دیوان کو غور سے پڑھا تو آنکھیں کھلیں۔

جو کچھ میں نے نئے سرے سے لکھا ہے (صفحہ نمبر ۱ تا صفحہ نمبر ۵۴) اشعار کی مثالیں دے کر لکھا ہے۔ اس دیوان پر پہلے جو مضمون لکھ کر بھیجا گیا تھا، وہ میں نے (دو چار عبارات قلمزد کر کے) نئے مقالے کے آخر میں ملحق کر دیا ہے۔

میں اپنے مکاتیب کے پروف دو مرتبہ درست کر کے لاہور بھیج چکا ہوں۔ ناشر صاحب کا کہنا ہے کہ ''غلطیاں لگ گئیں'' خدا نے چاہا تو مجموعہ عن قریب چھپ کر کتب فروشوں کے ہاں پہنچ جائے گا۔

بیگم صاحبہ کو سلام، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو بھی سلام۔

آپ کا دیرینہ نیاز مند

داؤد رہبر

9 October, 1994

مشفق خواجہ صاحب!

شفیق دوست کو سلامِ شوق!

''یادگارِ داغؔ'' والا مضمون نئے سرے سے لکھ کر ۱۹۔ ستمبر کو سپردِ ڈاک کیا۔ رجسٹری کرا کے بھیجا گیا۔ آپ دیکھ چکے ہوں گے، اس میں اشعار کا جو انتخاب شامل ہوا، وہ ضامن ہے اس بات کا کہ ترمیم آپ کو پسند آئی ہوگی۔

ایک غلطی کی تصحیح ضروری ہے۔ مسودے کے صفحہ نمبر ۱۰ پر ایک شعر میں نے یوں نقل کیا ہے

دربان کو بلا کر جو پکارا انہیں میں نے
خود کہنے لگے، کون ہے؟ وہ گھر میں نہیں ہیں

یہاں ''بلا کر'' غلط ہے۔ ''ملا کر'' درست ہے۔

پچھلے ہفتے ایک غزل کہی گئی۔ آپ سے داد وصول کرنے کو بھیجی جا رہی ہے۔

بیگم کو سلام، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو بھی سلام، اللہ سب کو تندرست اور شاد رکھے۔

نیاز مند

داؤد رہبر

30 September, 1995

میرے مہربان مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! دیکھ لیجیے، دور ہوتے ہوئے بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ کراچی اور لاہور کی اردو برادری سے رابطہ مسلسل رکھا۔ اردو میں روز کچھ نہ کچھ لکھا۔ کم ہی ناغہ ہوا۔ بھلا ہو ریٹائرمنٹ کا۔ فون پر اس روز

باتیں ہوئیں۔ آپ بیتیوں پر کام کرنے کی صورت یہ سوجھی ہے کہ دس بارہ بہترین آپ بیتیوں کے اقتباسات جمع کروں اور پھر ان پر گفتگو لکھوں۔ نقاد بن کر نہیں قاری بن کر۔ ادب کا مفتی بننا میرے مزاج کی بات نہیں، بعض لوگ چاہتے ہیں ماتیں اور جیتیں، میں چاہتا ہوں صرف باتیں چیتیں۔

''تسلیمات'' کا ایک شمارہ بھیجا جا رہا ہے۔ سوچا تھا کہ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے ہاتھ بھیج دوں لیکن ان کی واپسی ملتوی ہو گئی ہے۔ اکتوبر کا سارا مہینہ آپ امریکہ ہی میں گزاریں گے۔

''اُردو'' کا شمارۂ خاص چھپ کر آئے تو عزیزی نوید ریاض کو ان کے لاہور والے پتے پر بھیج کر ممنون فرمائیں۔ اہالیانِ کراچی پر اللہ کی رحمت ہو، وہاں کا تہلکہ کب اور کیسے فرو ہوگا، اُسی کو معلوم ہے۔

بیگم صاحبہ کو سلام، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور ڈاکٹر آصف فرخی سلمہ کو بھی میرا سلام۔

بندہ صحرائی

داؤد رہبر

31 January, 1996

برادر شفیق مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! اخبار نہ میں انگریزی کا پڑھتا ہوں نہ اُردو کا ع

آزاد ٹھکانہ ہے کچھ اس بے خبری کا؟

میری لغت میں خبر اُسے کہتے ہیں جو کسی دوست کے مکتوب سے ملے۔ دوست کی خبر ملنے کا ایک نیا ذریعہ ٹیلی فون ہے۔ اس پر سمندر پار سے جب گفتگو کی جاتی ہے تو آرائش گفتار ممکن نہیں ہوتی۔ آمنا سامنا نہیں ہوتا۔ ہر بات عجلت اور انتہائی اختصار سے کہی جاتی ہے۔ گفتگو ختم کرنے کے بعد آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ ہماری زندگی آبا ؤ اجداد کی زندگی سے کس قدر مختلف ہو گئی ہے۔

اعجاز حسین بٹالوی صاحب سے خبر ملی کہ آپ لاہور تشریف لے گئے تھے اور اب کے آپ کی ان کی ملاقات خوب رہی۔ نومبر میں میرے لاہور آنے کا امکان ہے، یہ آرزو پوری ہوئی تو احباب کے دیدار کے لیے دو تین روز کراچی آ کر بھی ٹھہروں گا اور وہاں کی محفلوں کا رنگ دیکھوں گا، ان شاء اللہ۔

میرے مکاتیب کی اشاعت کی بابت آپ کو اعجاز صاحب سے اطلاع ملی ہوگی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کتاب کی جیکٹ کے لیے آپ ایک ''تقریظچہ'' لکھ کر انہیں بھیجیں گے۔ کتاب چھپ کر آئے گی تو میں آپ کی اس تحریر کو مہرِ اخلاص سمجھ کر سینے سے لگاؤں گا۔

بیگم صاحبہ کو سلام، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب، ڈاکٹر آصف فرخی صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور حمید نسیم صاحب کو میرا سلام پہنچا کر ممنون فرمائیں۔ رسالہ ''اُردو'' چھپ کر نکلے تو عزیزم نوید ریاض کو لاہور بھیج دیں، وہ مجھے پہنچا دیں گے۔

نیاز مند

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

ظرافت پطرس کی ظرافت سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو میں بذلہ تھا یا نہیں، اس کا اندازہ ان تقریروں سے نہیں ہو سکا۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب کی تحریر میں مزاح مسلسل ہے لیکن ان کی گفتگو سنجیدہ ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ سرشار بھی کم سخن اور کم آمیز آدمی تھے۔

بشیر ہاشمی صاحب کی زندگی کے حالات سے میں بے خبر ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ پنجابی تھے یا یوپی کے کسی علاقے میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں ان کے مراسم کا رنگ کیا تھا، ملنسار تھے یا مشکل مزاج؟ ان کا تعارف ''قومی زبان'' کے لیے آپ لکھ دیں تو اسے پڑھ کر مجھے بھی واقفیت ہو۔

ادارۂ معارف اسلامیہ کے تین اجلاسوں کی رودادوں کی تین ضخیم جلدیں میرے پاس ہیں۔ ہر جلد میں شرکاء کرام کا گروپ فوٹو ہے۔ مطبوعہ فوٹو ہماری مطبوعات میں اتنے صاف نہیں ہوتے جتنے یورپین کتابوں اور رسالوں میں ہوتے ہیں۔ میرے پاس اصلی فوٹو ادارے کے اجلاسِ اول منعقدہ ۱۹۳۳ء والا محفوظ ہے۔ اس میں سر محمد اقبال صدر کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، ملک برکت علی، ڈاکٹر تاثیر، عبداللہ یوسف علی اور دیگر کئی بزرگ ہیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی کا بشرہ اس میں جیسا متبسم ہے، ان کی اور کسی تصویر میں نہیں۔ علامہ اقبال کا عمدہ ترین فوٹو بھی اسی گروپ میں ہے۔ نہایت دلکش، ایک نوٹ کے ساتھ یہ گروپ فوٹو آپ کو بھیجوں گا۔

''سلام و پیام'' میں واقعی چھاپے کی اغلاط کثرت سے ہیں۔ طبع دوم کی نوبت آئی تو دیکھیے پروف خوانی کون کرتا ہے۔ میں نے اپنے نسخے پر اغلاط کی نشاندہی کر لی ہے۔

آج کل ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ اس کا موضوع ہے مذہب سے ضمیر کی بازیاں، دکھانا یہ مقصود ہے کہ صلحاء اور خبثاء ہر ملت میں ہوتے آئے ہیں۔ اس کتاب کا تہیہ مدت سے ہے۔ یہ کام کر ڈالنا چاہیے۔ زندگی کا کیا بھروسا ہے۔

فرد کے ضمیر کا تعلق مذہبی تعلیمات سے کیا ہے، اس سوال سے یہاں کے پروفیسر کتراتے ہیں۔ میں نے اس پر برسوں غور کیا ہے۔ انگریزی میں تصنیف مکمل ہو کر چھپ جائے تو اس کا اردو ترجمہ بھی ان شاء اللہ ہو جائے گا۔

آپ کو اور دیگر مہربانوں کو خط لکھتا رہوں گا۔ اردو ادب کا ایک عظیم خزانہ پرانے رسائل اور اخبارات کی فائلوں میں ہے۔ یہ فائلیں کن کن لائبریریوں میں محفوظ (بلکہ مدفون) ہیں۔ اس کی ریسرچ ہونی چاہیے۔ ادب کے پارکھ ان فائلوں پر نظر ڈال کر عمدہ ترین مضامین کے انتخاب کریں اور ان کی اشاعت کسی بڑے ادارے کے اہتمام سے ہو تو سینکڑوں شاہکار سامنے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر جالبی صاحب سے بھی یہی کہا تھا، علی الخصوص ان کی توجہ ''اودھ پنچ'' کی طرف دلائی تھی۔

اللہ آپ کی اور بیگم صاحبہ کی تندرستی قائم رکھے۔

سالِ نو مبارک

والسلام

نیازمند

داؤد رہبر

15 September, 1997

رونقِ وطن گرامی مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم

امریکہ میں میں شلوار یا پاجامہ گھر میں تو پہن لیتا ہوں، گھر سے باہر اس وضع سے نکلنا ممکن نہیں۔

امریکہ میں پرائمری سکول کے چند ہم جماعتوں کو کوئی بچہ (یا بچی) اپنے والدین کی اجازت سے بعض اوقات اپنے گھر میں شب بسری کی دعوت دیتا (یا دیتی) ہے، اسے امریکی محاورہ میں پاجامہ پارٹی (Pyjama Party) کہتے ہیں۔

بوسٹن یونیورسٹی میں ایک روز اپنی تہذیب اور امریکی تہذیب کا فرق بیان کرتے ہوئے میں نے کلاس سے کہا، امریکہ میں پاجامہ پارٹی صرف بچوں کی رسم ہے۔ بھارت اور پاکستان میں پاجامہ پارٹی بالغوں کی پارٹی ہے اور یہ گھروں کے اندر ہی نہیں گھروں سے باہر تمام شہروں میں ہر سال کے تین سو چونسٹھ روز برپا رہتی ہے۔

کراچی اور لاہور میں پتلون اور پاجامے کی یکجائی دیکھ کر لطف آتا ہے۔ پچھلے سال آپ کو اور ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو سوٹ میں ملبوس دیکھ کر جی خوش ہوا۔

بزمِ موسیقی کی مسند نشینی مجھے یاد آ رہی ہے، اس کا فوٹو اگر آپ نے مجھے بھیجا تو مجھ تک نہ پہنچا۔ میں اور میرا فوٹو البم دونوں اس کے منتظر ہیں۔ میرے برادر عزیز محمد ایوب صاحب آپ کو فون کریں گے۔ فوٹو ان کو مل جائے تو وہ ڈاک سے مجھ کو بھیج دیں گے۔

بیگم صاحبہ کو سلام

آپ کی دوستی پر نازاں

داؤد رہبر

1st January, 1999

پہلے میں نے یہاں پاسبان لکھا تھا۔ محاورہ کھٹکا تو بدل کر پاسدار لکھا۔ الشعراء تلامیذ الرحمٰن

پاسدارِ خاطر احباب محترمی مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! آج سالِ نو کا پہلا دن ہے۔ صبح کے پانچ بجے ہیں۔ خلافِ معمول جلدی جاگ اُٹھا۔ باہر ابھی اندھیرا ہے۔ کافی کی ایک پیالی پی کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

نئی جنتری کل خرید کر لایا، یہ میرے سامنے آویزاں ہے۔ سال کے باون ہفتے کس تیزی سے گزر جاتے ہیں، جمعہ کے بعد اگلا جمعہ کیسے چھلانگ مار کر آتا ہے! اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چوبیس گھنٹے بھی کٹنے میں نہیں آتے۔

اما بعد، آپ کے بھیجے ہوئے تحفے ڈاکٹر جالبی صاحب نے مجھے پہنچا دیے، بے حد ممنون ہوں۔ تصویریں البم میں لگا دی گئیں۔ ''ادبیات'' والا کالم پڑھا، اس قدر افزائی کو انعام سمجھا گیا۔

''گفت و شنید'' کا نسخہ بھی ملا۔ بارانِ نوازش اسی کو کہیں گے۔ ہاشمی صاحب کی ریڈیائی تقریروں کی

31 January, 2000

محبِ دیرینہ مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم

تقویمِ عیسوی کے الف ثالث کا پہلا مہینہ بھی گزر گیا۔ ۲۰۰۰ء کی آمد کا انتظار یوں کیا جا رہا تھا گویا پرانا سورج ریٹائرڈ ہو جائے گا اور ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔ پہلی جنوری آئی تو پرانے سورج ہی کی کرنیں لے کر آئیں۔ پرانے سورج ہی سے زندگی ہے اور پرانی دوستیوں ہی سے سینے میں تابندگی ہے۔

پچھلی بار لاہور اور کراچی میں آپ سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن باتیں کم ہوئیں۔ میں ۹ مارچ کو ان شاء اللہ کراچی پہنچوں گا۔ تین دن وہاں ٹھہر کر ۱۲ کی شام لاہور جاؤں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کو جی بہت چاہتا ہے، کراچی پہنچ کر آپ کو فون کروں گا۔

بیگم صاحبہ کو سلام

نیاز مند

داؤد رہبر

13 May, 2000

قدیم الاحسان دیرینہ مہربان گرامی مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! اعجاز بٹالوی سے میں نے کہا تیس برس پہلے لاہور اور کراچی چٹھی پانچ روز میں پہنچ جاتی تھی۔ اب بارہ دن لگتے ہیں۔ اپنا فیکس نمبر بتا دو تا کہ کبھی اضطرار ہو تو فیکس کے ذریعے خط بھیج سکوں۔ اعجاز کی بیگم بھی موجود تھیں۔ بولیں ''ای میل سے بھیج دیا کریں۔'' میں نے کہا ''فی میل کی فتنہ گری ہی کیا کم تھی، اب ای میل کی فتنہ گری آن پہنچی۔'' میرے حساب سے ای میل آثارِ قیامت میں شامل ہے۔ کمپیوٹر کا جادو چڑھ کر بول رہا ہے۔ کمپیوٹر کے محاورے کے دو لفظ تہذیب سے چمٹ گئے ہیں:-

Internet

Web-site

میں تو ضلع جگت کا آدمی ہوں Web-site کا لفظ سنتا ہوں تو میرا دھیان مکڑے کے جالے کی طرف جاتا ہے۔ اب یہ ساری سائنس کا مکڑا بن کر آیا ہے۔ یہ دماغوں پر ایک غیر مرئی جالا بن رہا ہے، تہذیب کا اگلا باب اس عنوان سے شروع ہوا ہے:-

مکڑے نے جکڑا

ٹیلی فون سے فنِ گفتگو کا زوال ہوا۔ ای میل آئی تو مکتوب نویسی متروک ہوئی۔ تقویمِ غربی کا الف ثالث نئی نسلوں کو مبارک ہو۔ ہم تو قلم کے آدمی ہیں۔ خط نہ لکھیں تو جی کر کیا کریں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو کل جو خط لکھا اس کی کاپی آپ ملاحظہ فرمائیں۔ چھوٹے بخاری صاحب کے دیوان کی فوٹو کاپی آپ سے حاصل کر کے ڈاکٹر صاحب نے مجھے عطا فرمائی، میں دونو کا ممنون ہوں۔

اعجاز بٹالوی چھوٹے بخاری صاحب کے چہیتے دوست تھے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ ان کا دیوان

شایع ہو تو اس کا دیباچہ اعجاز بٹالوی لکھیں۔ میں نے اعجاز کو بتایا کہ اس دیوان کی فوٹو کاپی میرے پاس پہنچی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مشفق خواجہ صاحب دیوان کی نقل مجھے بھیج دیں تو میں بخاری صاحب کی بیٹیوں سے اجازت لے کر مکتبہ سنگ میل سے اس کی اشاعت کی بات کروں۔

بیگم صاحبہ کو میرا سلام

پنڈت کیفی کے مسدس ''بھارت درپن'' کا ایک اڈیشن انجمن ترقیٔ اُردو کے اہتمام سے شائع ہونا چاہیے۔ میں نے اس کا ذکر تاجور سامری کی ایک تحریر میں پڑھا تو اس کے مطالعہ کا مشتاق ہوا۔ یہ مسدس ملے تو یہ خواہش بھی پوری ہو۔

سراپا سپاس

داؤد رہبر

26 September, 2000

محسن و مخیر گرامی مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! آپ کے ہدیات نعمان صاحب نے مجھے بھیج دیے۔ ان کے ساتھ آپ کا کرم نامہ بھی موصول ہوا۔ ان عطیات نے بروقت میری مشکل آسان کر دی۔ بابائے اُردو کے خطبات اور ہاشمی صاحب کی پنجاہ سالہ تاریخ انجمن دونوں میرے پاس ہیں۔ ان میں مفید مطلب معلومات ملتی ہیں لیکن جو چیزیں آپ نے مرحمت فرمائی ہیں، ان سے مقالے کے لیے پورا مسالہ فراہم ہو گیا ہے (مسالہ کو مصالح لکھوں تو مزا جاتا رہے) شکریہ۔

دہلی کے سہ ماہی ''اردو ادب'' کے تین مضمون جو آپ نے بھیجے ہیں، انہیں پڑھ کر ہندی اردو قضیے کا ڈراما سامنے آیا۔ اس ڈرامے کو المیہ کہیں یا طربیہ؟ بیگم سلطانہ حیات نے مہاتما جی اور بابائے اردو کے مابین اپنی ''سفیرانہ'' فعالیت کی کہانی خوب لکھی ہے۔ ان کے نام اور کام سے میں واقف نہیں تھا۔ اب ان کا مضمون پڑھ کر ان کے باقی احوالِ زندگی جاننے کی خواہش ہے۔

انہوں نے اپنی اس تحریر میں پنڈت سندر لال کا ذکر کیا ہے۔ پنڈت سندر لال کی اپنی ایک نگارش میری نظر سے گزری، آپ کی نظر سے گزر چکی ہوگی:-

> ۱۸۹۱ء کی بات ہے میری عمر کا پانچواں سال تھا۔ الف، ب، ت شروع کرنے کا دن آیا۔ دادا بزرگوار زندہ تھے۔ خاندان کے رواج کے مطابق جب کسی لڑکے کی تعلیم شروع کرائی جاتی تھی تو مولوی صاحب آتے تھے۔ بسم اللہ سے آغاز ہوتا تھا۔ مولوی صاحب ہاتھ پکڑ کر تختی پر ا، ب لکھواتے تھے۔ انہیں عیدی پیش کی جاتی تھی، مٹھائی نذر کی جاتی تھی، مٹھائی بٹتی تھی وغیرہ۔ یہ رواج چند صدیوں پرانا ہی رہا ہوگا۔ دادا بزرگوار نے ایسا ہی طے کیا۔ پر میرے والد ماجد پر کچھ دوسرا رنگ چڑھ چکا تھا۔ والد نے چاہا کہ

KUTABKHANA OSMANIA

بچہ کی تعلیم شروع کرانے کے لیے پنڈت جی آئیں۔ شری گنیشایہ نمہ سے شروع کیا جائے اور تختی پر پہلے ناگری میں اَے، آ لکھایا جائے۔ باپ بیٹوں میں اختلاف ہو گیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جس دن ساعت دیکھ کر میری تعلیم شروع ہوئی، اسی دن پہلے صبح کو مولوی صاحب آئے۔ انہوں نے بسم اللہ سے ساری رسم ادا کی۔ میں نے انہیں عیدی پیش کی۔ انہوں نے مجھے مٹھائی کھلائی اور اس کے بعد سہ پہر کو پنڈت جی تشریف لائے۔ انہوں نے شری گنیش، آیہ نمہ سے اپنی رسم ادا کی۔ مجھے اَے، آ لکھنا سکھایا اور مٹھائی کھلائی اور کھائی۔

اس دن سے لے کر تقریباً دو سال تک یہی ہوتا رہا کہ روز صبح کو مولوی صاحب آتے تھے۔ میں اردو پڑھتا تھا۔ شام کو پنڈت جی آتے تھے۔ میں ان سے ہندی پڑھتا تھا۔ دو سال کے اندر میں ایک طرف تو کریما پڑھ رہا تھا اور دوسری طرف تلسی داس جی کی رامائن کا سندر کانڈ، کریما مجھے قریب قریب حفظ ہو گئی تھی اور سندر کانڈ کی بہت سی چوپائیاں بھی زبانی یاد تھیں۔ انگریزی پڑھنا میں نے ۱۸۹۳ء میں شروع کیا۔

ایک عرصہ کے بعد گاندھی جی سے ہندوستان کی مشترکہ کلچر، خاص کر ہندو مسلم کلچر پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ گاندھی جی بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ اسی گفتگو کے دوران میں ایک دن گاندھی جی سے میری تعلیم شروع ہونے کے اس واقعہ کا ذکر آیا۔ گاندھی جی نے اس سارے قصے کو غور سے سنا اور پھر مجھ سے کہا۔ ''اب میں سمجھا تمہارے اندر یہ کامن کلچر کی بات کیسے آئی۔'' (صفحہ ۶۲-۶۱)

(شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا مؤلفہ جنید احمد، جنید بک ہاؤس بمبئی، غیر مورخہ)

اس ''کامن کلچر'' سے راجا رام موہن رائے بہرہ مند تھے اور لالہ سریرام اور مہاراجہ کرشن پرشاد شاد، حتیٰ کہ پنڈت مدن موہن مالوی بھی۔ گاندھی جی اس کامن کلچر کے بغیر ہندو مسلم یگانگت کے پیامبر تھے۔ اسی لیے ان کی تبلیغ میں تاثیر کی کمی تھی۔

عشرت علی صدیقی صاحب کا ترجمہ بھی مل گیا۔ بے حد ممنون ہوں۔ مقالے کے لیے اس میں سے چند بیانات چن لوں گا اور واشنگٹن جا کر ہریجن اور ینگ انڈیا کی فائلوں سے اصل انگریزی عبارتیں نقل کروں گا۔

سیماب اکبر آبادی کا ترنم والد مرحوم کو پسند آیا ہو گا۔ سیماب صاحب نے خواہش کی ہو گی کہ کار امروز کا یہ تبصرہ لکھا گیا، آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے یہ تبرک اپنے ہدیات میں شامل فرمایا۔

بابائے اردو کو جو خط میں نے لکھے، ان میں سے بعض آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا ان کی نقلیں آپ مجھے عطا فرمائیں گے۔ اس بارے میں کوئی اضطرار اور جلدی نہیں۔ آئندہ چھ سات مہینوں میں

KUTABKHANA OSMANIA

جب مصروفیات اجازت دیں، ان کی فوٹو کاپیاں آپ میرے برادر عزیز محمد ایوب صاحب کو پہنچا دیں۔ کراچی میں ان کا فون نمبر 2216-455 ہے۔

بیگم صاحبہ کو میرا سلام

آپ کا نیاز مند

داؤد رہبر

8 January, 2002

میرے شفیق محبی مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! سالِ نو پر اللہ کی رحمت ہو ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء سے پچھلا سال ہجوم آفات میں کم نہیں رہا۔

سلام و پیام کی اشاعت کے بعد میری مراسلت جاری رہی۔ اس پر ایک شعر کہا گیا اور اس سے مطلع کا کام لیا گیا اور غزل حاصل ہوئی، وہ غزل اس خط کے ساتھ ارسال ہے۔ شعر یہ ہے۔

سلسلہ سلاموں کا میرے ہی قلم سے ہے
رسم نامہ لکھنے کی زندہ میرے دم سے ہے

اب میری عمر چھتر ہے۔ صحت اب تک سلامت ہے۔ تاہم اجل کے اٹل ہونے کا خیال پیہم رہتا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ جتنے خط اور جمع ہو گئے ہیں، ان کو طباعت کے لیے لاہور بھیج دوں۔ ان کی فوٹو کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کو میں نے جتنے خط لکھے، ان کا پلندا محترمہ عائکہ صدیقہ نے مولانا کے فرزند معز الدین احمد صاحب سے حاصل کر لیا تھا۔ یہ مولانا کی سوانح عمری لکھ رہی تھیں۔ پچھلے سال یہ سوانح عمری لاہور سے شائع ہوئی۔ (بعنوان: مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن) اس کی اشاعت کے بارے میں موصوفہ نے مجھ سے مشورہ کیا اور میرے خطوں کا وہ پلندا مجھے بھیج کر پوچھا، ان میں سے کون سے خط سوانح عمری میں شامل کیے جائیں۔ تقریباً اسی خطوں کے پلندے سے اٹھارہ خط چن کر میں نے ان کی صاف نقل اپنے قلم سے تیار کی اور انہیں بھیج دی۔ یہ سوانح عمری چھپی تو اس میں یہ اٹھارہ خط شامل ہو گئے۔

سلام و پیام کی جلد دوم کے لیے مجموعہ مرتب کر رہا ہوں، اس میں یہ اٹھارہ خط بھی شامل کیے جائیں گے۔

اب آپ سے استدعا ہے کہ آپ کو جو خط میں نے امریکہ آنے سے پہلے اور اقامت امریکہ کے اوائل میں لکھے، ان کی نقول مجھے عطا فرمائیں اور بابائے اُردو کو لکھے ہوئے میرے خطوط کی نقول بھی تاکہ مجموعہ مرتب کرتے ہوئے ان کو شامل کر سکوں۔ ان کا شمول میری تشفی کے لیے ضروری ہے۔

میرے بھائی محمد ایوب صاحب جو کراچی میں رہتے تھے، گزشتہ اکتوبر میں اپنی ایک دختر کے گھر منتقل

ہو گئے ہیں جو لاہور میں ہے۔ ان کا پتہ خط کے نیچے درج ہے۔ خطوط کی فوٹو کاپیاں ان کو اس پتے پر بھیج دیں تو وہ ان کا پیکٹ بنا کر مجھے بھیج دیں گے۔

ہم یہیں فلوریڈا کے ایک بہتر علاقے بلکہ احاطے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس احاطے کا رقبہ موڈل ٹاؤن کے رقبے کے برابر ہے۔ پچپن سال سے کم عمر کا کوئی شخص یہاں مکان خرید نہیں سکتا۔ یہ احاطہ ریٹائرڈ لوگوں کے آرام کے لیے تعمیر ہوا ہے۔ یہاں اکثریت بزرگواروں کی ہے۔ اکثر ساکنین کی عمریں میری عمر سے بھی زیادہ ہیں۔ شہرِ خموشاں کی تیاری کے لیے یہ پُرسکوت احاطہ بہترین ہے۔

نسخہ ہائے وفا چار مضامین کے اضافے کے ساتھ سنگِ میل والوں نے پھر چھاپ دی ہے۔ اس کی کمپوزنگ وجیہہ الدین احمد احب نے کراچی میں کرائی۔ تین بار پروف مجھے بھیجے گئے اور اغلاط کی درستی کی گئی۔ اغلاط سے پاک کمپوزنگ مطبعہ سنگِ میل کو بھیجی گئی۔ افسوس کسی وجہ سے مطبعہ نے طباعت کے لیے اسے استعمال نہ کیا۔ نئے سرے سے لاہور میں کمپوزنگ کرائی اور پروف خوانی کے بغیر کتاب چھاپ دی۔ میری پروف خوانی رائیگاں گئی۔ طباعت میں اغلاط کی ایسی بھرمار ہے کہ میں شرمندہ ہوں۔

جی چاہتا ہے کہ کراچی آؤں اور احباب سے معانقہ کروں اور اپنے مہربان میزبان ڈاکٹر جالبی صاحب کے برکت کدے میں راگ سرائی کروں لیکن یہ زمانہ جنگ کا ہے چنگ کا نہیں۔ ہوائی سفر کے مامون ہونے کا زمانہ واپس آئے تو پھر کراچی اور لاہور کا قصد کروں۔

بیگم صاحبہ کو میرا اسلام

آپ کا نیاز مند

داؤد رہبر

میرے بھائی محمد ایوب صاحب کا پتہ اب یہ ہے:-

M. Ayyub
C/o Mr Sarfaraz Rahman
107-5/A St. John's Park
hore Cantt.

21 April, 1993

بخدمت سید امجد الطاف

پیارے امجد الطاف!

دوستوں کو یاد رکھنے والے کا سلام تمہیں اور ضیاء جالندھری کو۔ ''علامت'' کے شمارۂ فروری میں، میں نے ضیاء کا ابتدائیہ پڑھا جس میں یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام ہے کہ اردو میں ڈراما نگاری کے مستقبل پر اپنے خیالات لکھ کر بھیجیں۔ اس دعوت کے جواب میں اگر میں کچھ کہوں تو گویا میں نے اپنے آپ کو نکتہ داں سمجھ لیا۔ میں موٹی سی بات لکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ کیا نکتہ موٹا بھی ہوتا ہے؟ ہاں ضرور ہوتا ہے۔ جلی خط میں چھوٹا نقطہ بھی موٹا ہو جاتا ہے۔

اس خط کے ساتھ ایک چھوٹی سی تحریر ملفوف ہے۔ ضیاء کو بھیج دو۔ وہ پسند کریں تو چھاپ دو۔

ضمناً یہ اطلاع دیتا ہوں کہ ''اوراق'' کا جو شمارہ اپریل، مئی میں نکل رہا ہے، اس کے لیے میں نے اپنے مشفق برادر ڈاکٹر وزیر آغا کو ایک مضمون ''بساطِ سخن اور ڈرامے کا سٹیج'' کے عنوان سے بھیجا۔ انہوں نے اس کی رسید کے ساتھ مجھے بتایا ہے کہ یہ مضمون انہیں پسند آیا لیکن بروقت نہ ملنے کے باعث اس شمارے میں نہیں، اس سے اگلے شمارے میں شامل ہوگا۔ اس مضمون میں ایک بات میں نے یہ کہی ہے کہ مغلوں کی تہذیب میں مسندِ مشاعرہ آراستہ ہوئی۔ اس پر ''متخلص'' شاعر آ کر بیٹھتے تھے۔ وہ بھی ایک طرح کی ایکٹنگ تھی۔ فرق یہ تھا کہ اس مسند کے ایکٹر گھر سے مکالمے رٹ کر نہ آتے تھے اور نہ بہروپ کا کوئی سلسلہ اس مسند پر ہوا۔ ایکٹنگ وہاں ''متخلص'' ہونے کی حد تک تھی یعنی خواجہ حیدر علی وہاں آ کر کہتا تھا۔ ''یہاں میں حیدر علی نہیں ہوں، آتش ہوں۔'' غزلوں کے ذریعے اس مسند پر عاشقانہ اور رندانہ بھاؤ بتائے جاتے تھے۔ خیالی خوباں سے خیال ہی خیال میں کورٹ شپ ہوتی تھی اور خیالی میکدے میں خیالی ساقی سے خیالی جام حاصل ہوتا تھا۔ تمسخر کے ساتھ جور کی شکایت کی جاتی تھی۔

موڈ میں آؤ تو ایک خط مجھے لکھو اور دل کی کوئی بات کہو۔ پردیسی کا دل خوش کرو۔ ضیاء کو بھی میرا یہی پیغام ہے۔

میرے مکاتیب کا مجموعہ اعجاز بٹالوی کے پاس ہے۔ اس کی اشاعت کے بارے میں کوئی خبر مجھے نہیں مل رہی۔ اعجاز سے پوچھو، وہ مجھ پر بے حد مہربان ہے لیکن خط لکھنا اس کی عادات میں شامل نہیں۔

تمہاری تندرستی کا دعاگو

داؤد رہبر

7 February, 1994

بخدمت پروفیسر امجد الطاف

برادر امجد الطاف، السلام علیکم! جو آرزوئیں لے کر میں لاہور آیا، ان میں تم سے ملنے کی آرزو بھی تھی، اس کا پورا ہونا قسمت میں نہ تھا۔ اعجاز نے بتایا کہ امجد کی طبیعت ماندہ ہے، صحت کی بحالی کے لیے وہ کسی ایسی جگہ مقیم ہے جہاں

ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہے

اللہ تمہاری تندرستی قایم رکھے۔

''علامت'' کے وسیلے سے تعلق کو ایک طرح کا ثبات ہے۔ اس میں مسلسل میری نگارشیں چھاپ کر تم نے مجھے نیاز مندانِ لاہور میں شامل کر لیا ہے، یہ تمہاری مہربانی ہے۔

شہرت بخاری اور عبدالسلام خورشید کی آپ بیتیاں پڑھیں جن میں ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس اور عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری کی یادیں شامل ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی کرسیوں اور کافی ہاؤس کی پیالیوں نے ہمیں بیدار مغز کیا۔ فرشی نشست پھر واپس نہ آئی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر ہم نے کہا۔ ''اللہ میاں، تجھے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ اب کافی پی کر ہمارا بھی یہی حال ہے۔ تیرا کلام نظمِ آزاد ہے تو ہم بھی نظمِ آزاد کہیں گے۔ تو عرش آرا ہے، ہم فرش آرا ہیں۔ تیرا اپنا فرمودہ ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

تم اقتصادی مشیرِ زمانہ ہو، ظاہر ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی تمہاری مصروفیات بہت ہوں گی۔

ایک مزیدار خط لکھو، اپنی صحت اور اپنے شاداب موڈ کی خوشخبری والا خط۔

اعجاز کا پتہ یہ ہے۔

High Court Chambers

4 Turner Road, Lahore

ان کا فون نمبر 758-3298

دیوان کی فوٹو کاپی پر جو رقم صرف ہو، اعجاز سے وصول کر لو۔ میں اعجاز سے حساب کر لوں گا۔ بھائی، پاکستان میں اُردو برادری کے سوا اور میرا کون ہے

ہے تو ملحدؔ ہے مگر اُردو کا رسیا آدمی
بخش دے یارب اسے، ہے یہ ہمارا آدمی

تم نے ایک بھی خط کا جواب نہ لکھا تو میرا دل دُکھے گا۔ بیگم کو سلام

من آنم کہ من دانم

اس خط کی فوٹو کاپیاں مشفق خواجہ صاحب، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور اعجاز کو بھیج رہا ہوں۔

10 October, 1996

صدرِ انجمن بلکہ شرحِ صدرِ انجمن، سلام بھی اور تسلیم بھی۔ میں ۱۵۔نومبر کو لاہور پہنچوں گا۔ دو ہفتے وہاں ٹھہر کر ۲ دسمبر کو کراچی آؤں گا، ان شاء اللہ اور تین دن (۳ اور ۴ اور ۵ دسمبر، منگل، بدھ اور جمعرات) کو کراچی میں ایوب کے ہاں ٹھہروں گا۔ اس سے ملاقات آٹھ برس بعد ہو رہی ہے۔ از راہِ کرم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور مشفق خواجہ صاحب سے مشورہ کر کے ایک وقت ایسا مقرر کر دو کہ میں انجمن کی نئی عمارت کی زیارت کو آؤں تو ادب نوازوں سے نیاز حاصل کر سکوں۔

ڈاکٹر جالبی صاحب میرے گانے کے لیے ایک نشست جمانے کا نیک ارادہ رکھتے ہیں۔ انجمن میں تمہاری مہربانی سے اگر کوئی تقریب رکھی جائے تو ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لینا مناسب ہوگا۔ مبادا دو تقریبیں ایک ہی شام طے پا جائیں۔ درحقیقت ۳۔ اور ۴ ہی دو تقریبوں کے لیے میرے پاس ہیں۔ ۵ کی شام نو بجے میرا سو جانا اچھا ہوگا۔ اس لیے کہ ۶ کی صبح پرواز کا وقت ساڑھے چار بجے ہے۔ ہوائی اڈے پر پہنچنے کے لیے ڈھائی بجے بیدار ہونا ہوگا۔ اگر ۵ کو تقریب ہو تو دن کے وقت ہو، اگر احتفال کی صورت نہ ہو سکے تو مضائقہ نہیں۔ میں انجمن کے کمپاؤنڈ کو دیکھنے آؤں گا ضرور۔

عامر سے تمہارا فون نمبر حاصل کر لوں گا۔

نومبر میں تم لاہور آسکو تو اور بھی اچھا ہے۔ وہاں میرا قیام دو ہفتوں کا ہے۔ مل کر ایک روز گورنمنٹ کالج کی سیر کریں گے۔ اس خط کی فوٹو کاپی میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو بھیج رہا ہوں۔

یاتری

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

کل یوم هو فی شان

آج تو جس شان میں ہے، اس کا پتہ دے۔ کیا جمہوریت تیری مرضی سے آئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو بتا کہ تجھے کونسی حمد پسند ہے، سجدے والی یا قوالی والی؟

برادرم، میں اُردو میں جو کچھ لکھ کر بھیجتا رہتا ہوں، مراسلے ہوں یا مضامین، سب حفظِ مراسم کا وسیلہ ہیں۔ نہ بھیجوں تو کون یاد رکھے۔ میری نثر میں جتنا رس ہے، دوستوں کی محبت کا رس ہے۔

آغا بابر اسی مہینے کے آخر میں چند ہفتوں کے لیے لاہور آئیں گے، تم سے ملیں گے۔ ایک خط میرے نام لکھ رکھو، وہ تم سے ملیں تو انہیں دے دینا۔ چار سطریں روز لکھو تو ایک عشرہ میں چالیس سطریں ہو جائیں۔ ضیاء جالندھری کو فون کرو یا خط لکھو تو میرا سلام پہنچاؤ۔

لاہور سے لوٹ کر تغزل کے طیارے پر سوار ہوا۔ شباب جاتا رہا، اس لیے یہ طیارہ سمندر کی سطح سے زیادہ دور نہیں گیا، تم کہو گے۔ داؤد رہبر، تم کو تو جوانی میں بھی عشقِ مجازی کی ہوا نہ لگی۔

امجد الطاف، کیا عشق کی تپتی دھوپ سے اُنس کی چاندنی زیادہ راحت بخش نہیں؟

سلامت رہو۔

تمہارا یار

داؤد رہبر

26 March, 1994

بخدمت آفتاب احمد خاں

عالیجناب، السلام علیکم! میں نے ''یادگارِ داغ'' کے حصول کی سعی میں تم سے مدد مانگی تھی۔ مجھے اعجاز حسین بٹالوی سے معلوم ہوا کہ تم نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب تک میرا سوال پہنچایا اور انہوں نے تمہیں بتایا کہ ''یادگارِ داغ'' کا ایک نسخہ ان کے پاس ہے اور اس کی فوٹو کاپی بن سکتی ہے۔ تم نے مجھے اطلاع نہ دی۔ میں نے گرامی جناب مشفق خواجہ صاحب کو بھی اس بارے میں خط لکھا ہے۔

اعجاز کے برادر آغا بابر صاحب آج کل پاکستان میں ہیں (ان کا مستقل ڈیرہ نیویارک میں ہے) اپریل کے اخیر میں امریکہ واپس آئیں گے۔ یہ زرّیں موقع ہے میری مدد کا۔ ''یادگارِ داغ'' کی فوٹو کاپی انہیں پہنچ جائے تو وہ اپنے ساتھ لا کر مجھے پہنچا دیں گے۔

میرا خط ملتے ہی کچھ تدبیر کرو، مشفق خواجہ صاحب سے ملو اور اعجاز کو فون کرو۔ آغا بابر اعجاز کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی روانگی سے پہلے فوٹو کاپی انہیں پہنچانے کی صورت نکالو۔ سیاست کو ہٹاؤ، ریاست کی شان دکھاؤ۔ مربی بنو، محسن بنو، ہم کو اپنے ندیموں میں شامل کرو۔

سنا ہے کہ انجمنِ ترقیٔ اردو کے رسالہ ''اردو'' کے تازہ شمارے میں داغ پر میرا ایک بسیط مضمون چھپا ہے۔ انجمن کے دفتر سے دریافت کرو، شمارہ اگر دستیاب ہے تو میرا مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھ ڈالو۔

ممکن ہے اپریل کے آخر میں میرا بوسٹن جانا ہو، وہاں ڈاکٹر نعمان الحق (خیر آبادی) سے ملوں گا۔

عامر کا وہاں آنا جانا ہے، وہاں سے تمہاری خیریت کی خبر ملے گی۔

28 February, 1997

زندہ دل دوست آفتاب کو آداب!

جب تک آدمی ریٹائرڈ نہیں ہوتا، اس کے پاس دو اڈے ہوتے ہیں دفتر (یا دکان) اور گھر، میرے پاس تو اب گھر ہی ہے، تم بلند اقبال اور خوش نصیب ہو، انجمن ترقیٔ اردو کی صدر نشینی سے تمہیں ایک بہترین علمی اور ادبی ٹھکانہ ملا ہوا ہے۔ تاہم فارغ اوقات کی تمہارے ہاں بھی کمی نہ ہوگی۔ انہیں غنیمت جانو اور اپنی یادیں لکھنے کو قلم اٹھاؤ۔ سیاسی یادوں پر بقول اہل پنجاب مٹی ڈالو۔ اپنے ادب نواز دوستوں کے چٹکلے قلمبند کر کے انہیں محفوظ کرو۔ اس سے تمہارا جی بہلے گا۔ تھوڑا تھوڑا روز لکھو تو ایک سال کے اندر اتنا ہو جائے گا کہ تم خود حیران رہ جاؤ گے۔ لکھتے جاؤ اور کسی اخبار میں چھپواتے جاؤ جیسے ذوالفقار علی بخاری نے کیا تھا۔

میں نے فون کر کے تم سے گزارش کی تھی کہ میرا لکھا ہوا میرزا داغؔ کا تذکرہ (جو ''اردو'' کے دو شماروں میں مطبوع ہوا) انجمن تمہاری ایک تقریظ کو شامل کر کے چھاپ دے تو میرا دل بہت خوش ہوگا۔ نئے غزل گو اور نظم گو شاعروں کے کلام چھپ چھپ کر تنور کی روٹیوں کی طرح نکلتے رہیں اور جہان اُستاد میرزا داغؔ کی کلیات نایاب ہو جائیں، یہ انصاف کی بات نہیں۔

کلیاتِ میرؔ کے دو انتخاب میری نظر سے گزرے، ایک انجمن نے چھپوایا، دوسرا مکتبۂ جامعہ نے، کلامِ داغؔ کا انتخاب بھی چھپنا چاہیے۔ میرے مضمون میں داغؔ کے کلام کا ایک انتخاب ''ضمناً'' شامل ہو گیا ہے۔ تقریظ لکھنے کو قلم اٹھاؤ، لکھ چکو تو اس کی فوٹو کاپیاں مجھے بھیج دو اور خط لکھ کر بتا دو کہ کمیٹی میں تجویز اس کتاب کے چھاپنے کی منظور ہوئی یا نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ انجمن ہی اسے چھاپے۔

تمہارا بیٹا طیارے اُڑاتا ہے، میرا ایک بھائی (الیاس) بھی طیارہ اُڑاتا ہے۔ میں نے تو پتنگ بھی کم ہی اڑائی، بے پر کی البتہ خوب اُڑائی۔

حمید نسیم صاحب کو میرا سلام پہنچا دینا۔ ان کے گھر کی ضیافت نہایت پر تپاک تھی۔ تمہارے وہاں موجود ہونے سے رونق دُگنی ہوئی۔ ''تعارف الفرقان'' کا جو تبصرہ تم نے لکھا تھا، اسے پڑھنے کا آرزومند ہوں۔ تقریظ بھیجو تو اس کے ساتھ اس تبصرے کا فوٹو بھی بھیجو، بڑی مہربانی ہوگی۔

بوسٹن آؤ تو یہاں بھی آؤ۔ ساحل کے کسی بنچ پر میرے ساتھ بیٹھو، سمندر کو دیکھو، اُفق کو دیکھو اور باتیں کرو ؎

ہم اِس ساحل پہ بیٹھے ہیں، وہ اُس ساحل پہ بیٹھے ہیں
سلامِ شوق لہروں کے حوالے کر دیا ہم نے

بندۂ خدا

داؤد رہبر

24 October, 1997

صدرِ انجمن!

السلام علیکم، بلکہ دونو ہاتھوں سے سلام۔

سالِ رواں میں دو بار تم کو فون کیا، دونو دفعہ تم نے کہا اگلے مہینے امریکہ آ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سفر ملتوی ہوتا رہا۔ اب معلوم نہیں، کیا نیت ہے یعنی کیا مشیت ہے۔ آؤ تو ادھر کا پھیرا بھی کرو۔

دو کتابیں میرے لیے ساتھ لیتے آنا:-

(۱) راگ دریا مصنفہ ذوالفقار علی بخاری

(۲) پانچویں جلد تعارف الفرقان کی۔

پچھلی گفتگو میں تم نے یہ کہہ کر دلاسا دیا کہ داغؔ والی کتاب انجمن سے چھپوا دو گے۔ تجویز کمیٹی کے سامنے آئی یا نہیں؟ کمیٹی کا اجلاس ہوا یا نہیں؟ روزِ سعید آیا یا نہیں؟ میرے حینِ حیات یہ اشاعت ہو جائے تو میں آداب بجالاؤں۔

گزارش ہے کہ بہر حال اس کے لیے پیش لفظ تو لکھ ڈالو۔ یہ بات تو کمیٹی کی رائے دہندگی کے بغیر ہو سکتی ہے۔ لکھ کر تحریر اپنے پاس رکھو اور ایک فوٹو کاپی اس کی مجھے بھیج دو، ٹالتے نہ رہنا۔

یہاں آؤ تو احوالِ دنیا پر رواں تبصرہ کریں اور دوستوں کی بے ضرر غیبتیں کریں۔

تمہارا ہم جماعت

داؤد رہبر

20 December, 1997

صدرِ انجمن، رونقِ بزم!

السلام علیکم! تم نے بتایا تھا کہ پچھلے سال دسمبر (۱۹۹۶ء) کے آخر میں بندہ انجمنِ ترقی اردو میں حاضر ہوا تو میرے رخصت ہونے کے بعد ''قومی زبان'' میں اس تقریب پر ایک نوٹ چھپا، کیا یہ ممکن ہے کہ اس نوٹ کی فوٹو کاپی مجھے بھیجی جائے؟ اسے دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے کہ ؏

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

پورا رسالہ نہیں مانگ رہا ہوں، صرف نوٹ کی فوٹو کاپی۔

دوسری بات تم نے یہ بتائی کہ ''تعارف الفرقان'' کا تبصرہ تم نے لکھا اور وہ کہیں چھپا اور فضلاء نے اسے پسند کیا، اسے پڑھنے کا مشتاق ہوں۔ اس کی فوٹو کاپی بھی بنواؤ اور مجھے بھیجو۔

تیسری بات یہ ہے کہ تم نے پیش لفظ لکھنے کا وعدہ کیا، سو کرم کرو اور لکھ ڈالو۔ ہمارے ہم جماعت ہونے کا ذکر اس میں ضرور ہو۔ اصل تحریر اپنے پاس محفوظ رکھو اور اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دو۔

انجمن کا عملہ تمہارا معاون ہے، کسی مستعد کے تعاون سے ایک ہی لفافے میں تینوں چیزیں ڈال کر ہوائی ڈاک میں ڈلوا دو۔ قومی زبان والا نوٹ، تعارف الفرقان کا تبصرہ اور پیش لفظ داغؔ والی کتاب کا۔

بڑی بڑی سرکاری کرسیوں پر بیٹھ کر تم نے زندگی میں بڑے بڑے کام کیے، اب صدارتِ انجمن کی کرسی پر بیٹھے ہو تو میرے یہ تین کام بھی کر دو۔ نوروز مبارک، بھابی کو سلام، مئی میں تمہارا انتظار رہے گا۔

مہر کا طالب

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

25 March, 1998

انجمن آرا تسلیم!

روح القدس سے کوئی کب تک باتیں کرتا رہے، اسی لیے کبھی مضمون لکھتا ہوں، کبھی غزل کہتا ہوں۔ کبھی گھاس کاٹتا ہوں اور کبھی کسی دوست کو خط لکھتا ہوں۔

تم نے اچھی خبر سنائی کہ تمہاری سفارش مانی گئی اور انجمن کو میرا تذکرۂ داغ چھاپنا منظور ہے۔

''اردو'' کے دونوں شماروں کی فوٹو کاپی کر کے میں نے ''پروف خوانی'' کی اور جو اغلاط نظر آئیں، ان کی نشاندہی کی۔ یہ فوٹو کاپی تمہاری خدمت میں ارسال ہے۔

کمپوزنگ کے شروع ہوجانے کی خبر ملے تو میں شکر مزید بجالاؤں۔ کمپوزر صاحب کمپوزنگ میری بھیجی ہوئی فوٹو کاپی سے فرمائیں تو بہتر ورنہ کمپوزنگ اغلاط سمیت ہوجائے گی۔

تمہاری ہدایت کی تعمیل میں یہ فوٹو کاپی کمپوزر کو پہنچ جائے تو میں اور میرزا داغ مل کر تمہیں دعا دیں گے۔

میری اس نگارش کے بہانے کلامِ داغ کا ایک انتخاب فراہم ہوا۔ یہ کام ضروری تھا۔

تمہارے قلم سے ایک تقریظ (حرفِ آغاز) کتاب میں شامل ہونی چاہیے۔ اس کے لیے خدارا وقت نکالو۔ اس پارسل کی رسید کا رقعہ لکھ دینا۔ مئی میں تمہارا انتظار رہے گا۔

بیگم کو سلام

یادِ خدا اور یادِ یاراں دونو میں گم

داؤد رہبر

27 May, 1998

میرے دوست آفتاب، سلام!

ریاضِ خیر آبادی اور تم بن پیے مست ہو، تم یہ نعرہ لگایا کرتے تھے ع

یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں

ایک شعر میرا سنو

کوشش کرو کہ مستیِ رنگِ چمن سے پاؤ
جب ہار مان جاؤ پی کر شراب دیکھو

مئی کا آخری ہفتہ آیا تو میں نے تمہیں فون کیا۔ معلوم ہوا کہ تمہارا سفر ملتوی ہوا اور اب تم جون میں آؤ گے۔ تمہاری آمد کا منتظر ہوں۔ روانگی سے پہلے میری کتاب کی کمپوزنگ شروع کرادو تو میں شکرانے کا سجدہ کروں۔

دوسری بات یہ کہ حمید نسیم صاحب کو میرا سلامِ نیاز پہنچے۔ انہیں فون کر کے بتادو کہ میں ان دنوں ان کی تصنیف ''تعارف الفرقان'' کا آخری باب غور سے پڑھ رہا ہوں تا کہ اس کی جداگانہ اشاعت کے لیے ایک تقریظ لکھوں۔

پچھلی بار تم نے غریب نوازی کی۔ ''تعارف الفرقان'' کی پانچویں جلد ساتھ لے کر آئے۔ اب

KUTABKHANA OSMANIA

تاکیدی گزارش ہے کہ ذوالفقار علی بخاری کی کتاب ''راگ دریا'' مجھے درکار ہے۔ اس کی فراہمی حمید نسیم صاحب کی مدد سے ہوگی۔ مل جائے تو ساتھ لیتے آنا۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

عامر کے گھر پہنچتے ہی مجھے فون کردینا اور اپنی آمد کی تاریخ بتادینا۔ بیگم آفتاب کو سلام۔

ہم جماعت

داؤد

11 September, 2001

مہربان دوست آفتاب!

السلام علیکم! تمہارے رخصت ہونے کے بعد اہلیہ کے لیے ایک عمدہ کونڈومنیم ایک سرسبز علاقے میں معقول قیمت پر مل گیا۔ اسے خرید کر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا یہ مکان بیچ کر ہم بھی اسی سرسبز علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ ایک اور کونڈومنیم پسند کر کے اس کا سودا بھی کیا۔ اکتوبر میں ہمارا پتہ بدل جائے گا۔ اس کی اطلاع تمہیں دے دوں گا۔

سید ہاشمی مرحوم نے پنجاہ سالہ تاریخ انجمن لکھی تھی۔ اس میں بابائے اردو کی اردو نوازیوں کی داستان ہے لیکن ایک کام ابھی باقی ہے۔ بابائے اردو کی سوانح عمری کی تالیف، میرا اندازہ ہے کہ مولوی صاحب کے متعلق جتنا لکھا گیا ہے، اتنا اور کسی بزرگ کی ذات پر نہیں لکھا گیا۔ جتنے مضامین ان کی سیرت پر لکھے گئے ہیں، سب رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کسی نے انہیں یکجا کر کے ان کی کتاب نہیں بنائی۔ ''اردو'' ''قومی زبان'' ''الشجاع'' ''ہم قلم'' کے خاص شمارے بیادگار بابائے اردو نکلتے رہے ہیں۔ بھارت میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہوگا۔ خصوصاً حیدر آباد میں، ان مضامین کی جمع آوری مشکل نہ ہوگی اور بہت شاندار کتاب اس مجموعے سے بنے گی۔

بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی کتاب ''ہمسفر'' میں مولوی صاحب کا جو تذکرہ ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے مولوی صاحب کی سیرت کھل کر سامنے آئی ہے۔ مجموعہ میں یہ تذکرہ بھی شامل ہونا چاہیے۔

جب اس مجموعہ کی اشاعت ہو چکے تو پھر اس کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے۔ تین چار مترجمین کی ایک ٹیم بنے تو ترجمہ جلد مکمل ہو سکے گا۔ ترجمے کی انگریزی پر سہاگہ پھیرنے کے لیے کسی انگریز یا امریکن ایڈیٹر کی مدد ضروری ہوگی۔

خطباتِ عبدالحق کا انگریزی ترجمہ بھی ہوجانا چاہیے۔ یہ کام جوانوں کو کرنا چاہیے، میں جوان ہوتا تو یہ ٹیم میں شامل ہوجاتا۔

قبلہ عالی صاحب کو میرا نیاز مندانہ سلام، ان سے مشورہ کرو۔

انگریزی میں بابائے اردو کی سوانح عمری اور ان کی نگارشات شائع ہوں تو یورپ اور امریکہ میں علمی حلقوں کو ان کی مرتبت معلوم ہو اور اردو کا بول بالا ہو۔

بھابی کو سلام

ہمدمِ دیرینہ

داؤد

24 June, 1994

بخدمت ڈاکٹر نعمان الحق صاحب!

... گریمر اور محاورہ کی صحت کے علمبردار نعمان صاحب

سلام شوق بھی اور سلام ذوق بھی۔

آپ تو جانتے ہیں کہ میں جھاڑو والا آدمی ہوں، مٹی اور تنکے ہڑپ کرنے والی مشین، لیموں نچوڑنے والی مشین، کپڑے دھونے والی مشین حتیٰ کہ آٹا گھوندنے والی مشین، ان سب کے دستیاب ہونے سے سہولت تو حاصل ہوئی لیکن زندگی کے بنیادی مزے جاتے رہے۔ آٹا گوندھنے کا مشغلہ گیا تو پھر بے کیف ہو کر نشاط سے بے بہرہ ہو کر یاروں نے غصے میں سگریٹ پیے۔

پچھلے چار روز اپنے مکاتیب کے پروفوں پر نظر ثانی کرنے میں گزارے۔ طباعت کے لیے سارا متن کمپوزر نے کھاتہ مشین (کمپیوٹر) پر ٹائپ کیا۔ اس مشین پر حروف بندروں کی طرح ناچتے ہیں۔ آپ فزکس پڑھ چکے ہیں۔ اس رقص کا ذوق آپ کو میسر ہے۔ میں تو جھاڑو اور قلم والا آدمی ہوں۔ غلط صدی میں پیدا ہو گیا۔

کمپوزنگ والی طباعت میں سمفنی آرکسٹرا کی سی بات پیدا ہوئی۔ برجستگی نہ رہی۔ ہر میم اور ہر نون اور ہر لام کی صورت یکساں، سر مو فرق نہیں (ٹیلی ویژن کے شیشے پر جو تصویر میں دیکھتا ہوں، عین وہی تصویر میرا ہمسایہ اپنے گھر میں اپنے ٹیلی ویژن کے شیشے پر دیکھ رہا ہے)

کتابت میں لام اور نون کی صورتیں بدل بدل کر آتی تھیں۔ خیال گائیکی اور گفتگو والی برجستگی وہاں بھی تھی۔ ٹائپ سے عبارتیں رجمنوں اور پلٹنوں کی شکل اختیار کر گئیں۔

کمپوز کیے ہوئے پروف پڑھتے ہوئے ایک کمی سامنے آئی اور اس سے طبیعت زچ ہوئی۔

مثلاً ضیاء محی الدین کو ایک خط لکھتے ہوئے میں کہنا چاہتا ہوں کہ مثلاً کو مثلا کر کے پڑھنا درست نہیں، کمپوزنگ میں اِعراب نہیں لگائے جا رہے۔ اس عبارت میں اِعراب نہ لگے تو جملہ بے معنی ہو گیا۔

ضیاء نے بچپن میں کہیں یہ جملہ دیکھا:-

محمد علی کا تخلّص مُخلِص ہے

اس کو ضیاء نے بوجہ ناخواندگی یوں پڑھا:-

محمد علی کا تخلّص مخلّص ہے۔

کمپوزر نے اعراب لگائے بغیر اسے دونوں بار یوں ٹائپ کر دیا:-

محمد علی کا تخلّص مخلّص ہے۔

سارا لطیفہ بے معنی ہو کر رہ گیا۔

ایک خط میں میں اس سوال کا جواب لکھ رہا ہوں کہ اُٹّھا (بہ تشدید ٹھ) درست ہے یا اُٹھا (بلا تشدید ٹھ) طباعت میں اعراب نہ ہوں تو یہ عبارت بھی پہیلی بن گئی۔

بعض عبارتوں میں ضلع جگت کا مزا لیا جا رہا ہے۔ دَرد اور دُرد، صاحبت دیوان اور صاحبِ دیوان، پیر اور پَیر، بکری اور بگری، قوت اور قُوت، دلآ رام اور دلا رام، سر اور سُر کو اوپر تلے استعمال کر کے تفنن ہو رہا ہے اور

اعراب کے نہ ہونے سے مطلب غت ربود۔

بعض مطبوعات میں دیکھتا ہوں کہ اعراب لگائے گئے لیکن مشین سے نہیں قلم سے مہیا کیے گئے۔ ٹائپ کی ہوئی عبارت میں ہاتھ سے لکھے ہوئے اعراب بھدے لگے۔

آپ نے تو پورا متن عربی کا کمپیوٹر پر خوبی سے ٹائپ کر ڈالا۔ فرمائیے ان مشکلات کا حل کیا ہے۔ اردو کے ٹائپ میں اعراب کی فراہمی حسب ضرورت کیوں نہیں ہے۔

تقویم ہجری سے بے خبری تو ہمارے ہاں ہے ہی، اب ایک رونا ہے کہ اعداد کی عربی شکلیں پہچاننے والے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں ایسے جملے سامنے آتے رہتے ہیں:

''1918ء میں پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی۔''

پرانی مطبوعات میں یہ جملہ اس شکل میں تھا۔

''۱۹۱۸ء میں پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی۔''

اتوار کی جگہ جمعہ کی چھٹی کا اجرا تو اچھی بات ہے لیکن اردو کی عبارت میں ۱۹۱۸ء کو 1918ء لکھنا بدذوقی کا ثبوت ہے اور ہماری تہذیب کی شکست خوردگی کا ثبوت ہے۔

اس روز ٹیلی فون پر کثیر الوقوع اغلاط گنوائی جا رہی تھیں (—— گاف کے نیچے زیر نہ ڈالی ہوتی تو یہ لفظ ''گنوائی'' بھی پڑھا جا سکتا ——) ان اغلاط کا ایک نوٹ بنا کر میز پر رکھا۔ آج کئی روز بعد اس خط میں یہ نوٹ شامل کرنے کا خیال آیا۔

سوچ رہا ہوں کہ یہ خط ''قومی زبان'' میں اشاعت کے لیے بھیج دوں لیکن وہاں بھی اگر کمپوزنگ کی گئی تو اعراب کا لگنا کیسے ہوگا۔ ایک صورت البتہ اس مشکل سے بچنے کی ہے۔ وہ یہ کہ میرے خط کا فوٹو رسالے میں چھپے۔

ایسے لفظ اردو میں نہیں پائے گئے جن کا پہلا حرف ساکن ہو۔ مثلاً انگریزی کا لفظ سکول، لفظ پروف بھی اس کی مثال ہے۔ سنسکرت میں البتہ ساکن حرف سے شروع ہونے والے الفاظ بکثرت ہیں۔

کیا مینارِ بابل از سرِ نو تعمیر نہ ہوگا؟ آپ کہیں گے یو۔ این۔ او مینار بابل ہی تو ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں ترجمانوں کی آوازیں گوش گزار ہیں۔

آپ کی ملاقات پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی سے ہونی چاہیے تھی۔ گریمر سے کھیلنا ان کا بھی خاص شوق تھا۔ گریمر میں میری دلچسپی اس حد تک ہے کہ گاہے گاہے آپ کو بہلایا کروں۔

اگلا صفحہ آپ کی تفریح اور کوّوں کی تعلیم کے لیے ہے:

چند کثیر الوقوع اغلاط کی تصحیح:-

غلط	صحیح
مجلس برخواست ہوئی	مجلس برخاست ہوئی
خوردو کلاں	خرد و کلاں
بے نیل و مرام	بے نیلِ مرام

KUTABKHANA OSMANIA

روح رواں	روح و رواں
عجوبہ	اُعجوبہ
حرج	ہرج
غیض و غضب	غیظ و غضب
تربیت	تربیت (بغیر تشدید)

(یہ لفظ ربی سے باب تفعیل میں ہے، اس کے مماثل ہیں تزکیہ، تکملہ، تصفیہ وغیرہ)

دو نئے لفظ (ایجاد بندہ)

jet-lag اُڑان خمیازہ

lift- چڑھن کھٹولا

علم بردار بیخودی

12 July, 1994

نعمان صاحب، سلام شوق اور سلام ذوق!

ہنگامہ ہائے خلوت کا پارسل آج روانہ ہو گیا۔ دو تین روز میں آپ کو مل جانا چاہیے۔ اسے پاکستان لے جانے کی آمادگی سے آپ نے میرا جی بہت خوش کیا۔ میں بے حد ممنون ہوں۔ (ترکی میں "ممنون"، "خوش" کا مترادف بھی ہے۔)

ڈاکٹر جالبی صاحب کے نام ایک خط لکھ دیا ہے۔ اسے ملفوف کر دیا ہے۔ اس کی فوٹو کاپی آپ کے ملاحظہ کے لیے ہے۔

مجموعہ غزلیات کا جو حصہ آپ کے پاس نہیں ہے، ستمبر میں آپ کی واپسی کے بعد آپ کو بھیج دوں گا۔ اس وقت آپ پا بہ رکاب ہیں، واپسی کے بعد آپ فراغت سے غزلیں دیکھ سکیں گے۔

انجمن کے احاطہ میں آپ جائیں تو ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو میرا سلام پہنچائیں۔ آپ کی روانگی سے پہلے فون کروں گا۔

ایک غلط جملہ لکھنے کی اجازت دیجیے:۔

"میرا اپنا کہا ہوا شعر مجھے بھول گیا۔"

ضخامت کی وجہ سے مجموعہ اشعار کی دو جلدیں بنوانی پڑیں۔ پیکٹ میں دونوں پیک کر دی ہیں۔

پیکٹ بندھا بندھایا رہے تو بہتر کہ یہ ایک طرح کی Camera Ready copy ہے۔

المخلص

داؤد رہبر

14 July, 1994

نعمان صاحب، تسلیم!

پنڈت نہرو نے سچ کہا تھا "پورب کا کوئی آدمی یورپ میں دو ایک برس رہے تو پھر غریب الوطنی دو

طرفہ ہو جاتی ہے۔ یورپ میں بیٹھا ہو تو پورب کی یاد میں تڑپتا ہے اور پورب میں پہنچ کر یورپ کو ترستا ہے۔" کیا ہم سب کا یہی حال ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ اس حال میں نہیں ہیں۔ غریب الوطنی سے آپ کو سابقہ نہیں۔ آپ کا لڑکپن لندن میں گزرا، طبیعت کی افتاد میں لندن کی یاد بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ معقولات کے ورثے کی بدولت آپ کی طبیعت خرد پسند ہے، جنوں پرور نہیں (البتہ مجنوں لوگوں کو آپ اپنے حلقۂ دوستاں میں شامل رکھتے ہیں۔)

شیخ سعدی شیراز میں ٹک کر کبھی نہ بیٹھے۔ جب واپس آئے تھوڑا سا قیام کر کے پھر نکل گئے۔ طرح طرح کی آب و ہوا دیکھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنیں۔ ہر زمرہ اور طبقہ کے لوگوں سے اختلاط رکھا۔ مسلسل سفر نے یادوں میں وسعت پیدا کی۔ بغداد گئے تو بیگار میں پکڑے گئے۔ اپنی مزدوری کے حال پر اندر ہی اندر ہنسے، گلستاں کے لیے ایک حکایت اور حاصل ہوئی۔

آپ مورخ تاریخ الحکماء ہیں (تجارت الامم نہیں) تجارب الامم سے آپ کی دلبستگی ہے۔ سفر مبارک ہو۔ بسلامت روی و باز آئی۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد سے حکایات جمع کر کے لائیے۔

آپ کے مزاج کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ فارسی ترکیب اضافت کو آپ ہندی ترکیب پر ترجیح دیتے ہیں۔ "اضافت کی ترکیب" کی بجائے "ترکیب اضافت کہا جائے تو آپ خوش ہوتے ہیں، اس لیے میرا یہ مصرع آپ کو پسند آیا۔ ع

ہے غزل ہی قدح میکدۂ کوئے سخن

13 October, 1995

محبی نعمان صاحب!

سلام مسنون بھی اور سلام مجنون بھی۔

اگر سنگت کے لیے اچھا طبلچی یہاں موجود ہوتا تو روز غزل نہ کہنا پڑتی۔ ("کہنی پڑتی" درست ہے یا "کہنا پڑتی؟" کیا فرماتے ہیں علمائے صرف و نحو بیچ اس مسئلے کے؟)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے حبیب (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی) کو جیل سے خط لکھے، ان کا مجموعہ "غبار خاطر" کہلایا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حبیب نے جواب لکھے یا نہیں اور لکھے تو وہ کیا ہوئے۔ "پاس خاطر" کے عنوان سے وہ چھپ جاتے تو تشفی ہوتی۔

اختر شیرانی جو راقم کے ہم نام یعنی داؤد خاں شیرانی تھے، اپنی سلمٰی کو عاشقانہ خط لکھا کرتے تھے، عاشقانہ نامہ نویسی کا ایک اسلوب انہوں نے ایجاد کیا۔ "ادھر" سے جواب بھی انہوں نے خود ہی قلمبند کیے۔ میرزا غالب کی کہی ہوئی بات پوری کر دی ع

ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

رسالہ "رومان" اختر اور عاشق بٹالوی صاحب مل کر نکالتے تھے۔ عاشق صاحب کے چھوٹے بھائی خادم حسین بٹالوی پولیس میں نوکر تھے۔ ایک روز بھائی سے ملنے "رومان" کے دفتر پہنچے۔ دفتر میں اس وقت کوئی تھا نہیں، بیکار بیٹھے بیٹھے انہوں نے ڈیسک کا دراز کھولا تو اختر و سلمٰی کے خطوط کا مسودہ اس میں دکھائی دیا۔ انہیں ورق

KUTABKHANA OSMANIA

گردانی کرتے ہوئے خیال آیا، کیوں نہ اسے گھر لے جا کر اس کی نقل تیار کی جائے۔ (اُن دنوں فوٹو کاپی کے سلسلے نہ تھے) چرا کر گھر لے گئے۔ دو دن میں اسے نقل کرا لیا اور مسودہ واپس اس دراز میں جا رکھا۔ خادم حسین صاحب ہی کے اعتناء سے وہ کئی سال بعد شائع ہوا۔

قیاس ہے کہ رہبرؔ نعمان کے خطوط بھی ایک دراز سے چرا کر کوئی محفوظ کر لے گا اور چھپوا کر ادیبوں کے سامانِ تفریح میں اضافہ کرے گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ادبیات کے مصر ہیں۔ انہیں کیسے بتاؤں کہ دینیات پر قلم اُٹھانا کس طرح کی آزمائش ہوتا ہے۔ ایک سرسری گفتگو میں میرے دو تین ریمارک سن کر انہوں نے فرمایا، انہیں میرے لیے قلمبند کر دیجیے۔ اس کی تعمیل کو ''تسلیمات'' کا ایک شمارہ تیار کیا گیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

آپ کے سحر و شام کی چہل پہل کی
دُعا کرنے والا فقیر
داؤد رہبرؔ

30 November, 1995

محبی نعمان صاحب!

السلام علیکم! لیجیے اب کے ایک ایسی نگارش آپ کو بھیجی جا رہی ہے جو ساری کی ساری صرف و نحو کے بارے میں ہے، تفریحاً تیار ہوئی۔

پطرسؔ بخاری اور ڈاکٹر محمد دین تاثیرؔ نے مل کر ایک سلسلۂ مضامین آج سے ساٹھ سال پہلے شروع کیا تھا جو چند ماہ ایک تحریک بن کر جاری رہا۔ اس تحریک کے شرکاء اپنے آپ کو نیاز مندانِ لاہور کہتے تھے۔ مجھے آپ ان کا خلیفہ سمجھ لیجیے۔

خلیفہ پنجاب میں حجام کو بھی کہتے ہیں، فلورڈا کی تنہائی میں میں صرف اپنا حجام ہوں، اپنے بال خود تراشتا ہوں۔

میرا ایک شاگرد ۱۹۶۵ء میں کابل گیا تھا۔ کلیاتِ بیدل کی چاروں جلدیں میرے لیے خرید کر لایا۔ تف ہے مجھ پر اگر چند ماہ اس کا مطالعہ نہ کروں۔

اقبالؔ کے مرشد تھے مولانائے روم۔ غالبؔ کے مرشد تو میرزا بیدلؔ ہی تھے۔ کیسی آفاقی وسعتیں ہیں بیدلؔ کی حیات اور ان کے آثارِ قلم میں! افسوس ہمارے ہاں ان کی یاد تازہ نہیں رکھی گئی۔

25 January, 1996

نعمان صاحب!

سلام بھی اور تسلیم بھی۔ بابِ تفاعل سے ایک لفظ ہم نے بنایا ہے۔ ''تلافن'' اسم فاعل اس سے ہوگا متلافن۔ میں آپ سے متلافن تو ہوتا ہی رہتا ہوں لیکن رسمِ مکاتبت بھی مجھے عزیز ہے، نصف الملاقات بزرگوں نے مکاتبت ہی کو کہا ہے۔

مکتوب میں روئے سخن جمہور کی طرف نہیں ہوتا بالخصوص مرسل الیہ کی طرف ہوتا ہے۔ تصنیفوں اور مقالوں میں روئے سخن زید، عمرو، بکر سب کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی تاثیر ویسی نہیں ہوتی جیسی مکتوب کی ہوتی ہے۔

میرا روئے سخن تو ان سطور میں خصوصاً آپ کی طرف ہے۔ اپنی خبریں کیا لکھوں۔ وارداتِ قلبی کی خبریں آپ کو تازہ غزلوں سے مل جائیں گی۔

سویرے کافی کا پہلا فنجان گھر میں پیتا ہوں۔ دوسرا میکڈانلڈ کے اُس ریستوراں میں جو گھر کے قریب ہی ہے۔ وہاں دیوار سے جڑا ہوا جو تختہ میز کا کام دیتا ہے، اس پر تال دے کر صبح کی کوئی راگنی چار پانچ منٹ گاتا ہوں۔ اس تختے سے گمک خوب نکلتی ہے۔ آپ آئیں تو یہ گمک سن کر خوش ہوں گے۔ گاہے گاہے وہاں غزل گوئی بھی ہو جاتی ہے۔ گھر آ کر تھوڑی بہت نثر نگاری بھی ہو جاتی ہے۔ کوئی مضمون مکمل ہوتا ہے تو اس کی کاپی آپ کو بھیج دی جاتی ہے۔

نصف الملاقات ہو چکی، پوری ملاقات ان شاء اللہ فروری کے آخر یا مارچ کے شروع میں ہوگی، اربابِ دانشگاہ کی باتیں ہوں گی اور منقولات و معقولات کی بھی۔

خیر طلب
داؤد رہبر

6 February, 1996

نعمان صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کے ساتھ فون کی گفتگو میں مناظروں کا ذکر آیا تو اس کے بعد میں سوچتا رہا کہ مناظروں کے قصے کہاں ملیں گے۔ اگر آپ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کے اشاریوں میں ملاحظہ فرمائیں تو میرا اندازہ ہے کہ آپ کو بہت سے حوالے مل جائیں گے۔

ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان سے باہر علمائے اسلام کے مناظرے مجوسیوں، نصرانیوں اور یہودیوں سے اوائلِ اسلام ہی میں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جانبین ایک دوسرے کے موقف سے واقف ہو گئے اور یہ بھی جان گئے کہ مقابلہ سخت ہے اور اپنی اپنی دُھن کے دونوں پکے ہیں۔ پہلے تجسس تھا، واقفیت ہو گئی تو مباحثہ سے دونو طرف کنارہ کشی اختیار کی گئی۔ اسلامی ملکوں میں یہودی اور مسیحی اقلیت ہو کر رہ گئے تو پیہم مناظرہ گرم رکھنا مصلحت کے منافی ہو گیا۔ چپ رہنے ہی میں خیر نظر آئی۔

اہلِ ایران دینِ زرتشی کی مدافعت جم کر نہ کر سکے۔ یہ مذہب ساسانی بادشاہوں کا مذہب تھا۔ یہ جب زدہ ہوا تو اس کے پیروؤں نے اس کے احیاء کی کوشش نہ کی۔ آتشکدوں کے پروہت (موبد) مقدس آگ کو اپنے حال پر چھوڑ کر ہندوستان کی طرف بھاگ گئے۔

ایران کا مجوسی مذہب مسیحیوں کی سازش سے پیدا ہوا۔ اس میں مانوی اور مسیحی خیالات مخلوط تھے۔ مجوسیوں کا دھڑا مضبوط نہ تھا۔ ان کی تبلیغ خفیہ قسم کی تھی۔ مناظرہ سے یہ بھی بچ کر ہی رہتے تھے۔

اشاعتِ اسلام کا مقابلہ بھارت میں ہندومت سے اور شمالی افریقہ میں مسیحیت سے ہوا۔ زیادہ سخت

KUTABKHANA OSMANIA

امام الدین رام نگری ہے۔

اپنی اپنی جگہ ہر ملت کے حامیوں کو مدافعت کے لیے کمر بستہ رہنا پڑا۔ کوئی ملت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے اور ہوش اُڑ جائیں۔ کلیسا والے جب ہندوستان پر قابض ہو گئے تو قدرت نے ایک طرف تو سر سید کو پیدا کیا اور اُدھر راجا رام موہن رائے کو، دونوں اپنے اپنے قافلوں کے سالار تھے۔ آگے چل کر اُدھر گاندھی جی میدان میں آئے اور اِدھر حکیم الامت ع

ہر کے رابہر کارے ساختند

چورن کو عربی میں مصلح کہتے ہیں۔ اصلاح احوال کے لیے مصلحین آتے ہی رہیں گے اور چورن کے نئے نئے نسخے ایجاد ہوتے رہیں گے۔

کل یوم ھو فی شان

اپنے آپ سے متوحش

داؤد رہبر

24 December, 1996

صاحبِ ذوقِ سمفنی نعمان صاحب!

السلام علیکم! ایک سمفنی ایسی بھی ہونی چاہیے جس کے ساتھ طنبورہ بجے۔ Drone کے معنی مولوی عبدالحق صاحب کی ڈکشنری میں درج ہیں۔ بھنبھنانا، ہائم کی انگریزی فارسی لغت میں وزوز، ایک انگریزی عربی لغت میں ونDنہ اور طنین۔

شام ہوا آ گئی اور آپ نہیں آئے۔ یہ شام تو پینے کی شام ہے۔ شامپین کی شام ہے۔

مکاتیب کی کتاب بھیج رہا ہوں۔ اعراب کے نہ لگنے کے باعث کئی لطائف کی لطافت جاتی رہی۔

ایک صحت نامہ تیار کر کے دوستوں کو بھیجوں گا۔

حج اکبر کا متمنی

داؤد رہبر

31 January, 1997

نعمان صاحب!

السلام علیکم! میں سحر خیز آدمی نہیں ہوں۔ آج البتہ جلدی اُٹھ بیٹھا۔ اندھیرا رفتہ رفتہ دور ہو رہا ہے۔ نور کا ظہور ہو رہا ہے۔ آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

آپ کے محسوسات کا مجھے اندازہ ہے۔ اگست میں آپ نے سامان ٹرک پر لدوایا اور فلاڈلفیا میں اتروایا۔ وہاں کی سکونت میں سکون نہ آیا۔ اب واپسی کے آثار ہیں۔ نقل و حمل کی صورت پھر درپیش ہے لیکن آپ جوان اور جواں ہمت ہیں۔ یہ سمجھ کر مسکرایئے کہ پروردگار نے آپ کو جھولنا جھلایا ہے۔ ان شاء اللہ ستمبر میں آپ اپنے سابقہ مستقر کو پہنچ کر آرام کی زندگی گزاریں گے اور اچھے طلبہ کی کلاسوں کو پڑھائیں گے۔

میرے ہاں روز و شب کے اوقات کی تقسیم کچھ ویسی ہی ہو گئی ہے جیسی چرند پرند کی ہوتی ہے۔ چرند

مقابلے یہی تھے۔ ہندوؤں میں گوشت خوری سے پرہیز تھا۔ مسلمان مبلغوں نے سوچا کہ اگر انہیں مسلمان کیا تو یہ گوشت کھانے لگیں گے اور جنگجو ہو جائیں گے۔ ہندوؤں کا اپنا دھرم تھا بھی سخت جاں۔ چنانچہ ہندوستان کی صورتِ حال مستثنیٰ رہی۔ آٹھ سو سال کی اسلامی حکومت کے باوجود ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں ہی کی رہی۔ جتنا قبول اسلام وہاں ان صدیوں میں ہوا صوفیاء کے حسنِ اخلاق کے اثر سے ہوا نہ کہ مناظروں سے کسی کو قایل کر کے۔ پنڈت اور مولوی کے مناظرے انیسویں صدی میں آ کر ہوئے۔ جب مغلوں کی سلطنت کا زوال ہو چکا تھا اور اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا تھا۔

ایشیا کے بعض علاقوں میں بدھ مت بھی مسلمان مبلغوں کو درپیش ہوا۔ یہ مقابلہ آسان نکلا۔ اس مذہب کے پیرو کسی دیوتا کے نام لیوا نہ تھے۔ اسی لیے بدھ مت تو ہندوستان میں بھی اپنے حریف (ہندومت) کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چین اور جاپان میں بدھ مت نے وہاں کے دیسی مذاہب سے شادی کر کے گھر بسایا۔ یہ مت لڑنت کبھی نہ ہوا اور دوسرے مذاہب سے آمیختہ ہوئے بغیر کہیں زندہ نہ رہا۔ اس کے منیوں کے مناظرے چین اور جاپان کے روحانی پیشواؤں سے ہوئے، مسلمان مبلغوں سے نہ ہوئے۔

نصاریٰ کے جن عقاید کا ابطال دینِ اسلام کو منظور تھا، وہ تو قرآن مجید ہی میں صراحت سے ہو گیا۔ عقاید کے مسائل بر طرف قرآن مجید میں زیادہ احتجاج اس زمانے کے یہود اور نصاریٰ کی منافقت کے خلاف ہے۔ اسلام کی فتح یابی ایسی تیزی سے ہوئی کہ رُو در رُو مناظرہ کی نوبت ہی نہ آئی۔

مصر کے پروفیسر محمد ابوزہرہ نے حیاتِ ابن حزم میں لکھا ہے کہ ابن حزم کی کتاب الفصل فی الملل والا ھواء والنحل میں یہود اور نصاریٰ کے عقاید کی تردید جا بجا بدلایل کی گئی ہے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصر کے مولانا شبلی ہیں بلکہ مولانا سے بڑھ کر ہیں۔ ان کی وسعتِ علم کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ فقہ اور علم الکلام میں ان کی تصنیفیں بھی بہت ہیں۔ ان کی کتاب ''المذاہب الاسلامیہ'' کا اُردو ترجمہ میرے پاس ہے۔ نہایت معقول اور روادار آدمی ہیں۔ قاہرہ کی فواد یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس بات سے آگاہی ہوئی کہ معتزلہ کا بڑا کام یہود اور مجوس اور نصاریٰ کے مقابلے میں حمایتِ اسلام کا تھا اور عباسیوں کے زمانے میں معتزلہ نے مناظرہ کر کے مسیحی علماء سے ٹکر لی اور ان سے مباحثہ کی ضرورت ہی سے خلق القرآن کا اثبات کیا۔ مسئلۂ خلق القرآن کا واسطہ اس مناظرہ سے کیا تھا۔ یہ اس کتاب کی ایک عبارت میں سمجھایا گیا ہے۔ اس عبارت کی فوٹو کاپی میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

مولانا شبلی کے قلم پر برٹش راج کی وجہ سے قدغن تھی۔ اس کے باعث وہ محتاط رہے اور ''علم الکلام'' میں انہوں نے یہود و نصاریٰ سے اسلامی علماء کے مناظروں کا قصہ نہیں چھیڑا۔

ہندو، مسلم، مسیحی مثلث کے مناظرے انیسویں صدی میں خوب خوب ہوئے۔ ان کا لٹریچر ہندوستان میں ڈھیروں مل جائے گا۔ ان مناظروں کی سپرٹ تفنن کی تھی۔ سامعین کا مجمع انتہائی حیرت کے ساتھ پنڈت، مولوی اور پادری کے سوال جواب سنتا تھا۔

تحریر میں ہندوؤں کی طرف سے اسلام پر اعتراض سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں کیا۔ یہ کتاب ہندوؤں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے ترجمے ہندوستان کی سب زبانوں میں ہوئے۔ اس کتاب کا جواب بنارس کے ایک مسلمان مبلغ نے اپنی تین چار تصنیفوں میں دیا۔ ان صاحب کا نام ابو محمد

KUTABKHANA OSMANIA

اس لیے کہ اب روزانہ تندرستی کے لیے تھوڑا سا سلاد چرتا ہوں، پر نداس لیے کہ غزل کہتا ہوں۔

کل شام ایک دولت مند ہندو ڈاکٹر کے ہاں استاد سلامت علی خاں کے فرزند شرافت علی خاں ایک گھریلو بیٹھک میں گائیں گے۔ چند برس پہلے بوسٹن یونیورسٹی میں سلامت علی صاحب کے گانے کا ایک جلسہ ہم نے کرایا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے تین بیٹوں کے ساتھ مل کر گایا تھا۔ اب خاں صاحب ضعیف ہو گئے ہیں۔ شرافت علی اب ان کے جانشین ہیں۔ راگ سرائی میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

ان کے ساتھ جولز کا طبلے پر سنگت کرے گا، اس سے پچھلے ہفتے تعارف ہوا۔ اس کا باج سن کر اس کی لیاقت کا اندازہ ہو گا۔ اس کی سکونت میامی میں ہے۔

ایک تازہ غزل ارسال ہے۔ اس کے دوسرے شعر میں خطاب آپ سے ہے۔

براؤن یونیورسٹی سے تقرر نامہ جونہی آپ کو ملے، مجھے خوش خبری دیجیے گا۔

والسلام

خیر طلب

راہرو

(رہبر لکھتے ہوئے شرم آتی ہے)

8 December, 1997

نعمان صاحب، السلام علیکم!

آپ کے اور میرے درمیان القاب کے تکلف نہیں ہیں۔ میں انگریزی میں لکھا ہوا یہ مضمون جس حال میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ یہ اعراب کے تکلف سے بھی مبرا ہے۔ مقصد بہر حال ابلاغ ہے۔

انڈیانا کی کانفرنس میں سب حضرات سلسلۂ ماسی نیوں کے صوفی تھے۔ وہاں ارادت کا اظہار مناسب تھا۔ تاہم محتاط رہ کر میں نے تھوڑی سی معروضیت وہاں عرض کر ہی دی۔ آپ اسے پڑھ چکیں تو فون پر گفتگو ہو۔

خاک نشین جنوب

ریگ نشینِ ساحل

19 December, 1997

نعمان صاحب!

السلام علیکم! آج ''اخبار الحلاج'' کا عطیہ موصول ہوا۔ جزاکم اللہ، ایک مضمون اس عنوان سے لکھ کر مجھے علی گڑھ بھیجنا ہے:- ''پروفیسر ماسی نیوں کی وابستگی حلاج کی روح سے۔'' ''یادگار نامۂ قاضی عبدالودود'' کے عنوان سے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ تیار ہو رہا ہے۔ اس کے لیے اس کے مدون نے مجھ سے ایک نگارش کی فرمائش کی تو میں نے یہ عنوان انہیں لکھ بھیجا۔

پروفیسر حق اور ڈاکٹر حق تو امریکی محاورہ ہے جیسے پولا عبدل' اصل میں تو آپ نعمان الحق ہیں۔ نعمان کے معنی خون کے ہیں۔ آپ کی رگوں میں سچائی کا خون ہے اور آپ کی سیرت، سیرت النعمان ہے۔

ایک نعرہ جو منصور کو نہ سوجھا اب مجھے سوجھا ہے۔ یہ آپ سے یگانگی کا اعلان ہے:-

الحق لی، یعنی حق میرا ہے

اورینٹل کالج (لاہور) کے پروفیسر عالمگیر صاحب نے چاہا کہ میں انہیں ایک خط لکھوں جس میں غزل اور قافیہ پر خیال آرائی ہو۔ میں نے ان کا جی بہلانے کو دو خط لکھے۔ دونوں کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔

ناحق

29 January, 1998

نعمان صاحب!

السلام علیکم! اگر آپ فرانسیسی سے بلد ہیں تو گارساں دتاسی کا ترجمہ' آثار الصنادید آپ کے کام آئے گا۔ مولوی شبلی نعمانی نے آرنلڈ صاحب سے فرانسیسی سیکھی، بندہ اس زبان سے نابلد ہے۔

اعجاز بٹالوی صاحب کا تبصرہ ''دشت سوس'' پر دیکھیے۔ مجھے بہت معقول لگا۔

''حیاتِ جاوید'' کے وہ صفحے فوٹو کر کے بھیج رہا ہوں جن پر آثار الصنادید کا ذکر ہے۔

آپ کی تقریب کی تاریخیں معلوم ہوں تو میں انہی دنوں میں بوسٹن آنے کا تہیہ کروں۔

متقاعد

داؤد

18 February, 1998

نعمان صاحب!

السلام علیکم! میرا انگریزی والا مقالہ تو آپ پڑھ چکے ہوں گے۔ اب اُردو والا مقالہ حاضر ہے۔ اسے آپ پڑھ لیں تو گفتگو کا بہانہ ہو جائے۔ اس بہانے مئے گلفام کا ایک پیمانہ ہو جائے گا۔

ایم آئی ٹی کی تقریب کی تاریخیں مقرر ہو چکی ہوں گی۔ فون کر کے دریافت کروں گا اور کوشش کروں گا کہ میں بھی انہی دنوں وہاں پہنچوں، اسے توارد کہیں گے۔

(باقی پھر) توسین میں ''باقی پھر'' کا اندراج پرانے رسالوں میں آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ کوئی مضمون باقساط چھپتا تو اگلی قسط کا وعدہ اس ترکیب سے کیا جاتا تھا۔ ''ساقی پھر'' کے معنی ہوں گے۔ ساقی جام خالی ہو گیا، پھر اسے بھر دے۔

ہماری آپ کی گفتگو فون پر باقساط ہوتی ہے۔ انہی دنوں کسی شام ہو گی۔

کیا ضروری ہے کہ اپنا نام لکھوں؟

10 April, 1998

نعمان صاحب، تسلیم!

اس مضمون کے صفحہ نمبر ۲۷ پر ''نے'' کے استعمال کی سند ملاحظہ ہو۔ سند بھی کس کی؟ بہادر شاہ ظفر کی۔

ہم نے جو بات ثابت کرنی تھی، کر دکھائی۔

۲۸ کی شام بوسٹن میں آپ سے ملاقات کہاں ہو گی، اس کا فیصلہ فون پر ہو گا۔

بڑی بی پاکستان میں رونق افروز ہوئیں، اخبار کا ایک ورق بھیج رہا ہوں۔

KUTABKHANA OSMANIA

لکھنو کی غزل کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

وعدہ آنے کا جو فرمایئے گا
دیکھئے اب نہ بدل جایئے گا
ایسی گھر جانے کی جلدی کیا ہے
بیٹھیے، جایئے گا، جایئے گا

خواہانِ مشافہہ

2 May, 1998

نعمان صاحب، تسلیم!

اقبال کی ابلیس دوستی پر آپ کا لیکچر کئی سال پہلے سنا تھا۔ بڑی بی نے صدارت فرمائی تھی۔ میں بھی وہاں حاضر تھا۔ بعد لیکچر کے سامعین میں سے ایک پاکستانی بزرگ نے سوال اُٹھایا کہ اگر شیطان دراصل ترغیبِ گناہ کی قوت کا نام ہے تو پھر ان قصوں کا کیا کریں جن میں وہ انسانی صورت میں متصور ہو کر کسی سے مخاطب ہوتا ہے۔ میں نے کچھ کہنے کی خواہش سے ہاتھ اُٹھایا تو سائل نے ٹوک دیا اور کہا، میرا سوال آپ سے نہیں پروفیسر شمل سے ہے۔ بڑی بی نے فتویٰ دیا: ''عارفوں کے عندیے میں تو شیطان ایک قوت ہی کا نام ہے۔ البتہ سادہ لوحوں کے لیے اس کی تجسیم کی ضرورت ہوئی۔'' یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا، شیطان کے قصوں کی عارفوں اور شاعروں کو بھی ضرورت ہے۔ یہ قصے نہ ہوں تو لطف ہی جاتا رہے۔ کسی شریر بچے کی شرارتیں دیکھ کر ہم پنجابی میں پیار سے کہتے ہیں۔ ''بڑا شیطان اے'' یا اردو میں کہیں گے۔ ''ارے شیطان'' چھیڑ والے ایسے اظہار کو کلام اور فقہ اور تصوف کے مسایل سے کیا واسطہ!

بڑی بی میری بات سن کر چپ رہیں۔ میری بات کاٹی نہیں۔ یہ روداد مجھ کو یاد رہی، اس کی داد دی جائے۔

اب کے آپ کا دوسرا لیکچر سنا۔ ایک احتیاط طلب اور نازک موضوع پر آپ نے حکمت اور معروضیت کے ساتھ تقریر کی۔

وہ بی بی جس نے پوچھا کہ آپ نے سینوں کے ذکر کو لیکچر میں شامل کیوں نہ کیا، کیا یہ وہی ہے جس کے امریکی شوہر کیمسٹری کے ماہر ہیں اور جس کا فلیٹ بیکن روڈ پر ہے؟ آپ ایک شام مجھے وہاں لے گئے تھے اور مجھے مخمور کر کے آپ نے رات کے دو بجے ڈورچسٹر پہنچایا تھا۔

عاشق صاحب پکار اُٹھے تھے۔ ''ہمیں تو شعر نے بچالیا۔'' آپ کے ہاں کیمیا (علی بلی ناس) بھی ہے اور شعر بھی۔

یہ شعر آپ نے سن رکھا ہوگا

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

القفطی کی ''تاریخ الحکماء'' میں ابلوس نیوس النجار کا تذکرہ بھی ہے۔ کیا بلی ناس اسی نام کی ایک دوسری شکل ہے؟

ناتواں

12 May, 1998

نعمان صاحب، تسلیم!

تمدن کی ستم ظریفیاں بے شمار ہیں۔ ایک ان میں سے یہ ہے کہ پرندے تو چہچہا کر بہار منا رہے ہیں لیکن احاطۂ دانشگاہ میں یہ امتحانات کا موسم ہے۔ بہاراں میں آزمایش تو قد و گیسو سے ہونی چاہیے۔

میں جانتا ہوں کہ ممتحن ہونا خود ایک امتحان ہے۔ جوابات کی نیلی کاپیوں کے ڈھیر سے سابقہ مجھے بھی رہ چکا ہے۔ اسی سے تنگ آکر میں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔

ایک مضمون آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ یہ آج رسالہ ''علامت'' کے لیے لاہور بھیجا جا رہا ہے۔ جی چاہا کہ ایک فوٹو کاپی اس کی آپ کو بھی بھیج دوں۔

فون کر کے آپ سے پوچھوں گا کہ اب کے گرمیوں کی سرگرمیاں کیا ہوں گی۔ سفر ہوگا یا حضر؟

27 November, 1998

نعمان صاحب، السلام علیکم!

میرا نصیب اچھا نکلا کہ اب کے اکیڈمی کا اجلاس ادھر دکن میں ہوا اور پھر آپ نے ہمت کی۔ مقامِ اجلاس سے سیدھی واپسی کی بجائے ادھر سے ہو کر واپس جانا منظور کیا۔ آپ نے میرا سنیاس آشرم بھی دیکھا۔ اور فلورڈا کی زمین سے آسمان کی وسعت بھی دیکھی۔ ملاقات بہت ہی مختصر رہی۔ اُمید ہے آیندہ جب آپ آئیں گے تو ایسی بھاگڑ نہ ہوگی۔

آپ کی تقریر والا فیتہ بھیج رہا ہوں۔ باقی دو تقریروں کی کاپی بھی میں نے کر لی۔ انہیں پھر غور سے سنوں گا۔ اتفاق کی بات ہے پچھلے دنوں بوسٹن میں، میں نے نجات اور نروان پر لیکچر دیا۔ یہ موضوع آپ کے مذاکرے کے موضوع سے غیر متعلق نہیں۔

باقی باتیں فون پر ہوں گی۔

بندہ

داوٗر رہبر

25 February, 1999

نعمان صاحب!

السلام علیکم، آپ مراجعت کی سوچ میں کیوں پڑ گئے۔ ترکِ ہجرت کا فیصلہ عجلت میں نہ کیجیے گا۔ مکے اور مدینے کے درمیان جو ہجرت ہوئی تھی وہ تو گھر کی بات تھی۔ وہ بھی عرب، یہ بھی عرب اور فاصلہ دو شہروں کے درمیان صرف دو سو میل کا۔ فلاڈلفیا اور کراچی کے درمیان فاصلہ ہے دس ہزار میل کا۔

آپ جس شعبہ میں پڑھاتے ہیں، اس کا مرتبہ بلند نہ سہی لیکن اس یونیورسٹی کی حیثیت خاصی ہے۔ بعض شعبے اس کے ممتاز بھی ہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ رزق کا پیمانہ معقول ہے۔ قسمت کی یاوری سے یہیں امریکہ میں آیندہ بہتر صورت نکل آئے تو بہترین بات ہے۔

آپ کہیں گے خط لکھنے والا خود غرض ہے۔ سوچ رہا ہے نعمان صاحب چل دیے تو ''تلافن'' ختم ہو

KUTABKHANA OSMANIA

جائے گا۔ تففن میں کمی ہوگی۔ یہ سچ ہے لیکن میرے تردد کی یہی ایک وجہ تو نہیں۔

آپ نے اس ملک میں اپنا مقام بڑے مجاہدہ کے بعد بنایا ہے۔ اس کو تیاگ کر لاہور کی کسی کرسی پر جا بیٹھنا بہت بڑا اقدام ہوگا۔ تمنا کا دوسرا قدم، وہاں ایک نیا مجاہدہ شروع ہو جائے گا۔

نہایت ممکن ہے کہ وہاں کی کسی دانشگاہ کے ارباب اس نیت سے آپ کو کرسیٔ درس پیش کریں کہ اس کو امریکہ سے تو اکھاڑو، کورٹ شپ کے احوال اور ہوتے ہیں اور ازدواج کے اور۔

ایک مثال دیتا ہوں، پنڈت نہرو نے چاہا کہ بڑے غلام علی خاں صاحب پاکستان چھوڑ کر بھارت کے شہری بن جائیں۔ پاکستان کی ناقدری سے خاں صاحب نالاں تھے ہی، بددل ہو کر بھارت چلے گئے۔ وہاں ان کے حاسدوں نے انہیں خوب ستایا۔ شہریت کا پروانہ حاصل کرنے میں انہیں بے حد دشواریاں پیش آئیں۔

میرے دو بڑے بھائی امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھے۔ محمد اسحاق صاحب انڈیانا یونیورسٹی میں تشریح الابدان پڑھاتے تھے۔ محمد یعقوب صاحب اوہائیو یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر تھے۔ بھائی اسحاق صاحب کو پاکستان میں میڈیکل ریسرچ کے ایک نئے ادارے کی سربراہی پیش کی گئی۔ یہ اڑ کر وہاں پہنچے۔ میٹنگ ہوئی تو عملے کے تیور دیکھ کر انہوں نے جی میں کہا، الامان الحفیظ۔

بھائی یعقوب صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پیش کش ہوئی۔ یہ بھی اڑ کر گئے۔ وہاں صدر شعبہ نے ایک ہی ملاقات میں ایسے رنگ دکھائے کہ بھائی صاحب توبہ توبہ کہتے ہوئے مطار کی طرف بھاگے۔

آپ کی غیر معمولی قابلیت کو دیکھ کر وہاں کے رفقائے کار آپ سے حسد نہ کریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے اور پھر مفتیوں کی گھاتوں کا خیال بھی رہے۔ وہاں کی کلاسوں میں ان مفتیوں کے مرید موجود ہوتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں ہوا تھا۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔

آپ جس یونیورسٹی میں تقرر کے خواہشمند ہیں۔ اس کا احاطہ بے شک امریکی نمونے کا ہے لیکن اس میں اساتذہ اور طلبہ کے طبقے دو ہیں۔ شریعت کے پاسبان اور جدیدیت کے نگہبان، غرض یہ کہ وہ احاطہ سیاست سے مامون نہیں۔

میں پروفیسر غزالہ عرفان کو یہ تجویز بڑی خوشی سے لکھ بھیجوں گا کہ وہ آپ کو پروفیسر قادر میموریل لیکچر کے لیے مدعو کریں۔ یہ لیکچر دسمبر کے آغاز میں ہر سال ہوتا ہے۔ اگر وہ آپ کو بلائیں تو آپ ان سے مل کر رابطہ قائم کریں۔

یہ بات سوچ کے کیجیے گا فیصلہ کہ وہاں
مشاعرہ تو بہت ہے مشاہرہ کم ہے

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

11 October, 1999

نعمان صاحب، السلام علیکم!

تقریر اب تحریر کی شکل میں ارسال ہے۔ میر صاحب نے چاہا تھا کہ تقریروں کی صوت بندی (ریکارڈنگ) ہو جائے۔ معاونین نے لاپروائی سے کام لیا۔ میر صاحب کی خواہش پوری نہ ہوئی۔

سابق میں آپ شاید صرف مزار اقبال پر فاتحہ پڑھنے لاہور گئے ہوں گے۔ امید ہے اب کے آپ داتا گنج بخشؒ کی درگاہ پر بھی حاضری دیں گے۔ تیسری بڑی درگاہ وہاں حضرت میاں میرؒ کی ہے۔ یاترا کی تکمیل کے لیے وہاں جانا بھی ضروری ہے۔ محرم کے مہینے میں آپ وہاں جائیں تو ذُلدُل کو ہاتھ لگانے کا موقع بھی ملے۔

داتا صاحبؒ کے عرس میں بہترین قوالی سنی جا سکتی ہے۔ خواجہ نظام الدینؒ اور خواجہ اجمیرؒ کے عرسوں میں قوالیاں بھی ہوتی ہیں اور خیال گائیکی اور دھرپد گائیکی بھی۔ جہاں تک میرا علم ہے شیخ احمد سرہندیؒ کی برسی میں موسیقی باریاب نہیں ہوتی۔ فنافی اللہ اور بقاباللہ کا یہ فرق خوب ہے۔

نہ رند نہ زاہد

بندۂ درگاہ

بے ننگ و نام

20 October, 1999

نعمان صاحب!

السلام علیکم! ''تسلیمات'' کے بیس سے زیادہ شمارے ایک زمانے میں دوستوں کو بھیجے گئے۔ اسی عنوان سے اب اردو میں ایک اور سلسلہ مضامین کا لکھنے کی نیت ہے۔ یہ مضامین لاہور کے رسالہ ''علامت'' کے لیے لکھے جائیں گے۔

ہر شمارے کے سرورق پر میرزا داغ کا یہ شعر چھاپا جائے گا

سر نیاز سلامت رہے پئے تسلیم
نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا ہے

میں نے یہ شعر جب آپ کو سنایا تھا تو دوسرا مصرع یوں پڑھا تھا:-

خبر نہیں ہے مجھے دیر کیا ہے حرم کیا ہے

میرے حافظے نے غلطی کی تھی۔ کچھ شک رہا، آج دیوان داغ دیکھا تو صحیح مصرع معلوم ہوا۔

زاویہ نشین

26 February, 2000

نعمان صاحب!

السلام علیکم! مولانا اشرف علی تھانوی نے اولیاء کے دو تذکرے اپنی تالیف حکایاتِ اولیا میں شامل کیے ہیں: امیر الروایات از حضرت امیر شاہ خاں صاحب اور روایات الطیب از مولانا قاری محمد طیب صاحب۔ بلا استثنیٰ ہر حکایت پر مولانا اشرف علی نے حاشیہ چڑھایا ہے۔

امیر الروایات سے ایک حکایت کی نقل میں آپ کو بھیج چکا ہوں۔ اس سے مولانا فضل حق اور مومن خاں کی ہم نشینی سامنے آئی۔

امیر الروایات ہی سے ایک اور حکایت کی نقل ملاحظہ ہو۔ اس سے انا الحق کی ایک خیال افروز تاویل

KUTABKHANA OSMANIA

معلوم ہوئی:-

خواجہ احمد جام مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ ایک عورت ان کی خدمت میں اپنے ایک نابینا بچے کو لائی اور عرض کیا کہ اپنا ہاتھ اس کے منہ پر پھیر دیجیے اور اس کی آنکھیں اچھی کر دیجیے۔ اس وقت آپ پر شانِ عبدیت غالب تھی۔ اس لیے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ اس نے اصرار کیا مگر آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ غرضیکہ تین چار مرتبہ یوں ہی رد و بدل جب آپ نے دیکھا کہ وہ مانتی ہی نہیں ہے تو آپ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ یہ کام تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ وہ اندھوں اور مبروصوں کو اچھا کرتے تھے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ الہام ہوا تو کون اور عیسیٰ کون اور موسیٰ کون۔ پیچھے لوٹ اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر۔ نہ تم اچھا کر سکتے ہو نہ عیسیٰ مامی کنیم۔ آپ یہ سن کر لوٹے اور مامی کنیم مامی کنیم فرماتے جاتے تھے اور جا کر اس کے منہ پر ہاتھ پھیر دیا اور آنکھیں اچھی ہو گئیں۔ یہ قصہ بیان فرما کر مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ احمق لوگ یوں سمجھا کرتے ہیں کہ یہ مامی کنیم خود کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا قول نہیں ہوتا وہ حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے جیسے جب کوئی کسی گویّے سے کوئی عمدہ شعر سنتا ہے تو اس کو اپنی زبان سے بار بار دہراتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ اسی طرح وہ اس الہام کی لذت سے حق تعالیٰ کا ارشاد ''مامی کنیم'' بار بار دہراتے تھے۔

(''حکایاتِ اولیاء'' دارالاشاعت۔ کراچی۔ غیر مورخہ، صفحہ ۲۴۹)

اس عبارت کے آخر میں ایک جملہ ہے۔ ''وہ حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے۔'' اس پر مولانا اشرف علی کا حاشیہ بس اتنا ہے:-

''منصور حلاج کی سب سے اچھی تاویل یہی ہے۔''

خیر طلب

بے نام

28 March, 2000

نعمان صاحب!

السلام علیکم، تین دن کراچی میں اور تین دن لاہور میں قیام کیا۔ وہ منطقہ تو اللہ نے قیلولے کے لیے پیدا کیا اور میرا یہ حال کہ قیلولہ تو کیا قعود بھی اب کے کم ہی نصیب ہوا۔ اپنے برادر محمد ایوب اور اپنے دوست وجیہہ الدین احمد کی عیادت اولیٰ تھی، یہی مرضیٔ مولیٰ تھی۔

آصف صاحب نے اکبر معصوم کا فرمودہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔ اس کا ایک نسخہ انہوں نے مجھے بھی عطا کیا۔ ظفر اقبال صاحب نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ یہ دیباچہ اور معصوم کا کلام آپ پڑھ لیں تو اس بہانے آپ سے باتیں ہو جائیں۔

خوگرِ استغفار

12 June, 2000

نعمان صاحب!

تسلیم! آپ کے میرے درمیان القاب کے تکلفات نہیں ہیں۔ اُمید ہے کہ کراچی کے سفر سے پہلے آپ مضمون مکمل کر چکے ہوں گے۔ انگریزی میں تو آپ نے بہت کچھ لکھا، اب آپ کی اُردو نویسی کی قسمت پھر جاگی ہے۔ ٹائپ رائٹر سے طبیعت بھاگی ہے، خامہ فرسائی کی لگن لاگی ہے۔

پچھلے مہینے ایک پاکستانی صاحب کا خط موصول ہوا۔ یہ حالاً ساکن امریکہ ہیں۔ ان کو جو جواب میں نے لکھا، اس کی کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔

آصف صاحب کو ایک خط میں نے لکھا ہے، ڈاک میں نہیں ڈالا۔ آپ کے ہاتھ انہیں پہنچے تو انہیں دونی خوشی ہو۔ وہ لفافہ کھول کر اسے پڑھ چکیں گے تو ان سے لے کر آپ بھی پڑھ لیجیے گا۔

آپ کی پرواز ۲۲ جون کو ہے۔ اس سے پہلے فون کروں گا۔ آصف صاحب کے نام جو لفافہ ہے، اسے ابھی اس تھیلے میں ڈال دیجیے جو آپ کے ساتھ کراچی جائے گا۔

صحرانورد

داؤد

(واللہ میں کسی کا رہبر نہیں)

KUTABKHANA OSMANIA

3 August, 2000

نعمان صاحب!

السلام علیکم، گاندھی جی والا مقالہ کل مکمل ہوا۔ قومی زبان کے مسئلے پر مہاتما جی کے دو سو بیانات کی فوٹو کاپی میرے سامنے تھی۔ اقتباسات اور تحشیہ میں سوچ اور احتیاط درکار تھی۔ ایسی ریسرچ کی اب مجھے عادت نہیں رہی۔ بہر حال مقالہ کل کینیڈا کے پروفیسر کو بھیج دیا۔

God of Justice کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے سوٹ کیس میں رکھ لیں تو مہربانی ہوگی۔ یونیورسٹی کے دفتر میں جو فوٹو کاپی ہے، اسے وہیں رہنے دیں۔ پارسل آپ کو غالباً پیر کے دن ملے گا۔ پیر کی شام کو فون کروں گا۔

آج شام کو عامر کے والد صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ یہاں پہنچیں گے۔ دو تین روز قیام کریں گے۔ گھر کی صفائی میں لگا ہوا ہوں۔

خاکروب

10 August, 2000

نعمان صاحب!

۱۹۴۷ء سے پہلے کی دلی آپ نے کہاں دیکھی ہوگی، وہ دلی انگریز کی دلی تھی۔ نئی دلی، کناٹ پلیس

میں ان دنوں کشادگی تھی اور شستگی بھی۔ فوارے والے ٹرک اس کی سڑکیں نور کے تڑکے دھویا کرتے تھے۔ (۱۹۴۷ء سے پہلے کراچی کی سڑکیں بھی اسی طرح دھوئی جاتی تھیں۔)

بہادر شاہ کا زمانہ جنہوں نے دیکھا، وہ کہیں گے میاں کناٹ پلیس کی تعریف وہی کرے گا جس نے ۱۸۵۷ء سے پہلے چاندنی چوک کی شامیں نہیں دیکھیں۔

سوادِ روما کو دیکھ کر اقبال کو دلی یاد آئی تھی۔ آپ واپس آئیں گے تو آپ سے آثار الصنادید کی باتیں ہوں گی۔ دہلی کہیں تو مذکر ہے اور دلی کہیں تو مونث۔ بادہ اور مے کی گریمر بھی یہی ہے۔

کراچی، دلی اور لاہور تینوں شہروں میں آپ کا وقت کیسے گزرا، یہ کہانی آپ سے سنی جائے گی۔

آپ کی واپسی کے بعد آپ کے اوقات معمول پر آئیں گے تو فون کروں گا۔

خدا کرے مکتبہ جامعہ سے آپ کو ذاکر صاحب کی تصنیف مل گئی ہو۔ میری کہانیوں کی جو کتاب بعنوان پراگندہ طبع لوگ لاہور سے شایع ہوئی، اس کا ایک نسخہ اپنے لیے اور ایک میرے لیے خرید لائیں تو عنایت ہوگی۔

ڈاکٹر آصف صاحب کو میرا سلام، وہ تصویر جو انہوں نے اخبار میں چھپوائی، میری نہیں بلکہ عکسِ محض کی ہے ع

ہے غیب غیب جس کو کہ سمجھے ہیں ہم شہود

منتظر

13 September, 2000

نعمان صاحب!

السلام علیکم، کراچی آپ فاتحانہ شان سے رہے۔ اپنے لیکچروں سے آپ نے جمود کو توڑا اور سامعین کی سوچ کو نئی طرف موڑا۔ وہاں کی (اور دلی کی) تقریبوں کی روداد فون پر نہیں بالمشافہ سنی جائے گی۔ یوں بھی آپ کی مصروفیات کا ہجوم اس سفر کے بہت بعد ہوگا۔ فون کے ذریعے دستک کا ابھی وقت نہیں۔

مشفق خواجہ صاحب کی عنایت سے اگر دو تین چیزیں میرے لیے بروقت آپ کو پہنچائی گئیں اور آپ کی عنایت سے وہ آپ کے ساتھ امریکہ آ گئیں تو جب بھی سہولت ہو، وہ چیزیں سپرد ڈاک فرما دیں۔ دو ''لحافی لفافے'' بھیج رہا ہوں۔ ان پر اپنا پتہ بھی میں نے لکھ دیا ہے۔

امید ہے طارق رحمٰن صاحب نے میری کہانیوں کی کتاب کی دو جلدیں آپ کو پہنچا دی ہوں گی۔ ایک جلد اس کی بھی ارسال فرما دیں۔

ایسی زحمت دینا میری عادت نہیں۔ اب کے ڈھیٹ بن کر سوالی بنا۔

آپ کی حلاج والی کتاب طبع ہو کر آئے گی تو اس کی خوشی میں آپ سے مل کر مٹھائی کھائی جائے گی۔

ممنون

23 September, 2000

نعمان صاحب!

السلام علیکم، مشائخِ دیوبند شاہ ولی اللہی کے سلسلے سے اپنا رشتہ جتاتے ہیں۔ ان کے ہاں تصوف سے

لگاؤ ہے لیکن شاعری سے پرہیز۔ مولانا شبلی نے شعر العجم لکھ کر اور غزلیں کہہ کر ندوۃ العلماء کے حلقے میں (قوالی کی تو نہیں) مشاعرہ گرم کرنے کی رسم ڈال دی۔

خیر آبادی دبستان فلسفہ کا اپنا ایک مدرسہ قائم ہو جاتا تو ذوقِ فلسفہ اور ذوقِ سخن کی آمیزش کا نسخہ معروف ہو جاتا۔

ایسا شربت گھولنے کا کام آپ کو ورثے میں ملا ہے۔ آپ کی کتاب کا عنوان رنگ رنگ طیلسان بجائے خود شاعری ہے اور اس کی عبارتوں میں شاعرانہ جولانی ہے۔ آپ کے قلم سے دیگر تعارفی عبارات بھی اس کتاب میں ہوں گی۔ ان کے پڑھنے کا مشتاق ہوں۔

پروفوں کے اُردو صفحات میں نے پڑھے تو پروف خوانی بھی ہو گئی۔ ''اغلاط'' والے صفحات بھیج رہا ہوں، ان کی فوٹو کاپی بنا کر میں نے محفوظ کر لی ہے۔

آپ نے قطعات کی جگہ مقطعات لکھا ہے۔ اگر عربی میں مقطعات مستعمل ہے تو مقطعات ہی رہنے دیں، کوئی مضایقہ نہیں۔

تماشہ اور تقاضہ کو تماشا اور تقاضا کر دیں تو مناسب ہے، یہ دونوں لفظ تحاشا کے قافیے ہیں، تحاشا (ح ش ی) سے مشتق ہے۔

تماشا (م ش ی) سے، تقاضا (ق ض ی) سے۔ آپ کی نثر اس قدر مقطع ہے کہ اس میں تماشہ اور تقاضہ والے ہجے کھپ نہیں سکتے۔

آپ کے لیکچروں کے خلاصے میں نے پڑھ لیے۔ یہ مفکرانہ لیکچر انگریزی میں دیے گئے، ان کی باتیں کرنے کا مزا اگلے خط میں لوں گا۔

ملاقات کا منتظر

6 November, 2000

نعمان صاحب!

آج نومبر کا چھٹا دن ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ۱۳ نومبر کو آپ کراچی جائیں گے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ واپس کب آئیں گے غالباً جلد، کیونکہ کلاسیں آپ کی منتظر ہوں گی، میں بھی منتظر ہوں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے خیر آبادی دبستانِ فلسفہ کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ میں نے سن کر آپ سے کہا تھا اس دبستان پر ایک کتاب لکھی جانی چاہیے۔ آپ نے بتایا کہ مولانا فضل حق کی تحریریں وارثین میں سے کسی کے پاس محفوظ ہیں۔

مولوی سلیمان ندوی کی تصنیف حیات شبلی اور عبدالحلیم شرر کی کتاب گزشتہ لکھنؤ کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ انیسویں صدی کے لکھنؤ میں فلسفے کا احیاء ہوا تھا۔ آپ کی توجہ سے سرِدست اتنا اہتمام تو ہو جائے کہ جو قلمی نسخے خاندان کے کسی گھر میں پڑے ہیں، پاکستان کے نیشنل میوزیم کی لائبریری میں منتقل ہو جائیں۔ لندن یونیورسٹی کی لائبریری یا پرنسٹن یونیورسٹی کی لائبریری انہیں خرید کر محفوظ کر لے تو اور بھی اچھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں فلسفہ الٰہیات سے منفصل نہ ہو پایا، کیا ابن سینا اور ابن رشد کے فلسفے

KUTABKHANA OSMANIA

اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں؟ دیکھنا چاہیے کہ مولانا فضل حق کے تفلسف کی صورت کیا تھی اور اس میں نئی بات کیا تھی۔

ابن رُشد کے بعد تفلسف کا قصہ دنیائے اسلام میں ختم ہوا تو اس پر تاسف کسی کو نہ ہوا۔ البتہ تصوف سب کو ہوا۔

لکھنو میں تفلسف سے دلچسپی کے اسباب کیا تھے؟ مولانا فضل حق کے علاوہ کون کون بزرگ تھے جنہوں نے فلسفیانہ مناظرے گرمائے اور معقولات سے ہنگامہ آرائی فرمائی؟ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں خیر آبادی دبستانِ فلسفہ کا پیدا ہونا ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس سے روشناس کرانا لطف اور فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

کیا آپ کے ابّا مرحوم نے اس پر کبھی کچھ لکھا یا اس پر کوئی تقریر کی؟ آپ آثار قدما کے محقق ہیں، اپنے خاندان کے ایک جید بزرگ کے ورثے پر بھی کچھ لکھیے۔ خود نہیں لکھتے تو کسی سے لکھوایئے۔

جویائے الوانِ نعمت

24 December, 2000

نعمان صاحب، تسلیم!

دوسروں کو تبریک کے کارڈ ہی بھیجے گئے، ان پر چند رسمی جملے لکھے گئے۔ آپ کی طرف جو کارڈ ارسال ہے، اس کے ساتھ تازہ غزل بھی ملفوف ہے۔ میکڈانلڈ کے قہوہ خانے میں بیٹھ کر کہی، از راہِ طبع آزمائی۔ ہاتف کی ذات پات کے تصور دو ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ جن ہے اور بعض کہتے ہیں یہ فرشتہ ہے۔ ہتف کے اصلی معنی ہیں کبوتر کی غٹرغوں۔

مہینوں غزل گوئی بند رہی۔ غزل ان دنوں کہتا ہوں جب اور کچھ کرنے کو نہ ہو۔ یہ غزل تعطیل کے موسم میں کہی۔

اللہ کرے سالِ آیندہ میں اس بھنگی کے قرب سے آپ کو رہائی ملے اور ساز گار بلکہ جانفزا فضا میں کام کرنے کی خوشیاں نصیب ہوں۔

جنوری میں لائبریری آف کانگرس میں ہندوستان کے بعض پرانے اخباروں کی ورق گردانی کے لیے واشنگٹن آؤں گا، کوشش کروں گا کہ آپ کی طرف بھی آؤں۔

ہندی کی بحر (پنگل) کو میرزا غالب نے ٹھکرایا اور میرؔ نے اپنایا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے سارا عالم جانے ہے

اسی بحر میں میں نے یہ غزل کہی جو آپ کے سامنے ہے۔ اس بحر کی لہر مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس کے ماترے سولہ ہیں اور یہ تین تال سے منطبق ہے (وزن رباعی کے ماترے دس ہیں اور رباعی جھپ تال سے قدم ملا کر چلتی ہے)

دیکھیے خط لکھ کر دستخط کرنے کو تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آپ سے باتیں شروع ہو گئیں۔ خوب رواں دواں گفتگو رہی۔

میں چاہتا ہوں کہ دو دن واشنگٹن میں گزار کر تیسرے روز سویرے آپ کے پاس چلا آؤں اور اسی

روز شام کو فلاڈلفیا سے سیدھا فلورڈا کا رخ کروں۔ شاید سنیچر کا دن ملاقات کے لیے ٹھیک رہے گا۔ فون کر کے آپ کی سہولت کی صورت معلوم کروں گا۔

اگلے صفحے پر غزل ہے۔ اس کے چوتھے شعر میں گریز بھی آ گئی ہے۔

آنا یہ بہاراں کا پھر سے تقریب نوائے عنادل ہے
ہر رُت کے اپنے نغمے ہیں، ہر دور کی اپنی محفل ہے
اے راہبرو کیوں روکتے ہو رہرو کو قبلہ نما ہو کر
جانے دو اسے جاتا ہے جدھر؛ اس کی اک اپنی منزل ہے
اس سوچ کو لے کر ساتھ اپنے میں جا بیٹھا میخانے میں
ہے بحرِ خیال بہت گہرا، یہ ساغر اس کا ساحل ہے
رحم آتا ہے اُس چہرے پر جس پر یہ لکھا ہوتا ہے
اُس فعل پہ پردہ بہتر ہے جس فعل کا بندہ فاعل ہے
خاکم بدہن کہہ کر اکثر یہ شکوہ خدا سے ہم نے کیا
کیوں ان سے ثواب نہیں حاصل دل جن کاموں پر مائل ہے
کشکول میں یہ کیا لا ڈالا اس در پر میرے مقدر نے
ہے وہ کچھ اور ہی شے داتا یہ بندہ جس کا سائل ہے
نسخہ اس معجون کا تو کیوں ہم سے چھپا کر رکھتا ہے
چارہ گر ہم کو بھی بتا دے کیا کیا اس میں شامل ہے
بت خانوں کے بنے بنائے بتوں سے اس کو کام نہیں
اپنا صنم یہ آپ گھڑے گا، رہبر یہ تیرا دل ہے

23 دسمبر 2000ء۔ داوَر رہبر

18 January, 2001

نعمان صاحب!

تسلیم اور سلام، ہاتف تو صرف مضمون بھجاتا ہے۔ الفاظ کی آمد طبیعت کی مستعدی سے ہوتی ہے۔

آج ہاتف اور طبیعت نے مل کر قلم کو ایڑ لگائی اور ایک مطلع اس سے لکھوایا

اک یار مجھ کو بزم میں دیر آشنا اچھا لگا
محتاط سا انداز اُس کا با حیا اچھا لگا

مطلع کے بعد صرف ایک شعر اور کہا

ہے ہرج ہی کیا گر ہمیں یہ ماسوا اچھا لگا
جب یہ لگا اچھا تو پھر ہم کو خدا اچھا لگا

تقطیع اس کی یوں ہوگی:

KUTABKHANA OSMANIA

مفعول فعلن فاعلن مفعول فعلن فاعلن

اس دوسرے شعر کے دونو مصرعوں میں سے ایک ماترہ کم کر کے اسے پڑھیے۔(یعنی پہلے مصرعے کو ''ہے'' کے بغیر اور دوسرے کو''جب'' کے بغیر)

ہرج ہی کیا گر ہمیں یہ ماسوئی اچھا لگا
یہ لگا اچھا تو پھر ہم کو خدا اچھا لگا

اب تقطیع ہوگی:- فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ...... فاعلاتن والی بحر مجھے سپاٹ لگتی ہے۔ایک ماترہ اس میں بڑھائیں تو اس میں ویسی لہک آتی ہے جیسی ہیر وارث شاہ کی بحر میں ہے۔ہیر کی بحر یوں ہے:-

متفاعل فاعل مفتعلن، متفاعل فاعل مفتعلن

کیسی مزے کی بحر ہے، اردو والوں کو اپنا لینی چاہیے۔رفیق خاور صاحب نے ہیر کا اردو ترجمہ اسی بحر میں کیا ہے۔اس کے کچھ اجزاء میں نے ماہِ نو کے شماروں میں دیکھے تھے۔شاید ایک آدھ طبع زاد غزل اس بحر میں صوفی تبسم صاحب نے بھی کہی تھی۔

اوپر والے دو شعر کہہ کر میں نے غزل مکمل نہیں کی۔البتہ انہی کی بحر میں کل ایک غزل ہوئی، وہ ارسال ہے۔

زحاف کا لفظ لین کی لغت میں دیکھیے۔المنجد میں اس کے دو معنی درج ہیں:- تھکن کے باعث اونٹ کا قدم گھسیٹ کر چلنا اور تیر کا ہدف تک پہنچ نہ پانا۔

ایک عربی شعر جو زحاف کی اچھی مثال ہے

بِالعُقْرِ دارٌ مِن جَميلَةَ هَيَّجَتْ
سَوَ الِفَ حُبٍّ في فُؤادِكَ مُنْصِبِ

بحر کی بنیادی شکل:-

مفعول فعلن فاعلاتن فاعلن

یا:- مفعول فعلن فاعلن متفاعلن

شعر کے دوسرے مصرعے میں زحاف ہے:-

سوالف حب فی فواوک منصب

تقطیع: مفاعل فعلن فاعلن متفاعلن

یعنی مفعول کی جگہ مفاعل آیا۔زحاف سے لہک پیدا ہوئی۔

شتر غمزہ نہیں، شتر کا خرام۔

اُردو میں زحاف کی عمدہ مثال میرزا کا یہ مطلع ہے

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

بحر کی بنیادی شکل:-

فاعلاتن مفاعلن فعلن (یا فعلن)

شعر کے پہلے مصرعے میں زحاف ہے یعنی:-

فعلاتن مفاعلن فعلن

جو زحافات شتر کی چال میں ہوتے ہیں، انہی سے عربی بحور میں جھومنے کی بات آئی۔فارسی بحور میں عسکری ضابطہ ہے یعنی زحافات شاذ و نادر۔

تال میل کا خوگر

29 January, 2001

نعمان صاحب، تسلیم!

پچھلے خط میں مطلع اور مطلعِ ثانی آپ کو بھیجا گیا۔آج فکرِ شعر کو فرصت ملی تو غزل پوری ہوئی، ملاحظہ فرمائیے۔صحیح تقطیع اس بحر کی یہ ہے:-

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

میں نے پچھلے خط میں تقطیع یوں لکھ دی تھی:-

مفعول فعلن فاعلن مفعول فعلن فاعلن

دونوں طرح ٹھیک ہے۔

کیمبرج کے پروفیسر رائٹ (W.Wright) کی عربی گریمر (جلد دوم) میں عربی عروض پر بہت اچھا باب ہے۔اس کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔تصرفات شاعرانہ (Poetic Licenses) کی بحث اس میں نہایت مفید ہے۔صفحات 361-359 پر اوزان عربی کی تقطیعیں درج ہیں۔ان کے ساتھ مثالاً مصرعے بھی۔تقطیعوں اور مثالوں کا موازنہ بغور کریں تو زحافات کا معاملہ معلوم ہو جاتا ہے۔عروض کا یہ باب پڑھ کر معلوم ہوا کہ عربی شاعروں کی گریمر من مانی گریمر ہے۔

ہمارے سنگیت میں ٹھمری کی معروف ترین اور مستعمل ترین تال دیپ چندی ہے۔اس کے ماترے چودہ ہیں:-

دھا دھن ان	دھا دھا دھن ان	دھا تن ان	دھا دھا دھن ان

نایک لوگ کہتے ہیں دیپ چندی تین تال سے مستخرج ہے۔یہ کیسے! جبکہ تین تال کے ماترے تو سولہ ہوتے ہیں:-

دھا دھن دھن دھا	دھا دھن دھن دھا	دھا تن تن تا	تا دھن دھن دھا

تین تال پر زحاف کا آپریشن ہوا تو دیپ چندی حاصل ہوئی۔

ٹھمری کا گانا دیپ چندی میں شروع کیا جاتا ہے۔اس تال میں خوش خرامی ہوتی ہے۔تین چار منٹوں کے بعد تین تال آ دھمکتی ہے۔اس کی چال سرپٹ ہوتی ہے۔اس کے دو تین چکر بجا کر ڈبل رفتار والی لگی بجانے لگتے ہیں جسے ادھا بھی کہتے ہیں یعنی تین تال کا آدھا۔آٹھ ماتروں والا، ڈیڑھ دو منٹ اس کا مزا لیتے ہیں۔پھر دیپ چندی کو واپسی ہوتی ہے۔ان تین کیفیتوں کے مجموعے کو ٹھمری کی ایک ''رکعت'' سمجھ لیجیے۔تین چار ''رکعتوں'' میں ٹھمری مکمل ہو جاتی ہے۔یہ ہے ہماری نماز، آپ آئیں تو طبلے پر مظاہرہ کیا جائے۔

KUTABKHANA OSMANIA

گاندھی جی والا مقالہ لکھ کر اور ٹائپ کر کے فروری کے پہلے ہفتے میں کانفرنس کے معتمد کو پہنچانا ہے۔ چند روز یکسوئی درکار رہے گی۔ بقول جگر ؎

خیال ایک جانب، نگہ چار سو ہے

بندہ

سن لو مرے بھائی مجھے دنیا میں کیا اچھا لگا
اپنے دہن میں مجھ کو لقمے کا مزا اچھا لگا
اک یار مجھ کو بزم میں دیر آشنا اچھا لگا
محتاط سا انداز اس کا باحیا اچھا لگا
ہے ہرج ہی کیا گر ہمیں یہ ماسوئی اچھا لگا
جب یہ لگا اچھا تو پھر ہم کو خدا اچھا لگا
ہم کو تو اپنی زندگانی مختصر اچھی لگی
ہیں کون جن کو سلسلہ لا انتہاء اچھا لگا
پیارے تری اک اک ادا مجھ کو لگی ہے بامزہ
لیکن نہیں اغیار سے ملنا ترا اچھا لگا
تعریف کافی ہو چکی اس عطر کی، اُس عطر کی
اب یہ بتاؤ شعر تم کو کونسا اچھا لگا
جب گرمیاں آئیں تو ہم کو چاندنی اچھی لگی
اور سردیوں میں سینک ہم کو دھوپ کا اچھا لگا
شکرِ خدا اک فرض ہے' بندے تبھی تو راہبر
کہتے رہے جینا ہمیں اچھا لگا اچھا لگا

29 جنوری 2001ء۔ داؤد رہبر

14 April, 2001

نعمان صاحب!

تسلیم، سر شاہ محمد سلیمان فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج تھے۔ ایک زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ان کے حسنِ اخلاق سے سب لوگ متاثر تھے۔ خواص بھی اور عوام بھی۔ میں ان کی ایک اور بات سے بھی متاثر ہوں، اور وہ ہے ان کی بلاغت۔

اُن کا مقالہ ''اضافیت جدید'' آپ کو بھیج رہا ہوں جو انہوں نے ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے اجلاس دہلی (منعقدہ ۱۹۳۸ء) میں پڑھا تھا۔ دیکھیے اردو میں سائنس کے مباحث انہوں نے کس سہولت اور سلاست کے ساتھ لکھے ہیں۔

یہ مقالہ خلاصہ ہے ایک بسیط رسالے کا جو انہوں نے چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔ ہمارے والد صاحب کو بھی بھیجا گیا تھا۔ کاش میں اسے محفوظ کر کے اپنے پاس رکھتا۔ ریاضی کے بعض مشکل فارمولے جو اس رسالے میں شامل تھے، اس خلاصے میں حذف کر دیئے گئے۔

ادارۂ معارف اسلامیہ پر میں نے جو مضمون لکھا ہے وہ بھی ارسال ہے۔ آپ دونوں چیزیں پڑھ لیں تو آپ سے ان پر گفتگو ہو۔

یکتائی کو انگریزی میں کہیں گے Onliness اور تنہائی کو Loneliness۔ یکتائی اللہ میاں کی صفت ہے اور تنہائی ہماری

تنہا

19 April, 2001

نعمان صاحب!

تسلیم، علامہ کی وہ تحریر جس کا اردو ترجمہ آپ کو بھیج رہا ہوں، غالباً کانفرنس کے عمومی اجلاس کا خطبۂ صدارت نہیں تھا بلکہ اس کے شعبۂ عربی و فارسی کا خطبۂ صدارت تھا۔ مجمع کے آگے پڑھتے ہوئے علامہ کے سامنے غالباً ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ تھا۔

کانفرنس کا یہ اجلاس لاہور ۱۹۲۸ء میں منعقد ہوا۔ کانفرنس کی روداد باقاعدہ شائع ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۲۸ء کی روداد ملے تو دیکھوں کہ اس میں اس خطبے کے متعلق کوئی نوٹ ہے یا نہیں۔

قیاساً کہہ رہا ہوں کہ اس سال کانفرنس کے شعبۂ عربی و فارسی کے ناظم میرے والد مرحوم تھے۔ علامہ نے طویل تاخیر کے بعد خطبہ پر نظر ثانی کر کے اسے ٹائپ کرایا اور والد صاحب کو بھیجا۔ کانفرنس کی روداد چھپ بھی چکی تھی۔ والد صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب اس خطبے کا کیا کریں۔

۱۹۴۶ء میں اتفاقاً والد صاحب کے کمرۂ مطالعہ میں اس پر میری نظر پڑی۔ میں نے ان سے پوچھا، یہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے بتایا کہ قصہ کیا ہے۔ میں نے کہا کیوں نہ اس کا اردو ترجمہ کر دوں اور ترجمہ اورینٹل کالج میگزین میں چھپ جائے۔ میرا خیال انہیں پسند آیا۔

ترجمہ کرنے کے بعد میں نے اصل انگریزی خطبہ والد صاحب کے ڈیسک پر وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ میرا ترجمہ اورینٹل کالج میگزین کے شمارہ اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ ٹائپ کیا ہوا انگریزی خطبہ کہاں گیا، مجھے معلوم نہیں۔

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کی بسم اللہ بیسویں صدی میں کب ہوئی، مجھے معلوم نہیں۔ اس کے اجلاس ہر دوسرے سال ہوتے تھے۔ یہ بڑے پیمانے پر ہوتے تھے جیسے امریکہ کی اورینٹل سوسائٹی اور ایسوی ایشن فار ایشین سٹڈیز کے اجلاس ہوتے ہیں۔

اس کل ہند کانفرنس کی فضا کو بھانت بھانت کی فضا کہہ سکتے تھے۔ کئی وضع کی پگڑیاں اور کئی قطع کی ٹوپیاں، تنگ پاجامے اور ہوادار پاجامے، شیروانیاں اور دھوتیاں۔ پکوان کے انتظام ہندو شرکاء کے لیے الگ اور مسلمان شرکاء کے لیے الگ۔ اُدھر ترکاری اور اِدھر نہاری۔ البتہ سب کی آمد و رفت کے لیے اِکے کی سواری۔

KUTABKHANA OSMANIA

اجلاسِ بنارس (۱۹۴۳ء) میں والد صاحب شرکت کے لیے مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے اور وہاں میں نے مشاعرے کے ارتقاء پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔

بنارس یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ہمارا قیام تھا۔ وہاں سے ایک اِکے پر سوار ہو کر ہم چار شرکاء اجلاس ایک روز بنارس کی سیر کو نکلے:۔ مولوی عبدالعزیز میمن صاحب، ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب، والد صاحب اور میں، اورنگزیب کی بنوائی ہوئی مسجد وہاں ایک ٹیلے پر تعمیر ہوئی ہے، اس سے اس کی سربلندی دو چند ہے۔ سارے شہر پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مسجد کی خستہ حالی دیکھ کر عبرت ہوئی۔ معلوم نہیں اب یہ کس حال میں ہے۔ اس کی مرمت سے نمازیوں کو غفلت نہیں کرنی چاہیے۔

مسجد کو دیکھنے کے بعد ہم نے کاشی (یعنی بنارس) میں ایک کبابیے کی دکان کا پتہ معلوم کیا۔ اس لیے کہ کانفرنس کے ہندو منتظمین کی طرف سے لحم خوری کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کبابیے کی دکان پر کباب کھا کر ہم نے گھاٹ کا رُخ کیا۔ وہاں یاتریوں اور جوگیوں اور سوامیوں کا جمگھٹ دیکھا۔ یاتری گنگا اشنان کے مزے لے رہے تھے۔ گھاٹ کا ایک حصہ شمشان بنا ہوا تھا۔ وہاں میتیں جلائی جا رہی تھیں۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

بنارس کا حاجی

9 July, 2001

نعمان صاحب!

السلام علیکم، مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت اور فن کے عنوان سے عاتکہ صدیقہ نے آج سے تیس بتیس برس پہلے ایک تھیسس ایم اے کی ڈگری کے لیے لکھا تھا۔ پچھلے سال انہوں نے اسے از سرِ نو مرتب کیا اور اس میں چند اضافے بھی کیے۔ اس سال جنوری میں اس کی اشاعت ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز انہوں نے شائع کی۔ اس کا عنوان ہے "مولانا صلاح الدین احمد کا خیالستان" مولانا کی صحافت کا آغاز خیالستان کی ادارت سے ہوا تھا۔ اس رسالے کا اجرا ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا۔ جب مولانا کا سن اٹھارہ تھا۔ اس کے صرف پانچ چھ شمارے نکلے، پھر یہ بند ہو گیا۔

یہ گمان عام تھا کہ "خیالستان" نام کا کوئی رسالہ کبھی وجود میں آیا ہی نہیں۔ عاتکہ بیگم کا وجدان اس گمان کے خلاف تھا۔ ان کی کوشش بارآور ہوئی۔ اس رسالے کا اولین شمارہ انہوں نے ڈھونڈ ہی نکالا اور اس کے مشتملات کی طباعت اپنے دیباچے کے ساتھ کرائی۔ مولانا کے فرزند وجیہہ الدین احمد سے بھی ایک دیباچہ لکھوایا۔ اس کی کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔

طباعت کی اغلاط اس میں کئی ہیں۔ کمپوزر نے سمرقند کو ثمرقند کر دیا اور آذر کو آ زر۔ دیگر اغلاط ایسی ہیں کہ ان سے مطلب خبط ہو گیا ہے۔ وجیہہ صاحب نے مجھ سے کہا تھا، میں اغلاط کی نشاندہی کا ایک خط تمہیں لکھوں گا، دیکھیے کب وہ خط آتا ہے۔ وہ ٹیلی فون تو کثرت سے کرتے ہیں، خط نہیں لکھتے۔

ان کے دیباچے کا حصہ دوم جو صفحہ ۱۵۵ سے شروع ہوتا ہے، زیادہ مزے کا ہے۔ اس میں تاش کے پتوں کی علامات بتائی گئی ہیں۔

آپ دیباچہ پڑھ لیں تو اس پر باتیں ہوں۔ آپ نے رنگ برنگ طیلسان کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا، اس کے اسلوب اور وجیہہ صاحب کے اسلوب میں مجھے مشابہت محسوس ہوئی۔

والسلام مع التسلیم

بندۂ درگاہ

13 July, 2001

نعمان صاحب!

السلام علیکم، ہمارے داماد صاحب نے اپنا بوسٹن والا گھر بیچ دیا ہے اور واشنگٹن میں ہاؤس آف کانگرس کے بہت قریب ایک کشادہ فلیٹ خرید لیا ہے۔ یکم ستمبر کو ہماری بیٹی سمیرہ اور داماد صاحب واشنگٹن منتقل ہو جائیں گے۔

یکم جولائی کو میں جو بوسٹن گیا، اس کا ایک مقصد تو ہارورڈ کی لائبریری سے فائدہ اٹھانا تھا، دوسرا مقصد یہ تھا کہ کاغذوں اور کتابوں کے جو ڈبے میں بیٹی کے گھر رکھوا آیا تھا، ان کی چھانٹی کروں۔ اس چھانٹی میں بعض ایسی چیزیں نکلیں جن کی بازیافت کی مجھے امید نہ تھی۔ مثلاً بوستان سعدی کے دو اردو ترجمے اور ان یادداشتوں کے دفتر جو میں نے انقرہ یونیورسٹی اور میک گل یونیورسٹی اور ہارٹفورڈ سیمینار میں لیکچر دینے کے لیے قلمبند کی تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ستمبر ۱۹۴۶ء میں "ادبی دنیا" کا جو شمارہ شائع ہوا، اس میں ایک مضمون "تک بندی کا نفسیاتی منظر" کے عنوان سے شامل تھا۔ یہ خ۔ م۔ سامری صاحب نے لکھا تھا۔ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اس مضمون کو پڑھ کر چپ رہوں۔ "ادبی دنیا" کے اگلے یا اگلے سے اگلے شمارے کے لیے میں نے اس مضمون کا جواب لکھا۔ بیٹی کے گھر میں پڑے ہوئے ایک ڈبے سے یہ مضمون بھی نکلا۔ اس کی فوٹو کاپی ارسالِ خدمت ہے۔ خیال رہے کہ یہ مضمون آج سے پچپن سال پہلے لکھا گیا۔ اب جی چاہتا ہے کہ لوگ ہمیں بزرگ مان لیں۔

ہارورڈ کی لائبریری میں گریرسن کے سروے کی دس جلدیں مجھے ملیں۔ (جلد نمبر ۲ تا جلد نمبر ۱۱) جلد اوّل شیلف سے غائب تھی۔ کسی کے زیرِ مطالعہ ہوگی۔ اسی لیے میں نے آپ کو زحمت دی۔

والتسلیم

سائلِ کرم

16 October, 2001

نعمان صاحب!

السلام علیکم!، بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مشاعروں میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں، جمع کر کے چھاپ دی جاتی تھیں۔ ان کے مجموعے گلدستے کہلاتے تھے۔

دو گلدستے جو بھیج رہا ہوں، مشاعروں کے نہیں۔ ایک اور طبقے کی محفلوں کے ہیں۔ ان میں جو غزلیں ہیں، ان کے ساتھ سارنگی اور طبلے کی سنگت بھی ہے۔ گانے والیوں کے اسماء حسنیٰ کی فہرست ملاحظہ ہو: حیدری جان آگرے والی، اللہ بندی جے پور والی۔ امیر جان پانی پت والی، حسنا جان بنارس والی، حشمت جان اجین والی، گوہر

KUTABKHANA OSMANIA

جان کلکتے والی۔

کل اپنے شاگرد کی مدد سے کتابوں کے بکس ٹرک پر لاد کر نئے گھر پہنچائے۔ بیشتر فرنیچر بھی منتقل ہو گیا۔ وہاں کی رہائش اکتوبر کے اواخر میں شروع ہوگی۔ جاڑوں میں تشریف لائیے اور دیکھ جائیے۔

منتظر

26 December, 2001

نعمان صاحب، تسلیم!

کل فون پر میں نے آپ کو یہ شعر سنایا ؎

کیوں ہے سخنور تیرے ہاں اپنا ہی رونا پیٹنا
ہے وقت شہر آشوب کا، اندوہ ہے انبوہ کا

آپ مجھ سے متفق ہوئے کہ زمین سنگلاخ ہے، انبوہ کا قافیہ تنگ ہے۔ فون ہو چکا تو سوچا کہ مصرع یوں کر دیا جائے ع

اندوہ ہے انبوہ کا، ہے وقت شہر آشوب کا

تو آشوب کا قافیہ خوب رہے گا کہ فارسی تلفظ آشوب کا آشُوب ہے۔

سوچ یہاں تک پہنچی تھی کہ ہاتف کو ہمارے حال پر رحم آیا۔ اس نے اصلاح دی اور شعر کی ساخت یوں کر دی ؎

ہے وقت شہر آشوب کا، اندوہ ہے انبوہ کا
اپنا ہی رونا پیٹنا کیوں ہے سخنور تیرے ہاں

زمین گنگنانے کے لائق ہوگئی اور غزل چالو۔

بحر کا تعین اس ٹکرے سے ہوا:۔

ہے وقت شہر آشوب کا

اس بحر کے چار ارکان ہیں:۔

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

رُکن اوّل سے پہلا ماترہ یعنی مس حذف کر دیں تو وزن یوں ہوگا:۔

تفعلن مس / تفعلن مس / تفعلن مس / تفعلن

ملا کر دیکھ لیجیے۔ اس صورت میں یہ فاعلاتن والی بحر سے منطبق ہے:۔

فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلن۔

دونو بحروں میں فرق صرف ایک ماترے کا ہے لیکن اتنے سے فرق سے "تال" کچھ اور ہوگئی۔

غزل ملاحظہ کے لیے ارسال ہے۔ اسے نوروز کا نذرانہ سمجھ لیجیے۔

آپ کا ندیم

آؤں میں کیا اُمید لے کر اے ستمگر تیرے ہاں
ٹھکانے کو میرے قرینے ہیں بہتر تیرے ہاں
ہاں خوب مجھ کو یاد ہے، وہ دور مجھ کو یاد ہے
میں پی کے آیا کرتا تھا راتوں کو اکثر تیرے ہاں
تجھے گل کھلائے خوب اس نے مل کے تیرے بخت سے
جب لے کے آیا تھا مجھے میرا مقدر تیرے ہاں
اس در پہ تیرے دلبرا یہ سن کے آج آیا ہوں میں
ملتی ہے شربت کے لیے سائل کو شکر تیرے ہاں
ہے اک بلا قامت تری اور اک بلا تیرا خرام
ہے بس خدا ہی جانتا کیا کیا ہیں محشر تیرے ہاں
میں نے پہیلی ہے کہی لکھ کر یہ خط میں یار کو
کب سر کروں میں ساز پھر اک روز آ کر تیرے ہاں
ہے وقت شہر آشوب کا، اندوہ ہے انبوہ کا
اپنا ہی رونا پیٹنا کیوں ہے سخنور تیرے ہاں
اُردو کے کچھ دیوان ہیں اور چند تصویرِ بتاں
ان کے علاوہ اور کیا ساماں ہے، رہبر تیرے ہاں

16 January, 2002

نعمان صاحب، تسلیم!

آپ کے ساتھ بیٹھ کر عربی عبارتوں پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ میری استعداد کس حد تک زائل ہو چکی ہے۔ پچاس برس پہلے میں بھی عربی قاموسوں کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔ ایم اے عربی کا امتحان میں نے ۱۹۴۷ء میں پاس کیا اور ۱۹۵۳ء میں کیمبرج کی تعلیم سے فارغ ہوا۔ مونٹریال میں سرسید کی تفسیر القرآن پر ایک کورس کا پڑھانا میرے سپرد ہوا تھا۔ یہ ۵۶۔۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد میری تدریس کا عربی سے براہ راست کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ترکی میں اُردو اور تاریخ تحریک پاکستان کی تدریس میرے سپرد تھی۔ پھر امریکہ آ کر جہاں بھی رہا، اُردو اور فارسی ادبیات ہی کے کورس پڑھائے۔

غرض یہ کہ ۱۹۵۶ء کے بعد تقریباً آدھی صدی گزر گئی۔ اس میں عربی نظم و نثر کا مطالعہ موقوف رہا۔ مزاولت نہ رہے تو استعداد کیسے قائم رہے۔ یہاں آپ عبارتیں پڑھ کر ترجمہ کر رہے تھے تو میری مدد نام کو بھی نہ تھی۔ شرکت کم تھی اور رفاقت خوب۔

ارضیات پر آپ کا جو مقالہ انگریزی میں ہے، اس کی فوٹو کاپی بنا کر میں نے محفوظ کر لی ہے۔ رسالہ ارسال ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے مقالات یہیں رہ گئے۔ یہ بھی ارسال ہیں، ان کی فوٹو کاپیاں بنوانے کے بعد اصل چاہیے (Off-prints) آپ عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کو بھیج دیں تو وہ ان کی جلد

بندھوانے کی تدبیر کریں۔ مجلد ہو کر یہ مجموعہ پاکستان سے واپس آئے گا تو کولمبیا یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھوا دیا جائے گا۔

میرے کلیات کے بہت سے نسخے وجیہہ الدین احمد صاحب کے گھر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کا کوئی عزیز اب تک کراچی میں ہے تو اس کو ہدایت لکھ بھیجیں کہ وجیہہ صاحب کے گھر سے ایک نسخہ آپ کے لیے حاصل کر لے اور جب امریکہ آئے تو نسخہ ساتھ لے آئے اور آپ کو پہنچا دے۔ میں نے وجیہہ صاحب کو فون پر مطلع کر دیا ہے کہ آپ کا عزیز نسخہ لینے ان کے پاس پہنچے گا۔

''زاویہ'' کا شمارہ آپ اپنے پاس رکھیں۔ البتہ اس میں یگانہ کے کلام کا جو انتخاب ہے، اس کی فوٹو کاپی اپنے کسی معاون سے بنوا کر مجھے بھیج دیں اور یگانہ کے فرزند کا رسالے میں جو مضمون ہے، اس کی فوٹو کاپی بھی، ممنون ہوں گا۔

''نسخہ ہائے وفا'' کی اس طبع ثانی کی چھپائی احتیاط سے نہیں کی گئی۔ دونوں دیباچے جو کمپوز ہوئے تھے، غائب ہیں۔

شرمسار

عبدالوہاب خاں صاحب کا پتہ یہ ہے:-

Mr.Abdul Wahab Khan Salim
1802 53rd Street, Apt.B-7
Brooklyn, N.Y. 11204

18 July, 1992

جناب عبدالوہاب سلیم صاحب

السلام علیکم! آج صبح آپ کا خط ملا اور شہزاد منظر صاحب کے ''سفرنامے'' کی فوٹو کاپی بھی موصول ہوئی، ممنون ہوں۔

میرے پاس جلسوں میں گائے ہوئے اپنے گانوں کے چند فیتے (ٹیپ) ہیں۔ آپ کا خط آیا تو میں نے جلدی میں کچھ چن کر اسے ایک تازہ ٹیپ پر منتقل کیا۔ یہ ٹیپ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ Side B پر جو کچھ ہے، گھر میں اپنے شاگردوں کو سبق دیتے ہوئے ریکارڈ کیا گیا۔

پکے گانے سے آپ کو شغف ہے یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں ویڈیو کی کاپی میں گھر میں نہیں بنا سکتا۔ میرا ایک شاگرد یہ کام اپنے گھر میں کرے گا۔ فی الحال وہ اپنے کاروبار کے لیے واشنگٹن گیا ہوا ہے، آٹھ دس روز میں واپس آئے گا۔

میرے پاس گھر میں جو سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں اُردو کی ہیں، ان کی فہرست بھیج رہا ہوں۔

میں عن قریب اپنی تصنیف ''باتیں کچھ سریلی سی'' کی فوٹو کاپی بنا کر آپ کو بھیجوں گا۔ میرے پاس اس کے دو نسخے باقی ہیں۔ احتیاطاً دونوں اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن سنگ میل کے مکتبہ سے ان شاءاللہ نکلے گا۔ اس لیے دونوں نسخے اپنے پاس محفوظ کر رکھے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ (دہلی) نے چھاپی تھی۔

''نسخہ ہائے وفا'' میرے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے ۱۹۵۶ء میں شائع فرمایا تھا۔ اس کے دو نسخے میرے پاس ہیں۔ پچھلے دنوں مولانا کے فرزند وجیہہ الدین احمد نے فون کر کے مجھ سے کہا ''ایک نسخہ اس کتاب کا مجھے بھیج دو۔ میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپواؤں گا۔'' اگر ان کی فرمائش نہ ہوتی تو میں ایک نسخہ آپ کو بھیج دیتا۔

فرصت کے اوقات میں اس کی فوٹو کاپی بھی بناؤں گا۔ فی الحال میرے پاس بس اتنا وقت ہے کہ موسیقی والی کتاب کی فوٹو کاپی تیار کروں۔

آغا بابر صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ نے ان سے ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ وہ LINK کے لیے کالم لکھتے رہتے ہیں۔ LINK آپ کے ہاں بھی پہنچتا رہتا ہوگا۔

خیر طلب
داؤد رہبر

آپ بیتیاں

نامۂ اعمال	سر محمد یامین خاں۔ آئینۂ ادب لاہور ۱۹۷۰ء جلد اول اور جلد دوم
ناقابلِ فراموش	سردار دیوان سنگھ مفتوں۔ مکتبۂ شعر و ادب لاہور ۱۹۵۷ء
یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی۔ جوش اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۰ء
کھوئے ہوؤں کی جستجو	شہرت بخاری۔ مکتبۂ سنگ میل لاہور ۱۹۸۷ء
عشرت فانی	عشرت رحمانی۔ مکتبۂ سنگ میل لاہور ۱۹۸۵ء
سرگزشت	عبدالمجید سالک۔ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۶۶ء
سرگزشت	ذوالفقار علی بخاری۔ معارف لمیٹڈ کراچی ۱۹۶۶ء
کاروانِ حیات	مشتاق احمد خاں۔ آفتاب عالم پریس لاہور ۱۹۷۴ء
میری زندگی کے پچھتر سال	اعجاز الحق قدوسی۔ مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۸۸ء
شام کی منڈیر سے	ڈاکٹر وزیر آغا۔ مکتبۂ فکر و خیال لاہور ۱۹۸۶ء
رو میں ہے رخشِ عمر	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۶ء
آپ بیتی	مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۳ء
داستانِ غدر	ظہیر الدین ظہیر دہلوی۔ اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۵ء
خاطرات	ظفر حسن ایبک۔ مکتبۂ سنگ میل لاہور ۱۹۹۰ء
ہم سفر	حمیدہ اختر حسین رائے پوری۔ مکتبۂ دانیال کراچی ۱۹۹۵ء
تحدیثِ نعمت	محمد ظفر اللہ خاں۔ جسارت پرنٹرز لاہور ۱۹۷۱ء
کاروانِ زندگی (جلد اول، دوم)	مولانا سید ابوالحسن ندوی۔ مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۵ء
حیاتِ مستعار	جلیل قدوائی۔ مکتبۂ اسلوب۔ کراچی ۱۹۸۷ء
ناممکن کی جستجو	حمید نسیم۔ فضلی سنز۔ کراچی ۱۹۹۰ء

KUTABKHANA OSMANIA

اعمال نامہ	سر رضا علی۔ فکشن ہاؤس۔ لاہور۔ ۱۹۹۵ء
جہادِ زندگی	مولوی فیروز الدین۔ فیروز سنز۔ لاہور ۔۱۹۷۳ء
گیان سنگھ شاطر کی آپ بیتی	فکشن ہاؤس لاہور ۔۱۹۹۵ء
شاد کی کہانی شاد کی زبانی	مولانا سید علی محمد شاد عظیم آبادی۔ معارف پریس اعظم گڑھ ۔۱۹۶۱ء
میر کی آپ بیتی	(ذکر میر کا اُردو ترجمہ فارسی سے) مترجم: نثار احمد فاروقی۔ مکتبہ برہان، دہلی ۔۱۹۵۷ء
بری عورت کی کتھا	کشور ناہید۔ سنگ میل۔ غیر مؤرخہ
بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل	شورش کاشمیری۔ مطبوعات چٹان لاہور ۔۱۹۷۲ء

سوانح عمریاں

یادگارِ انیس	مولفہ امیر احمد علوی۔ ہندوستان کتاب گھر لکھنو ۔۱۹۵۷ء
ماہنامہ 'فروغِ اردو' لکھنو	جگر نمبر۔ حصہ اول۔ حصہ دوم ۔۱۹۶۱ء
تذکرۂ جگر	مصنفہ محمود علی جامعی۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۔۱۹۶۲ء
نقشِ حالی	حصہ اول، حصہ دوم۔ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، احتشام حسین رضوی، شجاعت علی سندیلوی۔ سرفراز قومی پریس، لکھنو۔ غیر مؤرخہ
اکبر الٰہ آبادی	مصنفہ طالب الٰہ آبادی۔ مطبع انوار احمدی، الٰہ آباد۔ غیر مؤرخہ
حضرت اکبر کے شب و روز	محمد رحیم دہلوی۔ مکتبہ رضیہ کراچی۔ غیر مؤرخہ
تلوک چند محروم	ادارہ فروغِ اردو لکھنو ۔۱۹۵۹ء
داغ	تمکین کاظمی۔ آئینہ ادب لاہور ۔۱۹۶۰ء
شبلی نامہ	شیخ محمد اکرام، ناشر: شیخ نذیر احمد، بمبئی غیر مؤرخہ
حیاتِ شبلی	سید سلیمان ندوی۔ سلسلہ دار المصنفین نمبر ۲۶۔ غیر مؤرخہ
یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ غیر مؤرخہ
حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی	محمد اسلم سیفی۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۔۱۹۳۹ء
یادگارِ غالب	مولانا حالی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۔۱۹۶۳ء
حیاتِ غالب	شیخ محمد اکرام۔ فیروز سنز لاہور۔ غیر مؤرخہ
ذکرِ غالب	مالک رام۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۔۱۹۶۴ء
غالب	مصنفہ مولانا غلام رسول مہر۔ ناشر: شیخ مبارک علی لاہور۔ طبع چہارم۔ غیر مؤرخہ
حیاتِ اشرف	سوانح مولانا شاہ اشرف علی تھانوی۔ مصنف مولانا غلام محمد، مکتبہ تھانوی کراچی۔ غیر مؤرخہ
پریم چند	مصنفہ ہنس راج رہبر۔ مکتبہ جامعہ، بار دوم ۔۱۹۵۸ء
منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے	از ڈاکٹر قمر رئیس۔ مکتبہ عالیہ رام پور۔ بار اول ۔۱۹۶۲ء

حیاتِ جاوید	مصنفہ مولانا حالی۔ اکادمی پنجاب، لاہور ۔۱۹۵۷ء
مولانا ظفر علی خاں	حیات، خدمات اور آثار۔ مصنفہ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ مکتبہ سنگ میل' لاہور ۔۱۹۹۳ء
روزگارِ فقیر	فقیر سید وحید الدین۔ مکتبہ 'جدید' لاہور۔ غیر مؤرخہ
ذکرِ اقبال	مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک۔ بزم اقبال' لاہور۔ غیر مؤرخہ
امام الہند	(حیاتِ مولانا ابوالکلام) مصنفہ ابو سلیمان الہندی۔ مکتبہ 'اسلوب، کراچی ۔۱۹۶۲ء
ہارون الرشید	مصنفہ عبدالجبار الجومرد (عربی سے اُردو ترجمہ، رئیس احمد جعفری) مرکزی اردو بورڈ لاہور ۔۱۹۶۸ء
الغزالی	مصنفہ علامہ شبلی۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔ غیر مؤرخہ
سیرۃ النعمان	(امام ابو حنیفہ کی سوانح حیات) مصنفہ علامہ شبلی۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔ غیر مؤرخہ
المامون	مصنفہ علامہ شبلی۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی' کراچی ۔۱۹۷۲ء
مومن	حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر۔ مصنفہ کلب علی خاں فائق رام پوری۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۱۹۶۱ء
حیاتِ امام ابن القیم	مصنفہ عبدالعظیم شرف الدین (بزبانِ عربی) اردو ترجمہ: سید رشید احمد ارشد۔ نفیس اکیڈمی' کراچی ۔۱۹۶۳ء
امام ابن تیمیہ	مصنفہ پروفیسر ابو زہرہ (بزبان عربی) اردو ترجمہ نائب حسین نقوی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۔۱۹۶۸ء
حیاتِ امام ابن حزم	پروفیسر ابو زہرہ (بزبان عربی) اردو ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور۔ غیر مؤرخہ
حیاتِ سعدی	مولانا حالی' مجلس ترقی ادب' لاہور ۔۱۹۷۰ء
تذکرۂ غوثیہ	سید شاہ گل حسن قادری۔ نوری بک ڈپو' لاہور ۔۱۹۷۷ء

10 November, 1997

گرامی جناب عبدالوہاب سلیم صاحب!

السلام علیکم، اخبارات کا تحفہ موصول ہوا۔ ان میں جو خبریں ہیں، میرے لیے پہیلیاں ہیں۔ شطرنج میں نے کبھی نہیں کھیلی۔ تاش کی بازی کیسے کھیلتے ہیں، یہ بھی یاد نہیں رہا۔ میں نے ان اخباروں کی ورق گردانی اس امید میں کی کہ ضیاء محی الدین کا نوشتہ کوئی کالم ان میں ہوگا۔ ان کے قلم کی کوئی تحریر ان میں نہ پائی۔

ہماری نسل کے لوگ اب سیاست سے کنارہ کش ہیں۔ اگلی نسل کے جوان اب سیاسیات ہی میں نہیں،

KUTABKHANA OSMANIA

ادبیات میں بھی پیش پیش ہیں۔ ان میں میرے شناسا بہت ہی کم ہیں۔ میں وہاں کا اخبار پڑھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ کسی دوسرے کرہ کی خبریں پڑھ رہا ہوں۔

البتہ ان اخباروں کی ترسیل شہادت ہے اس بات کی کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ آپ کی مہربانی ہے۔

علی گڑھ سے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے مجھے خط لکھا۔ اس کے ساتھ ایک مضمون ملفوف کیا جو آپ کے لیے ہے۔ یہ مضمون اور ان کا ایک نامہ جو آپ کے نام ہے، دونو چیزیں آپ کو بھیجی جا رہی ہیں۔

خیر طلب

داؤد رہبر

30 December, 1997

کرم فرما محترم جناب عبدالوہاب سلیم صاحب!

السلام علیکم! آپ کے پیہم التفات سے میں بہت متاثر ہوں۔ پہلے آپ نے خالدہ ادیب خانم کا ''سفرنامۂ ہند'' مرحمت فرمایا۔ پھر تین سفرنامے پڑھنے کو بھیجے۔ یہ سارے سفرنامے میں نے پڑھ لیے۔ ''سفرنامۂ ہند'' ان میں بہترین ہے۔ ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی کا ہے۔ مصنفہ خوش نصیب تھی کہ اسے ایسا قادر اللسان مترجم ملا۔ سید صاحب کا اسلوبِ بیان ان کی ساری تصانیف میں دلکش ہے۔ پلوٹارک کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا۔ اس کا عنوان ''مشاہیر یونان و روما'' ہے۔ آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ خالدہ ادیب خانم کی سوانح عمری انگریزی میں ضرور کسی نے لکھی ہوگی۔ لائبریریوں میں تلاش کروں گا۔ موصوفہ نے وطن چھوڑ کر پیرس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں۔

نہایت امتنان کے ساتھ تین کتابیں واپس بھیج رہا ہوں۔ کوثر نیازی صاحب کے سفرنامے میں معلومات مفید ہیں۔ اگر وہ مختلف مقامات کو اپنے پہنچنے کی اور مدتِ قیام کی تاریخیں بھی لکھتے جاتے تو کتاب مفید تر ہوتی۔

حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی میں معلومات جستہ جستہ ہیں۔ کتاب مختصر ہے۔ گھریلو باتیں اس میں نہیں۔ طالب علمی کے احوال ہیں اور کچھ قصے مراسم کے ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا سفرنامہ تو ضیافتوں کی ڈائری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ڈائری کے اندراجات تکان کی حالت میں کیے گئے ہیں۔ داستان طرازی اس کتاب میں نہیں ہے۔

امید ہے آپ کی صحت اب بحال ہوگی۔

منت گزار

داؤد رہبر

11 January, 1998

دوستدارِ ادب و ادیباں عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم! سفرنامۂ ابن بطوطہ کا عطیہ آپ کی طرف سے کرم بالائے کرم ہے۔ انگریزی ترجمہ مدت ہوئی نظر سے گزرا۔ اردو ترجمہ فرحت کے لیے پڑھوں گا۔ باقی دونوں کتابیں واپس بھیج رہا ہوں۔ پینڈرل مون صاحب خوش فکر اور خوش بیان آدمی ہیں۔ ان کی تصنیف ''ہند میں انگریزی ریاست'' ظاہر ہے کہ انگریزی سے

ترجمہ کی گئی ہے۔ اس اشاعت پر نہ مترجم کا نام درج ہے نہ مترجم یا ناشر کی طرف سے کوئی دیباچہ ہے۔ ترجمہ گویا گمنام ہے۔ اسے جاتے چور کی لنگوٹی کیوں نہ کہیں۔ اس کتاب میں عدالتوں کے مقدمے بیان ہوئے ہیں اور مکالمے بھی خوب ہیں۔ یوں کتاب میں افسانے کی سی بات پیدا ہوئی ہے۔

''ہندی مسلم تہذیب'' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ قاضی جاوید صاحب سمجھدار آدمی ہیں۔ کتاب کے نو ابواب میں سے تین باب بہت اچھے ہیں:۔

شاہ ولی اللہ کا نظامِ فکر

شاہ عبداللطیف کا تصوف

پنجاب کی صوفیانہ روایت

قاضی صاحب نے یہ کتاب کیا اردو ہی میں لکھی؟ اگر ایسا ہے تو ان کی زباندانی کی داد دینی چاہیے۔ اگر انگریزی میں لکھ کر کسی سے ترجمہ کرایا گیا تو اشاعت پر مترجم کا نام مطبوع ہونا چاہیے۔

آپ نے میرے شوق کی قدر دانی فرمائی اور مطالعہ کا موقع دیا۔ فی الحال اور کتابیں نہ بھیجے گا کہ جب آتی ہیں تو فوراً پڑھ ڈالنے سے باز رہنا دشوار ہوتا ہے۔ اس وقت میں ایک تصنیف (بزبانِ انگریزی) میں لگا ہوا ہوں۔ اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو برس اس میں صرف ہوں گے۔ اس کام کے لیے اب کامل یکسوئی درکار ہے۔ اردو کی تو بہت سی سوانح عمریاں نظر سے گزریں، اب مجھے یورپین سوانح عمریوں کا مطالعہ مطلوب ہے تاکہ کلچروں کے امتیازات سامنے آئیں۔

آپ سے گفتگو ہوئی تو میں سمجھا کہ مطبعہ سنگِ میل سے اعجاز حسین بٹالوی صاحب کے خطبات چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ میں نے کل اعجاز صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ خطبات ان کے نہیں حلقۂ اربابِ ذوق کے سالانہ اجلاسوں کے خطباتِ صدارت ہیں جو کئی ممتاز ادیبوں کے قلم سے ہیں۔ اعجاز صاحب نے بڑی تلاش سے فراہم کیے اور انہیں اشاعت کے لیے مرتب کیا۔ ایک سالانہ جلسے کے صدر اعجاز صاحب خود تھے۔ چنانچہ ایک خطبہ خود ان کا بھی اس میں شامل ہے۔

والسلام

شریکِ حال

داؤد رہبر

29 January, 1998

صاحبدل عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم، دو اور اچھی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ میں آپ کا احسان مند ہوں۔ اختر الایمان کی آپ بیتی میں نے ساری پڑھی۔ میری ان کی ملاقات علی گڑھ، دلی اور لاہور میں رہی۔ (۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء) ان دنوں وہ بھاری بھرکم نہیں تھے، نازنین آدمی تھے۔ شیروانی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے رکھتے تھے۔ متبسم اور لطیفہ گو اور باتونی۔ ان کے بچپن کی کہانی سبق آموز ہے۔ اسے پڑھ کر میں ان کی ہمت اور استقلال کا قائل ہوا۔ آپ بیتی میں صاف گوئی ہے، اس میں نہ لاف زنی ہے نہ جھوٹا انکسار۔ انہوں نے مشقت کی زندگی گزاری۔ اپنے دوستوں سے

KUTABKHANA OSMANIA

ان کا برتاؤ مخلصانہ رہا۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

دوسری کتاب میں سے ان کی منظومات میں نے فوٹو کاپی کر کے محفوظ کر لی ہیں۔ دونوں کتابیں واپس بھیجی جا رہی ہیں، بڑی مہربانی۔

کبھی نیویارک آیا تو آپ سے ملنا ہوگا، ان شاء اللہ۔ اب اور کوئی کتاب نہ بھیجئے گا۔ میں یکسوئی کے ساتھ ایک تصنیف میں لگا ہوا ہوں۔ اخبارات بھی نہ بھیجئے۔ ان میں سیاست ہی سیاست ہے اور سیاست میں شرافت کم اور خباثت زیادہ ہے، الامان۔

حج کی نیت مبارک۔ بیگم صاحبہ کو سلام۔

خیر خواہ

داؤد رہبر

27 February, 1998

مکرمی!

السلام علیکم! دونوں کتابیں واپس بھیجی جا رہی ہیں۔ عنایاتِ مسلسل کا شکریہ۔

اُمید ہے کہ میرا شاگرد کل شام آئے گا تو Video ساتھ لائے گا۔ اس کا پیکٹ بنا کر پیر کے دن بھیجوں گا۔ "نسخہ ہائے وفا" (مطبوعہ لاہور) کا دوسرا نسخہ ملا تو وہ بھی بھیج دیا جائے گا۔

برسوں پہلے کے فوٹو تو میرے پاس بیسیوں ہیں، ریٹائر ہوئے اب مجھے سات برس ہو گئے۔ اس دوران میں فوٹو کھچوانے کے موقعے آئے ہی نہیں، سوائے ایک تقریب کے۔ اس کا فوٹو ارسال ہے۔ پرانے فوٹو بھیجنے میں کوئی تک نہیں ہے۔

لیجیے، ابھی یاد آیا کہ پاسپورٹ کی تجدید کے لیے ۱۹۹۶ء میں ایک فوٹو کھنچوایا۔ اس کے بچے ہوئے دو تین پرنٹ گھر میں ہیں۔ ایک اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔

نسخہ ہائے جفا یعنی اخبارات اب نہ بھیجئے گا، نواں حج مبارک ہو۔ یہ سعادت میری قسمت میں نہ تھی۔

میری قسمت میں حج کی سعادت نہ تھی
دور کعبے سے میں چار فرسنگ تھا

جو مضمون میں نے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی فرمائش سے لکھا ہے۔ اس کی کاپی آپ کو بھیجنے سے معذور ہوں۔ آپ کی ثقاہت کا میں قایل ہوں لیکن بعد چند تجربوں کے میں اب محتاط ہو گیا ہوں۔ کوئی ہلکا پھلکا مضمون ہو تو اور بات ہے۔ میری تدریس اور تصنیف کے موضوعات ادیان سے متعلق ہیں۔ یہ بات میرے لیے باعثِ برکت بھی ہے اور وجہ اضطرار بھی اس لیے کہ ہر گروہ میں تامل اور تحمل دونوں کی کمی ہے۔ خلاف مزاج ذرا سی بات سے لوگ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ نازک مزاجی کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ برداشت روشن خیالی سے بڑھتی ہے۔

میں نے آغا بابر صاحب کو ایک مضمون کا مسودہ بھیجا، فون پر اس کے بارے میں گفتگو چاہی تو انہوں نے کہا، تمہارا مضمون میرے سامنے نہیں ہے۔ فلاں صاحب مانگ کر لے گئے ہیں۔ ایک اور مضمون میں نے انہیں

KUTABKHANA OSMANIA

بھیجا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر چھپنے کے لیے LINK کے ایڈیٹر کو بھیج دیا۔ ہر چند انہوں نے ازراہِ مہربانی ایسا کیا لیکن ایسے بعض تجربوں کے بعد میں اس اصول کا پابند ہو گیا ہوں کہ غیر مطبوعہ تحریریں اپنی صرف رسالے کے ایڈیٹر یا کتاب کے ناشر کو بھیجا کروں۔ اُمید ہے آپ برا نہ مانیں گے، سنجیدہ موضوعات پر لکھنا بڑی ذمہ داری کی بات ہوتی ہے۔

حلاج والا مضمون جب چھپ جائے گا تو میں مطبوعہ صفحات کی فوٹو کاپی آپ کو بھیجوں گا۔ ان شاء اللہ۔

بیگم صاحبہ کو سلام۔

بندۂ خدا

داؤد رہبر

12 March, 1998

کتابوں کے دوست محترم عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم، نیویارک دلی کیسے بن جائے، بوسٹن لاہور کا نعم البدل کیسے ہو جائے۔ ہاں البتہ وہاں کی موسیقی کے ریکارڈوں سے اور وہاں کی کتابوں کی ورق گردانی سے اور (سب سے بڑھ کر) وہاں کے مسالوں اور اچاروں اور مٹھائیوں کے تناول سے مکافات کی کچھ صورت ہے۔

پچھلے پارسل کے ساتھ میں نے خط نہ لکھا۔ خط لکھنے میں پہلے کی سی مستعدی اب مجھ میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ آپ کو کیا بتاؤں، اب ٹیلی فون کا زمانہ ہے۔ تپاک کے اظہار کو جی چاہے تو لوگ فون کر دیتے ہیں۔ فون کے جواب میں فون کرنے والے بھی خال خال ہیں۔ اخلاص تو سورۂ اخلاص ہی میں رہ گیا۔

میں جی لگا کر کسی کو چار خط لکھوں اور ان کے جواب میں ادھر سے ایک خط بھی نہ آئے تو بتایئے پانچواں خط لکھنے کو کس کا جی چاہے گا۔ اگلے وقتوں میں ایسا نہیں تھا۔

کبھی گفتگو ہوگی تو آپ سے پوچھوں گا کہ کس طرح کی موسیقی آپ کو پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پکا گانا آپ کو پسند نہیں۔ بہر حال اب آپ کے احرام باندھنے کا وقت قریب ہے۔ راگ رنگ کچھ مدت موقوف رہیں گے۔ آپ حج کر کے واپس آئیں گے تو باتیں ہوں گی۔

بیگم صاحبہ کو سلام

نیاز مند

داؤد رہبر

14 October, 1998

پاسدارِ خاطرِ احباب عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم، مدت سے یہ تہیہ دل میں لیے بیٹھا تھا کہ اردو کی دس پندرہ منتخب آپ بیتیوں سے تاثر لے کر ایک کتاب لکھوں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی پڑھ کر گمان گیا کہ اس طرح گریباں چاک کر کے اپنے آپ سے کھلا اور مفصل تعارف اور کسی نے نہیں کرایا۔ اسی کے بارے میں لکھنا شروع کیا تھا کہ یکا یک حمید نسیم صاحب سے مراسلت کا آغاز ہوا۔ جو آپ بیتیاں میرے منصوبے میں شامل تھیں۔ ان کی فہرست میں نے انہیں

بھیجی اور بتایا کہ اس کتاب کے لکھنے میں تین برس لگیں گے۔ انہوں نے جواب لکھا کہ اگر ایسا ہے تو میرے جیتے جی یہ کتاب طبع نہ ہوگی۔ ان کا خط پڑھ کر میں نے اپنے جی میں کہا، کیوں نہ حمید نسیم صاحب کی خوشی کے لیے ان کی آپ بیتی کو مقدم رکھوں اور پہلے اسی کا ذکر چھیڑوں۔

اسے میں ایک بار پڑھ چکا تھا۔ اب اسے موضوعِ تحریر کی حیثیت سے پڑھنا لازم ہوا۔ غور سے مطالعہ شروع کیا تو ایک اور خیال پیدا ہوا کہ کسی بھی ذات کو تنہا رکھ کر اس کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ تنہا زندگی کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ اسی خیال سے میں نے ''ناممکن کی جستجو'' کے تذکرہ میں ذوالفقار بخاری صاحب کی ''سرگزشت'' کا تذکرہ شامل کیا۔

آٹھ قسطیں لکھ ڈالیں۔ ان کے بعد پچھلے دو سال یہ سلسلہ دیگر مصروفیتوں کے باعث بند رہا۔ چند باب اس کے لکھنے باقی ہیں۔ ان کے لیے وقت نکالنا پڑے گا۔

۲۳۔ اکتوبر کو چار روز کے لیے کینیڈا جاؤں گا۔ اوٹوا میں ایک جلسہ بھگتا کر ٹورانٹو جاؤں گا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی دختر صبیحہ جیلانی وہاں آ کر اپنی بیٹیوں کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔ ان سے ٹورانٹو میں چند گھنٹے ملاقات رہے گی۔

اس ہوائی سفر کے بعد نومبر میں مجھے تین لیکچر دینے کو بوسٹن جانا ہے۔ آج کل ان لیکچروں کی تیاری میں لگا ہوا ہوں۔

یہ سطور لکھ چکا تو آپ کا فون (ابھی دس بجے صبح) آیا اور آپ نے میرے انتقالِ پُرملال کی افواہ سے مجھے مطلع فرمایا۔ اس خبر کو میں نے حاصلِ مشاعرہ سمجھا۔ صوفیاء کی زبانوں پر ایک حدیث بھی ہے:-

موتوا قبل ان تموتوا

یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ۔

افواہ اور پتنگ میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں اُڑائی جاتی ہیں۔ البتہ پتنگ کی ڈور اُڑانے والے کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ افواہ کی ڈور ہوتی ہی نہیں۔ اس لیے تحقیق معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے اُڑائی۔ اس افواہ کی معتبر اخباری تردید اعجاز حسین بٹالوی صاحب ہی کر سکیں گے۔ قیاس ہے کہ اشفاق نقوی کو کسی وجہ سے بابر اور رہبر کے درمیان مغالطہ ہوا۔

والسلام مع الاکرام۔

ابھی زندہ

داؤد رہبر

18 October, 1999

مکرمی عبدالوہاب خاں سلیم صاحب، السلام علیکم!

اصل اہل الکتاب تو آپ ہیں یعنی لائبریرین۔ آغا بابر مرحوم کی برسی نیویارک میں یعنی آپ کے شہر میں منائی گئی لیکن آپ جلسے میں شریک نہ ہو سکے۔ ہوتے تو ملاقات ہو جاتی۔ اُدھر آپ عمرہ سے ثواب کما رہے تھے، اِدھر ہم جلسے میں شعرخوانی کر رہے تھے

KUTABKHANA OSMANIA

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

عربی میں کعبہ پانسے کو بھی کہتے ہیں۔ کعبتین کے معنی ہوئے دو پانسے۔

مغل سلاطین عجب قسم کے بادشاہ تھے۔ ان میں سے کسی نے حج نہ کیا۔ بہادر شاہ ظفر حج کا ارادہ ہی کرتے رہے۔ احرام باندھنے کی نوبت نہ آئی۔ رام پور کے نواب کلب علی خاں نے ۱۸۷۲ء میں حج کیا۔ میرزا داغ ان کے ہمراہ گئے۔ داغ نے یہ شعر کہا

دَیر سے کعبے کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

کے پہنچ کر انہوں نے جو غزل کہی، اس کا ایک شعر یہ ہے

خدا کا شکر ہمیں داغ حج نصیب ہوا
قصور وار گئے بے قصور ہم آئے

بہادر شاہ ظفر سے مخاطب ہو کر میرزا غالب نے یہ شعر کہا

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

تین چیزوں کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ انتظار حسین صاحب کا وہ مضمون جس میں انہوں نے مولانا صلاح الدین کو لاہور کا پیدل آدمی کہہ کر یاد کیا ہے، دوم:- یادگار نامہ قاضی عبدالودود والا مضمون اور سوم: وہ مضمون جو میں نے آغا بابر کی برسی کے جلسے میں پڑھا۔ تینوں چیزیں اس خط کے ساتھ ملفوف ہیں۔

والسلام

بندہ

داؤد رہبر

12 November, 1999

محترمی عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم، یورپ، امریکہ، چین، جاپان اور کوریا کی خبریں اب سراسر اقتصادی ہو گئی ہیں۔ انہیں سن کر سر دُکھتا ہے اور ہندوستان اور پاکستان کی خبریں پڑھ کر دل دُکھتا ہے۔ میں اخبار کبھی نہیں پڑھتا۔ روز خبریں شام کے ساڑھے چھ بجے ٹیلی ویژن پر سن لیتا ہوں۔

شاہ غوث علی قلندر سے کسی نے کہا، حضرت ملک معظم جارج اور ان کی ملکہ میری انگلستان سے آئے ہیں۔ سارے ہندوستان سے مہاراجے اور نوابان ان کو تعظیم دینے دلی پہنچے ہیں۔ آپ بھی جلوس اور دربار کا تماشا دیکھنے چلیں۔ انہوں نے سن کر یہ آیت کریمہ پڑھی:

یولج اللیل فی النهار ویولج النهار فی اللیل

اور کہا، اس سے بڑا تماشا کونسا ہوگا۔

غرض یہ کہ اخبارات واپس بھیج رہا ہوں۔ ''داستانِ غدر'' کا نسخہ اور رسالہ ''اُردو'' بھی ان کے ساتھ ملفوف ہیں۔ گیان چند صاحب کا مضمون میں نے پڑھ لیا۔ ''داستانِ غدر'' پڑھ کر واپس بھیج دیں۔

والسلام

ممنون

داؤد رہبر

4 January, 2000

مکرمی حاجی عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم! آپ نے نو حج کیے۔ خواب ثواب کمایا۔ اس کمائی پر بھی زکوٰۃ لازم ہے۔ اپنے ثواب میں سے کچھ ہمیں بھی دیجیے۔

آپ نے پہلے بھی فرمائش کی تھی کہ میں آپ کو اچھے اچھے، بھرے بھرے اور ہرے بھرے خط لکھا کروں۔ اب آپ کا جو خط آیا ہے، اس میں فرمائش ہوئی ہے کہ میں پرانے لاہور کی اور اورینٹل کالج کے احوال خطوں میں لکھوں یعنی تفصیل سے لکھوں۔

خدا نے اکیسویں صدی ہم کو جیتے جی دکھا دی۔ شکر ہے، اگر بیسویں صدی میں ہماری اجل آ جاتی تو ہم کیا کر لیتے۔ یہ نئی صدی جو آئی ہے، اس میں دوستانہ مکتوب نویسی کہاں تک کیے جاؤں۔ مراسلت کا مزا تب ہے کہ مزیدار جواب بھی آیا کریں۔ ڈاک میں آج کل صرف بجلی، پانی اور ٹیلی فون کے بل آتے ہیں۔ کئی ہفتوں کے وقفے کے بعد اگر کوئی خط آتا ہے تو پورے ایک صفحے کا بھی نہیں ہوتا اور لکھنے والا دستخط ایسی جھنجلاہٹ کے ساتھ کرتا ہے گویا مکتوب الیہ سے ناراض ہے اور خط لکھنے کو بیگار سمجھتا ہے۔

میں جو خط لکھتا ہوں کبھی کبھی دو تین صفحوں کا ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ لمبا خط خط نہیں رہتا بلکہ جواب مضمون ہو جاتا ہے۔

پرانے لاہور کی تھوڑی سی باتیں تو فون پر ہو سکتی ہیں لیکن جی بھر کے ایسی باتیں کرنے کو ملاقات لازم ہے۔ خط میں کیا لکھوں اور کتنا لکھوں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور میں بلکہ ہندوستان میں اورینٹل کالج کی حیثیت کیا تھی۔ کبھی فرصت ملی تو اس پر ایک مضمون لکھوں گا۔

۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر غلام حسین صاحب نے اورینٹل کالج کی تاریخ مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے حصہ دوم کا ایک باب ''نامور اساتذہ'' کے عنوان سے ہے، اس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔

قیامِ پاکستان کے بعد کالج کی حیثیت کچھ اور ہو گئی۔ سنسکرت اور ہندی کی تدریس خارج ہوئی۔ بعض نئے شعبے قائم ہوئے۔ پرانے شعبوں میں نئے اساتذہ جانشین ہوئے۔ یہ کہانی مجھے بخوبی معلوم نہیں۔ ممکن ہے پچھلے چالیس برسوں کی تاریخ بھی لکھی گئی ہو۔ لاہور جاؤں تو معلوم کروں۔

خوش وقت ہونے کے لیے آپ انگریزی کی کتابیں بھی پڑھا کیجیے۔ گنگا اور جمنا اور راوی ہی کو یاد

KUTABKHANA OSMANIA

کرتے رہنے سے اُداسی طاری رہے گی۔ اب تو آپ کو اور ہمیں یہیں رہنا ہے اور یہی جمنا ہے۔

والسلام مع الاکرام۔

بندہ

داؤد رہبر

28 April, 2000

محبی عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم، انگریزی تصنیف کا کام یکسوئی چاہتا ہے۔ لمبا مضمون لکھنے کے لیے فراغت چاہیے۔ فی الحال ایک خط میں نے انتظار حسین صاحب کو لکھا ہے۔ آپ پڑھ لیجیے۔

گرمیوں میں اپنی بہن سے ملنے آؤں گا۔ ان کا داماد بڑا مومن آدمی ہے۔ تاہم خواہشمند ہے کہ ان کے گھر میں میرے گانے کی ایک محفل ہو۔ تاریخ مقرر ہو جائے تو آپ کو اطلاع دوں۔ غالباً جون کے دوسرے ہفتے میں ہوگی۔ کیا معلوم کہ آپ پھر کب عازمِ عمرہ ہو جائیں۔

خطوطِ غالب کے انگریزی ترجمہ کے لیے میں نے ناشر کو فون کر دیا ہے۔ دو چار روز میں پارسل موصول ہوگا تو میں اسے دوسرے لفافے میں ڈال کر آپ کی طرف روانہ کر دوں گا۔

والسلام نیازمند

داؤد رہبر

22 February, 2001

کرم فرما مکرمی عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم، عاتکہ صدیقہ واپس آ چکی ہوں گی۔ اچھا ہوا۔ دونوں کتابیں انہوں نے اپنی نگرانی میں چھپوا لیں اور مولانا کی یاد میں جلسہ بھی کتابوں کی رونمائی کے سبب سے ہوا اور مولانا کے ارادتمند اس میں شریک ہوئے۔ وجیہہ الدین احمد باوجود اپنی نقاہت کے وہاں پہنچے لیکن انہوں نے وہاں تقریر نہ کی۔ البتہ دو کتابوں میں سے ایک کے لیے ایک مضمون انہوں نے لکھا۔

یادگار نامہ قاضی عبدالودود میں میرا جو مقالہ ہے، اس کی فوٹو کاپی بنوا کر مجھے عنایت فرمائیں۔ کتاب کے سرورق کی فوٹو کاپی اس کے ساتھ بھیجیں تو سند رہے۔

عاتکہ بیگم کا پتہ نیچے درج ہے۔

والسلام مع الاکرم

نیازمند

داؤد رہبر

Mrs. Atika Sadeeqa
610 North Campus Avenue
Upland, CA 91786
Phone No. (909)949-0802

7 October, 1997

بخدمت ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب

گرامی جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! آپ کا ۱۴۔ ستمبر کا لکھا ہوا کرم نامہ یہاں ستمبر کے آخر میں پہنچا۔ اس سے قبل فاران احمد صدیقی صاحب کے ہاتھ بھیجا ہوا علی گڑھ میگزین ملا۔ اس وقت مجھے لوئی ماسی نیون کانفرنس میں شرکت کے لیے باہر جانا تھا۔ یہ انڈیانا کی ایک یونیورسٹی میں منعقد ہوئی۔ امریکہ اور فرانس سے آئے ہوئے کئی مداحینِ ماسی نیون نے اس میں مقالے پڑھے اور اس مستشرق کی یاد کے ساتھ منصور حلاج کی یاد بھی منائی گئی۔

وہاں سے واپس آیا تو ڈاکٹر سید حبیب احمد صاحب کے ہاتھ بھیجے ہوئے رسالے اور مضامین موصول ہوئے اور ''نذرِ مختار'' کا نسخہ بھی نظر نواز ہوا۔

''علی گڑھ میگزین'' میں سفر میں ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے سارے مضمون میں نے طیارہ نشینی کے حال میں پڑھے۔ آپ کا چون برس پہلے کا لکھا ہوا روزنامچہ سینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر (چھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے) اُڑتے ہوئے پڑھا۔ اس میگزین کے ہاتھ میں ہوتے ہوئے کسی انگریزی میگزین کی طلب کیوں ہوتی۔ قرأتِ مضامینِ اُردو سے سفر خوشگوار ہوا۔

''علی گڑھ کے شب و روز'' کی ایک کاپی آپ نے آغا بابر صاحب کے لیے بھیجی ہے۔ آپ کے حسبِ خواہش اس کی فوٹو کاپی بنا کر ڈاکٹر سعید اختر صاحب کو کل بھیج دی جائے گی۔ اصل کاپی آغا بابر صاحب کو پرسوں بھیجوں گا۔ کوئی دوست آغا صاحب کو کوئی رسالہ یا کتاب بھیجے تو وہ توقع رکھتے ہیں کہ بھیجنے والا انہیں اس کے ساتھ ایک خط بھی لکھ کر بھیجے۔ پارسل کے اندر سے خط برآمد نہ ہو تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ خط بھی وہ گرمجوشی والا مانگتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید اختر صاحب کے گھر کا فون نمبر آسانی سے مل گیا۔ یہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ اس لیے یونیورسٹی میں ان کا نہ اب کوئی دفتر ہے، نہ فون نمبر۔ ان کا پتا میں اس خط کے آخر میں درج کر دوں گا۔

انڈیانا کی کانفرنس میں جانے سے پہلے میں نے ایک خط آپ کو لکھا۔ اس میں آپ کی اس تالیف کا ذکر کیا جو ۱۹۶۹ء میں آپ کے دستِ مبارک سے آپ کے دستخط کے ساتھ ازراہِ تالیفِ قلب مجھ کو (علی گڑھ میں) عطا ہوئی یعنی المبرد کا رسالہ بنام احمد بن الواثق العباسی۔ یہ اس وقت میرے سامنے رکھا ہوا ہے۔

اپنی دیگر نگارشات اور تدوینات جو آپ نے بھیجی ہیں، ان سب کو دیکھ کر جی بہت ہی خوش ہوا۔ آپ نے مولانا میمن کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ آپ کے عطیات کی آمد نے مرحوم کی یاد تازہ کی۔ ان کا طرزِ تکلم کیسا شاندار تھا اور ان کی آواز اور ان کے لہجے میں موسیقیت تھی۔ گھمبیر آواز جوان کی باوقار اور کلاسیکل شخصیت کی شان بڑھاتی تھی۔

میں تو مارچ ۱۹۴۹ء سے بیرونی آدمی ہوں۔ پاکستان میں رہا ہی نہیں۔ اچھا ہوا کہ آپ کی سکونت علی گڑھ ہی میں رہی۔ بھارت میں عربی، فارسی اور اردو کی باغبانی جس شگفتگی اور سلیقے سے ہو رہی ہے، ویسی پاکستان میں نہیں ہو رہی۔ اردو کتب کی طباعت اور پروف خوانی میں آپ کے ہاں احتیاط بہتر ہے۔

آپ نے میرے برادر مرحوم یعقوب صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے آکسفورڈ میں فنِ ریاضی کی ایک ماہرہ سے شادی رچائی۔ یہ بی بی کنٹربری کے آرچ بشپ ریمزے کی بھتیجی ہے۔ اس کے والد صاحب انگلستان کے ممتاز ریاضی دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

امریکہ میں یعقوب بھائی کی پہلی ملازمت ایم آئی ٹی میں تھی۔ یہ انسٹی ٹیوٹ بوسٹن میں ہے اور ٹیکنالوجی کا مکہ سمجھی جاتی ہے۔ میری نوکری ان دنوں ہارٹفورڈ میں تھی جو بوسٹن سے سو میل کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ ملاقات میں آسانی تھی۔

بوسٹن سے مرحوم اوہایو سٹیٹ یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر ہو کر منتقل ہوئے۔ وہیں ان کی بی بی کا تقرر ریاضی کی پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔

۱۹۸۱ء کے آخر میں میاں بی بی کرسمس کی تعطیل کے ایام میں لندن گئے۔ ۳۰ دسمبر کو وہاں ایک روز بھائی صاحب بازار گئے۔ موٹر کاروں کی ایک دکان کے سامنے کھڑے نئی موٹروں پر نظر ڈال رہے تھے کہ آناً فاناً حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے فٹ پاتھ پر افتادہ ہوئے اور جاں بحق ہوئے۔ ن۔م۔ راشد کی میت کی طرح ان کی میت حسبِ وصیت نذرِ آتش ہوئی۔ مدفون نہ ہوئی۔ چنانچہ ان کی کوئی قبر نہ بنی۔

یورپ اور امریکہ میں ستر فی صد میتیں یہودیوں اور مسیحیوں کی جلائی جا رہی ہیں۔ قبرستان میں جگہ کی قلت اس کی وجہ بتائی جاتی ہے۔ یہ اواخرِ الفِ ثانی کے عجائب ہیں۔ الفِ ثالث کیا رنگ لاتا ہے، مولیٰ ہی جانتا ہے۔

آپ نے یعقوب بھائی کا نام اپنے خط میں یعقوب اقبال لکھا ہے۔ ہم سب بھائیوں کے نام اس صورت سے نہیں ہیں جس صورت سے اقبال رشید اور احسان رشید کے نام ہیں۔ ہم بھائیوں کے نام یوں ہیں:- محمد اسحاق، محمد یعقوب، محمد ایوب، محمد داؤد، محمد الیاس۔

مسز یعقوب جن کا پیدائشی نام جل (JILL) ہے، ریٹائرڈ ہو کر شہر کولمبس میں رہتی ہیں۔

''نذرِ مختار'' کے پہلے باب پڑھ کر آپ کے احوال سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہوئی۔ میرے عزیز ترین علیگ دوست ڈاکٹر آغا اشرف علی ہیں۔ لاہور کے موڈل ٹاؤن میں یہ میرے ہمجولی تھے۔ علی گڑھ سے تاریخ میں ایم اے کرنے کے بعد جامعہ ملیہ سے وابستہ ہوئے۔ ذاکر صاحب سے یعقوب مرحوم کی اور میری ملاقات انہی نے کرائی تھی اور ذاکر صاحب کو انہوں نے اس بات پر راضی کیا تھا کہ ہم دونو بھائی فارغ التحصیل ہو کر اپنی زندگیاں جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کریں گے۔ ملک کی تقسیم سے ارادے کچھ سے کچھ ہو گئے۔

ذاکر صاحب شیخ الجامعہ نہ رہے تو آغا اشرف شیخ عبداللہ کے اصرار پر اپنے وطن سرینگر چلے گئے۔ وہاں ترقی پا کر تعلیمات کے ڈائریکٹر ہوئے۔ اب ریٹائرڈ ہو کر امریکہ آگئے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی یہاں کی دانشگاہوں میں پروفیسریوں پر فائز ہیں۔ میرا گمان ہے کہ آپ آغا اشرف کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ یہ علی گڑھ کے نامی سپوت ہیں بلکہ علی گڑھ کی گزک ہیں۔

مکاتیبِ غالب کے انگریزی ترجمے کے نسخے کے لیے ناشر کو لکھوں گا۔ جونہی مجھے ملا آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

KUTABKHANA OSMANIA

ریاض الرحمٰن صاحب کیا ریٹائرڈ ہو گئے ہیں؟ اگر اب تک علی گڑھ ہی میں ہیں تو انہیں میرا سلام پہنچا دیجیے۔

(بعد ملاحظہ بہ امعان وشوق) آپ کے بھیجے ہوئے رسالوں اور مضمونوں کو یکجا مجلد کرا کے پرنسٹن یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین کو بھیج دوں گا۔

والسلام مع الاحترام۔

آپ کے التفات سے شاداں

بندہ

داؤد رہبر

10 November, 1997

محترم مہربان پروفیسر مختار احمد صاحب، السلام علیکم!

اکبر الہ آبادی کا شعر ہے ؎

غیر کو نامے میں وہ مائی ڈیر لکھتے ہیں
مجھ سے بیگانہ وشی ہے، مجھے سر لکھتے ہیں

بہت سی باتیں ہماری تہذیب میں انگلستان سے آئیں۔ خطوں کے نیچے دستخط سے پہلے "مخلص" لکھنے کی رسم بھی وہیں سے آئی۔ حافظ محمود خان شیرانی ہمارے ابا کو جب خط لکھتے تو "مائی ڈیر ڈاکٹر صاحب" کہہ کر شروع کرتے۔ میں ابھی سوچ رہا تھا ڈیئر سر کا ترجمہ کیا ہوگا، جواب اک دم ذہن میں آیا۔ "پیارے صاحب"

مجھے بھیجنے کو جو چیزیں آپ نے ڈاکٹر عبدالواسع صاحب کے سپرد فرمائیں، وہ انہوں نے فیڈرل ایکسپریس کمپنی کے ذریعے فوراً پہنچا دیں۔ ڈاک کی یہ پرائیویٹ کمپنی اندرونِ امریکہ چٹھی اور پیکٹ راتوں رات پہنچا دیتی ہے۔

اس پیکٹ میں ایک تو آپ کا سفرنامہ ہے جو عبدالوہاب سلیم صاحب کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کل یہ انہیں بھیج دیا جائے گا۔ سفرنامہ میں نے پڑھ لیا۔ ڈائری لکھنا ہر ایک کے معمول میں شامل نہیں۔ باضابطہ لوگ ہی ڈائری لکھتے ہیں۔ آپ کے مزاج میں شاعری بھی ہے اور ڈائری بھی۔

پیکٹ میں جو خط آغا بابر صاحب کے نام ہے، وہ بھی کل ڈاک میں ڈال دوں گا۔ آپ کی نگارش بعنوان "علی گڑھ کے شب وروز" ان کو بھیج دی گئی تھی۔ فون کی ایک گفتگو سے معلوم ہوا کہ انہیں مل گئی۔ میں نے بہ تاکید ان سے کہا کہ ایک رقعہ رسید کا ضرور مختار صاحب کو لکھ بھیجیں۔ اگر اس میں ان کی طرف سے التوا ہے تو اس بات کا لحاظ مناسب ہے کہ اب ان کی عمر پچاسی کے قریب ہے۔ ان کی کمر خمیدہ ہو گئی ہے۔ امریکہ کے ایک اخبار میں وہ کالم لکھتے ہیں جو بہت مقبول ہے۔ ہر طرف سے ان کو چٹھیاں آتی ہیں۔ کسی کا جواب لکھتے ہیں، کسی کا نہیں۔ آپ کا بھیجا ہوا خط جب انہیں ملے گا تو ان شاء اللہ وہ جواب لکھیں گے۔ ان کا پتہ اس خط کے آخر میں درج کر دوں گا۔

یہ آخری پیکٹ تو ڈاکٹر عبدالواسع صاحب کے توسط سے پہنچا۔ اس سے پہلے سید حبیب احمد صاحب اور فصیح احمد صدیقی صاحب کی طرف سے دو پیکٹ موصول ہوئے۔ ان دونو کے مل جانے کی اطلاع اپنے گزشتہ خط میں دے چکا ہوں۔ ان ہدایات پر نظر ڈال کر جی بہت خوش ہوا، میں بے حد ممنون ہوں۔

احمد شفیق صاحب کا پتا دریافت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پہلے ڈارون میڈیکل سنٹر کا فون دریافت کرنا ہوگا۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ سنٹر شہر نیو یارک میں ہے یا ریاست نیو یارک کے کسی دوسرے شہر میں ہے۔ آپ کا مضمون "دیوانہ بکار خویش ہشیار" محفوظ رہے گا۔ پتا معلوم ہو جائے تو احمد شفیق صاحب کو بھیجوں۔

حسب ہدایت آپ کے مقالات مجلد کرا کر پرنسٹن یونیورسٹی لائبریری کو بھیج دوں گا۔ خطوطِ غالب کا انگریزی ترجمہ پبلشر نے مجھے بھیجا ہے۔ اس کا پارسل بھی کل رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے روانہ ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

آپ نے یادگار نامہ قاضی عبدالودود کے لیے ایک تحریر کی فرمائش کی ہے۔ ماسی نیوں کانفرنس والے مقالے کا ترجمہ اردو میں کرنے کے لیے بعض عربی مآخذ کا سامنے رکھنا لازم ہے۔ اپنی تصنیفِ ظریف La Passion d'al-Hallaj میں ماسی نیوں نے اخبار الحلاج اور کتاب الطواسین سے اقتباسات تو کیے لیکن صرف فرانسیسی ترجمہ کی صورت سے۔ اصل عربی عبارتیں نقل نہیں کیں۔ ان کو سامنے رکھے بغیر میں ترجمہ سے ترجمہ کروں تو دیانت نہ ہوگی۔ فلوریڈا میں جہاں میری سکونت ہے، عربی مآخذ تک رسائی آسان نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس کانفرنس میں میں نے مقالہ پڑھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ماسی نیوں کی ثناء کی جائے۔ وہاں ماسی نیوں کی اسلام شناسی اور تصوف شناسی پر کھل کر تنقید نہ ہو سکتی تھی۔ میرے کانفرنس والے مقالے کا عنوان یہ تھا:-

"پروفیسر ماسی نیوں کے افکار قرآن کے بارے میں (حلاج کی روحانیت کے توسط سے)"

آپ کی فرمائش کی تعمیل یوں کر سکتا ہوں کہ ایک نیا مضمون اس عنوان سے لکھوں:-

"حلاج سے پروفیسر ماسی نیوں کی وابستگی۔"

دسمبر کے آخر میں مضمون آپ کو بھیجوں تو جنوری کے پہلے ہفتے میں آپ کو مل جائے گا۔

آپ نے ہمارے والد مرحوم کا علی گڑھ کا زمانہ پوچھا۔ مرحوم کا علی گڑھ میں داخلہ ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں بی۔اے پاس کیا۔ چاروں سال آپ پروفیسر حبیب صاحب کے ہم جماعت تھے۔ عربی کے کورسوں میں دونوں کی مسابقت رہی۔ ۱۹۱۷ء میں والد صاحب نے عربیات میں ایم اے پاس کیا۔ پروفیسر سٹوری نے انہیں کیمبرج کے لیے سٹیٹ سکالرشپ دلوایا۔

علی گڑھ کی طالب علمی نہ مجھے نصیب ہوئی نہ بھائی یعقوب مرحوم کو۔ مرحوم اس کی خواہش رکھتے تھے جو حسرت ہو کر رہ گئی۔ میں علی گڑھ صرف دو بار پہنچا۔ ۱۹۴۳ء کے کل ہند اردو مباحثہ میں وہاں میں نے اوّل انعام پایا اور پھر ۱۹۴۶ء کے کل ہند انگریزی مباحثہ میں اوّل انعام پایا۔

دس تاریخ کا لکھا ہوا یہ خط آپ کو غالباً تئیس یا چوبیس کو ملے گا یعنی تقریباً دو ہفتوں میں۔ میں نے امریکہ کی سکونت ۱۹۵۹ء میں اختیار کی۔ اس زمانے میں یہاں سے دلی چٹھی پانچ دنوں میں پہنچ جایا کرتی تھی۔

KUTABKHANA OSMANIA

ہائے دوری۔ دُہری مجبوری اور دُگنی مجبوری۔

والسلام مع الاکرام۔

درماندہ

داؤد رہبر

8 December, 1997

محترم ڈاکٹر مختار احمد صاحب!

السلام علیکم، آپ کا خط مورخہ ۲۶ نومبر ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو آغا بابر صاحب اور عبدالوہاب سلیم صاحب کے جوابوں کا انتظار ہے۔ میں نے فوراً دونوں کو فون کر کے یاددہانی کرائی۔ دونوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیئے۔

آغا بابر کالم صرف اردو میں لکھتے ہیں۔ جس اخبار کے لیے وہ ان دنوں لکھتے ہیں، اس کا نام LINK ہے۔ یہ کیلیفورنیا سے نکلتا ہے۔ میں نے اپنے نام جاری نہیں کرایا۔ نہ ہی اس کا کوئی پرچہ کبھی دیکھا ہے۔ البتہ آغا صاحب نے ایک بار اپنے ایک کالم کا تراشا اس ہدایت کے ساتھ مجھے بھیجا تھا کہ پڑھ کر انہیں واپس بھیج دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کالم کی نوعیت ادبی ہے اور اس کے مضمون سبک ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے قارئین سب مہاجرین ہیں۔

آغا صاحب سے تو میرے تعلقات بھائیوں کے سے ہیں۔ عبدالوہاب سلیم صاحب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ملازم تھے۔ گزشتہ زمانوں کی باتیں کرنے کو کبھی کبھی مجھے فون کرتے ہیں۔ میں نے ''شب و روز'' والا چاپچہ (آف پرنٹ) بھیج دیا تھا۔ خدا انہیں توفیق دے کہ مضمون کی رسید کا خط آپ کو لکھیں۔

آف پرنٹ کے لیے میں نے چاپچہ کا لفظ وضع کیا ہے۔ ''چاپچہ جداگانہ'' کہنا چاہیے لیکن یہ ترکیب لمبی ہے۔ ہائم کی انگریزی، فارسی ڈکشنری میں آف پرنٹ کے معنی یوں درج ہیں:-

چاپ مجدد چیزی کہ از مطبوعات دیگری اقتباس شدہ باشد۔

چاپ ضمنی (یا طبع ضمنی) اور طبع فرعی (یا چاپ فرعی) اور چاپ منفصل ایسی ترکیبیں ہیں کہ ان کا چالو کرنا مشکل ہوگا۔ چاپچہ کا لفظ چلا دیا جائے تو عجب نہیں کہ لوگ متعارف ہو کر رفتہ رفتہ اسے قبول کر لیں۔

یادگارنامے کے لیے مضمون ان شاء اللہ دسمبر کے آخر تک مکمل کر سکوں گا۔ علمی موضوع پر زود نویسی مناسب نہیں۔ اس مضمون کے لیے مجھے پروفیسر ماسی نیوں کی سوانح عمری کا مطالعہ کرنا ہے، یہ پروفیسر ہربرٹ میسن کی تصنیف ہے۔ پروفیسر میسن نے مجھے بتایا کہ یہ پچھلے سال شایع ہوئی۔ میں نے یہ اس کے ناشر کو فون کر کے منگائی۔

مضمون ۳۰ دسمبر کو ڈاک میں ڈالوں تو جنوری کے دوسرے ہفتے میں آپ کو مل جانا چاہیے۔ کاش کہ مضمون جلد لکھا جا سکتا اور فصیح احمد صدیقی صاحب اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے۔

والد مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ حبیب صاحب کے بی۔ اے کے کورسوں میں عربی شامل تھی۔

برطانوی زمانے میں کراچی ہندوستان کا سب سے ستھرا شہر تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ وہاں مصفا پانی

بھی پینے کو نہیں ملتا۔ علی گڑھ کی قسمت اچھی ہے کہ آزادی کے بعد اس کی چمن بندیاں ہوئیں۔ اللہ برکت رکھے۔

والسلام مع الاحترام

سربزانو

داؤد رہبر

18 February, 1998

مکرمی پروفیسر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ مضمون آپ کو نہیں ملا۔ البتہ مجھ کو سبق ملا کہ ضروری چیزوں کا لفافہ رجسٹرڈ میل سے بھیجنا چاہیے۔ ہر مضمون کی دو تین فوٹو کاپیاں میں ہمیشہ بنوا کر محفوظ کر لیتا ہوں۔ اب ایک فوٹو کاپی رجسٹرڈ میل سے بھیج رہا ہوں، خدا کرے آپ کو مل جائے۔

ڈاکٹر سعید اختر صاحب کی معرفت آپ نے دو کتابیں اور کچھ مقالے بھیجے ہیں، وہ مجھے مل گئے۔ میں کل بوسٹن جا رہا ہوں، چار پانچ روز بعد واپس آؤں گا اور اس تازہ ہدیے کے مشتملات پر نظر ڈال کر آپ کو خط لکھوں گا۔

آغا بابر صاحب کو میں نے فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کو انہوں نے ایک خط لکھا اور ''پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی'' کے پتے پر ڈاک کے سپرد کیا۔ میں نے آپ کا پورا پتہ انہیں لکھ بھیجا تھا۔ انہوں نے لفافے پر پورا پتہ نہ لکھا۔ تبھی لفافہ آپ تک نہ پہنچا۔

اب ان کی عمر پچاسی ہے۔ کیوں نہ انہیں سنیاس آشرم کا آرام لینے دیا جائے۔ ان کی پرنویسی بھی اب ویسی نہیں رہی۔ اگر ہم جیتے رہے تو یہ وقت ہم پر بھی آئے گا۔

نیازمند

داؤد رہبر

24 April, 1998

مکرم و محترم پروفیسر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! پچھلے چند ہفتے ایسی مصروفیات میں گزرے جن کا کتب بینی اور تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ۶ مئی کو میری عمر بہتر ہو جائے گی۔ میری پیدائش ۶ مئی ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔ میونسپل کے رجسٹر میں ۶ اپریل ۱۹۲۷ء درج ہوئی۔ اس زمانے میں بزرگوں کی طرف سے ایسا دروغ عام تھا۔ اس کو وہ دروغ فایدہ مند سمجھتے تھے۔ ہم سب بھائیوں کی عمریں ایک ایک سال کم لکھائی گئیں۔ جب میرا عقد ہوا تو بیوی نے بتایا کہ اس کی عمر بھی ایک سال گھٹا کر لکھائی گئی۔ میں نے اپنے بڑے بھائی یعقوب مرحوم سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ سرکاری ملازمت میں اس طرح ریٹائرڈ ہونے سے پہلے ایک سال مزید حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آئی لیکن میری بیوی کی عمر ان کے والد صاحب نے گھٹا کر کیوں لکھائی، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

لاہور میں ایک دوست سے اس غیر مورخانہ رسم پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ پنجاب کے دیہاتی والدین اس کا الٹ کیا کرتے تھے یعنی عمر اپنے بیٹے کی تین چار سال بڑھا کر ظاہر کرتے تھے تاکہ پٹواری کا عہدہ

KUTABKHANA OSMANIA

12 June, 2000

میرے پرسانِ حال گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! عبدالوہاب خاں سلیم صاحب دوستوں کے دوست بھی ہیں اور کتابوں کے دوست بھی۔ کتابیں صرف اُردو کی پڑھتے ہیں۔ خود نیویارک میں رہتے ہیں لیکن دل ان کا لاہور میں رہتا ہے یا حجاز میں۔ حج کر چکے ہیں، اب سالانہ عمرہ کرتے ہیں۔ عمرہ میں اعتکاف کا امکان بہتر ہوتا ہے۔ انہوں نے حاجیوں کے سفرنامے جمع کیے ہیں۔ اشاعت کے لیے ان سفرناموں کے ایک مجموعہ کی تدوین میں مشغول ہیں۔

لاہور کی یاد ان کو تڑپاتی ہے۔ مجھ کو ٹیلی فون کر کے پرانے وقتوں اور ان کی شخصیتوں کو یاد کرتے ہیں۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی سکونت اب زیادہ تر پٹنے میں رہتی ہے۔ وہاں جس یونیورسٹی کے آپ وائس چانسلر ہیں، اس کی تعمیر اور ترقی کہاں تک پہنچی ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ کون کن سے شعبے قائم ہو چکے ہیں، اساتذہ کتنے ہیں اور طلبہ کتنے؟ یونیورسٹی کے تعارف کے لیے اگر کوئی پمفلٹ طبع ہوا ہے تو اس کو پڑھنا چاہوں گا۔

میں ۱۹۹۱ء میں ریٹائرڈ ہوا۔ گزشتہ نو برسوں میں جو کچھ لکھا اُردو میں لکھا۔ میری منظومات کی طباعت کراچی میں ہو رہی ہے۔ یہ کام "ادبی دنیا" کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے فرزند اکبر وجیہہ الدین احمد صاحب کے اہتمام ہو رہا ہے۔ امید ہے جولائی کے آخر یا اگست کے آغاز میں طباعت مکمل ہو جائے گی۔ ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھجوایا جائے گا۔

عبدالوہاب صاحب نے بتایا ہے کہ آپ علی گڑھ آتے رہتے ہیں اور یہ کہ میں آپ کو خط لکھوں تو علی گڑھ کے پتے پر ہی ارسال کروں۔

میں بالآخر اب ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ اس کا عنوان سوچ رکھا ہے Faith of the Individual اس کا ایک بہت بڑا حصہ میرے والد مرحوم کی سیرت پر مبنی ہے۔

بی۔ اے اور ایم۔ اے کے لیے ان کی درسگاہ تو علی گڑھ میں تھی لیکن امتحان ان دنوں الہٰ آباد میں ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے بی۔ اے میں ان کے اختیاری مضمون عربیات، تاریخ اور ریاضی تھے۔ ایم۔ اے انہوں نے عربی میں پاس کیا۔

انٹرنس کے بعد علی گڑھ وہ غالباً ۱۹۱۱ء میں پہنچے اور ایم۔ اے انہوں نے ۱۹۱۷ء میں پاس کیا۔ مجھے یہ جاننا ہے کہ ان ایام میں (یعنی ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۵ء) عربی اور تاریخ کے نصاب بی۔ اے کے لیے علی گڑھ میں کیا اور پھر ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے عربی کا نصاب کیا تھا۔

ان معلومات کی فراہمی کے لیے آپ کے پاس وقت کہاں ہوگا۔ آپ کسی مستعد اور سعادت مند شاگرد کو اس چھان بین میں لگا دیں اور یہ معلومات حاصل ہو جائیں تو میری نادانی دور ہو۔

مدت سے مجھے ایک کتاب کی تلاش ہے۔ اس کا عنوان "بھارت درپن" ہے۔ یہ ایک مسدس ہے جسے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب نے مولانا حالی کے مسدس کے نمونے پر لکھا اور اس میں ہندو سماج کی بدحالی کا رونا رویا۔ (کیفی صاحب کو شاعری میں مولانا حالی سے تلمذ تھا۔) ممکن ہے کہ علی گڑھ کی لائبریری میں یا آپ کے کسی

KUTABKHANA OSMANIA

اسے جلد مل سکے (اُن دنوں پٹواری بننے کے لیے چودہ برس کی عمر کی شرط تھی۔)

صحیح تاریخِ ولادت اور صحیح تاریخ وفات کے تعین کے لیے مورخ کیسی کیسی شہادت جوئی کرتے ہیں، دیکھیے میں نے اپنی صحیح تاریخ ولادت خود ہی بتا دی کہ سند رہے۔ ۱۹۴۹ء کے آغاز میں وطن سے نکلا۔ آدھی صدی باہر گزری۔ چالیس سال امریکہ میں گزارے۔ لاہور اور دلی کی خبریں دور بیٹھا سنتا رہا۔ وہاں کی ادبی مجالس میں حاضری سے محروم رہا۔

اب جبکہ بہتر کا ہو گیا ہوں، آخرت کی فکر سے بھی زیادہ یہ فکر ہے کہ جب مروں تو پسماندگان برا وقت نہ دیکھیں۔ اس کے لیے کچھ اہتمام ضروری ہے۔

یادگار نامہ' مولوی میمن مرحوم کی دونوں جلدیں مجھے مل گئی تھیں اور ان کے ساتھ چند چاپے (آف پرنٹ) بھی موصول ہوئے۔ اس نوازش نے حسب سابق احسان مند کیا۔ بڑی مہربانی۔ میمن صاحب نے اور ان کے بعد آپ نے دیس کا نام روشن کیا۔ ہم آپ کے علم وفضل پر فخر کرتے ہیں۔

آپ کے مقالات کی جلد بندی یہاں فلوریڈا میں ممکن نہیں۔ شہر ہارٹ فورڈ میں میں نے سات سال گزارے۔ وہاں صرف ایک جلد ساز تھا۔ دو تین جلدیں میں نے اس سے بندھوائیں۔ پھر ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی دکان بڑھا گیا۔ جہاں اس کی جلد سازی کی دکان تھی وہاں اب پوشاکوں کی دکان دکھائی دی ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

امریکہ میں اب جلد سازی کا کاروبار تقریباً سارا لائبریریوں کے لیے وقف ہے۔ لائبریریاں ہی غیر مجلد کتب خرید کر انہیں مجلد کراتی ہیں، ڈھیر ساری کتب۔

اور اب بڑے بڑے مطابع سب پورے کارخانے ہیں۔ کمپوزنگ کے بعد کتاب ایک اسمبلی لائن کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ پانچ ہزار یا دس ہزار نسخے۔ اسمبلی لائن کے سرے پر مجلد ہو کر پہنچ جاتے ہیں۔ مطبعہ میں کتاب کو مجلد کرنے کے لیے کسی جلد ساز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کام مشین کر دیتی ہے۔

کاش کہ آپ یہ چاپے وہاں سے مجلد کرا کر بھیجتے۔ اب بہر حال یہ کام کسی طرح یہاں کرایا جائے گا۔

عبدالوہاب سلیم صاحب نیویارک میں رہتے ہیں، ان سے گزارش کروں گا کہ وہاں کسی جلد ساز کا پتا نکالیں۔ وہاں مجموعہ مجلد ہو جائے تو میں نیویارک جا کر کولمبیا یونیورسٹی لائبریری میں اسے محفوظ کرانے کا انتظام کروں گا۔

یادگار نامہ' قاضی عبدالودود کے لیے مضمون میں نے عجلت میں لکھا تھا۔ اس کا ایک ضمیمہ میں نے لکھا ہے۔ یہ اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔

ڈاکٹر سعید اختر صاحب کا پتا مجھے معلوم نہیں، آپ پتا لکھ دیں تو میں آپ کا وہ مضمون انہیں ارسال کر دوں جو آپ نے ان کے لیے بھیجا تھا۔

والسلام مع الاحترام

نیاز مند

داؤد رہبر

دوست (مثلاً مالک رام صاحب) کی ذاتی لائبریری میں اس کا کوئی نسخہ ہو، اس کی مجھے بہت ضرورت ہے۔

یادگار نامہ، قاضی عبدالودود کی طباعت کب مکمل ہوگی۔ ریاض الرحمٰن صاحب کو میرا سلام۔

نیاز مند

داؤد رہبر

26 September, 2000

مدام نوازش آمادہ گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! خط لکھنے میں سستی ہوئی۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ بھارت درپن کی نقل مجھے عابد اللہ غازی صاحب کی معرفت پہنچ گئی۔ آپ کا احسان مند ہوں۔ مدت سے میں اس مسدس کا متلاشی تھا۔

یکم ستمبر ۱۹۹۰ء کو میں بوسٹن سے فلوریڈا منتقل ہوا۔ متقاعد ہو کر دس سال پہلے یہاں گزارے۔ اب ارادہ یہ ہے کہ فلوریڈا کی سکونت چھوڑ کر کسی ایسے شہر میں جا رہوں جہاں بہترین لائبریریوں تک رسائی آسان ہو۔ بیوی کی ضعیفی کا تقاضا یہ ہے کہ جو شہر چنا جائے، ہماری بڑی بیٹی کی جائے اقامت سے قریب ہو۔ میں چند روز کے لیے کسی سفر کو نکلوں تو بڑی بیٹی اپنی ماں کی رکھوالی کر سکے۔ آج کل یہ بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ بوسٹن میں رہتی ہے جس کا فاصلہ ہمارے فلوریڈا کے گھر سے بارہ سو میل ہے۔

میرے پاس اُردو کی جتنی کتابیں ہیں، سب گھر میں ہیں۔ انگریزی کی کتابیں کرائے کے پبلک سٹور ہاؤس میں رکھی ہیں۔ دونوں زبانوں کی کتابیں چھانٹ رہا ہوں۔ اپنی تصنیف کے لیے جن مآخذ کی ضرورت ہے، وہ کھلی رہیں گی۔ باقی بکسوں میں بھر دی جائیں گی تا کہ بوقتِ منتقلی سہولت کے ساتھ ٹرک پر لدوا دی جائیں۔

ہمارے مخلص دوست عبدالوہاب خاں سلیم صاحب سے آپ کی گفتگو فون پر ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ امریکہ میں جلد سازی کی دکانیں اب نایاب ہیں۔ پرنٹنگ پریسوں میں جب کوئی کتاب ہزاروں کی تعداد میں چھپتی ہے تو اس کے نسخے جلد بندی کے لیے کسی جلد ساز کو نہیں دیے جاتے۔ جلد بندی کا کام پرنٹنگ پریس ہی میں دھڑا دھڑ اور فٹافٹ مشینی ترکیب سے اسمبلی لائن کی بیلٹ پر ہو جاتا ہے اور اسمبلی لائن کے آخری سرے پر مجلد نسخوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔

جلد سازی کی دکانیں اب بازاروں میں کہیں نہیں۔ اس کے کارخانے البتہ اب بھی ہیں لیکن ان کا کاروباری تعلق صرف لائبریریوں سے ہے۔

عبدالوہاب خاں سلیم صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے بھیجے ہوئے چاچپے (Off-prints) میں ان کو دے دوں تو وہ انہیں جلد بندی کے لیے لاہور بھیج دیں گے اور وہ مجلد ہو کر لاہور سے واپس آئیں گے تو آپ (یعنی سلیم صاحب) مجلد مجموعہ کولمبیا یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین کو پہنچا دیں گے۔

اس تدبیر میں طوالت ہوگی۔ اس لیے میری درخواست یہ ہے کہ اگر ان مقالوں کے مزید چاچپے آپ کے پاس ہیں تو ان کا ایک سٹ علی گڑھ یا پٹنے سے مجلد کرا کے آپ سلیم صاحب کو نیویارک بھجوا دیں اور جو سٹ میرے پاس ہے، وہ میرے پاس ہی رہے۔ اس تجویز پر عمل آپ کی خوشی پر منحصر ہے۔

میرے بھائی محمد ایوب صاحب کراچی میں رہتے ہیں۔ یہ عنقریب میری کتاب پراگندہ طبع لوگ

آپ کو بھیج دیں گے۔

سلیم صاحب نے بتایا کہ یادگار قاضی عبدالودود کی طباعت مکمل ہو چکی اور یہ کہ آپ نے میرے لیے اس کا ایک نسخہ ارسال فرما دیا ہے۔ جونہی موصول ہوگا، رسید کا خط لکھوں گا۔

میں نے مضمون کا ایک ضمیمہ بھی آپ کو بھیجا تھا۔ اس میں پروفیسر ماسی نیوں کے دوست چارلس دو فوکولڈ کے احوالِ زندگی کا خلاصہ ہے۔ معلوم نہیں یہ ضمیمہ آپ کو ملا یا نہیں۔

کتابوں اور کاغذوں کی چھانٹی کرتے ہوئے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ایک نوازش نامہ (مورخہ یکم جون ۱۹۶۸ء) ملا۔ اس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔

آپ کے علمی مشاغل چند در چند ہیں اور آپ کی انتظامی ذمہ داریاں گوناگوں ہیں۔ آپ کی زندگی میں چہل پہل ہے۔ اللہ آپ کی تندرستی قائم رکھے۔

والسلام

آپ کا نیاز مند

داؤد رہبر

30 March, 2001

محبی و گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! آپ کی ذمہ داریاں پٹنے میں بھی ہیں، علی گڑھ میں بھی۔ دونوں شہروں کے درمیان آپ کا سفر ریلوے کار ہتا ہے یا ہوائی جہاز کا؟ میں تو ریٹائرڈ ہو کر حقیقتہً متقاعد ہوں۔ آرام حضر میں ہے سفر میں نہیں۔ لکھنے پڑھنے کا کام دن میں دو تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں کرتا۔ صحت کو ٹھیک اور طبیعت کو تازہ رکھنے کا یہ نسخہ آزمودہ ہے۔

عجمی تصوف نے لا ادریت (Agnosticism) کے پانیوں میں عرفان کے شربت گھولے ہیں۔ فارسی شاعری (خصوصاً غزل) میں اس کے شواہد بافراط ہیں۔ میں انگریزی میں جو کتاب لکھ رہا ہوں، اس کا موضوع یہی ہے۔ ہمارے والدِ مرحوم کی روحانیت پر فارسی شاعری کا گہرا اثر تھا۔ اس کتاب میں ایک باب ان کی زندگی پر بھی ہوگا۔

عبدالوہاب خاں صاحب نے فون پر آپ سے معلوم کر کے مجھے مطلع فرمایا کہ میری کہانیوں والی کتاب جو میرے برادر محمد ایوب نے آپ کو کراچی سے بھیجی تھی، آپ کو مل گئی۔ یہ خبر پا کر مجھ کو تسلی ہوئی۔

یادگار نامہ' قاضی عبدالودود کا نسخہ جو آپ کی ہدایت کی تعمیل میں دلی سے مجھے بھیجا گیا، اب تک موصول نہیں ہوا۔ سمندری ڈاک سے پارسل کے یہاں پہنچنے میں چھ مہینے لگتے ہیں۔ ممکن ہے کسی روز پہنچ ہی جائے۔ گمان یہ بھی گزرتا ہے کہ پارسل (سمندری ڈاک سے) بغیر رجسٹری کے ڈاکخانے کے سپرد ہوا اور وہاں کسی صاحبِ ذوق نے کتاب اُڑا لی۔

عبدالوہاب خاں صاحب نے مہربانی فرما کر اس کتاب میں سے میرے مقالے کی اور "فہرستِ مضامین" کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دی ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

کاتب سے صفحہ ۱۶۳ پر ایک غلطی ہوئی ہے جس سے قارئین کو آگاہ کرنا ضروری ہے لیکن نہایت مشکل۔ جملہ غلطی سے یوں چھپ گیا ہے:۔

''پروٹسٹنٹ روحانیت میں خوبیاں بھی ہیں لیکن اس کا نام ہی کہے دیتا ہے کہ اس کی سپرٹ خودکشی ہے۔''

کاتب صاحب کی ستم ظریفی دیکھیے۔ انہوں نے ''سرکشی'' کی جگہ یہاں ''خودکشی'' لکھ دیا۔ میں نے جو مسودہ آپ کو بھیجا تھا، اس کی فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں میں نے سرکشی ہی لکھا تھا۔

خواہانِ خیر نیاز مند

داؤد رہبر

3 June, 2001

گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! آپ کا کرمنامہ محمد حسین امام صاحب نے مجھے پہنچا دیا تھا۔ مکتوبات والی کتاب کا پارسل بھی موصول ہوا۔ پارسل سے کتاب کے علاوہ چار ''چاپچے'' بھی نکلے۔ علامہ میمن کے چار شاگردوں کا تذکرہ پڑھا۔ مولوی نبی بخش بلوچ کے آثار علمی کی تفاصیل معلوم ہوئیں۔

آپ جب آکسفورڈ پہنچے ہیں تو ڈاکٹر فضل الرحمن وہاں سے فارغ ہو کر جا چکے تھے۔ یہ لاہور کی ایک مسجد کے امام کے فرزند تھے۔ اپنی ڈاکٹریٹ کے لیے انہوں نے ابن سینا کی کتاب ''النفس'' کو ایڈٹ کیا تھا لیکن بعد میں جو کچھ انہوں نے لکھا، اس کا تعلق دینیات سے ہے۔

مولانا میمن دینیات کے نہیں عربی ادبیات کے محقق تھے اور حافظ محمود شیرانی فارسی ادبیات کے محقق تھے۔ یہ زمرہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام کے زمرہ سے الگ ہے کہ ان دونو بزرگوں کی وابستگی دینیات سے بھی تھی۔ یہ فرق چشم کشا ہے۔

آپ نے نصف صدی پہلے کی ڈائری کی دو قسطیں جو مجھے بھیجی ہیں، ان میں سے پہلی قسط کے اندراجات جولائی ۱۹۴۳ء سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ قسط آپ پہلے بھی مجھے بھیج چکے ہیں۔ اسے پھر پڑھا تو قندِ مکرر کا مزا ملا، ابا حلیم سے آپ کی رشتہ داری تھی۔ آپ علی گڑھ پہنچے تو یہ آپ کے میزبان تھے اور کیا چاہیے! یہ مبارک فال تھی۔ حلیم صاحب اُس وقت پرووائس چانسلر تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ آپ خود پرووائس چانسلر ہوئے اور اب آپ ایک نئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ اس کو کہیں گے۔ نور علی نور۔

مجھے یاد نہیں کہ علی گڑھ یونین کے سالانہ کل ہند انگریزی اور اردو مباحثے سال کے آغاز میں ہوتے تھے یا آخر میں۔ آپ کی ڈائری کی قسط اول میں پہلا اندراج ۴ جولائی ۱۹۴۳ء کا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں، میں نے علی گڑھ کے اُردو مباحثے کا اوّل انعام جیتا تھا۔ (اور پھر ۱۹۴۶ء میں انگریزی مباحثے کا اوّل انعام) اگر ۱۹۴۳ء والا مباحثہ سال کے شروع میں ہوا تو ظاہر ہے کہ میری شرکت اس میں آپ کے علی گڑھ پہنچنے سے پہلے ہوئی۔

ان مباحثوں کو سنتے ہوئے سٹریچی ہال میں طلبہ کا مجمع جو طوفانِ بدتمیزی برپا کرتا تھا، اس کی روک تھام کا خیال اربابِ دانشگاہ کو کیوں نہ آیا۔ میں مباحثوں میں حصہ لینے کو تقریر لکھ کر اسے رٹ لیا کرتا تھا۔ ایسی پختگی سے

کہ ڈھول تاشے بج رہے ہوتے تو بھی میرا حافظہ خطا نہ کرتا۔ ۱۹۴۳ء کے مباحثے میں حسب معمول طلبہ نے ایسی اودھم مچائی کہ کسی مقرر کا ایک جملہ بھی کسی کو صاف سنائی نہ دیا۔ اس مباحثے میں مجھے جو اول انعام ملا مغزِ تقریر کی خوبی کی وجہ سے نہیں ملا بلکہ اس لیے کہ میں اپنے حافظہ کے جماؤ کے بل پر مجمع کے شور وغل کی پروا کیے بغیر روانی اور اعتماد کے ساتھ رٹی ہوئی تقریر کرتا چلا گیا۔ حیرت ہے کہ مباحثے کے جج صاحبان جو علی گڑھ کے پروفیسر تھے، اس بدتمیزی کے آگے بے بس نظر آتے تھے۔

دوسرے روز جو انگریزی مباحثہ ہوا اس کے جج صاحبان میں ڈاکٹر ہادی حسن صاحب بھی شامل تھے۔ وہ خونٹ کھٹ آدی تھے۔ انہوں نے شور وغل کو روکنے کے لیے جو تقریر کی، اس کے دو جملے مجھے یاد ہیں:۔

If you can shout, I can howl.

If you can howl, I can growl.

اپنے اس مسخرہ پن سے انہوں نے طلبہ کو روکا تو کیا انہیں اور طرح دی۔ چنانچہ شور اور بلند ہوا۔

۱۹۴۶ء کے انگریزی مباحثہ کا مجھے اول انعام ملا۔ وہ یوں کہ اس سے ایک روز پہلے اردو مباحثہ کے درمیان پروفیسر بابر میرزا صاحب نے (جو جج صاحبان میں شامل تھے) سٹیج پر آ کر طلبہ کو ڈانٹ پلائی اور یہ کہہ کر شرم دلائی۔ ''بدتمیزو! کیا سرسید نے اسی بدتمیزی کے لیے اس کالج کی بنیاد رکھی تھی؟ ملک کے دور دراز شہروں سے اس مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے یہ مہمان آئے ہیں۔ بزدلو! ان کی ہمت اور ان کے تحمل کی داد دو کہ اس طوفانِ بدتمیزی کا مقابلہ یہ کس بہادری سے کر رہے ہیں۔ اگر تم میں سے کسی کو مائیکروفون کے آگے لا کھڑا کریں تو اس کی ٹانگیں خوف کے مارے لڑکھڑا جائیں۔ کچھ شرم کرو۔ اس مقدس دانشگاہ کی آبرو خراب نہ کرو۔''

یہ ڈانٹ موثر ثابت ہوئی۔ اس کے بعد مجمع نے باقی مقررین کی تقریروں کو خاموشی سے سنا۔ دوسرے روز انگریزی مباحثہ ہوا۔ اس میں بھی مجمع بدتمیزی سے باز رہا۔ آپ مجھے خط لکھیں تو بتائیں کہ اب وہاں طلبہ کے جو انعامی مباحثے ہوتے ہیں، ان کے آدابِ مجلس کس حال میں ہیں؟

آپ نے قاضی سعید صاحب کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہ وہی صاحب ہیں جو علی گڑھ کو چھوڑ کر پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ جغرافیہ کے صدر نشیں ہوئے اور جنہوں نے دیوانِ غالب کی شرح لکھی؟

آپ کو معلوم نہ ہوگا کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی (پنجابی) بیگم جن کا نام بتول تھا، ہماری خالہ زاد بہن تھیں۔ مدت ہوئی آپا بتول کے ایک بھائی مجھے ڈاکٹر صاحب کے گھر لے گئے تھے۔ ان دنوں بیچاری بہت علیل تھیں۔ میں ابھی طالب علم تھا، ڈاکٹر صاحب سے ملاقات سرسری ہوئی۔

میرے کلیات کی طباعت مکمل ہو چکی ہے۔ ان شاء اللہ کراچی سے ایک نسخہ اس کا جلد ہی آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

والسلام

نیاز مند

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

16 July, 2001

محبی وگرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم، معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے کرم نامہ مورخہ ۱۱ جون کا جواب اب تک نہ لکھ سکا۔ اس دوران میں دوبار بوسٹن جانا ہوا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی لائبریری میں اپنی ضرورت کی چند کتابوں کی دستیابی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

بوسٹن میں ہماری بڑی بیٹی کا گھر ہے۔ جب میں ریٹائر ہوا تو اپنی ساری کتابیں ساتھ نہ لایا۔ کتابوں (اور کاغذوں) کے پندرہ بیس بکس بیٹی کے گھر میں رکھوا آیا۔ ہمارے داماد کی ملازمت یکم ستمبر سے بوسٹن کی بجائے واشنگٹن میں ہوگی۔ بوسٹن کا گھر بیچ کر انہوں نے واشنگٹن میں ایک فلیٹ خرید لیا ہے۔ ستمبر میں یہ واشنگٹن منتقل ہو جائیں گے۔ میرے جو بکس ان کے بوسٹن والے گھر میں رکھے ہوئے تھے، پچھلے مہینے میں نے ان میں بھرے ہوئے کاغذات کی چھانٹی کی جو کاغذ محفوظ کرنے کے لائق تھے، ان کے یہاں منگانے کا انتظام کیا۔

امریکہ کی بڑی بڑی لائبریریوں میں میرے مطلب کی سب کتابیں موجود ہیں۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ خاص خاص کتابیں خرید کر اپنے پاس رکھوں۔ مثلاً کلیاتِ شیخ فرید الدین عطار، دیوان حکیم سنائی۔ یہ چیزیں والدِ مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ وہ کتب خانہ اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) کا جزو ہے۔

محسن فانی کی تصنیف دبستانِ مذاہب اور سیر المتاخرین مصنفہ غلام حسین طباطبائی کے مطالعہ کا مجھے اشتیاق ہے۔ دونو کے انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں۔ واشنگٹن میں لائبریری آف کانگریس ہے۔ وہاں جا کر ان کتابوں کا پتہ نکالوں گا۔

شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل کی جملہ تصانیف کا مجموعہ میں نے ۱۹۵۴ء میں کراچی کی شاہ ولی اللہ اکیڈمی سے میک گل یونیورسٹی کی اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے لیے خریدا تھا۔ کاش اس کا ایک سٹ اپنے لیے بھی خرید لیا ہوتا۔ معلوم نہیں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کراچی میں اب تک قائم ہے یا نہیں۔

فیضی کا دیوان دیکھنے کی مجھے خواہش ہے۔ ایران کے اساتذہ کے دیوان تو ایران سے منگائے جا سکتے ہیں۔ فیضی کا دیوان ایران سے کیوں ملے، ہندوستان میں اس کی تازہ ایڈیشن کا موجود ہونا بعید از امکان ہے لیکن اس کی کوئی پرانی ایڈیشن کہیں سے مل جائے تو میرا کام بن جائے۔

کراچی میں میرے کلیات کی طباعت اور جلد بندی مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے پرنٹر کو ان احباب کی فہرست لکھ بھیجی ہے جنہیں کلیات کے نسخے ہدیۃً بھیجے جائیں گے۔ امید ہے اگست کے شروع میں پارسل آپ کے پتے پر پہنچ جائے گا۔

اپنی گلوکاری کا ٹیپ ریکارڈ عن قریب آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔

والسلام مع الاحترام۔

نیاز مند

داؤد

17 December, 2001

محبی و مکرمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! جناب عبدالوہاب سلیم صاحب نے بتایا کہ آپ نے انہیں جو خط پچھلے دنوں لکھا، اس کے ذیل میں چند سطور مجھ سے مخاطب ہو کر بھی لکھیں۔ ان دنوں وہ اپنی دختر کے گھر میں مقیم ہیں جو بوسٹن میں ہیں۔ واپس نیو یارک پہنچ کر وہ میرے نام کی سطور مجھ کو بھیج دیں گے۔

ہم ایک نئے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ نیا پتہ اوپر درج ہے۔ میری خوش بختی ہے کہ آپ یاد فرماتے رہتے ہیں۔ آپ کی فرمائش تھی کہ اپنی گلوکاری کا کوئی ریکارڈ آپ کو بھیجوں۔ اس کی تعمیل میں دیر ہوئی۔ اس کی وجہ یہی نقل مکانی ہے۔ پرانے مکان کو فروخت کے لیے خالی کیا۔ اس کی مرمت اور اس کا رنگ و روغن تازہ کرنے پر دو ڈھائی مہینے صرف ہوئے۔ اب جلد ایک ٹیپ سے ٹیپ بنا کر ارسال کروں گا۔

جناب عبدالوہاب سلیم صاحب نے آمادگی ظاہر کی ہے کہ وہ آپ کے مطبوعہ مقالات کے ''چاپچوں'' کی جلد بندھوا کر نیو یارک کی کولمبیا یونیورسٹی کے لائبریرین کو پہنچا دیں گے۔ چاپچوں کا پارسل آغاز جنوری میں ان کی جانب روانہ کر دیا جائے گا۔

آپ نے اپنی ایک تالیف مجلد کرا کے مجھے بھیجی تھی۔ یہ البردہ کا ایک عربی رسالہ ہے۔ جس کا ایک نسخہ مشہور خطاط علی بن ہلال کے ہاتھ کا آپ کو معلوم ہوا تھا اور آپ نے اس کے متن کو اس نسخے کے فوٹو سمیت شائع فرمایا تھا۔ اس کا دیباچہ جو آپ نے اردو میں لکھا، پر مغز ہے۔ البردہ کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ آپ کی یہ تالیف کولمبیا یونیورسٹی کو نہ دوں گا، اسے اپنے پاس ہی رکھوں گا۔

والسلام

نیاز مند

داؤد رہبر

میرا پتہ بدل گیا ہے، نیا پتہ نوٹ فرما لیں۔

U.S.A

میرے کرم فرما پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم! میرے حبیب اعجاز حسین بٹالوی صاحب میری فریاد پر رحم کھا کر ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کی تصنیف ''ذوق دہلوی'' کا نسخہ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ یہ کتاب پہلے مجلس ترقی ادب نے چھاپی تھی۔ مجلس کے دفتر سے اعجاز صاحب کو یہ جواب ملا کہ سارے نسخے بک چکے۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ دوستوں سے پوچھتے رہے۔ میری خوش بختی ہے کہ اس کتاب کو تلاش کرتے ہوئے یہ آپ کے ہاں بھی پہنچے اور آپ نے اس کتاب کی دہلوی ایڈیشن کا نسخہ میرے لیے مرحمت فرمایا۔ اعجاز صاحب نے میرے ایک عزیز کے ہاتھ مجھے بھجوایا۔ اب یہ میرے سامنے رکھا ہے جو کتاب عطیہ ہو کر ملے وہ عزیز تر ہوتی ہے۔ میں آپ کا تہ دل سے احسان مند ہوں۔

کلاکاروں اور شاعروں میں کون بڑا ہے کون چھوٹا، یہ سوال اُٹھانا رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں تو اور کیا

KUTABKHANA OSMANIA

ہے۔ اُستاد ذوق کی روح سے میرا ایک فطری تعلق ہے۔ مرحوم ان اچھے بزرگوں میں سے تھے جن کے وجود سے زمانہ بابرکت ہوتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان کی یاد میں کچھ لکھ کر رسالہ ''اُردو'' (انجمن ترقی اردو) کے ایڈیٹر صاحب کو بھیجوں۔ کلیاتِ ذوق (مرتبہ ڈاکٹر تنویر علوی) اور شرح قصاید ذوق (از شفق رامپوری) مدت سے میرے پاس ہیں۔ اب آپ کی عطا کی ہوئی کتاب بھی آ گئی ہے۔ ان شاء اللہ دو تین ماہ کے اندر استاد کا ذکرِ خیر قلمبند کروں گا اور آپ کی اس مہربانی کا شکریہ مضمون کے شروع میں ادا کروں گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ اورینٹل کالج اب بھی لاء کالج والی عمارت کے متصل ہے یا موڈل ٹاؤن کے نواح میں منتقل ہو گیا ہے۔ اورینٹل کالج کو میں لاء کالج کی رعایت سے الٹا کالج کہا کرتا تھا۔

لاہور کے کوچوں اور خیابانوں کو سلام۔

آپ کی خوشیوں کا خواہاں

داؤد رہبر

16 February, 1996

میرے مہربان پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم! ہوا کے جھونکے اور خیال کے جھونکے تو دن رات آتے ہیں۔ احباب کے خط مہینے میں صرف تین چار آتے ہیں۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔ آپ سے تو دُہرا رشتہ ہے۔ ایک اردو برادری والا، دوسرا اورینٹل کالج والا۔

آپ کے کرم نامے میں جو فرمائش ہے، یہی فرمائش میں نے اپنے شفیق دوست مشفق خواجہ صاحب کی زبان مبارک سے آٹھ برس پہلے سنی یعنی یہ کہ میں بزرگوں کی یادیں لکھوں۔ لاہور، دہلی، الٰہ آباد، کراچی اور علی گڑھ میں بزرگوں کی آنکھیں دیکھنا مجھے طالب علمی کے زمانے ہی میں نصیب ہوا۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے دو سال بعد میں انگلستان چلا گیا۔ پھر سمندر پار ہی رہنا ہوا۔ حساب لگا لیجیے، ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۶ء عمر کا دو تہائی حصہ باہر گزارا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر لاہور ہی میں ساری زندگی گزرتی تو کہانی کچھ اور ہی بنتی۔ بزرگوں کی ہزار باتیں اور حافظے میں جمع ہوتیں۔

یہ خیال بھی فرمائیں کہ بیرونِ وطن گزشتہ سینتالیس سال جو گزارے ہیں، ان میں انگلستان، کینیڈا اور امریکہ کے اربابِ دانش کے مراسم بھی تو شامل ہیں۔ ان کی یادیں بھی اردو میں لکھنی چاہئیں۔ یہ سب لکھوں تو ایک طرح کا علمی سفرنامہ حاصل ہو اور پڑھنے والوں کو نئی بات ملے۔

آج سے تیس برس پہلے (۱۹۶۶ء میں) ''اوراق'' کے ایک شمارۂ خاص میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی فرمائش پر میں نے مولوی محمد شفیع صاحب کی یادیں لکھ کر بھیجی تھیں۔ وہ رسالہ آپ کو لاہور میں آسانی سے مل جائے گا۔ اب پھر مرحوم کی یاد میں لکھنے کو قلم اٹھاؤں تو ضرور کچھ اور باتیں یاد آئیں گی اور یادوں کا کیف بھی کچھ اور ہو گا کہ اب خود میرا سن ستر کو پہنچ چکا ہے۔ مولوی صاحب کا سب سے بڑا بیٹا ظفریاب میرے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم کا ہم جماعت تھا۔ دوسری جنگِ عالم کے زمانے میں فوج میں کپتان ہو گیا۔ اس کی اپنی رجمنٹ کے سپاہیوں نے اس کی کسی بات سے ناخوش ہو کر اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مولوی صاحب کی ایک چہیتی بیٹی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئی۔ ابھی اس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔ جوانی ہی میں جدائی کا داغ دے گئی۔ مولوی صاحب رونے دھونے والے

بزرگ نہ تھے۔ خاموشی سے دو صدمے سہہ گئے۔

مشفق خواجہ صاحب نے فرمائش کی تو میں نے کراچی کے رسالہ ''الشجاع'' کے لیے بابائے اردو کی یادیں قلمبند کیں۔ (شمارہ اگست ۱۹۵۹ء) مولوی صاحب کے بچپن کے حالات کہیں پڑھنے میں نہیں آئے۔ کاش کوئی کچھ جھلکیاں ان کے بچپن کی دکھاتا۔ یہ خانہ خالی رہا لیکن مرحوم کی باقی زندگی کے احوال غیر معمولی تفصیل سے ضبطِ تحریر میں آئے۔ بیگم حمیدہ اختر کی کتاب ''ہم سفر'' سے ان میں بہترین اضافہ ہوا ہے۔

''ادبی دنیا'' کے خاص شمارہ بیادگار مولانا صلاح الدین احمد (۱۹۶۵ء) کے لیے مولانا کی یادیں بھی میں نے لکھی تھیں۔ آپ کو اشتیاق ہو تو یہ تینوں نگارشیں ان رسالوں کی فائلوں میں آپ کو مل جائیں گی۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے انتقال کی خبر سن کر میں نے ان کی یادیں لکھیں۔ یہ ''قومی زبان'' میں چھپ گئیں۔ رسالے کا یہ شمارہ مجھے بھیجا نہ گیا۔ چنانچہ مجھے شمارہ کی تاریخ معلوم نہیں ہے۔

ان شاء اللہ حسبِ طاقت اور بھی لکھوں گا۔ یہاں کی اور وہاں کی باتیں ملا جلا کر، عنوان باندھ باندھ کر اور موضوعوں کو الگ الگ رکھ کر لکھنے کا اب مجھ میں یارا نہیں۔ تحریر میں بات سے بات نکلے تو اس میں ایک دوستانہ بے تکلفی ہوتی ہے۔ خاکہ نویسی کی طرف میرا میلان نہیں۔ باتوں باتوں میں کسی شخصیت کا ذکر آ جائے تو تھوڑی سی جھلکی مجھے کہیں زیادہ مزا دیتی ہے۔

بہرحال اب دیکھیے مرضی مولیٰ کیا ہے۔ موخر کیا ہے اور اُولیٰ کیا ہے۔ اپنی خلوت کو انجمن کرنے کے سامان کرنے ہی پڑیں گے۔ سوچ کی طغیانی فرو کرنے کو تحریر کی نہریں نکالنی ہی پڑیں گی۔ نہر جمن غربی اور نہر جمن شرقی، معلوم نہیں، ہندوؤں نے ان کے نام بدل دیے ہیں یا یہی رہنے دیے ہیں۔

آپ کی عطا کی ہوئی کتاب ''ذوق دہلوی'' اور ''دیوانِ ذوق'' (مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی) اور ''قصاید ذوق'' (مرتبہ شفق رام پوری مع شرح) کو دیکھتا رہتا ہوں۔ مضمون لکھنے کا وقت آئے گا تو زیادہ غور سے پڑھوں گا اور نوٹ تیار کروں گا۔ رفیق خاور صاحب کی تصنیف اگر لائبریری میں مل جائے اور اس کی فوٹو کاپی بن سکے تو اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو پہنچا دیں، میں بے حد ممنون ہوں گا۔ وہ کسی مسافر کے ہاتھ کتاب مجھے بھیج دیں گے۔

رفیق خاور صاحب نے پنجابی بحر میں ''ہیر رانجھا'' کا اُردو ترجمہ کر کے اپنی طبیعت داری دکھائی ہے۔ اس بحر کی اٹکھیلی کا کیا کہنا۔ ''ہیر رانجھا'' کو (پنجابی میں) یا اس کے منظوم ترجمے کو کوئی خوش ادا تحت اللفظ پڑھے اور طبلے پر بول بھی اسی حساب سے بجیں اور رقاصہ اس کے ساتھ ناچے تو سماں بندھے اور کتھک کے اُستاد منہ دیکھتے رہ جائیں۔

نومبر میں میرے لاہور آنے کے کچھ آثار ہیں۔ اگر آ سکا تو آپ سے ضرور ملاقات ہو گی۔ آپ نے یاد فرما کر میرا جی خوش کیا۔ فضلِ الٰہی آپ کے احوال میں شامل رہے۔

والسلام مع الاکرام

بیخودی کا طرفدار

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

U.S.A 21 June, 1997

سالکِ راہِ مہر و محبت پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم! آغا بابر صاحب نے آپ کا عطیہ امریکہ پہنچ کر مجھے بھیجا۔ آپ نے اس نایاب کتاب کا فوٹو میرے لیے بنوایا اور بھجوایا۔ گھر بیٹھے یہ کتاب مجھے ملی۔ آپ کی نوازش سے دل کو ٹھنڈک پہنچی۔ میں بہت احسان مند ہوں۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اُردو کی جدید شاعری میں پہل ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے کی۔ شاید یہ رائے درست ہے لیکن ان کی یہ سبقت معروف نہ ہوئی۔ یہ اردو ادب کے چودھری رحمت علی ہیں۔ لفظ پاکستان چودھری صاحب کو سوجھا اور خوب سوجھا۔ اس کا اعتراف قوم نے نہ کیا۔

ڈاکٹر تصدق حسین کے برادر ڈاکٹر محمد صادق صاحب میرے اُستاد تھے۔ ڈاکٹر صادق صاحب کا بیٹا ظفر اقبال میرا ہم جماعت تھا۔ خاور صاحب کو میں نے دیکھا ضرور لیکن ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کبھی نہ ہوئیں۔

طبعِ رسا ان سب بھائیوں کے حصے میں آئی۔ ان میں ایک کا نام سعید اختر تھا۔ یہ مصوری کرتے تھے۔ ایک بھائی ارشد محمود تھے۔ پہلے چھوٹے غلام علی خاں صاحب سے گانا سیکھتے تھے۔ پھر استاد امیر خاں صاحب کے شاگرد ہوئے۔

راشد کی طرح خاور صاحب غزل سے برگشتہ ہوئے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ یہ کہنا کہ پہلے ہماری تہذیب غزلائی ہوئی تہذیب تھی اور نئی شاعری نے اسے نظمایا، اُدھورا بیان ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہماری طبیعتیں نثرائی گئی ہیں۔ خود یورپ میں شاعری کی حیثیت اب وہ نہیں رہی جو انیسویں صدی میں تھی۔ نثر کی فتح سے فایدے بھی مترتب ہوئے اور نقصان بھی ہوا۔ نقصان یہ کہ طبیعتوں میں ویسا رس نہ رہا۔

ایک انگریزی۔ عربی ڈکشنری میں مجھے Courtship کا ایک مرادف ملا: مغازلہ۔ کیا عمدہ لفظ ہے۔ اسلامی سماج میں کورٹ شپ مفقود تھی۔ غزل گوئی سے شاعروں نے خیالی کورٹ شپ کے مزے لیے۔ غزل سے سرسید اور مولانا حالی کی برگشتگی ایک عجیب قصہ ہے۔ حقیقی کورٹ شپ تو پہلے ہی ممنوع تھی (اور اب تک ہے) خیالی کورٹ شپ سے بھی ان بزرگوں نے ہمیں روکنا چاہا، اسے کہیں گے ستم بالائے ستم۔

مغربی تنقید کا ایک وصف ہے اضطراب۔ اس میں بذلہ اور ظرافت نایاب ہیں۔ خاور صاحب نے ذوق کے کلام کو جس احساس کے ساتھ پرکھا ہے، اس پر بھی اضطراب کا غلبہ ہے۔ دیوانِ ذوق پڑھ کر مجھے حظ حاصل ہوا اور خاور صاحب کو نہ ہوا۔ یہ فرق بجائے خود ایک لطیفہ ہے۔

غزلیہ شاعری کا تذکرہ لکھنے کے لیے مولانا محمد حسین آزاد کی طبیعت مناسب ترین تھی۔ ان کا دلپسند شاعر سید انشا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے مزاج میں کس قدر شوخی تھی۔ ایسی شوخی شعر العجم کے مصنف کے مزاج میں نہ تھی۔ آبِ حیات سے ایک سبق میں نے یہ سیکھا کہ فرداً فرداً خاکے لکھنے سے تذکرہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ تذکرہ وہ ہے جو ایک عصر کی پوری بزم کو زندہ کرے۔

استاد ذوق کا تذکرہ لکھنے کو میرا جی اسی لیے چاہتا ہے، ہمارے ہاں کے ادب نواز میرزا غالب سے مغلوب ہوگئے ہیں اور کیا لکھوں۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

والسلام مع الاکرام۔

احسان مند

داؤد رہبر

27 November, 1997

رُکنِ حلقۂ اربابِ شوق پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم! آپ کا خط آیا، گویا پریم ساگر کی ایک موج اس ساحل سے آملی جس پر میری سکونت ہے۔

امابعد: آپ نے خط میں کئی موضوع چھیڑ دیے۔ ایک ہی خط میں ان سب کی باتیں لکھوں تو خط کھچڑی ہو جائے گا۔ کیوں نہ آئندہ چند دنوں میں دو تین خط آپ کو لکھوں تا کہ جی لگا کر ہر سوال کا جواب دیا جا سکے۔

راشد صاحب کی شفقتوں اور مہمان نوازیوں کو یاد کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کا برادرِ خرد ہوں۔ ان کے کلام کو پڑھتا ہوں تو پریشان ہوتا ہوں۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیجیے۔

ان کے کلام سے ان کی برہمی اور سرکشی آشکار ہے اور اس کے ساتھ ان کی مستقبلیت بھی۔ ان کی حسرتیں تو ان کی نظموں سے معلوم ہوئیں لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ الفِ ثالث میں زندگی کی بہتری کے لیے ان کے پاس کوئی نسخہ بھی ہے یا نہیں۔ کہیں کہیں ان کے کلام کا لہجہ پیغمبرانہ ہے لیکن ان کا پیغام بیچارگی کا رونا ہے اور بس، اس میں چارہ گری والی کوئی بات نہیں۔

جنگِ عالم کے زمانے میں راشد صاحب کپتان ہو کر ایران جا پہنچے۔ اس سے ایک بات ضرور پیدا ہوئی۔ فارسی بولنے کی مشق بھی ہوئی اور نظم کے محاورہ میں فارسیت آئی۔

ان کے بعض مدّاحوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے کلام میں سلف کا احترام موجود ہے۔ یہ کوشش عبث ہے۔ اس کلام میں بزرگوں کا ذکرِ خیر نہیں ملتا۔ فرمودۂ راشد اور فرمودۂ اقبال کے درمیان یہ بڑا فرق ہے۔

راشد کی نظموں میں الفاظ کی خوش آہنگی البتہ غیر معمولی ہے۔ یہ تحت اللفظ ڈرامائی قرأت کے لیے خوب ہے۔ آپ نے بتایا تو معلوم ہوا کہ آپ کو بھی اُستاد فیاض خاں مرحوم کا گانا دوسروں کے گانے سے زیادہ پسند آیا۔ آگرہ گھرانے کی گائیکی شہنائی انگ کی گائیکی ہے۔ بھارت میں اب یہ دم توڑ رہی ہے۔ خاں صاحب کے شاگرد عظمت حسین خاں، عطا حسین خاں، لطافت حسین خاں اور شرافت حسین خاں سب رحلت کر گئے۔

خاں صاحب کا وہ ریکارڈ میرے پاس یہاں محفوظ ہے جس کا ذکر آپ نے خط میں کیا۔ اس میں انہوں نے راگ کافی کا خیال ٹپہ کر کے گایا ہے۔ اس خیال کی آستھائی کے بول ہیں

بندے نند کمار

نہ کہ بندے ماترم یعنی یہ بھارت کا قومی ترانہ نہیں، کرشن کنہیا کی حمد کا گانا ہے۔ اس کی بندش میں انترہ کے بول ''شام منوہر'' سے شروع ہوتے ہیں۔

پچھلے سال نومبر کے آخر میں میں لاہور میں تھا۔ وہاں ایک عالم خواب میں دو ہفتے گزارے۔ اسی

KUTABKHANA OSMANIA

عالم میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ اورینٹل کالج کے سٹاف روم کی تقریب کے بعد کسی قہوہ خانے (بلکہ میخانے) میں دو تین گھنٹوں کی نشست جمتی تو اچھی طرح باتیں ہوتیں۔ قسمت میں ہوا تو اگلی زیارت میں ایسا موقع ملے گا۔

قافیے کے موضوع پر اگلا خط لکھوں گا۔ اس کے لیے آمد چاہیے۔ فی الحال ایک غزل بھیج رہا ہوں جو ازراہِ تفنن کہی گئی۔ آپ مجھے اچھا کہتے ہیں تو مجھے اپنے کئی گناہِ صغیرہ یاد آتے ہیں اور میں جی ہی جی میں ہنستا ہوں۔

کون کہتا ہے کسی کو آج اچھا راہبر
چند پیارے دوستوں کا حسن ظن ہے مغتنم

آغا بابر نے بتایا کہ اعجاز بٹالوی نے عمرہ کیا۔ میں نے سن کر کہا، میں نے تو صرف گرہ کیا۔

میری قسمت میں حج کی سعادت نہ تھی
دور کعبے سے میں چار فرسنگ تھا

شہیدوں کا نام لیوا

داؤد رہبر

دانستہ غلط قافیے

جہاں جاتے ہیں پاتے ہیں دھڑے بندی کے ہم قصے
حمایت ہم کریں کس کی، لڑائی مول لیں کس سے
کبھی اس بات پر بگڑے کبھی اُس بات پر بگڑے
ہم عاجز آگئے ہیں آپ کی بے وجہ جزبز سے
مجھے سختی سے مجلس میں دیا یہ حکم صاحب نے
ہمارے گھر میں سلگائیے نہ سگرٹ کوئی ماچس سے
فلاطونِ زماں ہونے کا کب ہم نے کیا دعویٰ
ہیں کہتے رہتے کچھ ہم کام لے کر عقل ناقص سے
ہمیں پورا یقیں ہے اک ملے گا ہم کو بھی ٹکڑا
مقرر سب کے ہیں حصے، مقدر سب کے ہیں حصے
ہمارے ملک میں اب پینے والے چھپ کے پیتے ہیں
یہ کہتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں فرمانِ نافذ سے
ہے دارالحرب اگر دنیا تو جائیں ہم کہاں یاں سے
نکالو فال جلدی بھائیو دیوانِ حافظ سے
ملیں گے راہبر ہاتف سے تو پامال ہی مضموں
نئے مضمون حاصل ہوتے ہیں تازہ حوادث سے

9 December, 1997

پرسانِ مسافران پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم! آپ نے فرمائش کی۔ "کچھ قافیے کے عیب و ہنر پر کہیے۔" مجھ کو باتیں کرنے کا اچھا بہانہ ملا۔ قافیے کے رسیا حضرت اکبرالہ آبادی تھے۔ الہ آباد میں رہتے تھے جہاں گنگا اور جمنا کا سنگھم ہے۔ فرماتے ہیں۔

دھوم ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی
جا کے گنگا پہ کہا کرتا ہوں جے مائی کی

راشد صاحب تین چیزوں سے چڑتے تھے: قافیہ، ضلع جگت اور راگ سرائی، راشد صاحب برہم تھے، باہم نہ تھے۔ قافیہ سے انہیں کیا واسطہ۔ قافیہ تو "باہمی" کا نام ہے۔

قافیے سے بغاوت دیکھ کر مجھے مجنوں یاد آیا۔ قبل از اسلام کا یہ دیوانہ (قیس عامری) صاحبِ دیوان بھی تھا۔ اس کے شاعرانہ مرتبہ کا اعتراف میں نے کیا۔

اس کے جنوں کی اور تھیں باتیں، قیس برہنہ رہتا تھا
وہ دیوانے کچے ہیں جو نظمِ معریٰ کہتے ہیں

اس سے کیا نسبت ہمیں، تھا قیس یکتا آدمی
کہتا تھا نظم مقفّی یہ معریٰ آدمی

ہمارے زمانے کے شاعروں نے سوٹ پہن کر معریٰ گوئی فرمائی۔

قافیہ کب آدمی پر تنگ تھا
قافیے سے آدمی تنگ آگیا

قافیے کی تعریف میں میں نے چند اشعار کہے۔

جھٹ خیال اچھوتا اک اور ڈھونڈ لاتا ہے
کیسی کیسی باتیں یہ قافیہ بھاتا ہے

کرتی ہے حسن پیدا پابند رہ کے فطرت
ہیں قافیے کے خوگر زیور بنانے والے

ایک قطعہ میراحمد بھی ہے اور قافیے کی تعریف کا بھی۔

قافیہ بھی اس میں ہے جغرافیہ بھی اس میں ہے
آفرینش ہے میاں اللہ میاں کی شاعری
کہہ کے غزلیں شاعروں نے ہے یہ ثابت کر دیا
ہے زمیں کی شاعری ہی آسماں کی شاعری

راشد صاحب نے ایک گفتگو میں مجھ سے کہا "بائبل خشک کتاب ہے۔ قرآن کی اور بات ہے۔ اس

میں شاعری ہے۔'' مقطع مومن کہیں گے راشد کا یہ قول شاعرانہ جسارت ہے۔

میں نے اپنے قطعہ میں اللہ میاں کی شاعری قرآن مجید کو نہیں کہا، آفرینش کو کہا ہے۔

میرا ایک طبلچی دوست بمبئی میں رہتا ہے۔ پرمود نایک اس کا نام ہے۔ بڑے غلام علی خاں صاحب بمبئی جاتے رہتے تھے۔ ایک بیٹھک میں انہوں نے پرمود نایک سے کہا۔ ''پرمود جی! سرگم شاعری ہے۔'' خاں صاحب نے سچی بات کہی۔ جوانی میں آپ مختلف راگوں کے خیال گاتے ہوئے ایسی ایسی سرگمیں لائے اور ایسی برمحل اور ایسی برجستگی اور برق رفتاری سے لائے کہ سننے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ اُن کی سرگمیں کیا ہیں موتیوں کی لڑیاں ہیں اور پھلجھڑیاں ہیں۔

سرگم سرائی کی طرح قافیہ پیمائی بھی صناعی چاہتی ہے۔ اپنے تجربے سے کہہ رہا ہوں کہ یہ نگینے جڑنے کا کام ہے۔ کبھی کبھی آمد سے کوئی بجتا ہوا قافیہ نازل ہوتا ہے تو کہنے والے کا جی کہتا ہے آہا ہا اور سننے والے بھی داد دیتے ہیں۔ میرے یہ چند اشعار پڑھیے اور بتائیے قافیے ان میں خم ٹھونک کر آئے ہیں یا نہیں

وہم منظرِ منزل شغل پارسائی کا
عشق نام ہے لیکن شوقِ نارسائی کا

میرے ہاں بھی تم کو میرے یار آنا چاہیے
آدمی کو آدمی پر پیار آنا چاہیے

میں ناصح کو تھا رات سمجھا رہا
گلوں میں نہیں رنگِ رُخسار ہا

میں نے جنوں میں کاٹ لی اپنی زبان تک
کیسے کہوں اب اس سے، ادھر میری جان تک

مرے گھر میں جو شب وہ خوبرو مہمان اُترا ہے
حواسِ خمسہ بولے مل کے یہ کون آن اُترا ہے

کہا اس نے ٹھینگا دکھا کے دور سے مجھ کو، ہے یہ برائے تو
کہا میں نے رکھیے معاف مجھ کو، عطائے تو بہ لقائے تو

نہیں ترنگ سے خالی ہماری بے وطنی
میں گنگناتا ہوں خلوت میں گل صبا چمنی

رازداں سے بھی باتیں چند ہم چھپاتے ہیں
اپنے دل کے اندر کے آشرم چھپاتے ہیں

ہم کو خالق نے دیا تھا اک جہانِ رسم و راہ
سب مٹا کر رکھ دیئے اک بے وفا نے رسم و راہ

وہ نثر کے لیے ہے جو ہلکا نہیں خیال
جس میں نہیں ہے چھیڑ غزل کا نہیں خیال

قافیے کی تعریف میں آپ نے خوب لکھا کہ ''یہ فردوس گوش کا سامان کرتا ہے۔'' اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اشعار کہتے ہوئے قافیہ خیال کی جست کا باعث ہو کر نازل ہوتا ہے۔ مثنوی میں یہ جست بیت کے مصرع اوّل اور مصرع دوم کے درمیان ہوتی ہے اور غزل اور قصیدہ میں اوپر تلے کے دو شعروں کے درمیان اس جست کے مزے بھی میں نے لیے اور اس مزے کا اعتراف کیا

از رہِ تشبیہ ہم نے چاند کو روٹی کہا
اور ملایا قافیہ پھر نور کا تنور سے

راہبر پنگھٹ کے مضموں کا اب اک گانا سنا
آن ٹپکا ہے کہیں سے قافیہ جب نیر کا

(زمین اس غزل کی ہے تعبیر کا۔ تقصیر کا وغیرہ)

غزل کہتے ہوئے قصے اچانک یاد آتے ہیں
کہاں بیٹھے ہوئے یاد آئے اہلِ حیرہ و کندہ

(قافیے اس غزل کے ہیں شرمندہ، تابندہ وغیرہ)

قافیہ ہے پابندی، قافیہ ہے آزادی
ورنہ کیوں خیال آتا ہم کو مومیائی کا

(قافیے اس غزل کے ہیں بھلائی کا، پائی پائی کا وغیرہ)

قافیے سے منہ پھیر لینے والوں سے میں نے ہاتھ باندھ کر کہا ہے

فکر کی پرواز کو کوئی اشارہ چاہیے
کیا ہوا گر قافیہ اک سوچ کا رہبر ہوا

قافیے سے شاعروں نے توبہ کی لیکن پینے سے توبہ نہیں کی۔ ان کو جام پیش کر کے کہتا ہوں۔ اگر قافیہ سے اجتناب میں قدغن کی سختی آجائے تو پھر آزادی کہاں رہی۔ نظم آزاد میں کہیں کہیں اچانک قافیہ آتا ہے تو لپک

KUTABKHANA OSMANIA

کی بات پیدا ہو۔ آیاتِ مصحف کے قافیوں کو دیکھیے ان میں کتنی آزادی اور کتنی لہک ہے

قافیہ ایمان کا اے شاعرو آمین ہے
قافیہ قرآن میں زیتون کا والتین ہے

اسلام سے پہلے کی شاعری میں ظلوم اور ہجوم کا قافیہ سلیم اور سہیم سے ممنوع نہیں تھا۔ اس میں بھی ایک مزا تھا۔

قافیہ کے ساتھ ردیف کا جوڑنا المعری کی اختراع ہے۔ اہلِ عجم کو یہ ترکیب پسند آئی۔ اس کی مانگ ایران میں بھی ہوئی اور ہندوستان میں بھی ہوئی۔

مشاق غزل گو ایک مصرع (اور زمین) کے سوجھتے ہی اندازہ لگا لیتا ہے کہ اس زمین سے دس بارہ اشعار کی دلپسند غزل اُگے گی کہ نہیں۔

اچھے شاعر کی قافیہ پیمائی تنگ بندی نہیں ہوتی۔ اچھی زمین اس کی طبیعت کو اُکساتی ہے تو اس کا جی کہتا ہے۔

مضرابِ فکر آ کے مرے تارِ جاں کو چھیڑ
میری زمیں کے قافیے تو بے شمار ہیں

آج میں نے خط میں انکسار سے کام نہیں لیا۔ اپنی خودی کو بلند کیا ہے۔

اُنا

داؤد

11 December, 1997

میرے خیر خواہ پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم، پرسوں آپ کو جو خط لکھا، اس میں قافیے کی باتیں ہوئیں۔ وہ خط روانہ ہوا لیکن قافیے کی سوچ رخصت نہ ہوئی۔ ایک خیال یہ آیا کہ قلمی یا چھپی ہوئی تحریر والا کوئی صفحہ جس پر کوئی قصیدہ یا غزل ہو ردیف اور قافیہ کے تواتر کے طفیل کس قدر آراستہ لگتا ہے! اُسے دیکھ کر طبیعت پراگندہ نہیں ہوتی بلکہ دلجمعی حاصل ہوتی ہے۔

یہ بتائیے کہ کافیاں کس زبان کا لفظ ہے۔ عجب نہیں کہ یہ اصل میں ''قافیاں' ہو۔ یہ امر تحقیق طلب ہے اور کافی جو راگ کا نام ہے، ممکن ہے کافیاں اسی کی جمع ہو۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے کہ اس لفظ کا رشتہ بھی لفظ ''قافیہ'' سے ہو۔ میرا قیاس ہے کہ راگ کافی پنڈتوں اور استادوں کو سندھ کے شتربانوں کی مقفیٰ دُھنوں سے ملا (ملتانی، پوربی اور پہاڑی، یہ تین راگ بھی دیہاتی دُھنوں سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔)

اپنی قافیہ پرستی کے اعلان کے بعد کیوں نہ اپنی غزل پرستی بھی جتا دوں۔ اس کے لیے مجھے اپنی غزلوں میں تقریباً تیس اشعار ملے۔ آپ کی تفریح کے لیے نقل کرتا ہوں

تو جیتی رہے اے غزل تا قیامت
دُکھوں کو ہے تو نے دوا کر دکھایا

غزل گو نے ان بت پرستوں کو رہبر
سنا کر غزل من کا مندر دکھایا

گنہگاروں کی محشر میں یوں ہوئی بخشش
خدا کے سامنے گا کر غزل سنائی گئی

مسلسل ایک آہنگِ ندیماں ہو کے آیا ہے
غزل میں کفر آیا ہے تو ایماں ہو کے آیا ہے

ہماری بے تکلف اس سے باتیں ہوتی رہتی ہیں
خدا کو شیخ جی ہم نے ہے ازراہِ غزل جانا

معاملہ مرا مسجد میں ذوالجلال سے ہے
مشاعرے میں مری گفتگو غزال سے ہے

دو زیور پہنائے رہبر ہم نے ایک سہاگن کو
مقطع ہے پازیب غزل کی، مطلع اسکا جھومر ہے

غزلیں کہنے والے باتیں محبوبوں سے کرتے ہیں
نظمیں کہنے والے غزلیں موضوعوں پر کہتے ہیں

ہجر کی اور وصل کی اور چھیڑ کی اور پیار کی
باتیں کی جاتی ہیں غزلوں میں تو یارو یار کی

ہیں ان میں تو بس یار کی اور پیار کی باتیں
غزلوں میں خودی کے کوئی اسرار نہیں ہیں

کیا مسرور ہم نے شیخ جی کو آج یہ کہہ کر
جو سچ پوچھو تو مذہب سب سے اچھا ہے تغزل کا

میں ہوں مایل بہ غزل، حمد نہیں میں نے کہی
مجھ کو قسمت نے بتوں ہی کا ثنا گر رکھا

KUTABKHANA OSMANIA

کریں گے ہم غزل میں آپ سے باتیں کبھی دل کی
تمہارے سامنے رکھ دیں گے شادی اور غمی دل کی

ذکر غزلوں میں نہ آئے گا بہو بیٹی کا
قصۂ عشق میں اس قسم کے ناتے ہی نہیں

سنی جو نثر میں فریاد تو ہوئے بے لطف
غزل سنی تو لگا اس میں احتجاج درست

شکایتِ ستم کسی کا نام لے کے کیوں کریں
میاں غزل ہی ٹھیک ہے کہ اس میں آن وایں ہیں ہم

نہیں کہتے قصہ غزل میں ہم کبھی نام لے کے حبیب کا
ہے عزیزو اس کا محاورہ کبھی ہائے وہ کبھی ہائے تو

غزلیں میری سن کے کی پیارے نے کیسی بھولی بات
نام لے کر ذکر کر میرا، مجھے مشہور کر

کس نے ان پردہ نشینوں سے لڑایا کبھی عشق
قصہ غزلوں میں جو ہے سارا قیاساً ہی تو ہے

سوانگ رچایا عشق کا اس نے جس کا کوئی معشوق نہ تھا
خمر کا مضموں باندھا اس شاعر نے جو مخمور نہ تھا

سنتے تھے شیخ جی بھی بزمِ سخن میں آ کر
بکتے تھے کفر شاعر غزلوں میں دندنا کر

غزلیں سن کر کہتے ہو تم یہ تو خیالی باتیں ہیں
پیارے ہیں یہ خیالی چونکہ تمہاری خالی باتیں ہیں

KUTABKHANA OSMANIA

یہ پردہ داریاں کب تک، بتا ہی دو رہبر
غزل میں اپنی ہے کس سے کلام تم نے کیا

ہمارے ہاتھ میں ہیں ڈوریاں جس کے تلوّن کی
اک ایسا یار آخر ہم نے پایا ہے تغزل سے

تیری کہانی فسانے میں ہم نام بدل کر کہتے ہیں
اور غزل جب کہتے ہیں تو تجھ کو دلبر کہتے ہیں

اسی لیے تو غزل گوئی اب بھی ہوتی ہے
اَنچ کی بات میں گھل جاتی ہے رواج کی بات

احساس ہیں شاعروں کے تازہ
مضمون اگرچہ ہیں پرانے

ہے کیا مضائقہ جو غزل میں اَنچ کی بات
پیدا ہوئی محاورۂ پائمال سے

کہا مطلع غزل کا ہم نے مضمون آفریں ہو کر
فلک نے زندگی پائی ہے اک تازہ زمیں ہو کر

غزل میں تو ہوتے ہیں بس چند اشارے
سمٹ آتے ہیں ان میں پورے فسانے

مطلب کا لطف آدھا اک انتظار میں ہے
پڑھتے ہیں پہلا مصرع شاعر بلند کر کے

اُصول ہے یہ ہماری غزل سرائی کا
ہو بحر فارسی، بندش ہماری تال میں ہو

حقیقت یہ ہے کہ تغزل بجائے خود ایک مذہب ہے۔

غزلایا ہوا آدمی

داؤد رہبر

27 October, 2001

قدردانِ تہذیب پروفیسر اورنگزیب عالمگیر صاحب!

السلام علیکم! میرے کرم فرما اعجاز حسین بٹالوی نے آپ کو اطلاع دے دی ہوگی کہ ان دنوں ہم اس مکان سے جس میں ہم نے گزشتہ گیارہ برس گزارے، ایک دوسرے مکان کو منتقل ہو رہے ہیں۔ جو مکان اب خریدا ہے، اس میں بعض چھوٹی چھوٹی مرمتیں لازم ہیں اور جس مکان کو چھوڑ رہے ہیں، اسے فروخت کرنے کے لیے اس کے نقائص کی درستی اور اس کی سفیدی اور صفائی ضروری ہے۔ اسباب کی چھانٹی اور اسے ڈھونڈنے کے انتظام بھی درپیش ہیں۔ ان حالات میں آپ کے کرم نامے کا جواب لکھنے میں دیر ہوئی، معافی دی جائے۔ آپ کا استفسار ایسا ہے کہ سرسری جواب سے کام نہیں چلے گا۔ دو تین ہفتوں میں اچھی طرح جواب لکھوں گا۔

میں آج کل انگریزی میں اپنے والد مرحوم کی سیرت لکھنے میں مشغول ہوں۔ مرحوم فارسی ادبیات کے اُستاد تھے۔ حافظِ قرآن بھی تھے، علی گڑھ سے انہوں نے عربی میں ایم اے پاس کیا تھا۔ خیام، حالی، اکبرالٰہ آبادی اور میر انیس ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ مولوی نذیر احمد کے ناول بھی نہایت شوق سے پڑھتے تھے۔ چار سال کیمبرج میں رہ کر ریسرچ کے مغربی طریقوں سے واقف ہوئے۔

اس کتاب میں مجھے مرحوم کے مراسم کا جائزہ تفصیل کے ساتھ لینا ہے۔ اقارب سے تعلقات، زوجہ سے تعلقات، اولاد سے، اکابر سے، خردوں سے، اغنیاء سے، ناداروں سے، ہندوؤں سے، سکھوں سے، انگریزوں سے، صنفِ نازک سے، ارواحِ اسلاف سے، قدیم سے، جدید سے، ذائقوں سے وغیرہ وغیرہ۔ اس جائزے کے ذریعے یہ دکھانا ہے کہ ان کے مراسم ان کے ''مذہب'' سے کیسے متاثر تھے۔ مذہب سے میری مراد مشرب ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم کا مذہب تغزل تھا اور یہ کہ تغزل کی سپرٹ میں لاادریت موجزن ہوتی ہے۔

میری نفسیات کا میرے والد مرحوم کی سیرت سے گہرا تعلق ہے۔ اس سیرت کو سمجھے بغیر میری خودشناسی کی کوشش لاحاصل رہے گی۔

انگریزی کی اس تصنیف کا خیال مجھے تین چار سال پہلے آیا تھا لیکن اس کا خاکہ ذہن نشین نہیں تھا۔ اب خاکہ تیار ہے۔ صحت اور حالات نے اجازت دی تو دو برسوں میں اس کا مسودہ مکمل ہو جائے گا۔

اس کتاب کی اشاعت سے پہلے اگر آپ کا کوئی شاگرد میرے حالات پر مقالہ لکھے تو مقالہ گہری معلومات پر مبنی نہیں ہوگا۔

بہرحال آپ سے مراسلت کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کے خطوں کی آمد سے مجھے خوشی ہوگی۔

حلقۂ احباب کو میرا سلام۔

آپ کا خیرخواہ

داؤد رہبر

17 July, 1993

بخدمت ڈاکٹر وزیر آغا صاحب!

۱۲۔ جولائی کا لکھا ہوا خط میز پر رکھا تھا، سوچ رہا تھا کہ ڈاک میں ڈال دوں یا آپ کے خط کا منتظر رہوں۔ شکر ہے کل آپ کا خط آ گیا۔ آپ کے تازہ اشعار بھی پہنچے۔ آپ کی غزلوں میں وہ شعر مزے کے ہیں جن میں موڈرن مصوری کی سی کوئی بات ہے۔ یہ شعر ان کی مثال ہے

جال پھینکیں کبھی اس کالی گھٹا میں ہم بھی
اور پھر جال میں بجلی کا تڑپنا دیکھیں

میں راگ کا آدمی ہوں۔ کالی گھٹا مجھے ملہار ہو کر دکھائی (سنائی) دی۔ اس راگ پر گویا خیال اور ابج کا جال پھینکتا ہے اور پھر ایسی تان اس کے گلے سے نکلتی ہے جسے بجلی کا تڑپنا کہیں تو غلط نہیں۔

''اوراق'' کے اگلے شمارے کے لیے آپ کے پاس بساطِ سخن اور تمیز والا مضمون تو پہلے ہی سے رکھا ہے۔ اب ایک انشائیہ ارسال ہے۔ انشائیہ رسالے کے ہر شمارے کا ایک خاص فیچر ہے۔ میری اس تازہ تحریر کے لیے بہترین رسالہ ''اوراق'' ہی ہے۔

امرتسر کے گوردوارہ (دربار صاحب) میں کیرتن کرنے والے مسلمان راگی بھائی کہلاتے ہیں۔ جیسے مثلاً بھائی لال، بھائی عنایت خاں۔ میں پردیس میں کیرتن کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے بھائی پردیسی ہوں۔

بھائی پردیسی

8 January, 1994

بخدمت ڈاکٹر وزیر آغا!

برادرم، السلام علیکم!

اوراق کا سالنامہ موصول ہوا۔ میرا مضمون اس میں طبع ہو کر آیا۔ آپ کا کرم ہے۔

میں ۲۹ نومبر کو لاہور پہنچا۔ اگلے روز سفر کی بے خوابی کی تلافی کو لیٹا رہا۔ دسمبر کی پہلی کو صبح گلوکاری کا ریہرسل تھا۔ شام کو الحمراء میں گانے کا جلسہ۔ دوسری کو صبح وہیں الحمراء میں میرا لیکچر اور پچھلے پہر شاکر علی میوزیم میں گانے کا دوسرا جلسہ۔ شام کو میں اپنے خسر بزرگوار کے سلام کو حاضر ہوا۔ اس کے بعد شب کو ایک عزیز کے ہمراہ ایک شادی والے گھر پہنچا۔ وہاں شامیانے کے نیچے اقبال بانو سازندوں کی سنگت میں گا رہی تھی۔ صبح پونے سات طیارہ پھر مجھے نیویارک کی جانب لے اُڑا۔

کوئی پوچھے کہ ایسی افراتفری والی صورت کیوں ہوئی تو کیا عرض کروں۔ میری بیوی کی صحت ایسی نازک ہے کہ اسے تنہا چھوڑ کر جانا باعثِ تشویش تھا۔ بوسٹن میں سکونت ہوتی تو احباب اس کی دیکھ بھال کو رضاکار ہو کر موجود رہتے۔ فلورڈا میں ہمارے شناسا نئے ہیں۔ ان پر ذمہ داری ڈالنا ممکن نہ تھا۔ خدا نے چاہا تو ۱۹۹۴ء میں دو ہفتوں کے لیے لاہور آؤں گا۔

میں نے اپنے ایک خط میں زیارتِ لاہور کا پروگرام آپ کو لکھا تھا۔ اُمید تھی کہ موسیقی اور لیکچر کی تقریبوں میں آپ رونق افروز ہوں گے۔ نظریں آپ کی تلاش میں رہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان تین چار دنوں میں

KUTABKHANA OSMANIA

آپ کا سرگودھا سے لاہور آنا ممکن نہ ہوا۔ اب آپ کا خط آئے تو خیریت معلوم ہو۔

قلمکاری آج کل صرف مکتوب نویسی کی صورت سے ہے۔ محض تفنن کے لیے لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ نثر نگاری میں بھی میرا تکیہ ہاتف ہی پر ہے۔ اسی کی مہربانی سے کوئی منصوبہ سلسلۂ مضامین کا شکل پذیر ہوگا۔

مجھے عطا کرنے کو آپ کے پاس اگر کوئی کتب ہیں تو آپ انہیں ازراہِ کرم اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو پہنچا دیں۔ ان کا فرزند آج کل پاکستان میں ہے، وہ امریکہ آئے گا تو ساتھ لے آئے گا اور مجھے پہنچا دے گا۔ اعجاز کا دفتر ہائیکورٹ کے پہلو میں ہے۔ ان کا پتہ ہے:-

4-Turner Road

''اوراق'' میں ایک بات دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس میں چھپنے والی چیزیں بھارت کے اہلِ قلم کی بھی ہیں۔ بعض ہندو افسانہ نویسوں کی تخلیقات کی روح داری دل پر اثر کرتی ہے۔

کاش اب کے ملاقات ہو سکتی۔ خدا نے چاہا تو پھر آؤں گا اور سرگودھا آپ کے ہمراہ چلوں گا۔

آپ کی مسرتوں کا خواہاں

داؤد رہبر

6 July, 1994

بخدمت ڈاکٹر وزیر آغا صاحب!

برادرم، السلام علیکم!

یہ جو کہتے ہیں کہ مکاتبت نصف الملاقات ہوتی ہے۔ بہت بڑا مبالغہ ہے۔ خطوں میں جی بھر کے باتیں نہیں ہو سکیں۔ سرگودھا کے 10 ڈاؤننگ سٹریٹ میں میں بھی دو راتیں گزاروں تو قصے کہوں اور سنوں۔

بعض مجبوریوں کی وجہ سے لاہور آ کر دو تین مہینے گزارنا بہت دنوں سے دشوار ہے۔ میری بیوی کی صحت ایسی نازک رہتی ہے کہ میرا گھر میں موجود رہنا لازمی ہے۔ دسمبر میں لاہور آیا تو کل چار دن وہاں ٹھہرا اور پھر واپس اُڑا (اصل میں ہوائی جہاز اُڑا۔ میں تو صرف مڑا۔) بیوی کی دیکھ بھال کا کوئی خاطر خواہ انتظام کر سکوں تو پندرہ بیس روز کے لیے لاہور آؤں۔ خدا کی مرضی ہوئی تو یہ خواب پورا ہوگا۔

آپ کا عطیہ بروقت پہنچا۔ آپ کا کرم ہے۔ میں نے دو چھوٹی چھوٹی تحریریں تیار کر رکھی تھیں اور بھیجنے کو تھا۔ اب اس خط کے ساتھ ملفوف ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عطیہ جو آپ نے بھیجا، ایک نئے رسالے کا پہلا شمارہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا یہ رسالہ سال میں ایک بار نکلا کرے گا یا دو بار؟ آپ کو خوب سوجھی کہ رسالے میں دو طرفہ ترجمے ہوں۔ شاعری کی بیڈمنٹن اسی کو کہیں گے۔ چڑیاں پھلانگ پھلانگ کر تماشا دکھائیں گی۔

شاعری کرنے والے شاعری کیے جائیں گے۔ شاعری پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ زمانہ رزم کا ہے اور ہم بزم کے ہیں۔ میں نے اعجاز بٹالوی کو ایک خط میں لکھا کہ جیسی بیٹھکیں زندہ دلوں کی بازار حکیماں میں جما کرتی تھیں، ویسی گلبرگ کالونی میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ گلبرگ کالونی تو بنگلستان ہے جس کے بنگلہ نشیں دوری پر تل گئے ہیں۔ ہمسائے کے سائے سے ہٹ کر رہتے ہیں۔ سانجھی دیوار کی کچھ اور ہی بات ہوتی ہے۔ میرا

خواب بچپن سے یہ رہا کہ موڈل ٹاؤن سے نکل کر ڈبی بازار میں جا رہوں بلکہ ڈبی کے اندر رہوں۔ کسی گلی میں رہوں، کوچے میں، کوئے یار میں۔

رسالے کا اجرا مبارک ہو۔ دنیا کی آبادی اب پانچ ارب ہو گئی ہے۔ اس میں ہم مذاق دوست ایک دوسرے کو یاد کرتے رہیں تو زندگی گوارا ہو۔ ''ادبی دنیا''، ''اوراق'' اور اب یہ نیا رسالہ۔ ان سب کی ادارت سے آپ نے مراسم کو زندہ رکھا اور ایک برادری پیدا کی۔ آپ کا فیض ہمیں بھی پہنچ رہا ہے۔

وجیہہ کی کوئی خبر نہیں۔ اس مخمور کے بڑھاپے میں بھی ایک کیف ضرور ہوگا۔ وہ شاہ دل آدمی ہے لیکن آرام طلب۔ خط لکھنے کے معاملے میں مولانا بھی (باوجود اہلِ قلم ہونے کے) کم کوش تھے۔ پہلوٹھی کا یہ فرزند بھی خط لکھنے سے گریز کرتا ہے۔ آپ اسے فون کریں تو میرا اسلام پہنچا دیں۔ صبیحہ اور سہیلہ کو بھی ''بلا موضوع'' کے عنوان سے جو تحریر میں نے آپ کو بھیجی تھی، اس کے چھپ جانے کی کوئی خبر نہیں۔ اگر چھپ چکی ہے تو اس کی فوٹو کاپی مجھے ارسال فرمائیں۔ پورا رسالہ لاہور آ کر دیکھ لوں گا۔ زود یا بدیر۔

''اوراق'' کا ہر شمارہ اچھی چیزوں سے معمور ہوتا ہے لیکن افسوس کہ سال میں ایک بار نکلتا ہے یا شاید دو بار، اگر سہ ماہی ہوتا تو میں متواتر کسی سلسلۂ مضامین کی کڑیاں بھیجتا رہتا۔

آپ یاد کرتے ہیں تو اچھے زمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ دو چھوٹے مضمون آپ کو مل جائیں تو ایک خط لکھ کر پردیسی کا جی خوش کیجیے۔

محروم لیکن شاکر

داؤد رہبر

12 October, 1999

محبی ڈاکٹر وزیر آغا صاحب!

السلام علیکم! کئی سال ہوئے ایک روز میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے پابرکاب تھا۔ ایک امریکی شاگرد کو میں نے گڈ بائی کہا تو اس نے ہنس کر جواباً کہا:-

Break a leg.

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسا جواب ہے۔ سفر سے واپس آیا تو میں نے ایک دوسرے شاگرد سے کہا، فلاں لڑکا بے ہودہ ہے۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے اسے گڈ بائی کہا تو کہتا ہے:-

Break a leg.

اس دوسرے شاگرد کو میری شکایت سن کر ہنسی آئی۔ بولا تم اس جملے کا مطلب غلط سمجھے۔ یہ کھلاڑیوں کا محاورہ ہے۔ جب کوئی کھلاڑی کھیلوں کے مقابلے کے لیے میدان میں اترنے نکلتا ہے تو اس وقت اس کے دوست اس سے کہتے ہیں:-

Break a leg.

کسی اولمپک مقابلے میں کسی کھلاڑی کی ٹانگ (یا بازو) کی ہڈی کو گزند پہنچے اور ڈاکٹر ٹانگ (یا بازو) کی ہڈی ٹھیک پیوست کر کے ٹانگ (یا بازو) پر پلاستر چڑھا دے اور کھلاڑی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا نمودار

ہوتو دوست اس سے یہ نہیں کہتے، تیرے حادثے کا ہمیں افسوس ہے بلکہ اسے مبارکباد دیتے ہیں۔ گویا کہتے ہیں:-

این کار از تو آید و مردان چنین کنند

یا:-

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

ہر دوست سفید پلاسٹر پر مزاحاً کچھ لکھ دیتا ہے یا اپنے دستخط کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کے ہیرو ہونے کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

کھلاڑی سے Break your leg کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے تجھے شاندار فتح نصیب ہو۔ میں نے یہ لطیفہ اس امید پر لکھا کہ گزندِ پا سے آپ افاقہ یاب ہو چکے ہوں گے۔

شکستِ استخواں کے دو حادثے مجھ پر بھی گزرے۔ ایک زمانے میں برف پر پھسلا تو کلائی ٹوٹی۔ پھر ایک بار جاڑوں میں پھسلا تو ایڑی سے ذرا اوپر دائیں ٹانگ ٹوٹی۔ کئی روز بیساکھیوں کے سہارے یونیورسٹی کے احاطے میں چلتا پھرتا دکھائی دیا۔ ہمدردی کے ایسے اظہار سننے میں آئے کہ لطف آ گیا۔

اللہ آپ کو پوری تندرستی عطا فرمائے۔ اپنے افاقہ کی اطلاع خط لکھ کر دیجیے اور بتائیے کہ حادثہ کہاں ہوا اور کیسے ہوا۔ میری اخبار بینی مدت سے بند ہے۔ جن صاحب نے مجھے خبر دی، ان کو خود پوری خبر نہ تھی۔

مقتدرہ اردو کا اخبار آتا ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے ہلالِ پاکستان کا اعزاز آپ کو عطا ہوا۔ مبارک ہو۔ آپ کا یہ اعزاز حکومت کی اپنی عزت افزائی ہے۔

وجیہہ آج کل بیمار ہے۔ ۴۔ اکتوبر کو اس کی آنکھ کا آپریشن ہوا۔ ٹیلی فون پر اس سے باتیں ہوئیں۔ اسے دل کا عارضہ بھی ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے۔

آپ کے خط کا منتظر ہوں۔

اگلے وقتوں کا ہمنشیں

داؤد رہبر

23 August, 2000

برادرم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب!

السلام علیکم! آپ کی آپ بیتی میں نے کئی برس پہلے پڑھی تھی۔ ان دنوں اس کو پھر پڑھا۔ آپ کا ایرانی الاصل ہونا تو مجھے یاد تھا لیکن یہ تفصیل یاد نہ رہی تھی کہ آپ کے والد صاحب آپ کی بڑی بہنوں سے فارسی میں بات کرتے تھے اور جوانی کے آغاز میں آپ نے بھی فارسی بولنا سیکھ لیا تھا۔

یہ بھی مجھے یاد تھا کہ آپ کے پردادا اور دادا اور والد صاحب گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے اور انگریزوں سے ان کا تعلق اسی سلسلے میں تھا۔

اپنی آپ بیتی میں آپ نے اپنے والد بزرگوار کا تذکرہ بالتفصیل نہیں لکھا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ انگریز گھوڑوں کے ملاحظہ کے لیے آتے تھے تو ان سے ان کی باتیں انگریزی میں ہوتی تھیں اور یہ کہ انہوں نے ایک پرانی موٹر کار خریدی تھی جسے انہوں نے اسپِ آہستہ خرام کا خطاب دیا تھا۔

KUTABKHANA OSMANIA

ان کی وفات کا ذکر آپ نے جہاں کیا ہے، وہاں ان کی سیرت چند جملوں میں بتائی ہے:- "ناشتہ کے بعد پیرانہ سالی کے باوجود باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو بعض اوقات آپ تین تین گھنٹوں تک اُپدیش دیتے۔" (صفحہ ۱۸۳)

اپنی اولین تصنیف "مسرت کی تلاش" آپ نے مرحوم کے نام معنون کی تھی۔ اس کا نسخہ جب آپ کو موصول ہوا تو آپ نے یہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حکایت سے ان کی سحر خیزی اور مراقبہ کے معمول معلوم ہوئے۔ اس کے آخر میں آپ کا بیان ہے:-

"انہوں نے ابواب کی فہرست پر ایک نظر ڈالی جس میں پورے دو باب مسرت اور فلسفہ کے موضوع پر تھے۔ مسکرائے اور کہا، یہ تم نے کب لکھی؟ میں نے کہا، میں نے کب لکھی ہے؟ یہ تو آپ ہی کا عطیہ ہے۔ آپ ہی نے لکھی ہے۔" (صفحہ ۹۵)

"انہوں نے کتاب کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا تھا۔ اس کے بعد وہ تقریباً ایک ماہ تک ہر روز مجھ سے اس کتاب کے ان نکات کے بارے میں باتیں کرتے رہے جنہیں میں نے محض چھو کر چھوڑ دیا تھا لیکن جن میں سے ہر نکتے پر پوری کتاب لکھی جا سکتی تھی۔" (صفحہ ۹۵)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم کے اندازِ فکر کا اثر آپ پر کتنا گہرا ہے۔ ان کے اُپدیشوں کا ذکر مجھ سے وجیہہ نے بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ نہایت دلآویز انسان تھے۔ وجیہہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا اُپدیش سننے مولانا بھی وزیر کوٹ گئے تھے۔

یہ بات نامعلوم رہی کہ مرحوم کے فرمودات کیا ہوتے تھے۔ ان میں صرف ویدانت کا درس ہوتا تھا یا دیگر معارف بھی بیان ہوتے تھے۔

ان کا تذکرہ لکھ کر آپ ان سے ہم سب کو اچھی طرح روشناس کرائیں تو ہم فیضیاب ہوں۔ ان کا پورا اسم مبارک بھی ہم سے آج تک مخفی ہے۔ و۔ ع۔ خ۔ ہی کیوں؟ پورا نام کس وجہ سے نامنکشف ہے؟

شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اور اپنے دادا شاہ وجیہہ الدین کے تذکرے پوری تفصیل سے حکایات سے معمور کر کے لکھے۔ ان حکایات سے شاہ صاحب کا اپنا تعارف بھی شافی ہوا۔

پچھلے سال وجیہہ کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ اب ایک آنکھ سے پڑھتے ہیں۔ ایسا پڑھنا باراحت نہیں ہے۔ ان کا مطالعہ جوانی میں بھی غیر معمولی تھا۔ ریٹائر ہو کر یہ خلوتی ہوئے تو مطالعہ میں انہماک بڑھ گیا۔

انہوں نے چوکھی ذہن پایا ہے۔ کاش کہ انہیں لکھنے کا شوق ہوتا۔

اُمید ہے آپ کی تندرستی اب بہتر ہوگی۔

والسلام

جواب کا منتظر

داؤد رہبر

3 April, 2001

برادرِ معظم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب!

السلام علیکم! عزیزہ عاتکہ صدیقہ نے مجھے اپنی دو کتابوں کی رونمائی کی خبر اخبار کا تراشا بھیج کر دی۔ اس میں جلسے کے فوٹو بھی ہیں۔ آپ، ڈاکٹر وحید قریشی، وجیہہ اور صبیحہ جیلانی سٹیج پر رونق افروز ہیں۔ کاش کہ میں اس جلسے میں حاضر ہو سکتا۔

عاتکہ صدیقہ کی یہ کوشش قابلِ مبارکباد ہے۔ آپ کی ہمت افزائی اور تائید کا اس اشاعت میں بڑا حصہ ہے۔

واپس امریکہ پہنچ کر انہوں نے مجھے خط لکھ کر بتایا کہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب گلہ مند ہیں کہ آپ نے انہیں خط کا جواب نہیں دیا۔ میں نے انہیں خط لکھ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کا خط میرے ''عیادت نامے'' کا جواب تھا۔ بہر حال میں قصور وار ہوں کہ مدت سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ''اوراق'' کے لیے کوئی نگارش بھیجنے کا خواہش مند تھا۔ شرمندگی ہے کہ یہ ارادہ اب تک پورا نہ کر سکا۔

دو برس سے انگریزی میں ایک تصنیف کی فکر میں ہوں۔ اس کا موضوع لاادریت، حیرت اور عرفان ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر قلم اُٹھانے کے لیے حوصلے کے علاوہ تین تیاریاں درکار ہیں۔ کثیر مطالعہ، معلومات پر غور و فکر اور کتاب کا ایک خاکہ۔ دو چار خاکے بنائے لیکن مطمئن نہ ہوا اور ان پر خاک ڈالی۔ موضوع کو محیطِ بے پایاں اور اپنی مجال کو تنگ پایا۔ بالآخر اس فیصلے پر پہنچا کہ کتاب کے موضوع کے لیے ہوگی صرف ایک شخصیت یعنی میرے والد مرحوم۔ یہ فیصلہ پچھلے چار پانچ برسوں کی سرگردانی کے بعد کیا ہے۔ قسمت یاوری کرے تو دو برسوں میں یہ کام کر ڈالوں۔ معلومات کے مآخذ کی فراہمی لازم ہے۔ جس شہر میں رہتا ہوں، اس میں بھرپور لائبریریاں نہیں ہیں۔ فہرست بنا کر نکلوں گا اور بوسٹن اور نیویارک کی لائبریریوں سے بعض اقتباسات کی فوٹو کاپیاں بنا کر لاؤں گا۔

والد مرحوم فارسی شاعری کے پروفیسر تھے۔ فارسی شاعری اور شعراء پر چھبیس برس انہوں نے لیکچر دیئے۔ مرحوم حافظِ قرآن تھے اور فارسی شعراء کا بے اندازہ کلام انہیں ازبر تھا۔ فارسی شاعری (اور عجمی تصوف) کا ان کی طبیعت پر گہرا اثر تھا۔ زندگی کے آخری ایآم میں آپ حکیم سنائی کے دیوان کو ایڈٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ایرانِ باستان میں بھی ان کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ آخری علمی کام جو انہوں نے دل لگا کر کیا، وہ تھا آرتھر کرسٹن سن کی ایک ضخیم تصنیف کا ترجمہ فرانسیسی سے۔ ''ایران بعہدِ ساسانیاں'' کے عنوان سے یہ ترجمہ دہلی سے شائع ہوا (سلسلۂ مطبوعاتِ انجمنِ ترقی اردو، ہند نمبر ۱۵۵۔ ۱۹۴۱ء)

رباعیاتِ عمر خیّام سے بھی ان کا لگاؤ حد سے بڑھا ہوا تھا۔ ان کی گفتگوئیں دس بارہ برس روزانہ میرے کانوں میں پڑیں۔ میں نے انہیں حیرتی پایا۔ میری موجودگی میں مرحوم اپنے عقائد کبھی زبان پر نہ لائے! فارسی شعراء کا جو کلام انہیں مرغوب تھا، میرے قیاسات کی بنا وہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ اس تصنیف کے لیے انگریزی میں قلم چلاتے ہوئے کچھ باتیں ایسی سوجھیں گی جن سے ضمناً کچھ مضمون نگاری اردو میں بھی ہوتی رہے گی۔ پاکستان سے فتاویٰ کے زور کی خبریں آنے لگیں تو ''قلم پھونک پھونک کر'' لکھنا ضروری لگا۔ کھل کر بات کرنا اب آسان نہیں رہا۔ یوں بھی ازراہِ تفنن کچھ لکھنے پر اب

طبیعت مائل نہیں۔

میرے امریکی رفقاءِ کار کا تقاضا ہے کہ اپنے افکار انگریزی میں لکھ کر شائع کروں۔ گفتگوؤں سے انہیں کچھ واقفیت ان افکار کی حاصل ہوئی لیکن سرسری۔ اس لیے انگریزی میں ایک تصنیف کا منصوبہ مقدم ہے۔

ادھر پاسِ خاطرِ احباب بھی ہے۔ سوچ سے کوئی موضوع اُچھلے گا تو آپ کی خدمت میں اوراق کے لیے کچھ بھیجوں گا۔

گزشتہ دو برسوں سے وجیہہ میرے منظومات کی اشاعت کی دھن میں ہے۔ علالت اور ضعیفی کے باوجود اس کا اعتناء برقرار ہے۔ طباعت اور جلد بندی ان شاء اللہ اپریل کے آخر میں مکمل ہو جائے گی۔ وجیہہ کے زیرِ ہدایت ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

پچھلے ڈیڑھ برس میں وجیہہ نے تقریباً ہر ہفتے مجھے فون کیا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی ہفتے میں تین چار بار اور فون پر لمبی لمبی گفتگوئیں کی ہیں۔ اپنی ریٹائرڈ زندگی کے بارہ برسوں میں وجیہہ دن رات مطالعہ میں منہمک رہا ہے۔ اس کے مطالعہ کی وسعت اب ایسی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ فون پر اس کی باتیں سنتے ہوئے میں یادداشتیں لکھتا چلا گیا۔ ان کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کا دماغ چوکس اور طرار ہے اور حافظہ بلا کا۔ اس کی جراُتِ رندانہ سے آپ پہلے ہی واقف ہیں۔ اس کی اُپج کا راز یہی ہے، زیادہ گفتگوئیں اس کی تغزل اور شاعری سے متعلق تھیں۔ اسلامی تاریخ کے بنیادی مآخذ کے جتنے ترجمے فارسی اور عربی سے اردو میں ہو چکے ہیں، سب اس کے شیلف پر موجود ہیں اور اس کے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں میں اس سے ملنے کراچی پہنچا۔ سید احمد بریلوی اور مجاہدین سرحد کے حالات اس کے زیرِ مطالعہ تھے۔ میں نے پوچھا، یہ شوق تمہیں کیونکر ہوا۔ جواب ملا۔ ''میں جہاد کی نفسیات پر غور کر رہا ہوں۔''

غرض یہ کہ وجیہہ اپنے ہی رنگ کا متخصص ہے۔ ڈاکٹر اجمل مرحوم اپنے آپ کو ینگی کہتے تھے۔ وجیہہ کا مزاج مقلدانہ نہیں۔ ینگ نے مشرقی تہذیبوں پر جو کچھ لکھا ہے، مشرق میں مقیم ہوئے بغیر لکھا ہے۔ وجیہہ نے مشرقی تہذیب کو سونگھ کر پہچانا ہے۔ افسوس ہمارے اس یار نے لکھا بہت کم۔

یہ خط لکھتے ہوئے میرے حافظے کے کمپیوٹر سے ایک یاد اُچھل کر سامنے آئی۔ وہ یہ کہ پچھلے سال گرمیوں میں میں نے ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ خط آپ کو ملا یا نہیں۔ میں اپنے خطوں کی فوٹو کاپی بنا کر محفوظ کر لیتا ہوں، اس کی کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔

آئندہ دسمبر یا جنوری میں لاہور آنا ممکن ہوا تو خط لکھ کر آپ کو خبر کر دوں گا۔ اب کے ملاقات ہونی چاہیے۔

مدت سے میں اپنی علیل بیوی کا تیماردار ہوں۔ سفر کے لیے کبھی کبھار نکلتا ہوں اور جب نکلتا ہوں تو بیوی کی رکھوالی کے لیے نرس کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے میرا ہر سفر نہایت مختصر ہوتا ہے۔

والسلام مع الاکرام

خواہانِ خیر و خبر
آپ کا برادر
داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

26 May, 1994

بخدمت گرامی جناب احمد ندیم قاسمی صاحب!

آبیارِ چمنستانِ ادب، کرمفرما۔ تسلیم!

''یادگارِ داغ'' کی تلاش نے میری سعادت چوگنی کردی۔ آپ کی عنایت سے دستخطی نسخہ اس کا مجھے ملا۔ آغا بابر صاحب نے اس کا پارسل مجھے بھیجا۔ آپ نے اوّل تو اسے شایع فرما کر شایقین کی آنکھیں روشن کیں اور پھر اس گنجینۂ گوہر کا عطیہ میری جھولی میں ڈال دیا۔ میرے دل میں احسان مندی کی اُمڈ گھمڈ ہے۔

اپنے مولد و منشا سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوں۔ میری حالت پر رشک اسی کو آئے گا جو حرماں کو دولت قرار دے۔ خدا وہ دن لائے کہ آپ کے مسکنِ مبارک میں حاضری دے کر آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کروں۔ رسالہ ''اردو'' کے لیے ''یادگارِ داغ'' پر جو باتیں لکھوں گا، اس کا آغاز اس دیوان کے دستیاب ہونے کی حکایت سے کروں گا۔

آپ کی صحت اور عافیت کی دعا۔

والسلام

نیاز مند

داؤد رہبر

28 April, 2000

میرے مہربان دوست انتظار حسین صاحب!

السلام علیکم، مکتبۂ سنگِ میل سے جو آٹھ دس کتابیں لے کر میں اپنے ساتھ یہاں لایا، ان میں ''چراغوں کا دھواں'' بھی ہے۔ اس میں کافی ہاؤس، چینیز اور پاک ٹی ہاؤس کے سین متواتر ہیں۔ ادیبوں کے یہ اڈے ایک زمانے (۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۸ء) میں نے بھی اپنائے تھے۔ آپ کی اس کتاب میں ان کی حکایات پڑھیں تو اپنا کہا ہوا ایک مقطع یاد آیا ؂

بولنا رہبر نے سیکھا لاہور کے قہوہ خانوں میں
صحبت واں رہتی تھی مسلسل اس کی فقرہ بازوں سے
دیکھیے میں نے ''قہوہ خانوں میں'' کہا ''قحبہ خانوں میں'' تو نہیں کہا۔

اپنی اُردو نثر کی جو داد مجھے آپ سے ملتی رہتی ہے، آپ کی عالی ظرفی پر دال ہے اور اس پر میں نازاں ہوں، ہم پنجابی قلمکاروں کو تسلیم ہے کہ ؂

مادری اپنی زباں ہم نے ہے ماں سے سیکھی
ہم نے اُردو ہے مگر اہلِ زباں سے سیکھی

برٹش راج کے آخری برسوں میں لاہور کا کافی ہاؤس ''ایک جہان'' تھا۔ میر تقی نے فرمایا ہے ؂

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا

لاہور کے کافی کدے میں اُن دنوں کالجوں کے ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی اساتذہ اور طلبہ (اور طالبات) صحافی اور فنکار سب جوق جوق آتے تھے۔ گفتگو کی بھن بھن ایسی ہوتی جیسی شہد کی مکھیوں کے چھتے کے آس پاس ہوتی ہے۔ ریاض قادر کی گفتار اس بھن بھن میں شامل رہتی تھی۔ ان کے مصاحب ان دنوں خلیل الرحمٰن صاحب تھے جن کی گفتار اور رفتار میں افیمیوں کی سی آہستگی تھی۔ ناصر کاظمی بھی ریاض قادر کے پاس اکثر آ بیٹھتے تھے لیکن بولتے کم تھے۔ ان کے اور (شہرت بخاری کے) کلام کا شہرہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔

میرزا داغ کے شاگرد تھے تجلّی اور تجلّی کے فرزند تھے تمکین کاظمی جنہوں نے داغ کی سوانح عمری لکھی ہے، ناصر کاظمی کا اس خاندان سے کوئی تعلق ہے یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔

آپ کے رتجگے ناصر کاظمی کی رفاقت میں ہوئے اور یوسف ظفر کے رتجگے شہرت بخاری کی معیت میں، کیسی قابلِ رشک دوستیاں ہیں!

۱۹۴۷ء سے ذرا پہلے ریاض قادر کو لاہور کے سٹیشن سے انگریزی خبریں نشر کرنے کی نوکری مل گئی تھی۔ ان کی گھمبیر آواز اور ان کا انگریزی لہجہ دونو اس کام کے نہایت مناسب تھے لیکن انہوں نے اس نوکری کو قیدِ بامشقت سمجھا۔ پابندیٔ اوقات کو برداشت نہ کیا، جلد ہی برخاست کیے گئے۔ سر عبدالقادر ان کی فارغ البالی سے نالاں رہتے تھے۔ ڈاکٹر باقر صاحب پر ایک روز انہوں نے اس دکھ کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، اجازت ہو تو میں انہیں سمجھاؤں۔ شیخ صاحب نے کہا، آپ کے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔

اعجاز بٹالوی، قیوم نظر، یوسف ظفر، ضیاء جالندھری اور وحید قریشی سے میری دوستی بے تکلفی والی تھی۔ عارف عبدالمتین سے بھی علیک سلیک تھی لیکن یہ بہت خاموش آدمی تھے۔

ان اربابِ ذوق سے میں نے نقد و نظر والی گفتگو کبھی نہ کی۔ بس تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ، یہ سب جانتے تھے کہ بندہ اورینٹل کالج کا پروردہ ہے۔ ترکیب بند مسدس کا نمایندہ، علامتی شاعری کی سمجھ سے قاصر۔

صفدر میر ٹک کر بیٹھنے والے آدمی نہ تھے۔ بولتے کم تھے۔ مسکراتے زیادہ تھے۔ بائیسکل سے اتر کر کھڑے کھڑے بات کرتے اور پھر نجانے کدھر کو چل دیتے۔ بعض نگارشوں میں ان کا عرف ''زینو'' دیکھا۔ شاید یہ ان کا گھریلو یعنی پیار کا نام تھا جو ان کے دوستوں کی زبانوں پر بھی چڑھ گیا جیسے سجاد ظہیر کا عرف ''بنّے''

اور ہاں ظہیر کاشمیری بھی تو تھے جن کی شباہت ایسی تھی گویا بنے بنائے شیکسپیئر۔ ان کا ایک شعر اعجاز بٹالوی کو بہت پسند ہے ؂

میں ہوں وحشت میں گُم، میں تیری دنیا میں نہیں رہتا
بگولہ رقص میں رہتا ہے صحرا میں نہیں رہتا

نظر امروہوی کا بلند بانگ ترنم بھی بہت مشہور تھا۔ ان کا یہ شعر گا کر اعجاز ان کے ترنم کی نقل اتارا کرتے تھے ؂

تھا تذکرہ کسی کے شباب و جمال کا
محسوس یہ ہوا کہ گلستاں میں آ گئے

اشفاق نقوی گورنمنٹ کالج میں ہمارے ساتھ تھے۔ موڈل ٹاؤن کے اے بلاک میں رہتے تھے۔

KUTABKHANA OSMANIA

موڈل ٹاؤن اور گورنمنٹ کالج کے نظر باز ان کے رنگ روپ کو ڈنڈوت کرتے تھے۔

قیوم نظر قہقہہ کھلی ہوا میں لگاتے تھے یا کسی قہوہ خانے میں داخل ہو کر۔ حلقے کے اجلاسوں میں یہ غصہ لے کر آتے تھے۔ تنقید کرتے تو تحمل کے بغیر، بلا ضرورت جھپٹتے تھے۔ دراصل ان کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ تین چار چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کے مصارف اپنی قلیل تنخواہ میں سے نکال کر پورے کرتے رہے۔

شہرت بخاری کو دیال سنگھ کالج کی نوکری علم الدین سالک صاحب نے دلوائی تھی اور قیوم نظر کو گورنمنٹ کالج کی نوکری ڈاکٹر محمد صادق صاحب نے، صوفی تبسم ان کے گورنمنٹ کالج میں آنے سے بدمزہ ہوئے۔ قیوم کے اس تقرر کے چند ماہ بعد میں لاہور پہنچا تو اعجاز بٹالوی مجھے صوفی صاحب کے گھر لے گئے۔ وہاں صوفی صاحب نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "قیوم کو صادق کالج میں لے کر آیا ہے۔ وہی اس کو سنبھالے۔"

آپ نے خواجہ دل محمد کی یاد تازہ کی۔ والد صاحب سے ان کی خوب دوستی تھی۔ یہ خوش مزاج آدمی تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی سلور جوبلی کے جشن میں انہوں نے (انگریز گورنر کے زیر صدارت) تہنیت کی ایک نظم پڑھی تھی۔ اس کا پہلا مصرع یہ تھا ؏

یہ جُبلی ہے کہ جبلا ہے کہ جبلستان کی جبلی؟

بچوں کے لیے پند و نصیحت کی ایک لمبی نظم کتابچہ بنا کر انہوں نے شائع کی تھی۔ اس کے دو شعر یاد آرہے ہیں۔

جوانی جو یونہی گنواتے رہیں
بڑے ہو کے چمٹا بجاتے رہیں

خفا وقت خیرات ہونا نہ تم
کہ بھونے ہوئے بیج بونا نہ تم

آپ کی کتاب پڑھ کر یاد رہنے والی باتیں ہیں:۔ میٹرو کے فلور پر انجلا کے ساتھ صندلی بلی کی جلوہ آرائی، کافی ہاؤس کا بیرا شرافت، لئیق تانگے والا، نواب ناطق، حسن لطیفی، عظیم قریشی اور صلاح الدین محمود کی شاعری۔ حفیظ ہوشیار پوری کی تاریخ گوئی، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے فرزند احسان رشید کا بدحالی میں پاکستان پہنچنا اور حفیظ جالندھری کے ہاں جا ٹھہرنا۔ اشفاق احمد کا تصوف، جو بندر روحانیت اور بلونگڑا روحانیت کا آمیختہ ہے۔ کشور ناہید کی نوازشیں اور مہمان نوازیاں، یہ سب باتیں تاریخی حقائق ہیں جو افسانوی رنگینی رکھتے ہیں۔ ان کو قلمبند کرنا آپ ہی کا کام تھا۔

حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں میری باقاعدہ حاضری ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ختم ہو گئی۔ ۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں انگلستان سے لاہور پہنچا تو ایک مضمون حلقے کے پروگرام میں پڑھا۔ پھر غیر حاضری ستائیس برس رہی۔

۱۹۷۵ء میں تین مہینوں کے لیے لاہور آیا تو میں نے اعجاز سے کہا، حلقہ والوں سے کہو، میرا ایک مضمون کسی اتوار کے اجلاس میں رکھ دیں۔ اعجاز نے کہا، حلقے کے سیکرٹری کے گھر ایک شادی کی ضیافت ہونے والی

ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا اور سیکرٹری سے ملوا دوں گا۔ تم خود ہی ان سے بات کر لینا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب حلقے دو ہو گئے ہیں۔ ایک ادبی اور دوسرا سیاسی۔ اعجاز نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ شادی والے گھر میں جن صاحب سے مجھے ملنا تھا۔ وہ حلقہ ارباب ذوق سیاسی کے سیکرٹری ہیں۔

سیکرٹری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے جھٹ اگلے ہی اجلاس میں میرا مضمون رکھ دیا۔ دو تین دنوں کے اندر میں نے کلاسیکل سنگیت کی تعریف میں ایک مضمون تیار کر لیا۔

اتوار کو وائی ایم سی اے کی عمارت میں پہنچا تو وہاں یاروں نے بتایا، تمہارا مضمون حلقہ ارباب ذوق سیاسی کے پروگرام میں ہوگا۔ وہ لوگ یہاں نہیں دوسری جگہ جلسہ جماتے ہیں۔ اب ٹھیک یاد نہیں۔ یہ دوسری جگہ غالباً چیمبرز کی دوسری منزل تھی۔ وہاں پہنچا اور مضمون پڑھا۔ صدارت حبیب جالب نے کی۔

صد افسوس کہ میرا وہ مضمون عزیز کھو گیا اور شائع نہ ہو سکا۔ اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے:۔

"جس شخص کی گود میں طنبورہ ہو وہ فرقت کے غم سے آزاد ہوتا ہے۔"

مضمون کے اول تا آخر ایسے ہی جملے تھے۔ ہر جملے پر بعض سامعین نے اسی طرح داد دی جیسے مشاعرے میں اشعار پر دی جاتی ہے۔

جب مضمون ختم ہوا تو پانچ چھ مارکسی حضرات نے مارکسی تان لی۔ اعتراض یہ تھا کہ کلاسیکل سنگیت درباروں کا پروردہ ہے اور اس کی ترویج سے عوامی موسیقی گھٹیا قرار پاتی ہے۔ (آپ کی کتاب میں حیات احمد خاں صاحب کا خط پڑھا تو یہ واقعہ مجھے یاد آیا)

حبیب جالب صاحب نے بڑے حزم کے ساتھ میرا بچاؤ کیا۔ معترضین سے کہا، جو کچھ اس مضمون میں کہا گیا ہے، اسے آپ سمجھے نہیں۔ خود میں نے اعتراض کا یہ جواب دیا کہ اس فن کے استاد جس محلے میں رہتے ہیں وہاں کوئی محل نہیں ہوتا۔ یہ غریب کلاکار روزی کمانے کے لیے کبھی کبھی قصر شاہی میں جا کر گاتے بجاتے ہیں۔ گا بجا کر پھر اپنے کوٹھوں کو لوٹ جاتے ہیں۔ خیال، دھرپد اور ٹھمری کے بول سادہ دیہاتی زندگی کے بول ہوتے ہیں۔ مثلاً

کنک مندر یا موری
گھڑ دے رے مورے بیر سر دا

اور

چنری موری رنگا دے بلما
ایسی رنگا دے لوگ سراہیں

ان نادار گلوکاروں کی گلوکاری ان کے درد دل کی آواز ہوتی ہے جسے سننے کی اغنیاء کو خواہش رہتی ہے۔ معترضین کی برہمی میرے جواب سے کم نہیں ہوئی، دھمکی کے لہجے میں انہوں نے مجھ سے پوچھا، آپ کہاں ٹھہرے ہوئے۔ میں نے کہا، اپنے بھائی محمد ایوب کے ہاں سمن آباد میں۔ انہوں نے پتہ مجھ سے لے کر لکھ لیا اور کہا، ہم وہاں آ کر آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ کب آئیں، میں نے کہا کل شام آیئے۔ میں منتظر رہا، یہ لوگ نہیں آئے۔

حبیب جالب صاحب مجھے جلسے کے بعد ٹی ہاؤس لے گئے۔ وہاں مجھے چائے پلائی اور کہا، میں خود

KUTABKHANA OSMANIA

اس موسیقی کا رسیا ہوں۔ میں نے راگ کی تعلیم اُستادوں سے پائی ہے۔

سیاسی حلقۂ اربابِ ذوق کا ڈول ۱۹۴۷ء کے بعد ڈالا گیا۔ شاید آپ نے سن رکھا ہو کہ حلقۂ اربابِ ذوق علمی کے نام سے ایک اور حلقہ ۱۹۴۷ء سے پہلے آغا بیدار بخت اور علامہ علاء الدین صدیقی نے قائم کیا تھا۔ اس کا انجام کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں۔

آپ کی داستان میں سیاسی حکایتیں بھی آئی ہیں۔ انہیں پڑھ کر معلوم ہوا کہ میرزا داغ کی طرح آپ نے ع

دیکھا ہے دیکھنے کی طرح اس جہان کو

پاکستان میں آپ سے یہ سوال پوچھا گیا۔ ''آپ نے بھارت سے ہجرت کیوں کی؟'' اس سوال کا سہل ترین جواب یہ ہے کہ ہجرت سنتِ نبوی ہے۔

امریکہ میں بیسیوں امریکیوں نے یہی سوال مجھ سے کیا۔ آغا بابر مرحوم مجھ سے ملنے فلوریڈا آئے۔ ان کو ہمراہ کر کے میں ریل گاڑی کے ذریعے شہر میامی کی سیر کو نکلا۔ ریل گاڑی میں دو میمیں ہمارے روبرو بیٹھی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے ہیں اور یہ کہ میری مستقل سکونت امریکہ ہی میں ہے تو ایک میم نے پوچھا، یہاں سکونت اختیار کرنے کا باعث کیا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں اپنے دیس کی خزاں کا ایک پتہ ہوں۔ ایک آندھی نے مجھے وہاں سے اُڑا کر یہاں لا ڈالا۔'' یہ جواب مسکت ثابت ہوا۔ ان میموں کے سامنے آغا بابر نے اس جواب کی داد مجھے انگریزی میں دی۔

اب کے لاہور میں میرا قیام صرف تین روز رہا۔ سعید شیخ صاحب کیسے اچھے میزبان ہیں، ان کے گھر میں ضیافتیں اکثر ہوتی ہیں۔ ان کے برکت کدے میں آپ سے بھی ملاقات ہوئی، الحمدللہ۔

ہمارے دوست عبدالوہاب خاں سلیم صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ نے اپنے کسی کالم میں اورینٹل کالج کے بوڑھے بزرگوار برگد کے کٹ جانے پر رنج کا اظہار کیا تھا۔ اس برگد کے سائے میں روزانہ ہمارے والد مرحوم اپنی موٹر کار کھڑی کیا کرتے تھے۔

جو باتیں آپ سے کرنے کو جی چاہتا تھا، ان میں سے کچھ میں نے اس خط میں لکھ دی ہیں۔ اللہ پھر جب ملائے گا تو آپ سے اور باتیں ہوں گی۔

آپ کا احسان مند

داؤد رہبر

28 March, 1994

بخدمت گرامی جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب

مخدومی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! آپ میرا حال کیا جانیں، گانا بجانا بند ہے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں بمبئی سے آیا ہوا ایک طالب علم نباتیات کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ نہایت اچھا طبلہ بجاتا ہے۔ ایم اے کی ڈگری لے کر یہاں سے چل دیا۔ یہاں تھا تو مہینے میں دو نشستیں اس کے ساتھ ہو جاتی تھیں۔ اب میرے اندر راگ خوابیدہ پڑے ہیں۔ جس طرح گراموفون کے توے میں سوئے رہتے ہیں۔

پچھلے سال شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چودھری محمد نعیم صاحب نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر آصف سلمہ ۱۹۹۴ء میں امریکہ آئیں گے اور چند ماہ یہاں ایک علمی کام کریں گے۔ ان سے گزارش ہے کہ جب امریکہ پہنچیں تو اپنی اقامت گاہ کا پتہ مجھ کو دیں اور مجھ کو فون کریں۔ ان سے باتیں کر کے غم غلط کروں گا۔

اُردو کا وہ شمارہ جس میں میرا مضمون چھپ رہا ہے، جب نکلے تو از راہ کرم اس کا ایک نسخہ میرے لیے میرے دوست اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو پارسل کر کے بھیج دیجیے۔ ان کے برادر مکرم آغا بابر (افسانہ نگار) اپریل کے آخر میں لاہور سے امریکہ کی جانب طیارہ سوار ہوں گے۔ آغا صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ اگر رسالہ بروقت انہیں مل گیا تو وہ امریکہ پہنچ کر مجھے بذریعہ پارسل پہنچا دیں گے۔

انجمن کے اس شاندار رسالے میں اتنا لمبا مضمون چھاپ کر آپ نے مجھے احسان مند فرمایا۔

''یادگارِ داغ'' اگر مجھ تک پہنچ جائے تو میں اس میں سے بھی کچھ اشعار چن کر ان کی تاثیر کو موضوع گفتگو کروں یعنی ایک مضمون اور لکھوں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب اور مشفق خواجہ صاحب کی مہربانی سے اُمید رکھتا ہوں کہ ''یادگارِ داغ'' کی فوٹو کاپی اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو پہنچانے کی تدبیر کی جائے گی۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ پیری میں استاد داغ کے دم خم کیسے ہیں اور اس سن کو پہنچ کر ان کے ٹھرک میں کوئی بزرگانہ بات پیدا ہوئی یا نہیں۔

Flirtation کے لیے پنجابی میں ٹھرک کا لفظ ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اردو میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر آصف صاحب کو میرا اسلام شوق پہنچے۔ اُمید ہے امریکہ پہنچ کر وہ مجھے خط لکھیں گے۔ (میرا فون نمبر یہ ہے 783-4948(305)) انجمن ترقی اردو نے مکالمات افلاطون شایع کیے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مترجم کون تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس ترجمے میں Symposium کا ترجمہ شامل ہوا یا نہیں۔

جناب مشفق خواجہ صاحب کو چند روز قبل خط لکھا، ان کے جواب کا منتظر ہوں۔ ان کو میرا سلام پہنچا کر ممنون فرمائیں۔

نیاز مند

داؤد رہبر

6 June, 1994

بخدمت جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب

کرم فرما، قدر دان!

السلام علیکم! اعجاز حسین بٹالوی کے برادر آغا بابر صاحب نے رسالہ ''اردو'' مجھے نیویارک سے بھیج دیا۔ پرسوں سنیچر کے دن مجھے پارسل ملا۔ آج پیر ہے۔ آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ نے پورا مقالہ ایک ہی شمارے میں شایع فرمایا، میں بے حد مسرور اور ممنون ہوں۔

''یادگارِ داغ'' کا ایک نسخہ ایک سال کی تلاش کے بعد لاہور سے ملا۔ اللہ کا شکر کیا۔ چاروں دیوان داغ کے اب میرے پاس ہیں۔

میں نے ''یادگارِ داغ'' کو پڑھ کر ایک باب اور لکھا ہے۔ اس کا آئندہ شمارہ میں بطور ضمیمہ شائع ہونا مناسب ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلی قسط میں داغ اور نظام کے مراسم کا ذکر اچھی طرح نہ

KUTABKHANA OSMANIA

ہوا۔ اس ضمیمہ میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔

ڈاکٹر آصف سلمہ امریکہ آئے یا نہیں، مجھے کچھ خبر نہ مل سکی۔ اگر آج کل کراچی میں ہیں تو انہیں میرا سلام پہنچے۔ امسال امریکہ آئیں تو جہاں بھی ہوں، مجھے ٹیلی فون کریں۔ میرا فون نمبر یہ ہے۔ 4948-783(305) اس قسط دوم کے موصول ہوجانے کی اطلاع دے کر ممنون فرمائیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اُردو برادری کے سہارے زندہ ہوں۔

''یادگارِ داغ'' کے ملنے کا پتہ مشفق خواجہ صاحب کی مدد سے ملا۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ میرا سلام مع امتنان انہیں پہنچے۔ ضیاء جالندھری سے اگر آپ کی ملاقات ہو تو انہیں بھی سلام پہنچے بلکہ اس کے ساتھ یادِ ایام بھی پہنچے۔ ان کو میرا یہ شعر ضرور یاد ہوگا جو میں نے گورنمنٹ کالج کے ایک مشاعرہ میں پڑھا تھا اور پرنسپل سوندھی صاحب نے اس کی داد تالی بجا کر دی تھی

کوئی فہرست سناتا تھا وفاداروں کی
چل دیئے اُٹھ کے مرے نام سے پہلے پہلے

اس مشاعرے کے بعد لاہور کے کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے ضیاء نے دوستوں سے کہا:

''وفاداروں کی فہرست میں داؤد رہبر کا نمبر ۶ تھا۔''

آپ کے کرمنامے کا انتظار رہے گا۔

والسلام مع الاحترام

نیاز مند

داؤد رہبر

4 October, 1994

بخدمت ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب!

خرد و کلاں کے مہربان گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! عنایت نامے کا لفافہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوئیں اور خط کا مضمون پڑھ کر دُھندلائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ کام سے سبکدوش ہوجانا طبی نقطہ نظر سے اچھا بھی ہے اور برا بھی۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب کو قلب کا عارضہ ہوا تو ایک روز وہ وقتِ معائنہ ڈاکٹر سے غذا کے بارے میں ہدایات لے رہے تھے۔ ہماری بھاوج بھی پاس بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''یہ آم کا اچار کھاتے رہتے ہیں۔ اس میں تیل بہت ہوتا ہے۔ ان سے کہیے اچار سے مکمل پرہیز کریں۔'' معالج نے کہا۔ ''ان کو اچار کھانے دو، ایسی حالت میں چٹخارہ مفید ہوتا ہے یعنی ذوقِ حیات کا معاون۔'' امید ہے آپ انجمن کی تقریبوں میں بطورِ تناولِ اچار شامل رہیں گے اور کارکنانِ انجمن آپ کے مشوروں سے برابر مستفید۔

آج کل صبح اُٹھ کر اکثر میں تقریباً ایک غزل کہتا ہوں۔ آج جو غزل کہی، ارسالِ خدمت ہے۔ ڈاکٹر آصف سلمہ کو بھی دکھائیے، وہ ہمارے بذلہ کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ ان کو میرا سلام پہنچے۔ نئی ملازمت انہیں مبارک ہو۔

والسلام مع الاکرام

آپ کا قدیمی نیاز مند

داؤد رہبر

''یادگارِ داغ'' پر جو مضمون آپ کی نظر سے گزرا، اس میں میں نے انصاف سے کام نہ لیا تھا۔ نظرِ ثانی کے بعد میں نے اس میں کچھ اضافہ کیا ہے جو مشفق خواجہ صاحب کو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجا جا چکا ہے۔ اب کے میں نے اشعار کی بہت سی مثالیں شامل کی ہیں۔ فون کریں تو میرا سلام انہیں پہنچا دیں۔ مہربانی

12 June, 2000

بخدمت ڈاکٹر آصف فرخی صاحب!

وارثِ ذوقِ علم و ادب ڈاکٹر آصف صاحب!

السلام علیکم، نعمان صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے آپ کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ ای میل کے ذریعے ہے۔ انہوں نے لندن میں فزکس بھی سیکھی۔ ای میل کا ذکر آیا تو میں نے ان سے کہا، ای میل کا جادو مجھے سمجھائیے۔ انہوں نے نہایت بلیغ جواب دیا۔ ''ایک چیز ہوتی ہے جسے مقناطیسی فیلڈ کہتے ہیں۔ اس سے نامہ بری کا کام لیا جاتا ہے۔''

اب دیکھیے نعمان صاحب خود میرے نامہ بر ہو کر آپ کے پاس آئیں گے اور میرا یہ خط آپ کو پہنچائیں گے۔ میں تو اس کو بھی مقناطیسی جولانگاہی کی بات سمجھتا ہوں۔

آپ کے اور نعمان صاحب کے درمیان حلاج کا ذکر مبارک رہے گا۔ میں وہاں ہوتا تو گفتگو میں شریک ہوتا۔ ایک روز نعمان صاحب نے مجھ سے کہا، میں تو خود حق ہوں، چنانچہ کہہ سکتا ہوں کہ انا الحق۔ (......امریکہ اور انگلستان میں یہ ڈاکٹر حق ہی کہلاتے ہیں......) میں نے یہ سن کر کہا۔ ''نعمان کے معنی ہیں خون، آپ کی رگوں میں خونِ حق گردش میں ہے اور بندے کی رگوں میں خونِ ناحق۔''

حلاج کو صوفی لوگ حلاج القلوب بھی کہتے ہیں یعنی دلوں کا دُھنیا لیکن اس کے حلاج کہلانے کی اصلی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کا باپ دُھنیا تھا۔

عمر خیام کے بزرگوں کا پیشہ غالباً خیمہ سازی تھا اور اس وجہ سے وہ خیام کہلایا۔ لڑکپن میں ممکن ہے خیمہ سازی اس نے بھی کی ہو لیکن جب یہ بڑا ہوا تو منجم اور ریاضی داں ہوا۔ غزل گو ہوتا تو اپنے نام خیام سے تخلص کا کام لیتا۔ شاعری اس نے بس اتنی کی کہ چند رباعیاں کہیں۔ قدیم ترین مخطوطات میں اس سے صرف دو تین رباعیاں منسوب ہیں۔ آیندہ زمانوں میں دوسروں کی کہی ہوئی بیسیوں رباعیاں اس سے منسوب ہوئیں۔

آدمی مزے کا تھا۔ آصف صاحب بھی مزے کے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر بھی ہیں اور قلمکار بھی۔ انہیں یاد کرتا ہوں تو

سوچتا ہوں کہ وہ کس کام کو کب کرتے ہیں
لکھتے کس وقت ہیں، کس وقت مطب کرتے ہیں

KUTABKHANA OSMANIA

19 November, 2001

بخدمت گرامی و محترمی افتخار عارف صاحب
صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان

مہربانم، السلام علیکم!

آپ کا تلطف نامہ مورخہ ۲۶۔اکتوبر ہماری نقلِ مکانی کے باعث روبراہ ہو کر مجھے ہمارے نئے پتے پر موصول ہوا، نہایت ممنون ہوں۔

مولوی عبدالحق ایوارڈ اگر مجھے ایک تصنیف پر حاصل ہوتا تو بھی افتخار کم نہ ہوتا۔ دو تصنیفوں پر دو انعام تو ایسی شاباش ہے کہ مشاعرے کی داد کا سا لطف آیا ہے۔ اکادمی کی جس کمیٹی نے مجھ کو ان انعاموں کا مستحق سمجھا اس کے ارکان کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ جھک جھک کر غائبانہ آداب عرض کر رہا ہوں۔

آپ کی دوستی پر نازاں

داؤد رہبر

19 January, 2002

میرے مہربان افتخار عارف صاحب زاد لطفکم!

السلام علیکم، میرے دوست وجیہہ الدین احمد صاحب نے اس صورتِ حال کی اطلاع آپ کو دے دی ہوگی کہ پاکستان کے کسی بھی بینک میں میرا اکاؤنٹ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اکادمی کی جانب سے عطیے کے جو چیک موصول ہوئے ہیں، ان کا وہاں میرے حساب میں جمع کرا دینا ممکن ہوتا۔

میں دونوں چیک اس خط کے ہمراہ رجسٹرڈ ڈاک سے واپس بھیج رہا ہوں۔ التماس یہ ہے کہ ان کی بجائے دونوں رقموں کے چیک وجیہہ الدین کے نام بنا کر انہیں کراچی بھیج دیے جائیں۔ وہ یہ رقم اپنے بینک کے حساب میں جمع کرا دیں گے۔

میں پاکستان سے اردو کی کتابیں منگاتا رہتا ہوں۔ جو کتابیں مطلوب ہوتی ہیں، وجیہہ صاحب خرید کر یہاں بھیج دیتے ہیں۔ عطیے کی یہ رقم ان کے پاس رہے گی تو اس سلسلے میں کام آئے گی۔

چیک یہاں جناب مولا بخش صاحب کے کرمنامے کے ہمراہ موصول ہوئے۔ میں نے ان کی رسید اور شکریے کا خط ان کی خدمت میں بذریعہ فیکس بھیج دیا ہے۔

والسلام مع الاحترام۔

آپ کا احسان مند۔

داؤد رہبر

وجیہہ صاحب کا پتہ ہے:-

جناب Wajihuddin Ahmed
44/II 13th Street (Off Khayaban-e-Mujahid)
Defense Housing Authority (Phase V)
Karachi

آپ کا لکھا ہوا انٹرویو چھپا تو اسے پڑھ کر وجیہہ الدین احمد نے مجھے کراچی سے فون کیا۔ فون کی گھنٹی نے مجھے جگایا تو میں نے ٹائم پیس پر نگاہ ڈالی۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ انہوں نے خبر دے کر پوچھا۔ ''اخبار تمہیں بھیج دوں؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں بھیج دو۔''

پرچہ ابھی تک یہاں پہنچا نہیں۔ البتہ ایک پاکستانی خاتون نے کمپیوٹر سے انٹرویو والی تحریر چھاپ کر مجھے بھیج دی۔ آپ نے نثر میں میری مدح ایسی لکھی گویا مئے دو آتشہ کشید کی۔ میرا پندار اس تحریر کو پڑھ کر مخمور ہوا۔ اگلے روز صبح خمیازہ کے علاج کے لیے میں نے سیاہ کافی کے دو پیالے نوش کیے۔ اس تحریر کو پڑھ کر مجھے سوداؔ کا یہ شعر یاد آیا ؎

سوداؔ جو ترا حال ہے، ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

آپ نے پہلی بار مجھے پردیس میں دیکھا۔ اسی سے میرے بارے میں آپ کا دل مائل بہ مبالغہ ہوا۔
بہر حال جزاکم اللہ۔

کراچی میں آپ کی بھیجی ہوئی جو فوٹوگرافر دختر آئی تھی، اس نے میرے کم سے کم ایک درجن فوٹو کھینچے۔ کمرے میں مختلف مقامات پر استادہ کر کے مختلف زاویوں سے ایسی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میرے مسکین بھائی محمد ایوب کے گھر میں سامانِ آسائش تو ہے، سامانِ آرائش کوئی نہیں سوائے دیوار پر ٹنگے ہوئے ایک آئینے کے جس کا فریم جڑاؤ ہے۔ اس آئینے کو غنیمت جان کر فوٹوگرافر نے مجھے اس کے سامنے کھڑا کیا اور میرا نہیں میرے عکس کا فوٹو کھینچا۔ خود بینی والا یہ فوٹو اخبار میں چھپ گیا۔

وجیہہ الدین احمد میری منظومات کی طباعت کی نگرانی میں مشغول ہیں۔ دیباچہ انہی کے قلم سے ہوگا۔ میرے دو شعر انہیں پسند آئے۔ ایک یہ ؎

پلا کر دیکھ لو جب چاہو اک جام
میں باہر نالہ ہوں اندر لطیفہ

میں نے ان سے کہا ''یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ میں باہر لطیفہ ہوں اور اندر نالہ۔'' (وجیہہ نے ایم۔ اے سائیکالوجی میں پاس کیا تھا اور عمر بھر اس فن کی کتابوں کا مطالعہ انہوں نے جاری رکھا۔ چنانچہ یہ کمال کے نفاس ہیں اور بحرِ لاشعور کے غواص) میری بات سن کر بولے ''تمہارے کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بات دونوں طرح ہوتی ہے۔''

دوسرا شعر یہ ہے ؎

ہم کو باہر بھی چراغاں چاہیے
کب تلک یہ شعلۂ شمعِ دروں

آپ کے اباّ کو میرا نیازمندانہ سلام۔ افسوس کہ کراچی کے مختصر قیام میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ آئندہ سال کے آغاز میں ان شاء اللہ پھر آؤں گا تو آپ کے گھر پہنچ کر انہیں سلام کروں گا۔

اہلِ زبان کا شاگرد

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

5 December, 1999

بخدمت گرامی محمد سعید شیخ صاحب

میرے محترم مہربان سعید شیخ صاحب، زاد لطفکم!

السلام علیکم، آپ کا ہدیۂ بیش بہا اعجاز بٹالوی صاحب نے مجھے پہنچا دیا یعنی ''علامت'' کے ۱۹۹۸ء کے سارے شمارے جو آپ نے مجلد کرائے۔ ''علامت'' میں لکھنے والوں کی ایک برادری بن گئی ہے۔ یہ آپ کی ہمت ہی سے بنی ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ اتنی دُور بیٹھ کر بھی اس برادری کی شرکت کا لطف مجھے میسر ہے۔

''تسلیمات'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھنے کا ارادہ میرے دل میں ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون بھیج رہا ہوں۔ اگر صحت رہی تو ان شاء اللہ آیندہ برس میں کم از کم چھ قسطیں اس کی لکھی جائیں گی۔

آپ کے گھر کی ضیافت یاد آتی ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے محسوس ہوا کہ شرکاء ضیافت باقیاتِ صالحات ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے وہاں فوٹو کھینچے تھے۔ ایک فوٹو مجھے انہوں نے بھیجا۔ یہ میرے البم میں رونق افروز ہے۔

آیندہ سال کے رُبعِ اوّل میں لاہور کی زیارت کی نیت ہے۔ آپ سے نیاز حاصل کرنے کی اُمید ہے۔

والسلام مع الاحترام

نیازمند

داؤد رہبر

اگر مناسب سمجھیں تو مضمون کے ساتھ یہ خط بھی چھاپ دیں۔

12 September, 2000

مہماں نواز دوست گرامی سعید شیخ صاحب!

السلام علیکم، اعجاز صاحب نے آپ کا پیغام مجھے پہنچا دیا۔ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ فلورڈا یعنی امریکہ کے دکن میں میری سکونت کے دس سال یکم ستمبر کو پورے ہوئے۔ اگلے سال گرمیوں میں یہاں سے منتقل ہو کر واشنگٹن کے قریب رہائش اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔ علمی اور کلچرل سرگرمیاں یہاں جنوب میں نہیں ہیں۔ گرمیاں البتہ زور کی ہوتی ہیں۔ دس برسوں کی یہ خلوت بہت مفید رہی۔ اردو نگاری کا شوق رہا اور اہلِ وطن سے تجدیدِ تعلق نصیب ہوئی۔ اب انگریزی میں ایک تصنیف کا کام شروع کیا ہے۔ اس کے لیے قیام ایسی جگہ چاہیے جہاں بہترین لائبریریاں ہوں۔

جو مضمون بھیجا جا رہا ہے، جلدی میں لکھا ہے۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل میں تاخیر ٹھیک نہیں۔

والسلام

نیازمند

داؤد رہبر

4 March, 2001

میزبانِ لاہور محبی سعید شیخ صاحب!

السلام علیکم، اعجاز نے آپ کی فرمائش مجھ تک پہنچائی تھی۔ سوچتا رہتا ہوں کس موضوع پر لکھوں۔ اچھا

موضوع بھی آورد سے نہیں، آمد سے سوجھتا ہے۔ اختر شیرانی کے ایک غیر معروف کام کی طرف توجہ دلانے کے لیے میں نے مضمون لکھا ہے۔ اُمید ہے آپ پسند فرمائیں گے۔

اُردو کے بعض فاضل اور سنجیدہ اہلِ قلم کے مضامین نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں یورپ کے مصوروں اور مفکروں اور فنکاروں کے احوالِ زندگی کا بیان نہیں ہوتا، صرف ان کے افکار کا تعارف ہوتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر کوئی انگریز اقبالؔ کے افکار کا تعارف مختصراً دو تین صفحوں میں حیاتِ اقبال کا تعارف کرائے بغیر لکھے تو تعارف کا حق کیسے ادا ہو اور مزا کیا آئے۔ اصل چیز تو سوانح عمری ہوتی ہے۔ مزا اسی میں ہوتا ہے۔

بیرونی ممالک (خصوصاً یورپین ممالک) کی عہد آفرین شخصیات کی سوانح عمریوں کے ترجمے اُردو میں ہونے چاہئیں۔ یہ کام تو ایک منصوبہ چاہتا ہے اور مترجمین کی ایک ٹیم، سرِدست ان شخصیات کی زندگیوں سے تعارف کرانے کے لیے مضمون نگاری شروع ہو جانی چاہیے۔ آپ اپنے احباب کی توجہ اِدھر دلائیے۔ اس سے ''علامت'' کے لیے نئی چیزیں حاصل ہوں گی۔ پروردگار آپ کی تندرستی قائم رکھے۔

نیازمند

داؤد رہبر

25 August, 2000

برادرِ معظم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب!

السلام علیکم، میرا بھائی محمد ایوب بھی کئی برس کمن آباد میں رہا۔ ہمسائیگی کی برکت سے اس زمانے میں آپ سے اس کی سلام دعا تھی۔ میں ۱۹۷۵ء کی گرمیوں میں لاہور آیا تھا تو اس کے ہمراہ آپ سے ملاقات کے لیے آپ کے گھر آیا تھا۔

۱۹۹۶ء میں سعید شیخ صاحب کی ضیافت میں آپ کے درشن ہوئے۔ اُن دنوں آپ اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ دوسرے روز میں وہاں پہنچا۔ آپ کے معانقے سے زندگی کا حوصلہ حاصل ہوا۔ آپ نے مہمان نوازی فرمائی۔ سارے حاضرین کو میرے اعزاز میں مزیدار مچھلی کھلائی۔

اسلام آباد سے مقتدرۂ اُردو کا اخبار یہاں آتا ہے۔ اس میں گاہے گاہے آپ کی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔

مدت ہوئی ''قومی زبان'' کے کسی شمارے میں تازہ رسائل کے مشتملات کا اشارہ پڑھتے ہوئے مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے کسی رسالے کے لیے ہمارے والد مرحوم کی یاد میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کی فوٹو کاپی مجھے مطلوب ہے۔ فوٹو کاپی عنایت کر کے میرا جی خوش کریں۔

میرے عزیز نوید ریاض صاحب کا دفتر مال روڈ پر ہے۔ فوٹو کاپی انہیں پہنچ جائے تو وہ ہوائی ڈاک سے مجھے بھیج دیں گے۔ ان کا فون نمبر 666-3607 ہے اور پتہ 33-C The Mall

آپ کی تندرستی کے لیے دُعا گو

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

6 May, 1998

کرم فرما محمد سہیل عمر صاحب!

السلام علیکم، میرے حبیب اعجاز حسین بٹالوی نے عمرہ کیا۔ ان کے برادر آغا بابر صاحب نے یہ اچھی خبر مجھے سنائی تو میں نے مبارکباد دینے کے لیے اعجاز صاحب کو فون کیا۔ وہ بولے۔ "جدہ کے ایک چائے خانے میں میں نے چائے پی۔ شکر کے جو پیکٹ وہاں چائے کے ساتھ میز پر لائے گئے ان پر انگریزی میں اس کارخانے کا نام اور پتا چھپا ہوا تھا جہاں سے برآمد ہو کر پیکٹ جدہ پہنچے۔ وہ کارخانہ تمہارے دیار یعنی فلوریڈا ہی میں ہے۔ میں نے ایک پیکٹ تمہیں بھیجنے کے لیے محفوظ کر لیا۔"

وہ پیکٹ اب تک یہاں موصول نہیں ہوا۔ جولائی میں اعجاز صاحب امریکہ آئیں گے تو غالباً پیکٹ میرے لیے ساتھ لائیں گے۔ البتہ آپ کا رُقعہ مجھے ملا۔ یہ رقعہ بھی میرے حق میں شکر کی پڑیا ہے۔ اس لیے کہ آپ نے تبصرے کی یاد دہانی کے ساتھ تین چار سطریں اخلاص کے ساتھ تحریر فرمائیں اور مطلع فرمایا کہ آپ مکالمہ میں میرا سفرنامہ پڑھ کر خوش ہوئے۔

گوڈون (Joscelyn Godwin) کی جو کتاب اپنے دستخط سے آراستہ کر کے مجھے مرحمت فرمائی تھی، اس کا عنوان The Music of the Spheres نہیں ہے۔ البتہ اس کتاب کے جزو ثالث کا عنوان یہی ہے۔ ساری کتاب کا عنوان Harmonies of Heaven and Earth ہے۔ کتاب کے سرورق کی فوٹو کاپی اور اس کی فہرست مضامین کی فوٹو کاپی ملفوف کر رہا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیجیے۔

دسمبر ۱۹۹۶ء میں امریکہ واپس آ کر میں نے کتاب کی سرسری ورق گردانی کی تو مجھے احساس ہوا کہ اس پر ماہرانہ تنقید کی لیاقت مجھ میں نہیں۔ اس لیے کہ کتاب میں سمفنی اور اوپرا کے ارتقاء کے بارے میں بہت سی عبارات ہیں جو مغربی موسیقی کی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں۔ سمفنی اور اوپرا سے مجھے کچھ ایسی بیگانگی نہیں ہے۔ ٹیلی ویژن پر ان کے بیسیوں پروگرام دیکھنے اور سننے میں آئے لیکن کسی کمپوزر کے ہاں "سرہافنیوں" کی خاص کرامتیں کیا ہیں۔ اس کی فہم سے میں بے بہرہ ہی رہا۔ مغربی موسیقی کا سمندر ایک بحر ذخار ہے اور بڑے بڑے مغربی موسیقاروں کی سوانح عمریاں بھی خاصی مفصل لکھی گئی ہیں۔ اس موسیقی پر مبصرانہ کچھ کہنے یا لکھنے کی لیاقت اسی شخص میں ہوگی جو اس کے کسی کالج کا فارغ التحصیل ہے اور اس کا گہرا ودوان ہے۔ میں تو اپنے دیس کی کلاسیکی موسیقی کا دیوانہ رہا۔ اپنے ہاں کے اور اپنے زمانے کے بہترین گائیکوں اور سازندوں کی نوآفرینیوں کی گونج میرے دماغ میں ہے۔ مغربی موسیقی کا چسکا مجھ کو نہ لگا۔

آپ نے یاد دہانی فرمائی تو میں نے گوڈون صاحب کی کتاب کے دو تین ابواب کو اب کے جستہ جستہ اس نیت سے پڑھا کہ دیکھوں کچھ میرے پلے پڑتا ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض عبارتوں کو پڑھ کر میں چونکا۔ بعض مشاہدات دل کو لگے۔ اب اعتماد ہے کہ ساری کتاب کو بغور پڑھ کر اس کے بارے میں ایک مضمون لکھ سکوں گا۔

آج ۶ مئی ہے۔ مئی کے آخر میں ان شاء اللہ تبصرہ آپ کو بھیج دوں گا۔ وسط جون سے پہلے آپ کو مل جائے گا۔

13 July, 2001

برادرم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب!

السلام علیکم، آپ کا عنایت نامہ ملا، بے حد خوشی ہوئی۔ الحمدللہ کہ مقتدرہ کی اور اقبال اکیڈمی کی سربراہی کے بعد اب آپ قائدِ اعظم لائبریری میں رونق افروز ہیں۔ مخزن کا احیاء مبارک ہو۔ اس کے لیے کچھ لکھ کر بھیجوں گا۔

سر عبدالقادر جب لندن گئے تھے تو مخزن کی ادارت شیخ محمد اکرام صاحب کے سپرد کر گئے تھے۔ دربارِ ملی کی تدوین میں اکرام صاحب سے آپ کی رفاقت رہی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ان کی یاد میں ایک مضمون لکھ کر مخزن کے کسی شمارے میں شامل کریں۔ مرحوم کا بلند پایہ محقق اور مورخ ہونا اور انڈین سول سروس میں مناصب عالیہ پر فائز ہونا تو سب شائقین علم کو معلوم ہے لیکن ان کے خاندانی اور نجی احوال معروف نہیں ہیں۔ ان کی چھان بین پر کسی شاگرد کو لگا دیجیے۔

۱۹۶۹ء میں جشنِ غالب دلی میں منایا گیا تو خوش قسمتی سے اس میں مدعو ہو کر میں بھی دلی پہنچا۔ ان ایام میں صدر مملکت ایوب خاں صاحب کی حکومت کا تختہ اُلٹ رہا تھا۔ پاکستانی علماء کو جشن غالب کی انتظامیہ کمیٹی نے دعوت نامے بڑی تاخیر کر کے بھیجے تھے۔ پاکستانی علماء ناراض ہوئے۔ پاکستان کا کوئی نمائندہ وہاں شریک ہونے کو نہ پہنچا۔

نئی دلی میں کتابوں کی مشہور دکان منشی رام منوہر لعل کی ہے۔ وہاں میں کتابیں خریدنے کے لیے پہنچا تو شیخ محمد اکرام صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا، میں جشن کی کسی تقریب میں شریک نہیں ہوں۔ صرف ملاقاتوں اور کتابوں کی خرید کے لیے دلی آیا ہوں۔ مرحوم سے عمر بھر میں میری ایک ہی ملاقات ہوئی اور وہ اسی دکان میں ہوئی۔

ہمارے والد مرحوم کی یاد میں آپ نے جو مضمون لکھ کر کسی رسالے میں شائع کیا تھا، اُمید ہے سامان کے کھلنے پر اس کی کھوج میں آپ کو دشواری نہ ہوگی۔ اس مضمون کی فوٹو کاپی آپ ارسال فرمائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

اورینٹل کالج میگزین کے پروفیسر اقبال نمبر کے سارے مضامین کا انگریزی ترجمہ کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے بھی ایک مضمون لکھا تھا۔ وہ کسی اور رسالے میں چھپا تھا۔ اس کا ترجمہ بھی میں نے کر لیا ہے۔ آپ کی تحریر کا ترجمہ بھی کروں گا۔

والد مرحوم کی سوانح عمری کے آخر میں سارے ترجمے بطور ضمیمہ شامل کرنے کا ارادہ ہے۔

جناب عنایت اللہ صاحب نے میری کہانیوں کی کتاب کا تعارف کشادہ دلی کے ساتھ لکھ کر قدر افزائی فرمائی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ ان کو میرا سلام پہنچا دیں بلکہ میرا یہ خط ان کو دکھا دیں۔

والسلام

آپ کا گرویدہ

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

میرے سب دوستوں کو سلام محبت۔

منت گزار

داؤد رہبر

9 July, 1998

نگرانِ ادب جناب سہیل عمر صاحب!

السلام علیکم! تبصرہ لکھنے اور بھیجنے میں بہت تاخیر ہوئی۔ معافی چاہتا ہوں۔ مشاہدات تو اس کتاب میں بہت ہیں لیکن مصنف صاحب بے پیرے لگتے ہیں یعنی کسی سالک سے بیعت نہیں ہیں۔ واللہ اعلم کہہ کر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ امریکہ میں یوگیوں نے یوگ کا پرچار کیا ہے۔ ان سے کچھ محاورہ پروفیسر گوڈون صاحب کو ملا ہے اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہندوستانی سنگیت بھی یوگ قسم کی کوئی چیز ہے۔ مسلمانوں (عربوں، ایرانیوں اور ترکوں) کی موسیقی کا درک بھی انہیں حاصل نہیں۔ غیر یورپی کلاسیکی موسیقاروں سے ان کا میل جول برائے نام بھی نہیں رہا۔ میں دو مہینے سوچتا رہا اس کتاب کے بارے میں کہوں تو کیا کہوں۔ بہرحال ''تبصرہ'' حاضر ہے۔

دوستوں کو سلام، کیا ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ریٹائرڈ ہو گئے ہیں؟ ان کو خصوصاً سلام۔

نیازمند

داؤد رہبر

21 April, 2001

محترم گرامی ڈاکٹر سہیل عمر صاحب!

السلام علیکم! آپ کی مہربانی سے اکیڈمی کی چند مطبوعات کا ہدیہ موصول ہوا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے میں دیر ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔

کتابوں کا جتنا ذخیرہ میرے پاس ہے، اس میں سے آدھا گھر میں رکھا ہوا ہے اور آدھا پبلک سٹوریج کی ایک کوٹھڑی میں جو میں نے کرائے پر لی ہوئی ہے۔ پچھلے مہینے وہاں کتابوں کو چھانٹتے ہوئے ادارۂ معارف اسلامیہ کے تین اجلاسوں کی ضخیم رودادیں مدت کے بعد سامنے آئیں۔ ان کی ورق گردانی سے گزرے ہوئے ایام کی یاد تازہ ہوئی اور میں نے ادارہ پر ایک مضمون لکھ کر لاہور کے رسالہ ''علامت'' کے مدیر جناب سعید شیخ صاحب کو اشاعت کے لیے بھیجا۔

ادارہ مذکورہ کی بنا علامہ اقبال مرحوم کی تجویز سے ڈالی گئی تھی۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ آپ کو اس مضمون سے دلچسپی ہوگی۔ مضمون کی نقل آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔

ادارہ کا پہلا اجلاس لاہور میں (۱۹۳۳ء) زیرِ صدارت علامہ اقبال منعقد ہوا۔ دوسرا اجلاس لاہور ہی میں (۱۹۳۶ء) زیرِ صدارت میاں سر فضل حسین مرحوم منعقد ہوا اور تیسرا دہلی میں (۱۹۳۸ء) زیرِ صدارت سر شاہ محمد سلیمان مرحوم۔ تینوں اجلاسوں کے گروپ فوٹو کھینچے گئے جو بفضلِ خدا میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی نقلیں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

تینوں اجلاسوں کی رودادیں شائع ہوئیں۔ ہر روداد کی تعداد اشاعت کیا تھی، مجھے معلوم نہیں۔ قیاس ہے کہ تعداد ڈیڑھ دو سو سے زیادہ نہ ہوگی۔

میرے خیال میں ان رودادوں کی اہمیت ایسی ہے کہ انہیں دستیاب رہنا چاہیے۔ اکیڈمی کی مجلسِ مشاورت اگر ان رودادوں کی طبع ثانی کی طرف توجہ کرے تو یہ ایک کارِ خیرِ عظیم ہوگا اور کارِ ثواب بھی۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں یہ رودادیں موجود ہوں گی۔ آپ وہاں سے منگوا کر ان پر نظر ڈالیں۔ آئندہ دسمبر یا جنوری میں لاہور آنا ہوا تو آپ کو سلام کرنے پہنچوں گا۔ میرے احباب اور اربابِ اکیڈمی کو سلام پہنچے۔

نیازمند

داؤد رہبر

30 May, 2001

گرامی و محترمی ڈاکٹر سہیل عمر صاحب!

السلام علیکم! کرم نامہ مورخہ ۹ مئی موصول ہوا۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ میرا مقالہ اقبال ریویو کے خصوصی شمارے میں جگہ پائے گا۔ آپ کی رائے صائب ہے کہ مقالہ اس جملے پر ختم کر دیا جائے:-

''ادارۂ معارف اسلامیہ کی تجدید کا خیال پھر کسی کو نہ آیا۔'' (مسودۂ مقالہ صفحہ ۲۲)

ادارہ کے اجلاس سوم کا جو گروپ فوٹو میرے پاس ہے، بہت اچھی حالت میں ہے۔ آج اس کا نیگیٹو بنوانے کے لیے ایک فوٹو سٹوڈیو پہنچا۔ ۴ جون کو نیگیٹو مجھے ملے گا۔ اسی روز ڈاک میں ڈال دوں گا۔

آپ نے بتایا ہے کہ اجلاسِ اوّل کا گروپ فوٹو لاہور میں دستیاب ہے۔ چنانچہ اس کا نیگیٹو بنوانا میں نے غیر ضروری سمجھا۔

اجلاسِ دوم کا گروپ فوٹو میرے پاس تھا۔ مسلسل نقل و حمل میں اس کو ضرر پہنچا۔ تلاش سے کاغذوں میں کہیں مل بھی جائے تو بے فائدہ ہوگا۔ اس لیے کہ نصف تصویریں اس میں مسخ ہو چکی ہیں۔ اجلاسِ دوم کی روداد کی جلد میں یہ گروپ فوٹو شامل ہے۔ وہاں سے نقل بنوائی جا سکتی ہے۔

علامہ صرف اجلاسِ اوّل (۱۹۳۳ء) کے گروپ فوٹو میں رونق افروز ہیں۔ اجلاسِ دوم (۱۹۳۶ء) کے دنوں میں آپ علیل تھے۔

والسلام مع الاکرام

نیازمند

داؤد رہبر

20 December, 1993

گرامی جناب نیاز احمد صاحب

السلام علیکم! قسمت نے ہماری ملاقات کرا دی۔ آپ وقت نکال کر میرے لیکچر میں تشریف لائے۔ آپ کے مکتبہ کی برکتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ آپ کی عطا کی ہوئی کتابیں میں نے واپس آتے ہی

KUTABKHANA OSMANIA

پڑھ ڈالیں۔ان کتابوں کے صفحات پر جا بجا میرے مہربانوں کے ذکر ہیں۔

پروف میں نے سب دیکھ لیے۔حسب توفیق درستیوں کے نشان لگا دیئے۔کئی سال پہلے مجھے اردو میں پروف خوانی کا تجربہ ہوا۔اس زمانے میں کمپوزنگ کا استعمال نہ تھا۔کتابت ہوا کرتی تھی۔اب اردو میں کمپوز کیے ہوئے پروف پڑھنے کا موقع پہلی بار ہوا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ کمپوزنگ میں غلطیاں اور قسم کی ہوتی ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کمپوز کیے ہوئے صفحات کی درستیاں درست کرنا بڑا نازک کام ہے۔ضروری ہے کہ کمپوزر صاحب ہشیار رہیں۔خدا کرے کہ غلطیوں کی درستی اچھی طرح ہو سکے اور اشاعت کی لاج رہے۔

درست کیے ہوئے پروفوں پر اگر میں ایک بار نظر ڈال سکوں تو بہتر ہو، میں دُور بیٹھا ہوں۔ڈیڑھ دو مہینوں کی دیر تو دوسری بار کی پروف خوانی میں ہوگی لیکن نتیجہ اچھا ہوگا۔آپ کا کیا خیال ہے؟

کتاب کا عنوان شاید غلطی سے میں نے ''پیام وسلام'' لکھ دیا تھا۔صحیح عنوان ہے:-

''سلام و پیام''

خطوط میں سلام ہمیشہ پیام سے پہلے ہوتا ہے۔

کتاب کے شروع میں ''فہرستِ مضامین'' جو صفحات کے نمبروں کے ساتھ درج ہوتی ہے،اس کی ترتیب میں غالباً میرا ہاتھ ضروری ہوگا۔جب اس فہرست کے بنانے کا وقت آئے،میں شریک کار ہونے کو حاضر ہوں۔

پروفوں کی غلطیاں جو صاحب درست کریں گے،ان کے لیے میں نے رنگین کاغذ پر چند ہدایات تیار کی ہیں،یہ رنگین کاغذ ان کو دے دیا جائے تو فایدہ ہوگا۔

لاہور کو بلکہ سارے پاکستان کو آپ فیض پہنچا رہے ہیں۔آپ کی علمی و ادبی سرگرمی سے میں متاثر ہوا۔اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت قائم رکھے۔

بھائی آغا بابر صاحب کو میں نے ''حوا کی بیٹی'' کا نسخہ پہنچا دیا تھا۔

والسلام

بندہ

داؤد رہبر

24 June, 1994

بخدمت جناب نیاز احمد صاحب!

کرم فرمائے محترم و مکرم،السلام علیکم!

اللہ کا شکر ہے کہ گزشتہ دسمبر میں آپ کے مکتبہ کی زیارت کا موقع ملا۔اس کے بغیر اس کی برکات کا منظر سامنے کیسے ہوتا۔

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے درست کیے ہوئے پروفوں پر نظر ڈالنے کا مجھے موقع دیا۔اتفاق سے اعجاز صاحب کے برادر مکرم واپس امریکہ آ رہے تھے۔ان کے ذریعے پروف مجھے مل گئے۔

پروف مجھے نیویارک سے ۱۸۔جون کو بھیجے گئے۔جون کی بیس تاریخ کو مجھے ملے۔تین روز سب کام چھوڑ کر ان کے پڑھنے میں لگا رہا۔اچھا ہوا کہ نظرِ ثانی ہوگئی۔کمپوزر صاحب کا کام میری توقع سے بہت بہتر ہے۔

واقعی بڑی محنت کا کام ہے۔تاہم ایسی غلطیاں پھر بھی کافی نکلیں جن کا پکڑ لینا مصنف کے لیے آسان ہے۔دوسرے پڑھنے والے کی نظر میں وہ ہشیاری ممکن نہیں۔

اگر میں لاہور میں ہوتا تو اکثر آپ سے ملنے آیا کرتا اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی طباعت کے امور پر بات چیت ہوتی رہتی۔کیا کروں،دُور امریکہ میں بیٹھا ہوں۔چٹھی پندرہ روز میں پہنچتی ہے اور جواب اُدھر سے فوراً چل پڑے تو مزید پندرہ دن لگتے ہیں۔گویا ایک مہینے میں جواب آتا ہے۔

پروفوں پر نظر ثانی کر کے میں نے درستیوں کے نشان لگائے۔کل (۲۳ جون کو) پروفوں کا رجسٹرڈ پارسل ہوائی ڈاک سے اعجاز صاحب کو بھیج دیا۔ان شاء اللہ جولائی کی سات یا آٹھ کو انہیں مل جائے گا اور وہ پارسل آپ کو پہنچا دیں گے۔

کمپوزر صاحب کو شاباش دی جائے تو یہ ہدایت بھی کہ جتنی غلطیاں باقی ہیں،ان کی درستی میں پوری احتیاط رہے۔اس لیے کہ اس کے بعد کوئی پروف میرے سامنے نہ آئیں گے۔

اب جو کام باقی ہے،ظاہر ہے کہ وہیں لاہور میں ہوگا۔ایک اور اہم کام باقی یہ ہے کہ ''فہرستِ صفحات'' پر صفحات کے نمبر لگانے ہیں،یہ کام بڑی احتیاط کا کام ہے۔

چھپی ہوئی فہرست اصحاب مراسلت مرتب تو ہے ہی،اس کی فوٹو کاپی اس خط کے ساتھ نتھی کر رہا ہوں۔جب پوری کتاب کے صفحات کے پورے نمبر لگ چکیں تو اس فہرست کے ناموں کے آگے صفحوں کے نمبر درج کرنا آسان ہوگا۔

صفحے پلٹ پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ پچھلے صاحب کے نام کے خط کہاں ختم ہوئے اور دوسرے صاحب کے نام کے خط کس صفحے سے شروع ہوئے۔

مجموعے کا آخری حصہ ان خطوں کا ہے جو میں نے فلورڈا سے (ریٹائر ہونے کے بعد) لکھے۔ان کی فہرست کی ضرورت نہیں۔ہر خط کے اوپر اس شخص کا نام صاف درج ہے جس کو خط لکھا گیا۔

پروفوں کے پارسل کے آپ تک پہنچ جانے کی اطلاع اعجاز صاحب سے مجھے ملے گی تو اطمینان کا سانس لوں گا۔

والسلام مع الاکرام

خیر طلب

داؤد رہبر

14 November, 1997

گرامی جناب چودھری نیاز احمد صاحب،زاد لطفکم!

السلام علیکم،ایک غلطی اور میرے دھیان میں آئی۔کتاب کے تیسرے باب (مسیحی کلچر کے روحانی عناصر) کے آخر میں مجھ سے ایک غلط بیانی ہوئی،وہاں ایک جملہ (پروفوں کے صفحہ ۱۳۱ کے آخری پیراگراف میں) یوں ہے:-

متی،مرقس،لوقا اور یوحنا مسیح کے صحابیوں میں سے تھے۔

لفظ ''صحابیوں'' کو کاٹ کر اس کی جگہ لفظ ''معتقدین'' چھاپ دیا جائے تو درست ہوگا۔

KUTABKHANA OSMANIA

میں لاہور میں ہوتا تو جو کچھ کہنا ہوتا، مکتبہ میں حاضر ہو کر کہتا۔ دُور سے دوسری بار زحمت دینے کی معافی آپ سے بھی چاہتا ہوں اور عزیزم نوید ریاض صاحب سے بھی۔

دُعائے خیر و عافیت۔

نیاز مند

داؤد رہبر

19 February, 1999

بخدمت گرامی چودھری نیاز احمد صاحب زاد لطفہم

کرم فرما محترمی چودھری صاحب!

السلام علیکم! امریکہ کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوں۔ اگلے زمانوں کے برگزیدہ بزرگوں کی روحوں کا اور اپنے زمانے کے مہربانوں کا رابطہ میرا سہارا ہے۔ ان مہربانوں میں آپ کا مقام میرے دل میں خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی راحت اور تندرستی قایم رکھے۔

کہانیوں کی کتاب کے پروف پڑھ کر واپس بھیج رہا ہوں۔ غلطیوں کی تعداد اور نوعیت ایسی ہے کہ انہیں درست کرنے کو بڑی احتیاط چاہیے۔ کمپوزر صاحب کے نام ایک خط اس خط کے ساتھ ملفوف ہے، اسے ملاحظہ فرما کر کمپوزر کو دے دیں۔

درست کیے ہوئے پروف بھی مجھے بھیجے جائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

والسلام مع الاکرام۔

نیاز مند

داؤد رہبر

17 July, 2000

مشفقی و محترمی چودھری نیاز احمد صاحب!

السلام علیکم، اعجاز صاحب سے خبر ملی کہ آپ اپنے عزیزوں سے ملنے افریقہ تشریف لے گئے تھے۔ آپ کی مہربانی سے موسیقی والی کتاب کے پروف ایک ہفتہ قبل موصول ہوئے، میں نے پڑھ کر غلطیوں کے نشان لگا دیئے۔

کمپوزر صاحب کے لیے میں نے چند یادداشتیں لکھی ہیں۔ آپ ان پر نظر ڈال کر پروفوں کے ساتھ انہیں کمپوزر صاحب کو پہنچا دیں اور مجھے ممنون فرمائیں۔

پروردگار آپ کی تندرستی قایم رکھے۔ آپ کے دونوں فرزندوں کو میری دعائیں۔

نیاز مند

داؤد رہبر

(۱) یہ کتاب موسیقی کے بارے میں ہے۔ اس میں ''سُر'' کا لفظ بہت کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اسے ٹائپ کرتے ہوئے سین پر پیش بہت ضروری ہے۔

بعض لفظ ایسے ہوتے ہیں کہ زیر، زبر، پیش کا خیال نہ رکھا جائے تو مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً ایک جگہ لفظ ''کُدیاں'' آیا ہے۔ اس کو بغیر پیش اور شد کے چھاپ دیں تو پڑھنے والوں کو مطلب سمجھنے میں دقت ہوگی۔

(۲) ہمزہ (ء) بھی بعض لفظوں میں ضروری ہوتی ہے۔ آپ نے ''تمئیز'' کو چند جگہوں پر بغیر ہمزہ کے (تمیز) ٹائپ کیا ہے۔ اسی طرح ''لکھنؤ'' کو لکھنو (بغیر ہمزہ) کے ٹائپ کیا ہے۔

(۳) تاریخیں ساری آپ نے انگریزی ہندسوں میں ٹائپ کر دی ہیں۔ حالانکہ اصل کتاب میں یہ عربی ہندسوں میں تھیں۔ اُمید ہے آپ ان کو عربی ہندسوں میں ٹائپ کر سکیں گے۔ مثلاً 1986ء کی جگہ ۱۹۸۶ء چاہیے۔

10 April, 2001

گرامی جناب چودھری نیاز احمد صاحب!

السلام علیکم! سریلی باتوں والی کتاب کے دو نسخوں کا پارسل موصول ہوا۔ میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم ایڈیٹر ''ادبی دنیا'' سے آپ کی سلام دعا رہی ہوگی۔ ''ادبی دنیا'' میں میرے مضامین ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک متواتر چھپتے رہے۔ مولانا نے ایک ادارہ اکادمی پنجاب کے نام سے قایم کیا تھا اور اس کا ایک سلسلہ مطبوعات بھی جاری کیا تھا۔ میرے جتنے مضامین ''ادبی دنیا'' میں چھپ چکے تھے، ان کا ایک مجموعہ مولانا نے اس سلسلہ میں شامل کر کے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان ''نسخہ ہائے وفا'' ہے۔

مولانا کے فرزند وجیہہ الدین احمد صاحب کراچی میں رہتے ہیں۔ دو سال ہوئے انہوں نے مجھے لکھا ''نسخہ ہائے وفا'' اب بازار میں نایاب ہے، اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنا چاہیے۔ انہوں نے کمال مہربانی سے اس کی کمپوزنگ کرائی۔ پروف مجھے تین دفعہ بھیجے گئے۔ کمپوزر نے سب غلطیاں درست کر دیں۔ کمپوزنگ کے ڈسک کمپوزر (نذیر احمد صاحب) کے پاس کراچی میں محفوظ ہیں۔

وجیہہ صاحب کا خیال تھا کہ یہ کتاب کراچی میں پرائیویٹ طور پر چھپوائی جائے۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ مکتبہ سنگ میل اس کو شائع کرے تو اس کی اشاعت باقاعدہ اور سہولت کے ساتھ ہو سکے گی۔ میں اس خط کی کاپی بذریعہ فیکس کمپوزر صاحب کو اور وجیہہ الدین احمد صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ آپ ان دونوں سے رابطہ قایم فرمائیں تو کوئی فیصلہ ہو سکے۔

آپ کی صحت و عافیت کا خواہاں

نیاز مند

داؤد رہبر

12 August, 2001

گرامی و محترمی چودھری نیاز احمد صاحب!

السلام علیکم، آپ کے سعادت مند فرزند عزیزی اعجاز احمد کے انتقال ناگہانی کی خبر ایسی ہے کہ یقین

KUTABKHANA OSMANIA

نہیں آتا۔ اس سانحہ کے ماتم میں شریک ہوں۔ مرحوم کے بلند اخلاق اور اطوارِ حسنہ کو میں نے اس سے ہمکلام ہو کر جانا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت الفردوس کی ساری نعمتوں سے نوازے اور آپ کو اور مرحوم کے پسماندگان کو صبرِ جمیل کی ہمت عطا فرمائے۔

غمگسار

داؤد رہبر

21 July, 1998

مسافر نواز افتخار جالب صاحب!

السلام علیکم! آپ سے گفتگو ہوئی تو آپ کے قلبِ مضطر کی دھڑکن سنائی دی۔ اتفاقاً آپ نے بتایا کہ گورنمنٹ کالج میں آپ ۱۹۵۱ میں داخل ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ آپ کی عمر اب ماشاء اللہ ساٹھ کے قریب ہے۔ بندہ گزشتہ مئی میں بہتر کا ہوا۔ بیسویں صدی کا تین چوتھائی دیکھنا نصیب ہوا۔ کئی ایکٹوں کا سنسنی خیز ڈراما دیکھا گیا۔

اُردو اور انگریزی اخبار پڑھنا میرے معمول میں کبھی شامل نہ رہا۔ ٹیلی ویژن پر خبریں البتہ سنتا رہا۔ پاکستان اور ہندوستان میں میرے ہم عمر ساتھی سب دادا اور نانا بن گئے۔ کئی ان میں سے گزر گئے۔ چند احباب ابھی حیات ہیں۔ ان کے ساتھ میری مکاتبت برقرار ہے۔ بعض ان میں سے امریکہ میں مجھ سے ملنے آئے۔ ہندوستان اور پاکستان کے کئی موسیقار امریکہ آتے رہے۔ ان سے دوستی ہوئی اور ان سے رموزِ موسیقی کے سبق لیے۔

طبیعت میں اب حیرت بھی ہے اور عبرت بھی۔ انسان اپنے آپ کو احوالِ کائنات کی گاڑی کا ڈرائیور سمجھ بیٹھا ہے۔ اس گاڑی کا ڈرائیور قدرت ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ بھارت میں فلمی آرکسٹراؤں کے سازندوں میں اب سٹاف نوٹیشن سامنے رکھ کر ساز بجانے کی لیاقت پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان میں سٹاف نوٹیشن کے استعمال کی ضرورت کی بحث قبل از وقت ہے۔ وہاں فتویٰ کلاسیکی موسیقی کے خلاف سختی سے ہے۔ یہ رکاوٹ دُور ہو تو سنگیت کی تعلیم کا چیلنج سامنے آئے۔

والسلام

بندہ

داؤد رہبر

27 August, 1998

میرے مہربان مکرمی افتخار جالب صاحب!

السلام علیکم! تشریحات راگوں کی بھیج رہا ہوں۔ ان کے لیے عنوان پہلے فردوسِ گوش سوجھا تھا، پھر میں نے بدل کر راگ سہاگ کر دیا۔ یہ مجھے بہتر لگا۔

آپ اس کتاب کی طباعت کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ اگر اس کی کتابت یا کمپوزنگ ہو تو غلطیوں سے بچ کر رہنا نہایت دشوار ہوگا۔ آپ تو بینک کے حسابات کی پڑتال میں برسوں مصروف

رہ چکے ہیں۔ کاغذ پر سرگم کی علامات کا بے خطا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا بینک کے حسابات کا بے خطا ہونا۔

اگر آپ اس بیاض کی طباعت پر کسی ناشر کو راضی کر لیں تو بہتر یہی ہے کہ میرے ہی ہینڈ رائٹنگ والے اس نسخے کو آوف سیٹ طباعت کے لیے استعمال کیا جائے۔ کمپوزنگ اور کتابت اور پروف خوانی کا جھنجھٹ نہ ہو۔ طباعت کو اغلاط سے مبرا رکھنے کی تدبیر یہی ہے۔

ڈیڑھ دو سو نسخوں سے زیادہ چھپوانا بھی غیر ضروری ہے۔ ایسی چیزوں کے شائقین ملک میں بہت ہی کم ہیں۔

اس کتاب کی بابت اگر آپ نے اہلِ فن خان صاحبان کی رائے لی تو وہ ماتھے پر تیوری لائیں گے۔ یہ اہلِ میراث راگداری پر اپنا اجارہ چاہتے ہیں۔ یہ تشریحات میری وضع کی ہوئی نہیں ہیں۔ پنڈت سبا راؤ کے مشاہدات کا گویا ترجمہ ہیں، پنڈت جی کا گیان گہرا ہے۔

خیریت سے کراچی پہنچ کر ادب نوازوں کو میرا سلام کہیں۔ آپ سے فون پر اچھی گفتگو رہی۔

والسلام

ہمیشہ مسافر

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

23 November, 2001

مکرمی افتخار جالب صاحب!

السلام علیکم، آپ کی تصنیف کا تحفہ موصول ہوا۔ بڑی مہربانی۔ اس کے مطالعہ سے میں مستفید ہوا۔

آپ تو راگ رنگ کے رسیا ہیں۔ تعجب ہے آپ قافیہ اور ردیف سے بے تعلق ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ مطلع میری بجائے آپ کہتے

کچھ اور آپ سے کہنا نہیں حضور مجھے
نہیں شعور مجھے، بس ہے لاشعور مجھے

آپ کی شاعری (اور آپ کی نثر) کا سرچشمہ آپ کا لاشعور ہے۔ چنانچہ آپ کے عندیے میں شعر وہ ہے جو لاشعر ہے۔

غزل گانے والوں میں مہدی حسن اور غلام علی نے بڑا نام پایا ہے۔ ان کی غزل سرائی غور سے سنیے تو سامعہ گواہی دے گا کہ ہر شعر کو گاتے ہوئے ''سم'' کا مزا ردیف کے شامل ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ غزل صدیوں سازسنگت کے ساتھ گائی جاتی رہی۔ جدید شاعری کی شادی سنگیت سے نہیں ہوئی، یہ بہت بڑا فرق ہے۔

میں آپ کی کتاب کے آخری حصہ (قدیم بجر) کی فوٹو کاپی وجیہہ الدین احمد صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ کراچی پہنچ کر ان سے ملیے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میرا جی اپنی نظموں کی تعبیر اور تاویل کے لیے وجیہہ صاحب سے رجوع کیا کرتے تھے۔

جو پہیلیاں امیر خسرو سے منسوب ہیں، وہ عوامی ہیں۔ آپ نے جو پہیلیاں کہی ہیں، عوام کے کام کی نہیں ہیں، خواص کے کام کی ہیں۔

ابن العربی کا محاورہ بھی چیستانی ہے۔ ان کی تصنیف فتوحاتِ مکیہ صدیوں خلوت میں نہیں مجلسوں میں پڑھی جاتی رہی۔ آپ کا چیستانی کلام کسی بزم میں پڑھا جائے اور اس کے ہر مصرعے (یا جملے) پر طرح طرح کی خیال آرائیاں چالو ہوں تو شرکاءِ بزم اس نتیجے پر پہنچیں کہ بعض چیستانوں کے متعدد حل ممکن ہوتے ہیں۔ جاپان میں بدھ مت کے دھیانی دبستان (Zen Budhism) کے گورو اپنے چیلے کی تربیت کے لیے انہیں کوئی چیستان یہ کہہ کر تھما دیتے تھے، جا اس پر غور کر اور اس کا ٹھیک جواب لا۔ چیلا مہینوں اس پر غور کر کے گورو کے پاس آتا اور ایک حل عرض کرتا۔ گورو کہتا یہ جواب ٹھیک نہیں۔ ایک مدت بعد جب چیلے کو ایک اور حل سوجھتا تو حاضر ہو کر گورو سے عرض کرتا، گورو پھر فرماتا، نہیں یہ جواب بھی ٹھیک نہیں۔ کئی چکر ہو چکتے تو گورو ایک دن ایک اور حل سن کر بالآخر فرماتا، ہاں اب تم نے ٹھیک حل دریافت کیا۔

میر تقی میر کا یہ شعر آپ نے سنا ہوگا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

یہ شعر شرح طلب ہے۔ شاید میر صاحب فرما رہے ہیں، میری شاعری خواص ہی کے کام کی ہے لیکن میرا میل جول زیادہ تر عوام سے ہے۔ انہی کی صحبت میں میرا وقت گزرتا ہے۔ میری ہمکلامی اکثر انہی سے رہتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں شعر میں عوام سے گفتگو کرتا ہوں لیکن میری یہ منظوم گفتگو خواص کو پسند آتی ہے۔

راشد کو نقادوں نے شاعروں کا شاعر کہا ہے۔ راشد پر مضمون نویسی ان کی زندگی میں کم ہوئی۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے، یارو، مجھ پر کچھ لکھو۔

راشد کا کلام بھی عوام کے کام کا نہیں۔ میرا جی کے کلیات میں البتہ عوام کے مذاق کی منظومات بھی ملتی ہیں۔

بیدل کے کلام میں پہیلی بکثرت ہے۔ دیوانِ غالب کی شرحیں شاہد ہیں کہ غالب بھی پہیلی کہتا تھا۔

اقبال کے ہاں پہیلی نہیں لیکن ان کی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی اور دیگر فارسی کلام سادہ گوئی نہیں۔ ان کے کلام کا اثر خواص پر کچھ اور ہے اور عوام پر کچھ اور۔ ان کا کلام عظمت کا درس ہے، ان پڑھ عوام جو نان و نمک کے محتاج ہیں، اس پیغام کو کیا کریں۔ رہے خواص انہیں عظمت کا پیغام پہنچا تو انہیں زعم کی غذا ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا روئے سخن خواص ہی کی طرف تھا۔

عوام کے شاعر ہیں بابا فرید، بابا نانک، تلسی داس، کبیر، وارث شاہ، بلھے شاہ، نظیر اکبرآبادی اور میرزا داغ۔ آپ کے آثارِ قلم میں روئے سخن کس طبقے کی طرف ہے؟ آپ کہیں گے کسی کی طرف بھی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے مخاطبین بھی خواص ہیں۔ ایسے تخاطب کا اس جمہوری زمانے میں آپ کو حق پہنچتا ہے۔

اگر آپ کے کلام سے کسی نقاد یا شاعر کو چڑ ہے تو ہوا کرے۔ آپ کے ''لاشعر'' کا (لاشعوری) مقصد ہے معاصر نقادوں کو جز بز اور عاجز کرنا۔ شاید یہ جدید (علامتی) شاعری کی پیروڈی ہے۔ واللہ اعلم۔

منیر نیازی کو آپ کا کلام پسند آیا۔ وہ بھی من مانی والا مزاج رکھتے ہیں اور مزے کے آدمی ہیں۔

بلراج کومل نے آپ کے کلام پر نکتہ چینی اس لیے کی ہوگی کہ وہ آپ کے باغیانہ مزاج کو نہیں سمجھے۔

ہر قلم کار اپنا مزاج رکھتا ہے اور ہر قاری اپنا۔ سب باتیں مزاج کی ہیں۔ ریستوراں میں بیرا ہمارے بیٹھتے ہی ہمارے سامنے مینو (فہرستِ خورش) لا رکھتا ہے۔ اپنی پسند کی خورش منگاؤ اور کھاؤ۔

شعریت کی جکڑبند تعریف (Definition) کی جائے تو وہ بھی شریعت ہی ہوگی، نقادی شریعت۔

آپ نے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی آواز کی دلآویزی کا ذکر کیا۔ لطف یہ ہے کہ مولانا کو کلاسیکی موسیقی سے تو کیا عوامی موسیقی سے بھی کوئی لگاؤ نہ رہا۔ چرچل کی خطابت میں کمال کا سریلا پن تھا لیکن وہ اپنی پسند کا کوئی گیت گاتا تھا تو بے سرا ہو جاتا تھا۔

دُنیا بے تُکی ہے تو ہم تُک سے تُک کیوں ملائیں۔ میرا خیال ہے قدیم بجر لکھ کر آپ نے یہ بات جتائی ہے۔ اب آپ ایک کام اور کریں، ایک نظم اور لکھیں بعنوان ''جدید بجر''

کیوں نہ ہم اور آپ سنگیت کی باتیں کیا کریں

یاد آ رہا ہے مجھ کو یہ کہنا ملنگ کا
کچھ سُر میں آ کے بات کرو راگ رنگ کی

کراچی میں وجیہہ صاحب سے مل کر مجھے خط لکھیے۔ میرا نیا پتہ نوٹ کر لیجیے۔

والسلام
خیر طلب
داؤد رہبر

KUTABKHANA
OSMANIA

17 December, 2001

مکرمی افتخار جالب صاحب!

السلام علیکم! طبلے کی تدریس کا ٹیپ ریکارڈ بنا کر بھیج رہا ہوں۔ اُستاد کرامت اللہ خاں مرحوم کلکتہ ریڈیو سٹیشن کے سٹاف آرٹسٹ تھے۔ ریڈیو پر میں نے ان کے گت توڑے کئی بار سنے اور برسوں ریڈیو ہی پر ان کی سنگت بھی سنی۔

طبلہ نوازی کا شوق بنگال کے عطائیوں میں عام ہے۔ وہاں گانا بجانا گھر گھر ہوتا ہے۔ بنگالی لڑکے سیدھا سادہ ٹھیکہ دو تین کثیر الاستعمال تالوں کا سیکھ لیتے ہیں اور گھریلو بیٹھکوں میں سنگت کرتے ہیں۔ نائیک لوگ اس معمولی درجے کے باج کو ہنر نہیں مانتے۔ جب سکھاتے ہیں تو شاگرد کو پہلے قاعدے یاد کراتے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال ان کی مشق کراتے ہیں۔ جب ان پر شاگرد کے ہاتھ قادر ہو جائیں تو پھر کہتے ہیں، اب سیدھا ٹھیکہ بجا۔ قاعدے سنگت میں اور گت توڑے میں کراری اور چٹکیلی آوازوں کے زیور بنانے کے کام آتے ہیں۔ قاعدے کا انگریزی ترجمہ ہوگا Formation۔

جب شاگرد کی لیاقت کافی ہو جاتی ہے تو اُستاد کہتا ہے، اب ریاضت کی ضرورت ہے۔ سب کام چھوڑ کر شاگرد چالیس روز دن رات طبلہ بجاتا ہے۔ یہ شاگرد کا چلہ کہلاتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ ہنر بغیر تپسیا کے قابو میں نہیں آتا۔ گت توڑا اپنی جگہ ایک فن ہے اور اچھی سنگت کی طبلہ نوازی اپنی جگہ۔ سنگت کے لیے پختگی تجربے سے آتی

ہے۔کئی سال گویوں اور سازندوں کی سنگت میسر رہے تو موسیقی کو آراستہ کرنے کی صلاحیت طبلچی کو حاصل ہوتی ہے اور وجدان کے کرشمے ہونے لگتے ہیں۔سنگت میں طبلچی کا کام ہے گویے یا سازندے کے کام کو سجانا۔

پکھاوج اور مردنگ کا باج رزمیہ ہے اور طبلے کا بزمیہ۔ طبلے میں نزاکت ہے اور بانکپن، مردنگ دو ہتھڑ والا ساز ہے۔طبلہ چپت والا۔

Colloquium والا مقالہ دیگر مقالات کے ساتھ کسی بکس میں ہے۔نقلِ مکانی کے بعد کئی بکس میں نے کھولے نہیں، مقالہ نکال کر آپ کو بھیج دوں گا۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

7 January, 1997

بخدمت ڈاکٹر آغا اشرف علی!

برادرم، السلام علیکم!

یہ کتاب تم کو مل جائے تو پھر فون پر باتیں ہوں۔ جو خط پسند آئیں، صوفیہ کو پڑھ کے سنا دو۔

مجھ سے باتیں کرو تو "آپ" کہہ کر خطاب نہ کیا کرو۔"آپ" اور "تُم" کہنے والے اور تکلف کرنے والے تو بہت ہیں۔ ہجولی لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔

اس کتاب میں چھاپے کی غلطیاں باوجود پروف خوانی کے بہت سی ہیں۔ایک "صحت نامہ" تیار کر رہا ہوں۔وہ بھی بھیجوں گا۔

پروفیسر حفیظ ملک صاحب کو خط لکھوں گا۔اب تک غالباً ریٹائرڈ ہو چکے ہوں گے۔یونیورسٹی ہی کے پتے پر خط بھیجوں گا۔دیکھیے ان تک پہنچتا ہے یا نہیں۔یہ صبیحہ کے رشتہ داروں میں سے ہیں لیکن میرا ان سے میل جول برائے نام ہے۔ان کی بیگم امریکی ہیں، بیاہ سے پہلے یہودی تھیں، اب کلمہ گو ہیں۔

نومبر میں ایک چکر موڈل ٹاؤن کا لگایا۔ ہمارا مکان ڈھا کر نئے مالک نے ملبہ بھی اُٹھوا دیا۔ جہاں یعقوب کا کمرہ تھا، وہاں اب گھاس ہی گھاس ہے۔آپ کے مکان کا نمبر 103-G تھا، وہ اب تک سلامت ہے۔سہ منزلہ تو وہ آپ کی رہائش کے دنوں ہی میں ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمرے اُوپر بڑھائے گئے تھے۔ رہے نام اللہ کا، نہیں معلوم اب وہاں کون رہتا ہے۔جی بلاک کے قبرستان جا کر میں نے شہرِ خموشاں پر مجموعاً فاتحہ پڑھا۔

تمہارا ساتھی

داؤد رہبر

30 January, 1998

برادرِ کلاں یعنی بڑے بھائی!

آداب، تمہارے ساتھ باتیں تو بہت ہوئیں لیکن میزبانی اچھی طرح نہ ہوئی۔ بیچ میں خلل

مسلسل رہا۔انیسہ کی براہی ہر مہمان کو پیش آئی۔ دسمبر میں اس کے کالج کے کورس پورے ہوں گے۔ آج کل اس کی نوکری بھی ہے اور تعلیم بھی۔ بہر حال ہماری صورتِ حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگلے سال دیکھو کیا تغیر ہوتا ہے۔

تمہاری بنائی ہوئی چٹنی ابھی ختم نہیں ہوئی۔تھوڑی تھوڑی روز استعمال ہوتی ہے۔

نیڈھم کی کتاب کے صفحات میں نے فوٹو کاپی کر کے رکھ لیے ہیں۔اس وقت منصور والا مقالہ لکھ رہا ہوں۔جب یہ لکھ چکوں گا تو نیڈھم کی کتاب پڑھوں گا۔

اپنے گانے کے دو ٹیپ الگ لفافے میں ہیں۔ طبلے کی سنگت ان کے ساتھ کمزور ہے۔طبلہ کرارا نہ ہو تو گانے کا مزا آدھا رہ جاتا ہے۔بہر حال گانا سنو اور بھیا کو بھی سنواؤ۔

آپ نے انیسہ کو اتنی ساری رقم عطا فرمائی۔اکیس یا اکاون سے بھی وہ اتنی ہی خوش ہو جاتی۔ وہ خود شکریے کا خط لکھے گی۔ میری طرف سے بھی شکریہ۔گھر میں سب کو دعا اور پیار۔

برادرِ خرد

داؤد

7 April, 1998

برادرم، تسلیم!

آپ کو زیادہ زحمت کیوں دوں، ایک کتاب دیکھنے کی آرزو مدت سے ہے۔اس کا عنوان "بھارت درپن" ہے۔یہ نثر کی نہیں نظم کی کتاب ہے۔ پنڈت برجموہن کیفی صاحب نے لکھی۔مولانا حالی کے مسدس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی بدحالی کا رونا ہے۔ پنڈت کیفی کی کتاب میں ہندوؤں کی بدحالی کا۔کتاب آج سے ستر اسی سال پہلے چھپی، اس لیے اس کا نسخہ ڈھونڈنا پڑے گا۔لائبریوں میں تو ضرور کہیں ہوگا۔اگر مل جائے تو آپ خود بھی پڑھیے اور پڑھ کر میرے لیے لے آئیے۔ میں بھی پڑھوں گا اور پھر اس پر گفتگو گرم ہوگی۔

دوسری گزارش:۔ لکھنؤ کے کسی ادبی ادارے یا پبلشر نے لکھنوی شاعروں کے دیوان چھاپے ہیں۔ ان میں ان اُستادوں کے دیوان بھی شامل ہیں جو نواب کلب علی خاں کے زمانے میں رامپور کے دربار سے وابستہ تھے اور رامپور کے مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے تھے۔ان کے نام یہ ہیں:۔

امیر احمد امیر مینائی۔ سید ضامن علی جلال۔ مظفر علی اسیر۔ سید اسمٰعیل حسین، منیر شکوہ آبادی، ارشد علی خاں قلق۔ امداد علی بحر

آپ دلّی میں کسی سے پوچھیں تو شاید پتہ چلے کہ ان کے دیوان کہاں سے ملیں گے۔

13 April, 1998

برادرِ گرامی، تسلیم

Tao Te Ching کا منظوم ترجمہ بھیج رہا ہوں۔ میرے پاس کیمبرج کی ایک تصویر ہے۔۱۹۲۰ء میں خواجہ ناظم الدین جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو والد صاحب کے کمرے میں ان کو الوداعی ڈنر دیا گیا تھا۔اس

KUTABKHANA OSMANIA

ڈنر کی تصویر میں مبشر حسین قدوائی بھی موجود ہیں۔ قدوائی صاحب سے پوچھیے کہ مبشر مرحوم سے ان کا رشتہ کیا تھا۔

ہو سکے تو یہ ترجمہ اپنے ساتھ لے جائیے اور ان کو دکھائیے۔ یہ مکمل ترجمہ ہے۔ اس کی چھوٹی سی کتاب اچھی بن سکتی ہے۔

تمہارا بھائی

داؤد

گیان سنگھ شاطر صاحب کا پتہ بھی معلوم کریں تا کہ میں انہیں خط لکھ سکوں۔

ذاکر صاحب کی کوئی اچھی سوانح عمری لکھی گئی ہو تو اسے پڑھنے کا بھی مشتاق ہوں۔

خیر سے کشمیر جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔ بیٹوں اور بیٹیوں کو دُعا اور پیار۔

خانہ نشین

داؤد

18 January, 1999

برادرم اشرف!

السلام علیکم! ہم بھائیوں سے تمہاری واقفیت پہلے بھی کم نہ تھی۔ اب کے کھل کر اور بہت سی باتیں ہوئیں اور تم نے میری لکھی ہوئی دو درجن کہانیاں پڑھیں تو واقفیت اور بھی گہری ہوئی۔

امریکی دوستوں کو سالِ نو کی مبارکباد کے ساتھ بھیجنے کے لیے اپنے اردو اشعار کے جو انگریزی ترجمے میں نے کیے تھے، وہ بھیج رہا ہوں۔ اصل اردو اشعار بھی تمہارے لیے بیاض میں سے نکال کر درج کر دیے ہیں۔ اب اصل بھی پڑھو اور ''ترجمہ'' بھی۔ ''ترجمہ'' حد سے زیادہ آزادی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اصل اُردو سے صرف چٹکلا انگریزی میں منتقل ہو جائے۔

ایک سو ایک، اور اکاون اور اکتیس۔ یہ اسلامی عدد ہیں۔ شادیوں اور عیدیوں اور دیگر خوشیوں کے مواقع پر ایسی رقمیں عزیزوں کو دی جاتی ہیں۔ امیہ اکتیس سے بھی خوش ہے اور تمہاری مہربانی پر شکر گزار۔

نزاکت علی سلامت علی کے چند گانوں کے ٹیپ بنا کر عنقریب بھیجوں گا۔ فی الحال اُستاد امیر خاں کا گانا بھیا کو سنواؤ۔

ایمیل تین ہفتوں کے لیے باہر چلا گیا ہے۔ میرے لیکچروں کی فلم دے کر نہیں گیا۔ جب مجھے موصول ہوگی وہ بھی بھیج دی جائے گی۔

معلوم نہیں یہ مصرع کس کا ہے۔ شاید میر تقی میر کا ہے:-

تک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ دونوں بیٹوں اور بیٹیوں کو دُعا۔ مہربانی کرو اور کرشنا راؤ شنکر پنڈت کے گانوں کا پیکٹ ڈاک میں ڈال دو۔

بندۂ خدا

داؤد

23 February, 1999

برادرم!

سلام، تسلیم، آداب اور بندگی۔ اُستاد نثار حسین خاں اور اُستاد سلامت علی کے چند گانے اور بھی میرے پاس ہیں۔ جلدی میں تین فیتے تیار ہوئے۔ یہ حاضر ہیں۔

اب لاہور سے جو ایڈیشن میری کتاب کا نکلا ہے، اس میں ایک نیا دیباچہ ہے جو ''نیا دور'' والے رسالے میں نہیں تھا۔ اس کی دو نقلیں بھیج رہا ہوں۔ ایک اپنے پاس رکھیے اور ایک پروفیسر جمال الیاس صاحب کو دے دیجیے۔

باقی باتیں فون کے ذریعے ہوں گی۔

والسلام

اُلٹا سیدھا آدمی

داؤد

6 December, 1993

بخدمت نوید ریاض صاحب!

میرے نگہبان، میرے میزبان۔ سلام تشکر!

لطف آ گیا۔ اِدھر مانو، اُدھر اقبال بانو۔ ہر صبح پراٹھے اور کباب کا ناشتہ۔ جونہی عیاشی کا چسکا لگا، روانگی کا وقت آ گیا۔

آپ کے گھر کی برکت دیکھی۔ آپ کے دفتر کی چہل پہل دیکھی۔ آپ نے اپنا آرام قربان کر کے مجھے آرام پہنچایا۔ میں انجان آدمی، رُسوائے زمان آدمی۔ مشغولِ بوستان آدمی۔ عرشِ معلی کے فرامین سے بے خبر۔ وطن کے تازہ ترین آئین سے بے خبر۔ مطاروں کے بدلے ہوئے قوانین سے بے خبر۔ چنانچہ ہر ہر معاملے میں آپ کی رہنمائی اور امداد کی ضرورت پڑی۔ اپنی رہبری رہ گئی دھری۔ اپنے تخلص سے بیزاری ہوئی۔

Music Appreciation والا پمفلٹ دیکھ رہا ہوں۔ تاثر کے اظہار کو خط لکھوں گا۔ اسم بامسمیٰ غالباً ابھی ہسپانیہ سے واپس نہیں آئے۔

مشفق خواجہ صاحب کو پارسل کراچی بھیجا جا چکا ہوگا۔ ایک خط بھی اس کے ساتھ آپ کے پاس چھوڑ آیا۔ یہ خط انہی کے نام تھا۔

گھر میں سب کو دعا۔

یاتری ماموں

2 March, 1995

مکرم بھانجے جی، چھام!

لاہور میں شادیوں کی رُت آ گئی ہے۔ اعجاز کے بڑے بھائی آغا بابر صاحب پرسوں یہاں سے اُڑیں گے اور اتوار (۶ مارچ) کو لاہور پہنچیں گے۔ دو عزیزوں کی شادیوں میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ شادی

میرا یہ خط وسیم صاحب یا واصف صاحب کو دکھانے کے لیے نہیں ہے۔ البتہ ایک ورق نتھی کر رہا ہوں۔ وہ وسیم صاحب کو پہنچا دیں۔ مہربانی۔

انوکھے لاڈلے کو پیار۔

دُعائے خیر

بھگوان پرش پرسے کو بھاری نہ کرے۔

اپنے شاگردوں کا چچا لیکن آپ کا ماموں

21 April, 1997 (یعنی یوم اقبال)

غریب نواز کارساز بھانجے جی!

چھام مسنون! وارث علی، انتظار حسین صاحب اور خالد احمد صاحب تینوں کے تبصرے آپ کی نوازش سے موصول ہوئے۔ خالد احمد صاحب کے مبالغہ شیوہ قلم نے ہماری خودی کو بلند کیا۔ اس قدر بلند کہ اللہ میاں نے ہم سے پوچھا۔ ''بتا تیری رضا کیا ہے؟'' اللہ میاں کو جواب سوچ کر دیا جائے گا۔ اس لیے کہ

''...... ہر خواہش پہ دم نکلے''

ایک خواہش یہ ہے کہ آپ طیارہ اُڑائیں اور ہم آپ کے پہلو میں بیٹھ کر کچھ برجستہ باتیں کریں، کیا خیال ہے؟

غزلیں پڑھ کر زبردست ماموں کو پہنچا دیجیے۔ وہ پڑھ چکیں تو ان سے واپس لے کر اپنے پاس رکھیے۔

چند بار سنیچر اور اتوار کو فون کا نمبر مکرر اور مکرر گھمایا۔ سرکٹ (Circuit) مسدود پائے، کوشش جاری رہے گی۔

ہمسایوں کو سلام اور پیار۔

سنگت کا طالب

11 June, 1997

مکرم خواہر زادہ جی، چھام مسنون!

بھانجے اور بھتیجے دونوں کے لیے انگریزی میں ایک ہی لفظ ہے Nephew حالانکہ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ رشتوں کی نزاکت اردو نے ہندی سے سیکھی۔

''انگریزی ...... فارسی'' ڈکشنری میں Nephew کا لفظ دیکھا۔ اس کے معنی یوں درج پائے:۔

(۱)	برادر زادہ	در صورتیکہ پسر باشد (نہ کہ دختر)
(۲)	خواہر زادہ	در صورتیکہ پسر باشد (نہ کہ دختر)

''نہ کہ دختر'' کے الفاظ ڈکشنری میں نہیں۔ ایضاحاً میں نے بڑھا دیے ہیں۔ دیکھ لیجیے فارسی بھی انگریزی کی طرح اس معاملے میں لا اُبالی نکلی۔

سفرنامہ بھیج رہا ہوں۔ ان کی فوٹو کاپیاں بنوا کر خالد احمد صاحب اور پروفیسر غزالہ عرفان صاحبہ کو پیش کر دیں تو کرم ہوگا۔

ہرجائی اور پرچھائی کو سلام کیسے لکھوں۔ وہ ٹک کر بیٹھنا جانتے ہی نہیں۔ کبھی لکھنؤ میں ہیں، کبھی

میں اعزہ کا جو اجتماع ہوتا ہے، اس کے کیا کہنے۔ یگانگی ہی یگانگی، تین چار نسلیں یکجا۔ دو تین وضع کی مردانہ پوشاکیں۔ ململ، مخمل، جھلمل، گوٹا کناری، زیور، بناؤ، تناؤ۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی تبسم کا مبادلہ، بے اختیار جپھی (لیکن یہ ہر ایک سے ممکن نہیں)

بھائی آغا بابر صاحب نے مجھ سے کہا، میں لاہور پہنچتے ہی تمہارے خطوط کی طباعت کی صورت حال دریافت کروں گا اور اعجاز سے کہوں گا تم نے جو دیباچہ لکھا ہے، مجھے دکھاؤ۔ پبلشر صاحب سے بھی جا کر ملوں گا اور اگر کوئی بریک لگی ہوئی ہے تو اُسے رفع کرنے کی صورت نکالوں گا۔

ستارۂ پاکستان کو میرا سلام۔ تندرست ہو کر وہ اپنے مضمون کی پروف خوانی کی طرف توجہ فرمائیں ہی گے۔ آپ اپنے نام کے خطوط کی پروف خوانی کے لیے بھی انہیں زحمت دیجیے۔ میں ان کا ماموں نہیں ہوں۔ ان کا ممنوں ہوں۔ آپ کا ماموں بھی ہوں، ممنوں بھی۔ (ممنوں کو نون غنہ کے تلفظ سے پڑھیے گا تا کہ قافیہ بحال رہے)

سنگِ میل کی دکان (۲۵ لوئر مال) پر جانا ہو تو نیاز احمد کو میرا سلام پہنچایئے۔ اب دو تین روزے باقی ہیں، اس کے بعد آپ کو سحری کے لیے اُٹھنا نہ پڑے گا۔ ایک غزل کہی۔ یہ ہمسایہ ماموں کو دے دیجیے۔

داوَر رہبر

10 January, 1996

بھانجے جی!

لِس کے احاطے میں کوئی حجرِ اسود تو ہے نہیں کہ اُسے چومنے میں بھاگا آؤں۔ میں تو داتا صاحب کے دربار میں حاضر ہونے کو آؤں گا۔ لِس کی کسی دیوار کے کسی کتبے کا چھونا اگر قسمت میں ہے تو ضمناً وہ بھی ہو جائے گا۔

آپ کی فرمائش پر غور کر کے میں نے چار موضوع سوچے ہیں۔ چاروں لیکچر لکھ کر لاؤں گا۔ اس سے زیادہ زیادتی ہوگی۔ فالتو بات انسان کیوں کرے۔ اکبر الٰہ آبادی فرما گئے ہیں

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

وسیم صاحب کو اور واصف صاحب کو میرا سلام، میرے مکاتیب کی کتاب چھپ کر دستیاب ہو تو دونوں صاحبوں کو دکھا دیجیے گا بلکہ اعجاز صاحب کے ذریعے اس کا ایک نسخہ لے کر لِس کی لائبریری کے لیے میری طرف سے وسیم صاحب کو پیش کرنا مناسب ہوگا۔ (میں اعجاز صاحب کو اس خط کی کاپی بھیج رہا ہوں۔) وسیم صاحب سے کہیں کہ مجھے گرمیوں میں نہیں، گرمیوں کے ٹلنے کے وقت بلائیں تو کرم ہو۔ اکتوبر میں یا نومبر میں۔ اتنا وقت ملے تو اطمینان سے لیکچر لکھوں۔ لیکچر انگریزی میں ہوں گے۔ یہ چار موضوع اگر ان کو پسند نہ آئیں تو میں کہوں گا، اللہ کی مرضی بھی ان لیکچروں کے حق میں نہیں ہے۔

اگر میں دو ہفتوں کے لیے پاکستان آؤں تو پندرہ دنوں میں سے تین چار روز مجھے کراچی کی زیارت کے لیے مطلوب ہیں۔

برمنگھم میں، کبھی مدینے میں، کبھی گنگا جمنا کے سنگھم میں۔

عذرا کے لیے پرجھائی کا لفظ (بجائے بھابی یا بھاوج کے) کیسا رہا۔

قافیہ پرست ماموں

24 March, 1999

وضعدار بھانجے جی، سلامت باشید!

ہماری ملازمہ حفصہ جسے ہم پنجابی لوگ ہافزاں کہہ کر بلاتے تھے، بچاری یک چشم تھی۔ بچپن میں اس کی ایک آنکھ چیچک کی نذر ہوگئی تھی۔

یہ گیلی لکڑی کے ایندھن کی خوگر بلکہ دوستدار تھی۔ اس کے دھوئیں پر پھونکیں مارتی اور اسے پھانکتی تھی۔ اس پر ترس کھا کر ہم نے مٹی کے تیل کا ایک سٹوو خریدا اور اس کا استعمال اسے سکھایا۔ یہ سٹوو اسے ایک آنکھ نہ بھایا، اسے خدشہ ہوا کہ ایسے آلات آگئے تو گھروں کی بیباں کھانا خود ہی پکانے لگیں گی اور نوکر برخاست کر دیے جائیں گے۔ سٹوو سے اس کی ٹھن گئی۔ ہر دوسرے تیسرے روز اسے بگاڑ دیتی۔

ٹیکنالوجی کے بعض آلات سے میری بھی نہیں بنتی خصوصاً ای میل سے۔ میں عربی رسم الخط والا آدمی ہوں۔

بارہا سنیچروں اور اتواروں کو آپ کے فون کا نمبر گھمایا، ناکامی ہوئی۔ گزشتہ اتوار حسن اتفاق سے ربط حاصل ہوا۔ یہاں رات کے دس بجے تھے۔ وہاں صبح کے آٹھ۔ عصمت نے کہا، نوید ساری رات کام کرتے ہیں (تہجد بھی پڑھتے ہیں) صبح چار پانچ بجے بستر کا رخ کرتے ہیں۔ کوئی ضروری بات ہے تو میں انہیں جگا دوں۔ میں نے کہا، یہ نامناسب ہے۔ انھیں تو میرا اسلام ان سے کہہ دیجیے گا۔

میں نے فون کسی کاروباری ضرورت سے نہ کیا تھا۔ سرتال کی گپ کو جی چاہتا تھا، نہ ہو سکی تو اب خط لکھ رہا ہوں۔

آپ نے مجھے بتایا تھا کہ بالی اور زہرہ کی بہن چھکی (ثریا) نے مجھے دو تین بار خواب میں دیکھا۔ میں زہے نصیب کیوں کہوں، وہ میرے خواب میں قدم رنجہ فرماتی تو کچھ بات بھی تھی، اب ایک قطعہ سنیے:-

خبر پہنچی ہے مجھ کو اس نے مجھ کو خواب میں دیکھا
میں بیٹھا ہوں یہاں، اس نے مجھے پنجاب میں دیکھا
اگر ملنا ہوا اس سے تو میں اس سے یہ پوچھوں گا
مجھے کس واسطے تو نے دلِ بے تاب میں دیکھا

آخری مصرع یوں بھی ہوسکتا ہے:-

مجھے کس حال میں تو نے دلِ بے تاب میں دیکھا

ضیاء محی الدین اورنگزیب اگر لاہور میں ہیں تو یہ خط ان کو سنا دیجیے۔ انہیں اور عذرا کو سلام۔ عصمت بی بی کو سلام اور دُعا۔

اپنی بزرگی کا منتظر

بہتر سالہ ماموں

(۶۔ مئی کو تہتر کا ہو جاؤں گا)

26 November, 1999

مکرمی بھانجے جی!

السلام علیکم! خیال کی ایجاد جونپور کے سلطان حسین شرقی سے منسوب ہے۔ واللہ اعلم۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے سے پہلے خیال بلمپت ہی میں ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑھت میں خیال سے کام لینا یعنی سوچ سوچ کر بہلاوے لینا بلمپت ہی میں ممکن ہوتا ہے۔ وصال میں ہاتھ پھیر پھیر کر پیکرِ محبوب کا ہر پہلو اور ہر گوشہ ٹٹولا جاتا ہے۔ راگنی کے ساتھ ایسا برتاؤ بلمپت خیال میں ہوتا ہے۔

محمد شاہ کے زمانے میں ادارنگ اور سدارنگ نے درت میں خیال سرائی کی اور اسے درت خیال کہا۔ لے تیز ہوئی تو سوچ کو چھٹی دے دی گئی۔ سوچ والی بات نہ رہی۔

اچھا خیال گانے والا بہر حال لکیر کا فقیر نہیں ہوتا۔ درت میں بھی اس کی اپج دمبدم کام کرتی ہے۔ برجستگی برقرار رہتی ہے۔ من کی موج سے کبھی اوپر نکل گئے اور کبھی نیچے آن اترے۔ چڑیا کی طرح جو انگل سے کسی ٹہنی پر آ بیٹھی ہے۔ اب دیکھیے اُڑتی ہے تو کدھر کا رُخ کرتی ہے۔

یہی آپ نے کیا۔ امریکہ کے دکن کی طرف آئے اور ہمارے ہاں آتے آتے رہ گئے۔ ہماری قسمت نے اڑنگا دیا یعنی بھانجی ماری (یہ محاورہ ڈکشنری میں دیکھ لیجیے گا)۔

ہمارا گھر فقیر کا تکیہ ہی تو ہے۔ کوئی مکہ مدینہ تو نہیں۔ سر منڈانا اور احرام باندھنا یہاں آنے کے لیے ضروری نہ تھا۔ جتنے دن ہم جیتے ہیں، ہمیں غنیمت جانیے۔ کبھی آئیے، آپ کی سیوا میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

قاری ضیاء محی الدین لاہور میں ہوں تو وہیں اور اگر کراچی میں ہوں تو وہاں ان کے نام کا خط انہیں پہنچا دیں۔ پہنچانے سے پہلے خود بھی اسے پڑھ لیجیے۔ اسی لیے میں نے لفافہ کھلا رہنے دیا۔

عصمت بیگم کو سلام، عمر کی عمر دراز۔

خوگرِ انتظار

خالِ رُخِ یار

(عربی میں ماموں کو خال کہتے ہیں۔

اسی سے خالہ کا لفظ بنا)

14 May, 2000

میزبان بھانجے جی، سلامت!

چٹنی سے طنبورے کا کام لیا گیا۔ کبوتر سے پپیہے کا۔ پیو پیو کی جگہ غٹرغوں غٹرغوں ہوئی۔ بہر حال گلے بازی ہوئی۔ الحمدللہ علی کل حال۔

یہ پوچھنے کے لیے کہ ہمارا بزرگانہ گانا آپ کو کیسا لگا، کل کئی بار آپ کا فون نمبر گھمایا۔ آپ کی ہیلو مجھے سنائی دے رہی تھی، میری آواز آپ کو نہیں پہنچ رہی تھی۔

غور فرمائیے کہ اس محفل سے پہلے صرف ایک بار آپ نے میری گلوکاری سنی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں اپنے دوست سکندر کریم کے گھر، اُستاد نبی بخش نے سارنگی پر سنگت کی تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اُستاد سے کہا تھا، عطائی بلکہ خطائی کی

KUTABKHANA OSMANIA

خطائیں معاف۔ اُستاد نے ہمت بڑھانے کو فرمایا تھا "یہ چھایانٹ جو آپ نے گائی عطائیوں والی چھایانٹ نہیں تھی۔"

علی اکبر خاں صاحب سرود پر راگ مالا بجایا کرتے ہیں۔ دس بارہ راگنیوں کی جھلکیاں ایک ہی گت میں، راگ مالا گانے میں ہو تو اسے راگ ساگر کہتے ہیں۔ ایسی باتوں سے کلاکار کا ودوان ہونا ثابت ہوتا ہے۔ میں نے اس رات جو کام کیا، کچھ ثابت کرنے کے لیے نہیں کیا، مزا لینے کے لیے کیا۔ پوریا کلیان گاتے گاتے یمن کی طرف نکل گیا۔ پھر درباری گائی تو اسے گاتے گاتے سوہا کی طرف نکل گیا۔ امریکہ کے بعض جلسوں میں میں نے بہاگ گاتے گاتے پڑی بدلی اور شنکرا کی طرف نکل گیا۔ پڑی بدلنے سے ہم کبھی باز نہیں آئے۔

کرانہ گھرانے کے ڈھنگ سے ابھوگی کیسا رہا؟ خود مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا رادھا بن کر گانے میں بھی ایک مزا ہے، بھکتی رس کے کیا کہنے!

چرن دھر آیو ری

اب بتائیے آپ چرن کب دھریں گے۔ رس لیلا والی کتاب پڑھنے کو وقت ملا یا نہیں؟ قاری ضیا محی الدین ☆ کو اور عذرا کو سلام۔ میں وہاں پہنچا تو وہ اڈے پر موجود نہ تھے۔ اسے کہتے ہیں قسمت کی نارسائی، یار زندہ، صحبت باقی۔

عزیزہ عصمت اور عمر کو دُعائیں۔

منتظر ماموں

☆ فٹ نوٹ: قاری کلام شیکسپیئر

25 July, 2000

مکرم بھانجے جی، سلام!

بھائی اسحاق مرحوم نے ایک روز ٹیلی فون پر چھام کہا۔ میں نے جواب میں چھام کہہ تو دیا لیکن یہ بھی کہا کہ آپ اب تک مجھ کو نابالغ کیوں شمار کرتے ہیں۔ بولے "اسی ایتھے وی سب نوں چھام سکھا دتا اے۔" (ہم نے یہاں بھی سب کو چھام کہنا سکھا دیا ہے) میں نے جی میں کہا، الحمدللہ، کہیں تو معصومیت واپس آئی۔"

اخبار کے کالم موصول ہوئے۔ ان کے ساتھ آپ کا رقعہ جس میں آپ نے اپنی آنکھوں کے ڈبڈبا آنے کا حال بتایا اور یہ بھی لکھا "ہم نے کیا کچھ نہیں کھو دیا۔"

میں آپ کو تسلی دیتا ہوں، یہ کہہ کر کہ آپ نے کچھ نہیں کھویا۔ آپ نے کبیرے کا یہ دوہا سنا ہوگا

چلتی کو گاڑی کہیں، بنے دودھ کو کھویا
رنگی کو نارنگی کہیں، دیکھ کبیرا رویا

آپ نے کچھ بھی نہیں کھویا، امریکہ میں اب ہمارے ہاں کی مٹھائیاں بھی دستیاب ہیں۔ آپ یہاں آئیں تو ہم آپ کو قلاقند کھلائیں۔

مزا اسی میں ہے کہ کہانی مزیدار بنے۔ کہانیاں رُسوائی کے بغیر مزیدار نہیں ہوتیں۔ میرزا ہادی بیگ نے یہی سوچ کر اپنا تخلص رُسوا رکھا اور پھر امراؤ جان ادا کے ساتھ اپنی دوستی کی کہانی لکھی۔ تب بات بنی۔

آپ نے تو خود ڈرامے تختاتے ہیں اور سٹیج پر آتے ہیں، آپ سب کچھ جانتے ہیں۔

ہم تو تب مانیں کہ آپ کے برادر ارجمند مولوی مانو کی آنکھیں ہماری کہانی سن کر ڈبڈبا آئیں۔

آنسو پونچھ ڈالیے، قہقہہ لگائیے۔

اچھی سنگت کا منتظر

ماموں

25 August, 2000

سعادت مآب بھانجے جی!

آپ کو بلا تامل زحمت دینے میں ایک مزا ہے، اس لیے کہ آپ زحمت کو رحمت سمجھتے ہیں۔

بعض لوگ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں لے کر معزز ہوتے ہیں۔ بعض خطاب یافتہ ہو کر یا دیگر قومی اعزازات سے، ماموں ہونا ایک خداداد رتبہ ہے۔ اس میں کسی کوشش کو دخل نہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب یادگار زمانہ آدمی ہیں۔ ہو سکے تو ان سے ملیے۔ ان کا فون نمبر مجھے معلوم نہیں، ان کا پتہ یہ ہے:-

269-North Samanabad

منتظر ماموں

31 January, 2000

مربی حلقۂ ارباب رباب و سرود حیات احمد خاں صاحب!

السلام علیکم! گزشتہ زیارت لاہور دسمبر ۱۹۹۶ء میں ہوئی تھی۔ تین برس پھر لاہور کی مجالس سے محروم رہا۔ راگ دیس کا الاپ پردیس میں کیا مزا دے! لاہور آ کر اسے گانے کو جی چاہ رہا ہے۔

میں ان شاء اللہ ۱۲۔ مارچ کی شام لاہور پہنچوں گا۔ چار دن وہاں رہوں گا۔ میں نے عزیزی نوید ریاض صاحب کو ان تاریخوں سے مطلع کیا اور ان سے کہا کہ ہو سکے تو ای۔ ایم۔ آئی کے سٹوڈیو میں ۱۴ یا ۱۵۔ مارچ کی شام میری خوشی کے لیے ایک مجلس کی تدبیر کریں اور جو کچھ میں اس میں گاؤں، اسے ریکارڈ کر لیں۔

انہوں نے اس تجویز پر خوشی ظاہر کی اور کہا کہ ضرور کوشش کی جائے گی اور حیات احمد خاں صاحب کا تعاون میسر ہوا تو انتظام بخوبی ہو سکے گا۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ ایسی ایک مجلس کے بغیر میرے لاہور آنے کا لطف میرے لیے آدھا رہ جائے گا۔ پروفیسر غزالہ کو میرا بہت بہت سلام، ان سے باتیں کرنے کو بھی جی بہت چاہتا ہے۔

باقی عندالملاقات

شریک شوق زمزمہ

داؤد رہبر

10 May, 2000

مسافر نواز میزبان محترمی حیات احمد خاں صاحب!

السلام علیکم! جی تو چاہتا تھا کہ لاہور میں کم سے کم دو ہفتے قیام کروں اور احباب اور عزیزوں سے

KUTABKHANA OSMANIA

بافراغت ہوکر ملاقاتیں کروں اور باکمالوں کا گانا بجانا سامنے بیٹھ کر سنوں۔ میری مجبوریاں کچھ ایسی تھیں کہ ہفتہ عشرہ سے زیادہ کا سفر نہیں کرسکتا تھا۔ سفر ملتوی بھی نہ کرسکتا تھا۔ ایک اضطراری وجہ یہ تھی کہ کراچی میں دو عزیزوں کی آنکھوں کے آپریشن ہوئے، عیادت لازم ہوئی۔ ان شاءاللہ آئندہ سال پھر زیارت کروں گا اور آپ کے معمورۂ پرنشاط میں حاضری دوں گا جس میں آپ نے کمال خوشدلی سے مجھے گلوکاری کا شرف بخشا اور میرے لیے سننے والے جمع کیے۔

لاس اینجلس میں علی اکبر خاں صاحب نے اپنا میوزک کالج کھول رکھا ہے۔ وہاں سرود اور طبلے کی تعلیم ہوتی ہے۔ چند امریکیوں نے وہاں سرود اور طبلہ بجانا سیکھا ہے۔ گائیکی سکھانے کا انتظام وہاں نہیں ہے۔

خیال گانے والا امریکی صرف ایک ہے۔ اس نے اپنے شوق سے ہندوستان جاکر خیال گائیکی سیکھی ہے۔ اس کے گانے کا ایک ریکارڈ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اسے سن کر آپ محظوظ ہوں گے۔

اگر آپ اکتوبر کی کانفرنس میں اسے مدعو فرمائیں تو اس کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس کی بیوی ہندو ہے۔ دونوں دلّی جاتے رہتے ہیں۔ اگر دعوت نامہ اسے ابھی بھیج دیں تو دلی اور لاہور میں اس کا قدم رنجہ ایک ہی سفر میں ہوجائے۔

پروفیسر غزالہ کو میرا بہت بہت سلام۔ امریکی گویے کا ریکارڈ ان کو بھی سنوادیں۔

والسلام مع الاکرام

نیازمند

داؤد رہبر

اس امریکی موسیقار کا پتہ یہ ہے:-

Mr. Warren Senders
Cambridge Community Performers
P.O.Box 38-1634
Harvard Square
Cambridge MASS. 02238-1634

10 October, 1999

سعادت نشاں بیگم عاتکہ صدیقہ صاحبہ، سلام مسنون!

آپ کا نوازش نامہ ملا جس میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے حادثے کا ذکر ہے۔ پوری خبر مجھ تک نہیں پہنچی۔ آپ کا فون نمبر مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ سے پوچھ لیتا۔ پاکستان کے بعض رسالے سابق میں آتے رہے۔ اب یہ سلسلہ بند ہے۔ اسلام آباد سے مقتدرہ اردو کا اخبار البتہ آتا ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو حکومت نے ہلالِ پاکستان کے تمغے سے نوازا لیکن علالت کے باعث وہ اعزاز کی رسم میں شریک نہ ہوسکے۔ شاید علالت کا اشارہ اس اخبار میں اسی حادثہ کی طرف تھا۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے بارے میں آپ نے جو مقالہ لکھا، اس کے لیے مولانا کی اولاد سے آپ کی گفتگوئیں ہوئیں یا نہیں؟

جو "پرائیویٹ" (بلکہ "نیم پرائیویٹ") پرچہ میں احباب کو بھیجتا رہا، اس کا عنوان "تسلیمات" ہے۔ اس کی صورت یوں ہے کہ اردو میں جب کسی تصنیف کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو اس کے ابواب قسط وار دوستوں کو "تسلیمات" کی شکل میں بھیجتا رہتا ہوں۔ کئی سال ہوئے کلاسیکی موسیقی سے متعلق میں نے چند باب لکھے۔ "تسلیمات" ہی کی صورت سے انہیں دوستوں تک پہنچاتا رہا۔ ان سے جو کتاب بنی "باتیں کچھ سریلی سی" اسی کا عنوان ہے۔ یہ کتاب دلّی کے مکتبۂ جامعہ سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اگلے سال اس کا پاکستانی ایڈیشن لاہور کے مکتبۂ سنگِ میل نکالے گا۔ ان شاءاللہ

آج کل میں ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ اس کا موضوع ہے، فرد کا دین ایمان (Faith of the Individual) اس کی تکمیل کو دو سال چاہئیں۔ تاہم اس دوران میں "تسلیمات" کا کوئی شمارہ تیار ہوا تو آپ کو بھیجوں گا۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو "عیادت" کا خط عنقریب لکھوں گا۔ "تخلیق" کے اداریے میں جو خبر اس حادثے کی چھپی ہے، ہوسکے تو اس کی فوٹو کاپی بھیج کر مجھے ممنون فرمائیں۔

والسلام

آپ کا خوش خواہ

داؤد رہبر

میرا فون نمبر:-

(954)783-4948

12 June, 2000

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

ایک مہمان کی تشریف آوری کے باعث آپ کے خط کا جواب لکھنے میں دیر ہوئی۔ آپ نے خط کے ساتھ شیکسپیئر کی تصویر کی جو فوٹو کاپی بھیجی، وہ واپس بھیج رہا ہوں۔ اس لیے کہ سوائے جھٹ پٹے کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ اگر اصل رسالے میں خدوخال آشکار ہیں تو ایک بہتر فوٹو کاپی بنوا کر مجھے بھیجے۔

خیالستان کا ذکر مولانا نے مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ اپنے گزشتہ ایام کا ذکر مولانا کی تحریروں میں بھی کہیں نہیں۔ ان دنوں نامہ نگار لوگوں میں انٹرویو کا دستور نہیں تھا۔ اگر کوئی نامہ نگار انٹرویو کے ارادے سے مولانا کے پاس حاضر ہوا ہوتا تو شاید اس کی تحریر سے اتفاقاً آپ کے سوال کا جواب مل جاتا یا پھر مولانا نے آپ بیتی لکھی ہوتی تو ایسی معلومات میسر ہوتیں۔

آپ نے فون پر ایک روز کہا تھا کہ اکادمی پنجاب کے کاغذات میں مولانا کے نام میرے بانوے خطوط آپ کو ملے۔ یہ کس زمانے کی بات ہے؟ انگلستان، کینیڈا اور ٹرکی سے (یعنی ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان) میں انہیں خط لکھتا رہا۔ دس برسوں میں بانوے خط ہوئے تو سالانہ اوسط نو ہوئی جو خاصی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولانا خطوں کے جواب نہیں دیتے تھے، متواتر یاددہانی کرنی پڑتی تھی۔

اکادمی کے کاغذات اگر اب تک کہیں محفوظ ہیں تو ان کا رکھوالا کون ہے؟ فصیح الدین احمد یا معز الدین

KUTABKHANA OSMANIA

احمد؟ میرے مکاتیب کے دوسرے ایڈیشن کا کبھی اہتمام ہوا تو میں چاہوں گا کہ مولانا کے نام جو خطوط ہیں، وہ اس میں شامل ہو جائیں۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

18 July, 2000

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

وجیہہ الدین احمد آج کل میری کلیات کا دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ کلیات کی اشاعت کا خیال انہی کو آیا اور کئی مہینوں سے وہ اسی دھن میں ہیں۔ ان سے فون پر ہر ہفتے گفتگو ہوتی ہے۔ کبھی وہ میرا نمبر گھماتے ہیں، کبھی میں ان کا۔ پچھلے ہفتے انہوں نے کہا۔ ''دیباچے کا کام دو چار روز سے بند ہے۔ میرے ہاں ایک صاحب مہمان ہو کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مولانا پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ مجھ سے معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے پانچ چھ تھیسس مولانا کی ادبی زندگی پر لکھے جا چکے ہیں۔''

دو تین مہینے ہوئے میں نے وجیہہ سے آپ کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا، ہاں میں ان سے واقف ہوں۔ ان کا فون نمبر مجھے دو۔ نمبر میں نے ایک خط میں لکھ بھیجا۔

آپ کا ۱۱۔ جولائی کا خط (اخبار اور تراشوں کے ہمراہ) ملا۔ مہربانی، اس خط میں آپ نے لکھا کہ ''جو خط واپس کیے تھے، ان میں بعض کو اپنے خط میں نقل کر لیا تھا۔ متفرق فائل بڑی ضخیم تھی۔ اس میں سے نقل کیے تھے۔''

آپ کے ان الفاظ سے یہ معلوم نہ ہوا کہ خط کس کو'' واپس کیے تھے۔''

آپ کا ۲ جولائی والا خط بھی میرے سامنے ہے۔ دونوں خط بغور پڑھ کر بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ مولانا کے نام میرے کل کتنے خط آپ کے پاس ہیں۔ (میرے اپنے ہینڈ رائٹنگ میں کتنے اور اصل سے منقول یعنی آپ کے ہینڈ رائٹنگ میں کتنے۔)

آپ نے یہ بھی لکھا ہے ''خطوط کے عکس اُتاروں تو لخت لخت ہو جائیں گے۔ بعض کی توانائی بحال نہیں رہی۔''

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے اصل خطوط اور ان کے ساتھ نقل کیے ہوئے خطوط کا پلندا مجھے رجسٹرڈ پارسل کے ذریعے ایک ہفتے کے لیے بھیج دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پارسل موصول ہوتے ہی میں خطوط کی فوٹو کاپی بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بناؤں گا اور آپ کی امانت ایک ہفتے کے اندر اندر بذریعہ رجسٹرڈ لفافہ آپ کو واپس بھیج دوں گا۔

میرے مکاتیب کی جلد دوم کے لیے خاصا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ عنقریب اسے مرتب کر کے لاہور بھیج دوں۔

مولانا کے نام متفرق ادیبوں کے جو خطوط آپ کے پاس ہیں، ان کی اشاعت کی بات میں اعجاز

بٹالوی صاحب سے کروں گا۔ لاہور کے مکتبۂ سنگ میل سے اعجاز صاحب کا رابطہ مضبوط ہے اور مولانا سے انہیں برخوردارانہ تعلق تھا۔

آپ مجھے جواب لکھیں تو مہربانی سے اپنا فون نمبر پھر لکھ دیجیے گا۔ ایک کارڈ پر نمبر لکھ کر میں نے محفوظ کیا تھا۔ وہ کارڈ مل نہیں رہا۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

4 August, 2000

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے تبرکاتِ مولانا صلاح الدین احمد کا مجموعہ میرے دیکھنے کو بھیجا۔ میں نے ساری تحریریں پڑھیں۔ اپنے پرانے خطوط پڑھ کر چالیس پینتالیس سال پرانی باتیں یاد آئیں۔ پرانی کہتے ہوئے ہنسی آتی ہے۔ اصل پرانی باتیں تو گزشتہ قرون کی تاریخی باتیں ہیں۔ چالیس سال پہلے کی اپنی ہی زندگی کی باتیں تو گویا کل کی باتیں ہیں۔

سچ پوچھیے تو جو کچھ آپ نے بھیجا اسے مرتب کر کے ایک الگ کتابچہ بنایا جائے تو کچھ ایسا دلچسپ نہ ہوگا۔ البتہ اگر آپ کا تھیسس چھپے تو یہ مجموعہ بطور ضمیمہ کتاب سے ملحق کیا جا سکتا ہے۔

مجموعے میں میرے خطوط کثیر تعداد میں ہیں۔ ضمیمے میں میرے ستر بہتر خطوط شامل کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ان میں سے سولہ خطوط چن کر میں نے صاف نقل کیے ہیں۔ آپ میری بات مانیں، سولہ خطوط کا یہ انتخاب ضمیمے کے لیے کافی ہوگا۔ باقی خطوط مزید ارنہیں ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اور احمد ندیم قاسمی کے خط مولانا کے نام اور خود مولانا کے خط عاشق صاحب کے نام ضمیمے میں تبرکاً شامل ہونے چاہئیں۔ دیگر مکتوب نویسوں کے جو خطوط آپ نے کاپی میں نقل کیے ہیں۔ ضمیمے میں سارے آ جائیں یا ان سے انتخاب کیا جائے، یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

بہرحال پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے تھیسس کی ٹائپ کی ہوئی ایک صاف ستھری اور مکمل کاپی آپ تیار کریں اور احتیاطاً اس کی پانچ فوٹو کاپیاں بنوا کر محفوظ کر لیں۔ آپ سے معلوم ہوا کہ اورینٹل کالج والی کاپی طلبہ کے ہاتھوں کثرتِ استعمال سے بدحال ہو گئی ہے۔ پس ایک اچھی کاپی کسی طرح فراہم کریں اور اس سے پانچ فوٹو کاپیاں یہیں امریکہ میں بنوائیں۔

ضمیمے کا مسودہ بھی بہت صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ خود اپنے سولہ خطوط کے انتخاب کا صاف مسودہ اپنے ہینڈ رائٹنگ میں تیار کر کے آپ کو بھیج رہا ہوں۔

اشاعتِ کتاب کی گفت و شنید کے لیے آپ کا پاکستان جانا ضروری ہوگا۔ وجیہہ الدین احمد صاحب کا پیغام آپ کے نام یہ ہے کہ آپ تھیسس کا مسودہ ان کو دیں تو وہ چھپوانے کا انتظام کر دیں گے۔ اگر آپ فیصلہ کریں کہ ان کی مدد سے اشاعت ہو تو پھر آپ کا کراچی جانا مناسب ہوگا۔

KUTABKHANA OSMANIA

تھیس اور ضمیمے کی کم سے کم دو فوٹو کاپیاں امریکہ سے اپنے ساتھ لے کر پاکستان جائیں۔ ضمیمے کا ستھرا مسودہ تیار کرنا شروع کر دیں۔ لاہور میں اعجاز بٹالوی صاحب سے بھی ملاقات کریں اور ان سے مشورہ کریں۔

اس خط کی فوٹو کاپی وجیہہ صاحب اور اعجاز صاحب دونوں کو بھیج رہا ہوں۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

18 August, 2000

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

آپ نے بتایا کہ اپنی تصنیف کی اشاعت کے لیے آپ مولانا صلاح الدین احمد کی انشاء پر ایک باب کا اضافہ کریں گی اور اس کے لیے لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ''ادبی دنیا'' کے پرانے شماروں کی ورق گردانی کی جائے گی اور مولانا کی انشاء کے نمونے جمع کیے جائیں گے، بالفاظِ دیگر آپ لاہور جا کر ایک بکھیڑے میں پڑ جائیں گی۔ عزیزوں سے میل ملاقات کے لیے فراغ میسر نہ ہوگا۔

''ادبی دنیا'' کے کئی پرانے شمارے میرے پاس ہیں۔ ان سب کے دیباچے جو مولانا کے قلم سے ہیں، فوٹو کاپی کر کے میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

مولانا نے اکادمیٔ پنجاب قائم کی تھی۔ اس کی مطبوعات کا سلسلہ مختصر ہی رہا۔ مولانا نے ان کے دیباچے بھی لکھے۔ میرے پاس ان میں سے یہ کتابیں نکلیں:- حیاتِ جاوید۔ دیوانِ شیفتہ۔ مکتوبات چودھری محمد علی ردولوی۔ تصوراتِ اقبال۔ نسخہ ہائے وفا۔ امریکہ کا سیاسی نظام۔

مولانا کی انشاء پر جو باب آپ کو لکھنا ہے، یہیں امریکہ میں لکھ لیجیے اور لاہور جا کر عزیزوں سے بافراغت ملاقاتیں کیجیے۔

ایک بات سرخ نوک والے قلم سے لکھ رہا ہوں۔ اس لیے کہ یہ اہم ترین ہے۔ جونہی میرا یہ پیکٹ آپ کو ملے، اس کی دو فوٹو کاپیاں بنوا کر انہیں فولڈروں میں محفوظ کر لیں (ایک درجن فولڈر خرید رکھیں)

جو باب آپ لکھیں گی، اس میں مثالیں دینے کے لیے آپ کو اقتباسات کی ضرورت ہوگی۔ میرے بھیجے ہوئے اوراق کی ایک فوٹو کاپی خاص اس کے لیے مفید ہوگی۔ اس کاپی سے تراشے قطع کر کے انہیں اپنی تحریر میں برمحل گوند کے ساتھ چسپاں کرتی جائیں۔ ایک قینچی اس کے لیے درکار ہوگی۔ تراشے قطع کرنا بڑی احتیاط چاہتا ہے۔

ایسی ہی ضرورتوں کا خیال کر کے میں نے کہا کہ دو فوٹو کاپیاں میرے بھیجے ہوئے پلندے کی بنوائیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے جب آپ کو تھیس کی فوٹو کاپی بنوا کر دی تو اسی وقت اس کے ہر صفحے کا معائنہ اچھی طرح آپ کو کر لینا چاہیے تھا۔ اب کے لاہور میں صرف ایک فوٹو کاپی نہیں۔ کم سے کم تین فوٹو کاپیاں بنوائیں اور ان کا ہر صفحہ چیک کر کے تسلی کر لیں۔

یہ باتیں انسان ٹھوکریں کھا کر سیکھتا ہے۔ اشاعت کا ارادہ ہو تو مسودہ نہایت باترتیب اور ستھرا ہونا

چاہیے اور ہمیشہ اس کی دو تین فوٹو کاپیاں بنوا کر محفوظ کر لینی چاہئیں۔ خصوصاً جب کہ طباعت لاہور میں ہوگی اور آپ یہاں بیٹھی ہوں گی۔

اگر آپ کا قیام لاہور میں صرف مہینے ڈیڑھ مہینے ہی کا ہوگا تو آپ اس خیال میں نہ رہیں کہ مکتبہ سنگ میل والے اسی عرصے میں جھٹ پٹ آپ کی تصنیف کی کمپوزنگ اور پھر پروفوں کی درستی کرا سکیں گے۔ اس کے لیے چند مہینے وہاں قیام لازم ہوگا۔

مسودہ مکمل کر کے آپ اعجاز صاحب کو دے دیں۔ پروف آپ کو امریکہ بھیجے جائیں گے۔ میرا قیاس تو یہی ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں میری چار پانچ تصنیفیں پاکستان میں چھپی ہیں۔ ہر ایک کے پروف میرے پاس آتے رہے۔ ہر کتاب کے پروف میں نے کم سے کم دو دفعہ پڑھے۔ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے پارسلوں کی آمد و رفت رہی۔

دنیا بامید قایم۔ والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

21 March, 2001

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

KUTABKHANA OSMANIA

آپ کا خط پا کر ممنون ہوا۔ دونوں کتابوں کی طباعت اور اشاعت آپ کی ہمت سے ہوئی۔ سفر مفید رہا۔ مبارک ہو۔

وجیہہ سے فون پر گفتگو ہر ہفتے ہوتی رہتی ہے۔ آپ نے جو تراشا مجھے بھیجا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مولانا صلاح الدین احمد کے دادا ہندو نژاد تھے اور کشمیر میں انہوں نے اسلام قبول کیا۔ وجیہہ کے عمزاد ڈبلیو زیڈ احمد تقریر نہ کرتے تو یہ بات نامعلوم ہی رہتی۔

میرا پتہ دریافت کر کے آپ نے جب مجھے پہلا خط لکھا تھا اور بتایا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب میرے پرسان حال ہیں تو میں نے فوراً انہیں ایک خط لکھ کر ان کی خیریت پوچھی تھی۔ اس خط کی فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کی کاپی بنا کر آپ کو بھیج رہا ہوں تا کہ آپ کو یقین آ جائے۔

اس خط کا جواب ان کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو گلہ شاید اس بات کا ہے کہ میں اوراق کے لیے کوئی مضمون نہیں بھیجتا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اب بندے کی عمر پچھتر ہو گئی ہے۔ ان دنوں انگریزی میں ایک بسیط کتاب لکھنے کا کام درپیش ہے، جس میں کم سے کم دو سال اور لگیں گے۔ اردو میں مضمون نگاری کے لیے وقت نکالنا آسان نہیں رہا۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کو اگر گلہ ہے تو اسے دور کرنے کے لیے ان شاء اللہ انہیں کچھ بھیجوں گا۔

یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے خط کا جواب نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا خط میرے عریضے کا ''جواب'' تھا اور اس میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی۔

میری مکتوب نویسی کا چرچا میرے دوستوں میں خوب ہے۔ یہ میرا مرغوب مشغلہ ہے۔ کوئی بہانہ نکال کر میں دوستوں کو خط لکھتا رہتا ہوں۔ میرا مجموعہ مکاتیب بعنوان ''سلام و پیام'' ۱۹۹۶ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

یہ پانچ سو صفحات کا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد میری مراسلت اتنی کثیر رہی کہ ''سلام و پیام'' کی جلد دوم کے لیے میرے خطوط کا ایک ڈھیر فراہم ہو گیا ہے۔ خط کا جواب نہ دینا میرا شعار نہیں۔

لاہور کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ مہربانی، کتابوں کی اشاعت پر مکرر مبارکباد۔

والسلام

خیر طلب

داؤد رہبر

ڈاکٹر صاحب کو جو خط (مورخہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء) میں نے لکھا تھا اس کی فوٹو کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔

17 April, 2001

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

آپ کا گرانقدر ہدیہ وصول کر کے ممنون ہوا۔ یہ چار چیزوں پر مشتمل ہے۔ رسالہ الندا کا وہ شمارہ جو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی یادگار ہے۔ دو تصنیفیں حضرت میرزا طاہر احمد صاحب کی جو انگریزی میں ہیں اور ایک ریکارڈ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کا۔

میں آپ کی بھیجی ہوئی کتابیں شوق سے پڑھوں گا۔ چودھری صاحب کی تقریر کا ریکارڈ کل شام میں نے سنا، دو مہمان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی سنا۔

وجیہہ الدین احمد صاحب اب تک آپ کی کتابیں مجھے بھیج نہیں سکے۔ تقریباً دو سال ہوئے ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا جو ان کی بینائی کے حق میں مفید ثابت نہ ہوا۔ ان کا مشغلہ ایک ہی تھا: پڑھتے رہنا، اب وہ بڑی مشکل سے پڑھتے ہیں، بینائی کی کمزوری حد کو پہنچی ہے۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

9 July, 2001

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

آپ کی دونوں کتابوں کا عطیہ موصول ہوا۔ بہت ممنون اور خوش ہوا۔ ''شخصیت اور فن'' کے عنوان والی تصنیف میں آپ نے جو محنت کی، اس کی داد ہماری طرف سے اور اجر من اللہ ہے۔ آپ کی تحریر نہایت شستہ ہے۔ الفاظ کا چناؤ پاکیزہ ہے اور مطالب فصاحت کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔

اردو کے بیسیوں ممتاز ادیب اور شاعر سوانح نگاروں کی توجہ کے مستحق ہیں لیکن افسوس کہ لگن کے ساتھ سوانح عمریاں لکھنے والے نایاب ہیں۔ خاکہ نگاری البتہ عام ہے جو بغیر محنت کے کی جا سکتی ہے۔

آپ نے مولانا مرحوم کی زندگی کے حالات ارادت مندی کے ساتھ معلوم کیے ہیں اور ان کو سلیقہ مندی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ادب اردو کے مورخین آپ کی دونوں کتابوں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

''خیالستان'' کے شمارے کی بازیابی بجائے خود ایک یادگار واقعہ ہے۔ دونوں کتابوں کی اشاعت مبارک ہو۔

کتابوں کی رونمائی کے جلسے میں صبیحہ جیلانی نے جو مقالہ پڑھا، وہ کہیں چھپا یا نہیں؟ اگر نہیں چھپا تو یہ کسی اچھے رسالے میں چھپ جانا چاہیے۔ وجیہہ نے فون کر کے مجھے بتایا کہ صبیحہ نے بہت اچھا مضمون پڑھا۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ صبیحہ جیلانی موڈل ٹاؤن کے سکول میں پانچ برس ہماری ہم جماعت رہیں (اس سکول میں لڑکے اور لڑکیاں مل کر تعلیم پاتے تھے) ان دنوں صبیحہ اور اس کی چھوٹی بہن سہیلہ کا بہت سا وقت ہمارے گھر میں گزرتا تھا۔ وجیہہ اسی سکول میں ہمارے درجے سے دو درجے اوپر تھے۔ یہ بھی ہمارے ہجولی تھے۔ ایم۔ اے فارسی کی کلاس میں صبیحہ ہمارے والد مرحوم کی شاگرد بھی رہیں۔

صبیحہ کی الہڑ اور شریر طبیعت کو دیکھ کر والد صاحب نے مولانا سے کہا تھا، اسے لڑکوں کے سکول سے اٹھا کر لڑکیوں کے سکول میں داخل کرائیے۔ مولانا نے بلا تامل اس تجویز پر عمل فرمایا۔

وجیہہ غیر معمولی ذہانت اور قابلیت والے آدمی ہیں۔ جیسی وسعت ان کے مطالعہ میں ہے، اس وقت پاکستان کے کسی علامہ میں نہیں۔ ان کی طباعی اور قوت حافظہ بھی اتنی ہی غیر معمولی ہے۔ میں نے انہیں اُکسایا ہے اور میرے اُکسانے پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے۔ آج کل یہ ایک سلسلہ مضامین لکھ رہے ہیں۔ ان کی بینائی بہت کمزور ہے۔ اللہ انہیں اس سلسلے کے جاری رکھنے اور اسے شایع کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

5 September, 2001

عزیزہ عاتکہ صدیقہ صاحبہ سلمہا!

آپ کا خط مع مضمون ملا، مہربانی۔ آپ نے لکھا کہ شیکسپیئر کی جو تصویر ''خیالستان'' میں چھپی، اس کی کاپی صاف نہیں آرہی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ تصویر خود صاف نہیں۔ اگر یہ قیاس غلط ہے تو چھپی ہوئی تصویر کا فوٹو کسی فوٹو سٹوڈیو کے ماہر سے بنوا کر دیکھیں۔

افسوس کہ اردو کے رسالوں میں جو تصویریں شامل ہوتی ہیں۔ ان کا چھاپا اکثر ناقص ہوتا ہے۔

Sandwi کی نسبت غالباً سانده سے بنی ہے۔ لفظ سانده کے تلفظ سے یاد پڑتا ہے کہ یہ کسی گاؤں یا قصبے کا نام ہے۔ سانده سے نسبت ساندوی ہی بنے گی۔ جیسے انبالہ سے انبالوی اور امروہہ سے امروہوی بنتی ہے۔ سانده پنجاب میں ہے یا پنجاب سے باہر کہیں، اس کی تحقیق آپ کے لیے مشکل نہ ہوگی۔ لاہور پہنچ کر آپ ریلوے کا ٹائم ٹیبل ملاحظہ کریں۔

فرعون اور توحید والا مضمون آپ نے محنت سے لکھا ہے۔ میں نے شوق سے پڑھا۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

21 September, 2001

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

بوسٹن کے ایک مشاعرے میں نیر جہاں نے اپنا کلام ترنم کے ساتھ سنایا تھا۔ ان کو میرا سلام پہنچا دیں۔ ان کے برادر ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب بوسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ میری ملازمت بھی اسی یونیورسٹی میں تھی۔

نیر جہاں کی شادی کی دعوت میں میں شریک ہوا تھا۔ دعوت کے بعد چند مہمان ان کے ایک عزیز معارج کرمانی صاحب کے گھر میں جمع ہوئے تھے، میں نے میزبان کی فرمائش کی تعمیل میں وہاں پکا گانا گایا تھا۔

پاکستان میں آپ کا قیام غالباً لاہور میں ہوگا۔ میرے مکاتیب کی کتاب (سلام و پیام) آپ کو وہیں فیروز سنز کے ہاں سے یا مکتبۂ سنگِ میل کی دکان سے مل جائے گی۔ سنگِ میل والوں نے میری تین اور کتابیں بھی شائع کی ہیں:-

۱) پراگندہ طبع لوگ

۲) کلچر کے روحانی عناصر

۳) باتیں کچھ سریلی سی

اپنے لیے کلیات کا نسخہ آپ وجیہہ سے مانگ لیں۔ وہ بخوشی دے دیں گے۔ اگر مزید نسخے درکار ہوں تو کراچی میں فضلی اینڈ سنز کی دکان سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اس دکان کا پتہ یہ ہے:-

Fazlee's Book Super Market
507/3 Temple Road, Urdu Bazar,
Karachi 74200

چودھری ظفر اللہ خاں مرحوم موڈل ٹاؤن میں ہمارے ہمسائے تھے۔ ان کی عالیشان کوٹھی ہمارے گھر کے سامنے تھی۔ ان کی ساس بیگم شمشاد علی نے اس کوٹھی کے پہلو میں اپنا بنگلہ تعمیر کرایا۔ اس بنگلے میں کئی برس ہمارا آنا جانا روز کا رہا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ ہمارے بچپن اور لڑکپن کا آدھا زمانہ اس گھر میں گزرا۔

ہماری والدہ مرحوم چودھری صاحب کی والدہ مرحومہ سے ملنے جایا کرتی تھیں۔ ان کا (یعنی ہماری والدہ کا) انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر کل اُنتیس تھی۔ چودھری صاحب کی والدہ صاحبہ نے چاہا کہ ہمارے والد صاحب چودھری صاحب کی بیگم (بدر) کی چھوٹی بہن زُہرہ سے شادی کر لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ والد صاحب بیاہ کا خیال ہی ترک کر چکے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ برسوں بعد زُہرہ نے اپنے شوہر ڈاکٹر غلام احمد کو طلاق دے کر میرے چھوٹے بھائی محمد الیاس سے شادی کر لی۔ حالانکہ زُہرہ عمر میں میرے اس بھائی سے تیئیس برس بڑی تھی۔ الیاس نے آج سے تیس برس پہلے ۴۳ کی عمر میں انتقال کیا۔ اب تو زُہرہ بھی فوت ہو چکی، اس کی تاریخِ وفات مجھے معلوم نہیں۔

والسلام

آپ کا خیر خواہ

داؤد رہبر

14 December, 2001

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

السلام علیکم! ہم ایک نئے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ میری کچھ ڈاک نئے پتے پر آ رہی ہے، کچھ پرانے گھر کے پتے پر۔ پرانا گھر فروخت کیا جائے گا۔ میں وہاں روزانہ جاتا ہوں جو ڈاک وہاں ڈبے میں ہوتی ہے، اُٹھا لاتا ہوں۔

آپ کا ایک خط پرسوں موصول ہوا۔ اس کے ہمراہ مولانا کے نام میرے پرانے خطوط کا بنڈل بھی آیا۔ معلوم نہیں وجیہہ صاحب اس مجموعے کو پا کر کیا کریں گے۔ اس میں سولہ سترہ جو اچھے خطوط ہیں، وہ آپ کی تصنیف میں شامل ہو کر شائع ہو ہی چکے ہیں۔ بہر حال مجموعے کا لفافہ رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے جلد انہیں بھیج دوں گا۔

ایک اور خط آپ کا اس سے چند روز پہلے ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبیحہ جیلانی کا مضمون بھی آپ نے مجھے بھیجا تھا۔ افسوس اس مضمون والا لفافہ ڈاک میں میرے ہاتھ نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔

نقلِ مکانی کی مہم آسان نہ تھی۔ پرانا مکان فروخت کے لیے خالی کیا گیا، وہاں سے لایا ہوا سامان ابھی ٹھکانے نہیں لگا۔ میرا نیا پتہ نوٹ کر لیں۔

والسلام

داؤد رہبر

KUTABKHANA
OSMANIA

26 June, 1999

عزیزِ مکرم لطف المنان صاحب!

السلام علیکم! آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آغا بابر مرحوم کے خاندان سے آپ کی یگانگی کیسی گہری ہے۔ ان کے برادر اعجاز حسین سے میری دوستی بلکہ یاری پچاس سال کی ہے۔ ہر مہینے میں ایک بار ان کو فون کرتا ہوں۔ انہیں خط بھی لکھتا رہتا ہوں۔ ان کی دوستی کی بدولت عاشق صاحب مرحوم سے بھی نیاز مندی نصیب ہوئی۔ بھائی بابر صاحب جب امریکہ میں آن بسے تو ان سے قرب زیادہ ہوا۔ میں ریٹائرڈ ہو کر فلوریڈا کا ساکن ہوا تو فون پر مسلسل ان سے گفتگوئیں ہوئیں۔ آٹھ سال تقریباً ہر ہفتے میں انہیں فون کرتا رہا اور خوب گپ ہوتی تھی۔ جونہی وہ کوئی مضمون یا افسانہ مکمل کر لیتے، اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دیتے۔ جو کچھ میں لکھتا، اس کی فوٹو کاپی انہیں فوراً بھیج دیتا۔

اعجاز سے میں نے دو چار بار کہا، تمہارے والد بزرگوار غلام اکبر خاں مرحوم اس قدر شاندار اور خوش صحبت آدمی تھے، ان کی سیرت لکھو تا کہ پڑھنے والے جانیں کہ تم بھائیوں میں محفل آرائی کہاں سے آئی۔ اعجاز کو وکالت سے فرصت کم ملی۔ یہی بات میں نے بھائی بابر سے بار بار کہی تو انہوں نے سنجیدگی سے اس پر غور کیا اور قلم اُٹھایا اور جب اُٹھایا تو باپ کی سیرت کو یاد کرتے ہوئے اقارب اور احباب کی یادیں بھی بیدار ہوئیں۔ کہانیوں کا ایک سلسلہ حافظے سے کاغذ پر آیا۔ اس سلسلے کا عنوان انہوں نے ''خدوخال'' رکھا۔ اس کی قسطیں مختلف رسالوں میں چھپتی رہیں۔ آخری حصہ جو شائع نہ ہو سکا، میری ٹاؤن میں اعجاز کو یکجا مل گیا، اب ان شاء اللہ لاہور سے اس کی اشاعت ہوگی۔

بھائی عاشق کی یادوں کا لکھنا وہ ملتوی کرتے رہے۔ میں یاددہانی کرتا رہا۔ وہ کہتے رہے ہاں یہ کتاب بھائی عاشق کی داستان پر آ کر ختم ہوگی۔ یہ ارادہ دل میں رکھتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کی اور یادیں لکھتے رہے۔ اتنے میں اجل آ گئی۔ ارادہ دل ہی میں رہ گیا۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اس لیے کہ بھائی عاشق کے ازدواج کا المیہ نہایت موثر ہے۔ اس کا خلاصہ انہوں نے ایک گفتگو میں بیان کیا تھا۔

"خدوخال" میں رشتہ داروں کی کہانیاں ہیں۔ اصل نام لے لے کر کہی گئی ہیں۔ فرضی ناموں سے نہیں اور چونکہ مرحوم افسانہ نگار تھے، اس لیے واقعاتی بیان میں افسانوی رنگینی آ گئی ہے اور یہ جدت ہے۔

آپ نے ان کا تعارف جس مضمون میں کرایا تھا، اسے پڑھنے کی مجھے خواہش ہے۔

میرے مکاتیب کا مجموعہ "سلام و پیام" بھی بھائی بابر صاحب کے پاس تھا۔ معلوم نہیں یہ بھی آپ کو ملا یا نہیں۔

اور باتیں آپ سے فون پر ہوں گی۔

خیر طلب

داؤد رہبر

20 July, 1999

عزیز مکرم لطف المنان خاں صاحب!

السلام علیکم! لفافے پر مسٹر (.Mr) کی بجائے جناب میں سبھی احباب کے ناموں کے ساتھ لکھتا ہوں۔ مسٹر کے لفظ سے مجھے بیگانہ وشی محسوس ہوتی ہے۔

فون کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ آپ سبک موسیقی زیادہ پسند کرتے ہیں اور پکے گانے کا چسکا آپ کو نہیں ہے۔ آپ کی فرمایش پوری کرنے کو چند نمونے اپنی گلے بازی کے جلدی میں چن کر بھیج رہا ہوں، ان میں بیشتر امریکہ کی گھریلو بیٹھکوں میں معمولی مشین پر ریکارڈ کیے گئے۔

"ہم لوگ" کے ایڈیٹر صاحب کو میرا سلام پہنچا دیں۔ رسالہ کی طباعت نفیس ہے لیکن ابھی تو یہ منحنی سا چہار ورقہ ہے۔ میرے مضامین مختصر نہیں ہوتے۔ لاہور کے "علامت" اور کراچی کے "مکالمہ" کے لیے میں مسلسل لکھتا رہا ہوں لیکن اب ان کے لیے بھی وقت میسر نہیں۔ ایک تصنیف میں لگا ہوا ہوں جو انگریزی میں ہے۔ انگلستان کے چند شاعروں اور اردو کے چند شاعروں کی تہذیبوں کا فرق سمجھنا اور سمجھانا اس کتاب سے مقصود ہے۔ میری عمر گزشتہ مئی میں تہتر کو پہنچی۔ پہلے کی سی سکت اب کہاں ہے۔ اس کتاب کی تکمیل اس وقت مقدم ہے۔ اُمید ہے آپ میری معذوری کو برحق سمجھیں گے۔

اعجاز کی آمد کا آپ کو بھی انتظار ہے اور مجھے بھی۔ میں ان سے ملنے ٹیری ٹاؤن جاؤں گا۔ خوب ہو اگر آپ بھی وہاں ان دنوں موجود ہوں۔

والسلام

خیر طلب

داؤد رہبر

27 July, 1999

عزیزِ مکرم لطف المنان خاں صاحب!

السلام علیکم!

استاد بندو خاں نے ایک ساز خود ایجاد کیا یعنی بانس سے بنی ہوئی سارنگی جس پر تانت کی بجائے فولاد کے تار چڑھائے گئے۔

وائلن کی طرح سارنگی "گز" سے بجائی جاتی ہے۔ گز اس کی چار تانتوں پر پھرتا ہے۔ چار تانتوں کے نیچے فولاد کے بیس پچیس تار ہوتے ہیں، یہ "طربیں" (طرب کی جمع) کہلاتے ہیں۔ انہیں یوں سر کیا جاتا ہے کہ تانت سے نکلنے والی اصوات سُر ملاپ کے باعث ان کو مرتعش کرتی ہیں۔ ان کے ارتعاش سے سارنگی کی گونج چہار چند ہو جاتی ہے۔

بندو خاں صاحب نے سارنگی نواز بھائیوں سے کہا "طربوں" کی افراط ایک بے مزا تکلف ہے۔ خاں صاحب نے سارنگی کی ساخت پر غور کیا۔ انہیں سوجھا کہ بانس کی سارنگی بنانی چاہیے۔ بانس پر تانتیں چڑھائی گئیں تو آواز ہی نہ نکلی۔ آپ نے سوچا، تانتوں کی بجائے فولاد کے تار چڑھا کر دیکھیں۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور ایسی انوکھی آواز پیدا ہوئی کہ کسی نے خواب میں بھی نہ سنی تھی۔

کراچی میں خاں صاحب کے فرزند امراؤ بندو خاں صاحب کی اقامت گاہ میں میرا جانا ہوا، بانس والی وہ سارنگی دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔ امراؤ خاں نے مرحوم باپ کا یہ ساز میرے سامنے سُر کیا اور اسے باپ ہی کے ڈھنگ سے بجا کر مجھے خوش کیا۔

اُستاد بندو خاں کی بجائی ہوئی درباری کا ریکارڈ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اسے سنیے اور اس کے بعد اُستاد حامد حسین اور استاد نتھو خاں کے باج سنیے۔ فرق آپ خود محسوس کر لیں گے۔

بندو خاں صاحب کے باج کی بڑی بات تو یہ تھی کہ تار پر گز چلاتے ہی آپ وجد کے حال میں چلے جاتے تھے اور راگ کا پورا رس نچوڑ کر دکھا دیتے تھے۔ یہ بات ان کی غیر معمولی حسِ جمال اور جامع تعلیم سے پیدا ہوئی تھی۔

والسلام

خیر خواہ

داؤد رہبر

15 June, 2000

عزیز مکرم لطف المنان خاں صاحب!

السلام علیکم! پشاور میں بخاری صاحب کا ایک انگریز اُستاد تھا۔ یہ بخاری صاحب کے والد صاحب سے شناسائی رکھتا تھا جو پشاور میں پیر صاحب کہلاتے تھے۔ فرانسیسی زبان میں پیٹر کا تلفظ پئر ہے۔ بخاری صاحب کو یہ چھیڑ ہی چھیڑ میں (پیر نہیں) پئر کہا کرتا تھا۔ بخاری صاحب کے تخلص پطرس کے پیچھے یہ کہانی ہے۔

آپ کے دولہا فرزند کا اصلی نام حارث تو نہیں؟ دعوت نامے میں ہیرس پڑھ کر یہ خیال آیا۔

ولیمے کی ضیافت میں حاضر نہ ہو سکا۔ دولہا کے لیے ایک نذرانہ ارسال ہے۔ دور بیٹھے ہوئے آپ کی

KUTABKHANA OSMANIA

خوشی میں شرکت کی یہی صورت نظر آئی۔ اللہ دولہا اور دلہن کو شاد آباد رکھے۔

خیر خواہ

داؤد رہبر

14 August, 2001

مہربانم لطف المنان صاحب!

السلام علیکم! آپ کے عطیات موصول ہوئے۔ پہلے موسیقی کے تین فیتے، پھر پطرس کا سوانحی خاکہ، عنایات کا شکریہ۔ پطرس کو میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک خط لکھا۔ انہیں خاقانِ تکلم کہہ کر اُن سے خطاب کیا۔ واقعی وہ گفتگو کے بادشاہ تھے۔ البتہ ان کی طبیعت میں تعظیم کسی کے لیے نہیں تھی۔ پھبتی سے باز نہیں آتے تھے۔ مُقطع بزرگ ان سے ڈرتے تھے۔ مبادا یہ ان کی پگڑی اُچھال دیں اور خُردان کے آگے سہمے رہتے تھے۔ مبادا یہ انہیں بے وقوف یا جاہل کہہ دیں۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت ایسی دلکش تھی کہ ان کا مقرب ہونے کی خواہش میرے دل میں برسوں رہی۔ یہ خواہش اب حسرت ہو کر میرے دل میں ہے۔

ان کی گفتار کی جولانی اور ان کی اداکاریاں گورنمنٹ کالج کے کلاس روموں میں ان کے شاگردوں نے دیکھیں۔ افسوس ان کے ملفوظات محفوظ کرنے کی توفیق ان کے کسی شاگرد کو نہ ہوئی۔ ریڈیو برادری کے برخورداروں میں سے بھی کسی نے ان کے چٹکلے قلمبند نہ کیے۔ کاش ان میں سے کوئی ارادت مند ڈائری لکھتا رہتا جیسے بازویل نے ڈاکٹر جانسن کی گفتگوؤں کی ڈائری لکھی۔

آپ نے جو مضمون مجھے بھیجا ہے، اسے پڑھ کر ماننا پڑتا ہے کہ نیویارک آ کر انہوں نے بڑے کام کیے۔ ان کی شخصیت سفارت کے کام کے لیے نہایت مناسب اور شاندار تھی۔ یونائیٹڈ نیشنز کے رسمی اجلاسوں اور اس کے قہوہ خانے میں ان کی رونق افروزی بے مثل تھی۔ اسی لیے ان سے بعض کم ظرف لوگوں کو حسد تھا اور ان کے خلاف سازش گرم رہتی تھی۔

آپ نے موسیقی کے جو فیتے (ٹیپ) مجھے بھیجے ہیں۔ ان میں ایک کی ڈبیا کے اوپر روشن آرا بیگم کا نام چھپا ہوا ہے۔ جب فیتہ نکال کر میں نے بجایا تو مردانہ آواز سنائی دی۔ ایک منٹ سن کر میں نے پہچان لیا کہ آواز اُستاد سلامت علی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لاہور کی ریکارڈنگ کمپنی نے ڈبیا میں غلط فیتہ ڈال دیا۔ بہر حال سلامت خاں کا گانا بھی بڑی چیز ہے۔ میں نے سارا فیتہ شوق سے سنا۔

فیض کا تحت اللفظ اِنشاد اور طبلے پر ذاکر حسین کا توڑا سن کر بھی فرحت حاصل ہوئی۔ آپ نے مجھے یاد کیا اور تحائف بھیجے۔ جزاکم اللہ۔

آپ کا خیر خواہ

داؤد رہبر

27 May, 1997

صاحبِ فہم و ذکا عزیز گرامی خالد احمد صاحب!

السلام علیکم! نومبر ۱۹۹۳ء میں آپ سے نوید کے گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔ اب آپ کا اخلاص نامہ

ملا۔ اس سے پہلے ''فرائیڈے ٹائمز'' میں آپ کا لکھا ہوا تبصرہ موصول ہوا۔ پہلے اعجاز بٹالوی صاحب کی طرف سے اور پھر نوید ریاض کی طرف سے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ نے ''سلام و پیام'' کو شوق سے اچھی طرح پڑھا۔ میرے مزاج کا رنگ آپ کو اچھا لگا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے، دل سے دل کو راہ ہونا یہی حاصلِ زندگی ہے۔ آپ کے خط سے اور آپ کے تبصرہ سے اندازہ ہوا کہ آپ احساس کی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں، اس میں رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔

آپ کے ماموں حفیظ الدین کے بشرہ کی یاد آپ کے خط سے تازہ ہوئی۔ تجمل کے ساتھ احاطۂ کالج کے کسی گوشے میں بیٹھ کر چلغوزے ٹھنگنا مجھے خوب یاد ہے۔ تجمل کی ٹولی سے میرا تعلق ضرور تھا لیکن اس کی ساری سرگرمیوں میں میری شرکت نہ تھی۔ آپ کے ماموں قدرے خاموش آدمی تھے۔ ان کو میرا خط دکھا دیجیے گا اور میرا سلام محبت پہنچا دیجیے گا۔

آپ میرا ذکرِ خیر لکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے آپ کو ''سوانحی خاکہ'' درکار ہے۔ ایسا کوئی سوانحی خاکہ موجود نہیں۔ البتہ اختصار کے ساتھ اپنے احوال اور بعض وارداتِ قلبی کا بیان لکھ بھیجوں گا۔

ایسا کرنے سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ کسی اخبار کے لیے ہے یا کسی رسالے کے لیے اور یہ کہ یہ نگارش دو چار صفحوں کی ہوگی یا دس بیس صفحوں کی یا اس سے بھی زیادہ؟

میری سب سے پہلی تصنیف ''نسخہ ہائے وفا'' کا ایک نسخہ عزیزم نوید ریاض کے پاس ہے۔ اگر یہ آپ کی نظر سے نہیں گزری تو ان سے مانگ کر پڑھ لیں۔ شاید آپ اسے مفید پائیں۔

میں اپنے نام کے ڈھنڈورے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ ناموری کی بجائے مجھے آٹھ دس دوستوں کی دوستی کی پروا ہے۔

میں نے پچھلے ہفتے ایک ''سفرنامہ'' مکمل کیا۔ اس کا عنوان ہے۔ ''تین ہفتے پاکستان میں'' اس کی فوٹو کاپی میں نے عزیزی نوید کو بھیجی ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ اس کی کاپی بنوا کر آپ کو میری طرف سے پیش کریں۔

خیر طلب

داؤد رہبر

25 July, 1997

طالبِ نورِ علم خالد احمد صاحب!

السلام علیکم، آپ کے مخلصانہ خط سے میرا جی بہت خوش ہوا۔ اشتقاقات کی مثالوں والا مقالہ بھی موصول ہوا۔ آپ کے علمی شوق اور قابلیت سے میں بہت متاثر ہوں۔ ناولوں سے مزا لینے والے تو ہزاروں ہیں، آپ الفاظ کی تحقیق سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ یہ سب کو نصیب نہیں۔ جو کچھ اب تک آپ نے لکھا ہے، کتاب کی صورت سے طبع ہونا چاہیے۔

لفافے میں اس خط کے ساتھ چار چیزیں ملفوف ہیں:-

۱) میری تعلیم اور ملازمتوں کا کچا چٹھا۔

KUTABKHANA OSMANIA

۲) میرے قیام کیمبرج کی روداد

(میں نے انگریزی میں ایک آپ بیتی دوستوں کے اصرار پر بیس سال قبل لکھی تھی۔ میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ اسی لیے اسے شایع نہیں کیا۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ کیمبرج کے دنوں کی کہانی اس مسودے کا جزو ہے۔)

۳) ایک مقالہ جو میرے کیمبرج کے تھیسس کا خلاصہ ہے۔

۴) ایک اردو تحریر جس میں میرے قیام انقرہ کی یادیں بیان ہوئی ہیں۔

میری تاریخ پیدائش دراصل ۶ مئی ۱۹۲۶ء ہے۔ لاہور میونسپل کے دفترِ ولادات میں والد صاحب نے ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء درج کرائی۔ ان کی دانست یوں تھی کہ اس طرح فرزندار جمند کو ریٹائرمنٹ سے پہلے ملازمت کا ایک سال مزید ہاتھ آئے گا۔ ہم سب بھائیوں کی تاریخِ ولادت کا اندراج سرکاری دفتر میں اسی حساب سے ہوا۔ اس دروغ میں ہم سب بھائیوں کو والد مرحوم کا ساتھ دینا پڑا۔

اُس زمانے کے اکثر شہری بزرگ دانستہ اولاد کی عمریں سرکاری دفتر میں گھٹا کر درج کراتے تھے۔ میری بیوی کی پیدائش کی تاریخ دراصل ۲ فروری ۱۹۳۰ء ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش دفتر میں ۲۔ اپریل ۱۹۳۱ء لکھوائی گئی۔

اب آپ کی باتیں ہونی چاہئیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ صحافت آپ کا میدان ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ آپ کی طالب علمی کہاں کہاں رہی۔ روس آپ کیسے پہنچے اور جرمنی کب۔ کتنا زمانہ ان ملکوں میں گزارا اور وہاں کیا مشغلے رہے اور آپ کے ماموں عبدالحفیظ خاں نے برطانیہ میں کیا تعلیم پائی اور ان کی ملازمت کس فن سے متعلق رہی۔ ان کو میرا سلام محبت پہنچے۔

پچھلے دنوں لاہور کے ایک صاحب سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ آپ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا، خالد احمد صاحب، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے برادرِ حقیقی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

آپ کی خیریت اور خوشحالی کا خواہاں

داؤد رہبر

15 September, 1997

مخلص دوست خالد احمد صاحب!

السلام علیکم، آپ کا ۱۷۔ اگست کا لکھا ہوا خط مجھے اگست کے آخر میں ملا۔ میرے جس مضمون کو دیکھنے کے آپ خواہش مند ہیں، اس کی ایک کاپی بھیج رہا ہوں۔ اس کی تلاش کے باعث جواب میں دیر ہوئی۔

یہ مضمون ایم۔ ایم شریف کی فلوسوفیکل کانگریس میں نہیں، دسمبر ۱۹۵۷ء کے بین الاقوامی موتمر اسلامی میں پڑھا گیا۔ اس موتمر کی ضخیم روداد پنجاب یونیورسٹی نے چھاپی۔ یونیورسٹی بکڈپو میں دستیاب ہوگی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں تو ضرور آپ کو مل سکے گی۔

اعجاز کو یاد نہ رہا۔ یہ مضمون مسئلہ تناسخ سے متعلق نہیں۔ قرآن مجید کے مسئلہ نسخ سے متعلق ہے۔ خود قرآن مجید کی ایک آیت کی رو سے بعض آیات بعض دوسری آیات کو منسوخ کرتی ہیں:-

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا...... (سورہ البقرہ، آیت نمبر ۱۰۰)

اردو ترجمہ اس آیت کا مولوی نذیر احمد صاحب نے یوں کیا ہے:-

"(اے پیغمبر) ہم کوئی آیت منسوخ کر دیں یا (تمہارے) ذہن سے اس کو اُتار دیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی نازل (بھی) بھی کر دیتے ہیں۔"

آج سے ایک ہزار سال پہلے کے مسلمان مفکرین بہادر لوگ تھے۔ بڑی آزادی کے ساتھ دماغ لڑاتے تھے۔ آج کل کی فتویٰ بازی، روشن خیالی کی فضا کی میں نہیں ہے۔ فتویٰ بازی زباں بندی کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کا زور ٹوٹ جانا چاہیے تاکہ سوچ کے نئے دریچے کھل سکیں اور کایا پلٹ دنیا کے نئے تقاضوں سے معقولیت کے ساتھ نپٹا جائے۔ دل و دماغ کو نئے تجربات کا موقع دیا جائے۔ اکیسویں صدی کے نوروز کا جشن آزادیٔ فکر کا جشن ہو تو کچھ بات بھی ہے۔ عبادت خانوں کا احترام بھی ٹھیک ہے لیکن ہم جنس کا احترام جاتا رہا تو کچھ بھی نہ رہا۔

ایک زمانہ نبوت کا تھا۔ پھر ولیوں کا زمانہ آیا جسے عہدِ ولایت کہتے ہیں۔ اب ایک عہد بھلمنساہٹ کا انتظار ہے۔ اب بھلا مانس ہی کافی ہے۔

دیکھیے اب میرا لاہور آنا کب ہوتا ہے۔ اس سال تو نہیں آیندہ سال ان شاء اللہ، پھر آپ سے اچھی طرح باتیں ہوں گی۔ آپ کے ماموں کو سلام محبت۔

خیر طلب

داؤد رہبر

25 October, 1997

میرے خیر خواہ خالد احمد صاحب!

السلام علیکم! لاہور اور کراچی اور اسلام آباد میں میری نسل کے چند ہم عمر احباب بفضلہٖ ابھی حیات ہیں۔ اردو نویسی کے ذریعے ان سے میرا رابطہ برقرار ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے، جواں سال قدر دانوں میں میں آپ کا بالخصوص ممنون ہوں۔ آپ کے ہر خط میں تحسین ہوتی ہے۔

یادگارِ لوئی ماسی نیوں کی کانفرنس میں میں نے جو مقالہ پڑھا، اس کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ پروفیسر ماسی نیوں کی سرگرمی علمی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ یورپ کے اور خصوصاً فرانس کے بہت سے اربابِ سیاست سے ان کے تعلقات تھے۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ انہوں نے منصور حلاج کے تصوف کی تحقیق میں گزارا اور فرانسیسی میں شہادتِ حلاج کے عنوان سے ایک شاہکار کتاب تصنیف کی۔ ان کا اندازِ تحقیق دیگر مستشرقین کے انداز سے الگ ہے۔ یہ علم ہی کے نہیں عرفان کے بھی آرزومند تھے۔ منصور حلاج کی روح سے انہوں نے لو لگائی۔ الجزائر کو فرانس کے تسلط سے آزاد کرانے کی جو تحریک تھی، اس کے کچھ حمایتی فرانس میں بھی تھے۔ پروفیسر ماسی نیوں نے اس حمایت میں سبقت کی۔

کانفرنس میں شرکت کو ان کے چند ارادت مند پیرس سے بھی آئے۔ مقصد کانفرنس کا یہ تھا کہ ماسی نیوں کی خوبیاں یاد کی جائیں۔ اس لیے مقالات میں ان کی تصانیف کی تنقید شامل نہ تھی۔ میں نے بھی مقالہ موقع کی مناسبت سے قلمبند کیا۔ حلاج کے تصوف سے متعلق اردو میں ان شاء اللہ کچھ لکھوں گا، فی الفور نہیں۔ چند مہینے

اس کے لیے درکار ہیں۔

یہ مقالہ جو میں بھیج رہا ہوں، آپ ہی کے ملاحظہ کے لیے ہے۔ پاکستان کے کسی اخبار یا رسالہ کے لیے نہیں ہے۔ کانفرنس کی روئیداد کتابی شکل میں چھپے گی۔ یہ مقالہ اس میں شامل ہوگا۔

باشندگانِ لاہور کو سلام، خصوصاً آپ کے ماموں صاحب کو۔

اپنی بزرگی کا منتظر

داؤد رہبر

24 October, 1997

بخدمت ظفر احمد چودھری صاحب

برادرم ظفر!

السلام علیکم! اپنے آپ کو اساں اور مخاطب کو تو نہ کہنا اور پھر اعتراض کا یہ جواب کہ ''ایہہ نوں وی ساڈی عاجزی سمجھ لو'' بہترین لطیفہ ہے۔ تمہارے دیہاتی دوست کی طبیعت داری کی داد دینی چاہیے۔

امابعد، تم یہ پیمان کرو کہ اپنے ہم جماعتوں سے پرانی بے تکلفی برقرار رکھو گے۔ آفتاب احمد خاں اور تجمل کی طرح۔ تجمل سے اب کے لاہور میں اور آفتاب سے کراچی میں ملاقات ہوئی، انہوں نے تو مجھے آپ یا تسی نہیں کہا۔

تمہارا جو خط آیا تھا، اس میں اظہار تہہ دل سے ہوا۔ اس کا جواب اگر میں اس زعم کے ساتھ لکھوں کہ میں مذاہب کا گہرا گیانی ہوں تو یہ تنگ ظرفی ہوگی۔ جتنے حیران تم ہو، اتنا ہی حیران میں بھی ہوں۔ تم نے آہ بھر کر خط لکھا اور اپنے دکھ اور اپنی بے بسی سے مجھے آشنا کیا۔ میں ممنون ہوں، یہ بے بسی صرف تمہاری اور میری نہیں، آج کل کروڑوں نفوس کی ہے۔

عقائد کے بارے میں لب کشائی فقہاء اور علماء اور صوفیا تو کرتے ہی رہیں گے۔ شکر کرو کہ تمہارے کسبِ معاش کو مناظرہ سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ اپنے فن میں بلندترین مرتبہ کو پہنچ کر تم سبکدوش ہوئے۔ اچھے دنوں کو یاد کرو اور آج کل کی دنیا کی ابتری پر حیران ہوتے رہو۔ حقوقِ انسانی کے کمیشن کو زندہ رکھو اور اپنے دل کو کشادہ، تمدن کی برکتیں بھی ہیں اور لعنتیں بھی۔ میں جب کسی ریستوراں میں جا بیٹھتا ہوں اور ویٹرس میری فرمائش کی پلیٹ اور میری فرمائش کا گلاس میرے آگے لا کر رکھتی ہے تو میں جی میں کہتا ہوں، شکر ہے کہ تہذیب کچھ تو باقی ہے۔

اُمید ہے مکتبہ سُنگِ میل سے میری کتاب چھپ کر جلد کتب فروشوں کے ہاں آ جائے گی۔ اس کا عنوان یہ ہے:-

''کلچر کے روحانی عناصر''

اسے پڑھ کر مجھے خط لکھنا، لاہور آنا ہوا تو تمہارے گھر آ کر چائے پیوں گا۔

سعیداللہ، ثریا اور بالی کو میرا سلام پہنچا دینا۔ موجی کو بھی میرا سلام محبت۔ تم نے فون کیا تو یہ سب لوگ یاد آئے۔

ساحل نشیں

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

فون پر تم نے پوچھا ''مرنے کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں تمہارے کیا عقیدہ ہے؟'' میرا جواب یہ ہے کہ ہو تو کچھ مضایقہ نہیں۔ شاید کشودِ اسرارِ غیب کی کوئی صورت آگے چل کر بہتر ہو۔

ایک حدیث ہے کہ آنحضرتؐ سے کسی نے عالمِ غیب کے بارے میں سوال کیا۔ حضورؐ نے جواب دیا۔ ''جس سے سوال کیا گیا، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔''

7 November, 1997

برادرم ظفر!

السلام علیکم! تم نے بتایا تھا کہ ۶ نومبر کو تمہاری واپسی کی پرواز ہے۔ تمہیں تو اپنا طیارہ اُڑا کر لے جانا چاہیے تھا۔

تمہیں میری غزل کے دو شعر خوب یاد رہے۔ اُس زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اور نظمیں میں نے محفوظ نہ کیں۔ اس غزل کے باقی اشعار میرے حافظے سے محو ہو گئے۔

تم نے اپنے خط میں اس غزل کا مقطع یوں لکھا:-

راہبر بھی تو رہا عاشق دشنام کبھی
کون ہوتا نہیں اسلام سے پہلے پہلے

تمہیں سہو ہوا، اصل مصرع یوں تھا:-

راہبر بھی تو رہا عاشق اصنام کبھی

یہ غزل میں نے گورنمنٹ کالج کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ ''وفاداروں کی فہرست'' والا شعر پرنسپل سوندھی کو بھی پسند آیا تھا اور انہوں نے زور زور سے تالی بجا کر اس کی داد دی تھی۔ ضیاء جالندھری نے اگلے روز کافی ہاؤس میں دوستوں میں بیٹھے ہوئے یہ فقرہ کسا تھا۔ ''وفاداروں کی فہرست میں داؤد رہبر کا نمبر چونسٹھ تھا۔''

تمہارا سامنا لندن کے کسی بازار یا پارک میں لارڈ ویول سے بھی تو ہوا تھا۔ تم نے یہ واقعہ مجھے سنایا تھا۔ مجھے یوں یاد ہے:-

لارڈ ویول کو تم نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے کہا۔ ''اچھا، تو تم بھی چودھری ہو۔ کیا چودھری ظفر اللہ خاں کی طرح تم بھی غیر معمولی ذہانت رکھتے ہو؟'' تم نے اس کا جواب دیا تھا۔ ''نہیں جناب، میں تو نرا ڈفر ہوں۔'' بتاؤ میری یاد درست ہے یا اس میں کوئی خطا ہے؟

چودھری صاحب چند تقریبوں کے سلسلے میں وسکانسن یونیورسٹی تشریف لائے۔ یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ ایک روز ہوٹل میں وہاں میرا برادر یعقوب اور میں ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ تمہارا ذکر آیا تو انہوں نے کہا۔ ''اس کو میں ظفر ٹُو کہتا ہوں۔ اب ٹو کے معنی انگریزی میں ''دو'' کے بھی ہیں اور ''بھی'' کے بھی۔ معلوم نہیں ''ٹو'' سے ان کی مراد کیا تھی۔ چودھری صاحب نے تجویز فرمائی۔'' کیوں نہ ہم تینوں مل کر ظفر کو یہاں سے ایک کارڈ بھیجیں۔ ہوٹل کے سٹال سے ایک باتصویر کارڈ خریدا گیا۔ تینوں نے اس پر دستخط کیے اور کارڈ ڈاک میں ڈال دیا گیا۔ ممکن ہے اس کارڈ کا ملنا تمہیں یاد ہو۔

نیو ہوسٹل کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہاں کسی ہم جماعت کے کمرے میں تم، سعید اللہ اور میں یکجا تھے۔ پچھلے پہر کا وقت تھا۔ گرمی زوروں پر تھی۔ سعید اللہ لیٹ گیا تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ میں نے ہیئر آئل کی بوتل کا ڈھکنا کھول کر دو قطرے تیل کے سعید کی ناک میں ڈال دیے۔ ہڑ بڑا کر اُٹھا اور مجھے مارنے کو دوڑا۔

اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں کوئی تمہیں یاد آئیں تو خط میں لکھو۔ جیسے مسعود محمود کی بات تم نے مجھے سنائی تھی۔ امید ہے سعید کو اور موجی کو تم نے میرا اسلام پہنچا دیا ہوگا۔

31 January, 1999

برادر ظفر!

السلام علیکم! میں حیران ہوں کہ کس کی تجویز سے مجھے کمیشن کا لائف ممبر بنایا گیا اور اس کی رکنیت کی فیس (دس ہزار روپے) کس مخیّر نے اپنی جیب سے ادا کی۔ رُکن سے کن خدمات کی توقع رکھی جاتی ہے؟ یہاں بیٹھا میں وہاں کے لیے کیا کروں، میری سمجھ سے باہر ہے۔

میلہ چراغاں اب بھی ہوتا ہوگا۔ اس جشن کو منانے والے شالامار باغ کی کیاریاں روند کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اندھیر نگری ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ برادر روشن خیالی اور رواداری یوں نہیں آتی کہ بٹن دبایا اور جھاڑ فانوس جگمگا اٹھے۔ اس کے لیے ایک صدی بھی کافی نہیں۔ بہر حال کمیشن کا فریاد گھر قایم رہنا چاہیے۔

میری دو کتابیں مطبعہ سنگِ میل نے چھاپی ہیں۔ تم نے دیکھیں یا نہیں؟ اب ایک تصنیف انگریزی میں شروع کی ہے۔ یہ آزاد خیالی کا دعوت نامہ ہوگی۔

شکوہ اور جواب شکوہ کا ترجمہ تم نے خوب کیا ہے۔ یہ یہاں کسی رسالے میں چھپ جانا چاہیے۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں ''مسلم ورلڈ'' کے ایڈیٹر کو بھیج دوں۔ یہ بڑا موقر رسالہ ہے۔ اس میں ممتاز محققین کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ امریکہ آؤ تو مجھے فون کرنا۔

تمہارا بھائی

داؤد رہبر

24 December, 2000

پیارے ظفر!

وعلیکم السلام! تم نے خط زندہ دلی کے ساتھ لکھا اور داد کشادہ دلی کے ساتھ دی۔ خط پڑھ کر حمید اور پاتھو کے شباب کا زمانہ یاد آیا۔ حمید زندہ رہتا تو اس کی جوانی کی کہانی مثنوی کے لائق ہوتی۔ نفیسہ سے اس کی شادی ایسی حالت میں کر دی گئی جب وہ صاحبِ فراش تھا بلکہ بسترِ مرگ ہی سمجھو۔ اسی لیے اس کے نکاح کی تقریب کے لیے نہ شامیانے تانے گئے نہ شادیانے بجائے گئے۔ بیاہ تو ہوا لیکن بے ثمر رہا۔ اولاد بھی نہ ہوئی۔ بیچاری نفیسہ پر بھی ظلم تھا۔ حمید کے انتقال کے بعد جلد ہی نفیسہ کا بیاہ کسی اور سے کر دیا گیا تھا۔

وہ دوسری لڑکی جسے شادی کے فوراً بعد لے بھاگنے کی نیت حمید کے دل میں تھی یا تو اس کی عیسائی ٹیوٹر تھی جو اسے ریاضی کا سبق دینے آیا کرتی تھی یا پھر خاندان ہی کی ایک لڑکی جو اس گھر میں رہتی تھی اور چھوٹی زہرہ کہلاتی تھی، ہمارا یہ بے قرار بجولی مرحوم ہو کر حوروں سے ہمکنار ہوا۔

تمہیں معلوم ہے کہ میں مارچ ۱۹۴۹ء کے بعد پاکستان میں رہا ہی نہیں۔ البتہ کیمبرج کی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۵۳ء کی گرمیوں میں لاہور آیا۔ ایک سال وہاں معاش کی اُمید میں کاٹ کر ۱۹۵۴ء کی گرمیوں میں کینیڈا چلا گیا۔

لاہور کے اس یک سالہ قیام کے ایاّم میں میری دوستی جنرل نذیر سے ہوئی۔ یہ بڑی محبت والے آدمی تھے۔ عسکری زندگی سے الگ ہو چکے تھے۔ ان کے ہمراہ روزانہ پچھلے پہر میں ٹہل قدمی کے لیے نکلتا تھا۔ سرکلر روڈ کا پورا چکر ہم لگاتے تھے۔

انہی دنوں (۱۹۵۳ء کی گرمیوں میں) مجھے ہیضہ ہوا تو اس کی خبر بالی کو ہوئی۔ وقتِ شب عیادت کو آئی تو میرا حال دیکھ کر اسے رحم آیا۔ فوراً اس نے نوکر کو حکم دے کر دوڑایا، جا کر دکان سے برف لا۔ میرا بخار ۱۰۵ درجے تک چڑھا ہوا تھا۔ برف تولیے میں لپیٹ کر اس نے اس سے ڈھائی تین گھنٹے میرے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچائی۔ جب تک بخار نہ اترا، اُٹھ کر رخصت نہ ہوئی۔ اس کی تیمارداری سے میری جان بچی۔

۱۹۴۹ء کے بعد میری ساری زندگی لاہور سے باہر ہی گزری بلکہ کہنا چاہیے پاکستان سے باہر۔ سعید اللہ اور نصر اللہ کی زندگیوں کی کہانیاں کیا بنیں، مجھے معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ سعید اللہ تمہارے ساتھ ایئر فورس میں تھا اور ریٹائرڈ ہو کر اس نے ایک سکول کھولا۔ اس کے عوارض کی خبر بری خبر ہے۔ اسے میرا پیار دینا۔

نصر بھائی کچھ مدت شیزان ریستوراں کے منیجر رہے۔ بس اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔ ہم سے کم ہی مخاطب ہوئے۔ حمید اور سعید سے بھی بات زیادہ نہ کرتے تھے۔ اُردو کم اور انگریزی زیادہ اور انگریزی بھی چٹاخ پٹاخ، جیسے شب برات کی آتش بازی۔ یہ بات تمہارے دوست نور خاں میں بھی تھی۔ ایک روز ان دونو کی ملاقات ہوئی تو دونو کے درمیان انگریزی تکلم کی شب برات ہوئی۔ میں وہاں موجود تھا، خوب لطف رہا۔

کالج کے دنوں میں مونچھیں میری بھی تھیں اور تمہاری بھی۔ ان کا صفایا کر دیا گیا۔ پاتھو نے مونچھیں بڑھا کر انہیں تاؤ دیا۔ ایسا حوصلہ ہم میں کیوں نہیں تھا؟

آیندہ سال گلوکاری کے لیے لاہور آؤں گا تو خط لکھ کر تمہیں آمد کی تاریخ بتاؤں گا۔

ہر موسم کے تازہ پھل کھایا کرو اور اپنی صحت کا خیال رکھو۔

تمہارا ہمدمِ دیرینہ

داؤد

19 May, 2000

بخدمت اے۔ایچ۔انجم صاحب!

مکرمی انجم صاحب!

السلام علیکم! میرزا غالبؔ کے اس شعر پر آپ کا استفسار موصول ہوا

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

KUTABKHANA OSMANIA

دمن (یعنی دمینتی) نے اپنے معشوق نل کے زانو پر تکیہ رکھنا (یعنی تکیہ کرنا، سہارا لینا) چاہا۔ نل بندھن سے گھبرایا، بھاگا تو اسے روکنے کے لیے دمینتی نے دست دراز کیا۔

خیال رہے کہ راجا نل کا لباس نہ شلوار تھا نہ پاجامہ نہ پتلون۔ اس کا لباس چادر یعنی دھوتی تھا۔ دمینتی نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ دھوتی پر جا پڑا۔ صورتِ حال نازک تھی، کھینچا تانی سے دھوتی کے کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ راجا نے تلوار سے دھوتی کے پلے کو کاٹا اور دمینتی کی پکڑ سے آزاد ہو کر بھاگا۔ پلہ دمینتی کے ہاتھ میں رہ گیا۔

حضرت یوسف کا دامن زلیخا نے پکڑا تھا، دامن پھٹ گیا، ایک دریدہ ٹکڑا اس کا زلیخا کے ہاتھ میں رہ گیا۔ دونوں قصوں میں مشابہت کے باوجود ایک عجیب فرق ہے۔

وہاں حضرت یوسف کے کرتے کا دامن، یہاں راجا نل کی دھوتی۔ مختلف تہذیبوں کی کہانیوں میں بات یکساں نہیں ہوتی۔

آپ نے اپنا نام ایچ۔ اے انجم لکھا ہے۔ ایچ۔ اے سے کیا مراد ہے؟ حیدر علی؟ حسن اختر؟ حسین احمد؟

خیر اندیش

داؤد رہبر

13 September, 2000

بخدمت شمیم احمد میرزا صاحب!

کرم فرمائے من میرزا صاحب!

السلام علیکم! ایک روز میں نے آپ کو بتایا کہ میں انگریزی میں اپنے والد صاحب کی سیرت لکھ رہا ہوں اور اس کے پہلے باب میں ان کے پنجابی نژاد ہونے کی باتیں ہوں گی۔ آپ نے سن کر کہا، یہ پنجابی والا باب تو آپ نہ ہی لکھیں تو اچھا ہے۔ میں نے جواب دیا، فرد کی مٹی کہاں کی ہے۔ یہیں سے بات شروع ہونی چاہیے۔ یہ سن کر آپ نے کہا، ہاں بات تو ٹھیک ہے۔

انگریزی میں یہ باب اور ہی پیرائے میں لکھا جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں روئے سخن اوروں کی طرف ہوگا۔

جو مضمون بھیج رہا ہوں، یہ میں نے لاہور کے ایک رسالے کے لیے اعجاز کو بھیجا ہے۔ اور اس کی چند فوٹو کاپیاں دوستوں کو بھیجی ہیں۔ اُمید ہے اسے پڑھ کر آپ کو پنجابیوں پر کچھ تو رحم آئے گا۔

دانتے اطالوی تھا، اس کی سیرت کا بیان اس کے اطالوی الاصل ہونے کے ذکر سے شروع ہوگا۔ گوئٹے جرمن تھا، اس کی سیرت کا بیان اس کے المانوی الاصل ہونے کے ذکر سے شروع ہوگا۔ علامہ اقبال اور مولوی ظفر علی خاں پنجابی تھے، ان کی سیرت کے سمجھنے سمجھانے کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کے پنجابی الاصل ہونے پر غور کیا جائے۔

اقبال کی نظم شکوہ کا مزاج پنجابی ہے۔ شکوے کا خلاصہ یہ ہے:-

ربا! تو نہہ ساڈے نال کیہ کیتی!

لکھنؤ کا کوئی شاعر ہوتا تو اس کے بجائے شکوہ فلکِ کج رفتار سے کرتا یا یارِ کج ابرو سے۔

والسلام

خانہ بدوش

داؤد رہبر

1st October, 2000

محترم شمیم میرزا صاحب!

السلام علیکم! لیجیے اکتوبر آ گیا۔ اسی تیزی سے جنوری آئے گا۔ ایک ہفتہ چٹکی بجاتے گزر جاتا ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے میں نانا بن گیا تھا۔ اب وہ نواسا بھی پچیس کا ہو گیا۔ وہ خود باپ بننے کو مستعد ہے۔ عمرِ عزیز کس تیزی سے گزری ہے، جتنی باقی ہے، اسی تیزی سے گزر جائے گی۔ دل میں کسی کام کا ولولہ ہو تو ہر لمحہ قیمتی ہے۔

آپ کے التفات اور خلوص اور تپاک کا میرے دل پر اثر ہے۔ دو تین ملاقاتوں اور چند ٹیلی فونی گفتگوؤں سے آپ کے احوال اور آپ کے مزاج کی کچھ شناسائی حاصل ہوئی۔ آپ بڑے وسیع المراسم آدمی ہیں اور آپ کے تجربات رنگا رنگ ہیں اور ان کی حکایات سے آپ کا حافظہ بھرپور ہے۔ یہ حکایات قلمبند ہو جانی چاہئیں۔ آغا بابر مرحوم نے امریکہ ہی میں بیٹھ کر اسّی سال کی عمر میں اپنی یادیں لکھیں۔ ان سے جو کتاب بنی ''خد و خال'' کے عنوان سے عنقریب شائع ہو جائے گی۔ آپ کی یادیں بھی اتنی ہی رنگین ہیں۔ لکھنے کا عزم چاہیے اور ضابطہ یعنی ہر روز دو چار صفحے لکھے جائیں۔ اگر آپ شروع کر دیں تو روز افزوں رفتار پر آپ کو خود حیرانی ہوگی۔ میر تقی نے آپ بیتی بہتر سال کی عمر میں لکھی۔ وہ آپ بیتی اب ادبیاتِ عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ میر تقی کم آمیز اور خلوت پسند آدمی تھے لیکن اپنی شاعری اور اپنی تحریر کے ذریعے بنی آدم سے رشتہ پکا کر گئے۔ آپ لکھنا شروع کریں تو آپ کی تنہائی دیکھتے دیکھتے انجمن بن جائے گی۔

چھٹ بھیے آپ کا حصہ کھا گئے۔ اس بے مروتی اور ناانصافی کا غم آپ کھا رہے ہیں۔ میرزا غالب کا حصہ لوہارو کے نواب شمس الدین کھا گئے تھے۔ نواب نے پھانسی پائی، میرزا غالب کا جی ٹھنڈا ہوا لیکن نواب کے انجام سے پہلے میرزا کی مظلومی کا تدارک ان کی شاعری سے ہوتا رہا۔ کوئی غم رائیگاں نہیں جانا چاہیے۔ خدا نے اخروٹ اس لیے بنایا ہے کہ اسے توڑ کر اس کی گری کھائی جائے اور ناریل اس لیے بنایا ہے کہ اسے پھوڑ کر اس کا رس پیا جائے۔

میری اوقات کو نہ دیکھیے میرے اوقات کو دیکھیے۔ سویرے ساڑھے چھ بجے جاگ اٹھتا ہوں۔ میکڈانلڈ سے کافی کے چار پیالے لاتا ہوں۔ انیسہ کو ناشتہ کھلاتا ہوں۔ سوا سات بجے وہ نوکری کو نکل جاتی ہے۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد مضمون نگاری کرتا ہوں یا کسی دوست کو خط لکھتا ہوں۔ ''سلام و پیام'' کی کتاب اسی طرح بنی۔ اس کی اشاعت ۱۹۹۳ء میں ہوئی۔ آپ اس روز یہاں تھے تو میں نے آپ کو ان خطوط کا ڈھیر دکھایا جو ۱۹۹۳ء کے بعد لکھے گئے۔ ''سلام و پیام'' کی جلد دوم کے لیے مجموعہ تیار ہے۔ میں ای میل کا آدمی نہیں ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ میں ٹیلی فون کا آدمی بھی نہیں ہوں۔ آمنا سامنا میری تہذیب ہے۔

دس برس فلوریڈا میں گزار چکا ہوں۔ آپ اٹھائیس برس یہاں رہ چکے ہیں۔ کاش کہ دس برس پہلے آپ سے ملاقات ہو جاتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کاش کہ ہمارے گھروں کے درمیان کا فاصلہ پچپن میل نہ ہوتا،

KUTABKHANA OSMANIA

پانچ میل ہوتا، پھر ہر ہفتے ملاقات ہوا کرتی۔

میری بیوی کی مزمن ذہنی علالت نے میری روز مرہ کی ذمہ داریاں بڑھا رکھی ہیں۔ ذرا خیال فرمائیے بھابی صاحبہ کے کام دھام آپ کے گھر میں کیا ہیں اور کتنے ہیں۔ یہاں میری کٹیا میں اُتنے ہی کام دھام میرے ذمے ہیں۔ انہی ذمہ داریوں نے ریٹائرمنٹ کے زمانے میں مجھے خلوتی کر دیا ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں میرا آنا جانا ان اطراف میں کہیں نہیں رہا۔ سال میں تین چار سفر ضرور کرتا ہوں۔ بوسٹن اور نیویارک کے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی مذاکرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے مدعو ہوتا ہوں۔ اکتوبر کے آخری ہفتے میں ایک لیکچر دینے بوسٹن جاؤں گا۔ آئندہ مارچ میں ایک مذاکرہ (مہاتما گاندھی کے بارے میں) کینیڈا میں ہوگا۔ بس ایسے دو تین ہنگاموں سے اپنا جی خوش کر لیتا ہوں۔

اب رہائش کی منتقلی بھی درپیش ہے۔ اس مہینے کے آخر میں بوسٹن جاؤں گا۔ وہاں اپنی بیٹی کے گھر میں تین دن قیام ہوگا۔ سکونت کس شہر کی اختیار کی جائے، اس کی بات چیت وہاں ہوگی۔

یہ خط آپ کو پہنچ جائے تو فون کروں گا اور پھر طے ہوگا کہ اگلی ملاقات کب ہو۔

بھابی صاحبہ کو سلام۔

نیاز مند

داؤد رہبر

30 October, 2000

اپنے دادا کی آن اور شان کے سچے وارث!

اپنے دادا کے چہیتے اور پروردہ، مکرمی شمیم میرزا صاحب!

تسلیم، برا ہو جمہوریت کا جس نے قصیدہ گوئی کا خاتمہ کر دیا ورنہ میں آپ کی مدح میں قصیدہ کہتا اور آپ میرا منہ موتیوں سے بھر دیتے۔ آپ اور ہم جس ملک میں آ بیٹھے ہیں، اس کے آئین شاہانہ نہیں ہیں۔ بادشاہی سے قطع تعلق کر کے یہاں نظامِ حکومت قایم ہوا تھا۔

آپ کا مزاج خسروانہ ہے اور میری طبع ندیمانہ۔ اپنے مزاج کا اعلان میں نے اپنے ایک شعر میں کیا تھا۔

وہ پرانا نظام دو ہم کو
کچھ ندیمی کا کام دو ہم کو

وجیہہ الدین احمد صاحب میرے کلیات کا دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ تقریباً روزانہ مجھے فون کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب کیا لکھا جا رہا ہے۔ میں انہیں خط لکھتا رہتا ہوں۔ پچھلے تین دنوں میں میں نے انہیں دو خط لکھے۔ ان کی نقلیں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

بوسٹن یونیورسٹی میں دو لیکچر دیے گئے۔ فون پر یا عندالملاقات اس سفر کی روداد کہی جائے گی۔

بھابی صاحبہ کو سلام

نیاز مند

داؤد رہبر

12 December, 2000

مکرمی شمیم احمد میرزا صاحب!

السلام علیکم! انگلستان کے ایک بڑے قانون دان (غالباً ریمزے میکڈ لنلڈ) کو کیمبرج یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین نے ایک مباحثے میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ جب یہ تقریر کر چکے تو حزبِ مخالف کے مقرر نے (جو طالب علم تھا) اپنی تقریر یہ کہہ کر شروع کی:-

We have heard the gentleman
who has just come from the bar.

لفظ بار کی ضلع جگت کا مزا سب نے لیا۔ آپ اس روز لاہور ہائیکورٹ کے بار روم کی جولانیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ بھی Gentleman from the bar ہیں۔ ادھر کافی ہاؤس میں بھی آپ کی بیٹھک رہی۔ میر تقی میرؔ کا شعر ہے۔

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا

دربارِ اکبری کی رودادیں، ابوالفضل اور محمد حسین آزاد نے لکھیں۔ بار روم اور کافی ہاؤس کی یادیں لکھنا آپ کے ذمے ہے، فرض نہیں نفل۔

KUTABKHANA OSMANIA

خطوطِ غالب کا انگریزی ترجمہ نذر ہے۔ اس کا دیباچہ شیخ محمد اکرام کی تصنیف "حیاتِ غالب" پر مبنی ہے۔ اس کی داد انہی کو دی جائے۔ میں تو صرف ترجمے کی داد مانگتا ہوں۔

بھابی صاحبہ کو سلام۔

نیاز مند

داؤد رہبر

5 September, 2000

بخدمت سیمیں ایوب صاحبہ سلمہا!

عزیزہ سیمیں سلمہا!

میں نے پرسوں (بروز اتوار) آپ کے گھر کے فون کا نمبر کئی دفعہ گھمایا۔ گھنٹی بجتی رہی اور فون کسی نے نہ اُٹھایا۔ میں نے نتیجہ نکالا کہ آپ سب ابھی لاہور ہی میں ہیں۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ زیبا کو فون کر کے معلوم کروں۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ آپ اتوار کو لاہور سے رخصت ہوئے اور پانچ یا چھ بجے بخیریت کراچی پہنچ گئے اور یہ کہ آپ کے گھر کا فون کام نہیں کر رہا۔

سوچتا رہا اب کیا کروں، ای میل کا سلسلہ میرے گھر میں نہیں۔ اس لیے میں نے فیکس کی سوچی۔

آپ کے ابو کو میرا سلام اور انہیں میرا یہ ضروری پیغام کہ نذیر احمد (کمپوزر) سے میری کتاب (نسخہ ہائے وفا) کے پروف منگا لیں اور چیک کر لیں کہ کوئی غلطیاں باقی تو نہیں رہ گئیں؟ اگر رہ گئی ہیں تو ان کے نشان پروفوں پر لگا دیں اور پھر پروف اپنے پاس ہی رکھیں۔ نذیر احمد کو واپس نہ بھیجیں۔ میں فون کر کے اس کی وجہ بتاؤں

گا۔ اُمید ہے آپ کے گھر کی فون لائن جلد ٹھیک ہو جائے گی۔
آپ کی امی کو سلام۔

آپ کا چچا

داؤد

19 August, 1998

بخدمت نصرت اقبال صاحب!

نصرت بھائی!

السلام علیکم! تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔ تم سے فون کی گفتگو ہوئی تو اس کے بعد مہمان آ گئے۔ پھر میں اپنے ایک عزیز کی عیادت کے لیے نیویارک گیا اور وہاں سے بوسٹن ہوتا ہوا واپس آیا۔

بندشوں کے جو بول میں نے جمع کیے، تم کو بھیج رہا ہوں۔ کراچی کے رسالہ ''مکالمہ'' کے ایڈیٹر کو میں نے اشاعت کے لیے بھیج دیے تھے۔ دو قسطوں میں شائع ہوں گے۔

حسبِ لیاقت میں نے غور سے گانے سن کر ان کے الفاظ کی شناخت کی۔ غالباً کئی جگہ پہچان ٹھیک نہ ہوئی۔ اسی لیے میری خواہش ہے کہ محمد مسلم غوری کی فراہم کی ہوئی چیزیں دیکھوں اور اپنی غلطیوں پر آگاہی پاؤں مثلاً پوربی راگ کی چیز فیاض خاں صاحب کی گائی ہوئی سنی:-

متھرا نا جائیو مورا کانہا؟

آستھائی کی دوسری لائن یوں سنائی دی:-

من کرو گوپیو

میں سوچتا رہ گیا کہ ''من کرو'' کا مطلب کیا ہوا۔ ایک روز یکا یک خیال آیا کہ شاید اصل میں ''منع کرو'' ہے۔ یعنی اے گوپیو کنہیا کو متھرا جانے سے روکو۔

غوری صاحب کے مجموعے میں بہت سے بول ہوں گے جو میرے مجموعے میں نہیں ہیں۔

میرا گانا باقاعدہ کسی سٹوڈیو میں کبھی ریکارڈ نہ ہوا۔ بعض بیٹھکوں میں دوستوں نے اپنے ریکارڈر سامنے رکھ کر میری سمع خراشی ریکارڈ کر لی۔ خصوصاً بوسٹن کے بیس سالہ قیام کے ایام میں (۱۹۶۸ء تا ۱۹۹۰ء)

حیات احمد خاں صاحب نے لاہور کے الحمرا ہال میں دو بار شائقین کو میرا گانا سنوایا۔ (۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء) اور ریکارڈ کیا۔ وہ ریکارڈنگ انہی کے پاس محفوظ ہے۔

گھریلو ریکارڈنگ کے تیس چالیس ٹیپ میرے پاس ہیں۔ ان میں سے چار گانے کاپی کر کے بھیج رہا ہوں۔ سن کر بتاؤ کہ ان میں مزا ہے یا نہیں۔

آگرہ گھرانہ میرے دل کو لگا۔ اوّل اوّل تم نے بھی اسی کو اپنایا تھا۔ بااصول گانا میں اسی کا وفادار رہ کر گاتا ہوں لیکن دوسرے گھرانوں کی آوازوں کی نقالی سے بھی دل بہلاتا رہا ہوں۔

جے جے ونتی جو اس ٹیپ پر ہے، میں نے ۱۹۸۸ء میں اُستاد بلند اقبال خاں (فرزند اُستاد بندو خاں) کی خوشی کے لیے کراچی میں گائی۔ انہوں نے میرے ساتھ بیٹھ کر طنبورہ بجایا اور بڑی کشادہ دلی سے داد دی۔ ٹیپ

سنو گے تو ان کی صدائے تحسین بیچ بیچ میں سنائی دے گی۔

کھماج کی صوت بندی برمنگھم (انگلستان) کے ایک جلسے میں ہوئی۔ (۱۹۸۷ء) اس وقت میرے گلے کو آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس لیے آواز میں خراش تھی۔ یہ گانا بھی آگرے والوں کے انداز کا ہے۔

اچھی سنگت تو لاہور اور کراچی میں ملے گی۔ ایک چکر وہاں کا لگاؤں گا اور باسلیقہ ریکارڈنگ کراؤں گا۔ صحت اور زندگی اس کے لیے شرط ہے۔

میرا یہ خط تمہیں مل چکے تو میں پھر فون کروں، بھابی کو سلام، اولادوں اور اولادوں کی اولادوں کو دُعا۔

تمہارا بھائی

داؤد

4 February, 1999

نصرت بھائی!

السلام علیکم! تمہارے گھر کی محفل کے ریکارڈوں کی اور کتھے مہاراج کے باج کی کاپیاں بنا کر میں نے محفوظ کر لی ہیں۔ اصل فیتے واپس بھیج رہا ہوں۔ ونے اور پرشاد دونو کی استعداد سے جی بہت خوش ہوا۔ ان دونو کے شریک ہونے سے اچھی خاصی سنگیت سبھا ہو گئی۔ پرشاد کی یادداشت اور مشق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے استاد کی بجائی ہوئی پہاڑی کے سارے لطائف اس نے مشاقی سے ادا کیے۔ اس کی انگلیوں پر بھگوان کی دیا ہے یعنی ماشاء اللہ ونے نے کامود کا خیال نہایت رواداری کے ساتھ گایا۔

بھابی کو سلام، سب کی تندرستی کی دُعا، زینب کو پیار۔

طلب گارِ طرب

داؤد

19 April, 1995.

کرم فرما مکرمی عبدالقوی ضیاء صاحب!

السلام علیکم! آخر مارچ میں مجھے آپ کا کرم نامہ ملا۔ اس کے ساتھ راغب شکیب صاحب کا رقعہ بھی ملفوف تھا۔ میں نے حسبِ فرمائش ایک مضمون (ظہیر دہلوی کے بارے میں) لکھ کر کل انہیں ہوائی ڈاک سے بھیج دیا۔

جی ہاں، اُردو برادری کے اصحاب کے درمیان سلام اور پیام کا سلسلہ رہنا چاہیے۔ میں بوسٹن یونیورسٹی سے بائیس برس کی نوکری کر کے ستمبر ۱۹۹۱ء میں ریٹائر ہوا۔ چاہتا تو چھ سات برس اور تدریس کیے جاتا لیکن جی چاہا کہ فارغ ہو کر اُردو کے لکھنے پڑھنے میں لگ جاؤں۔ یہ فیصلہ راس آیا۔ روز قلم دائیں سے بائیں چلتا ہے۔

کینیڈا اور امریکہ میں بھارت اور پاکستان کے مہاجرین کے احوال ایک سے نہیں ہیں۔ کینیڈا (اور برطانیہ) میں ادھر کے مہاجرین کثیر ہیں۔ اس لیے ہند اور پاکستان کی تہذیب کے چرچے زیادہ ہیں۔ امریکہ میں افریقی النسل قوم نمایاں ہے۔ یہ فرق اثر انداز ہے۔ اردو کے رسائل برطانیہ اور کینیڈا میں برابر دستیاب رہتے ہیں۔ امریکہ میں صرف بڑی بڑی یونیورسٹی لائبریریوں ہی میں اُردو رسائل اور کتب کی درآمد ہوتی ہے۔ ہارورڈ،

KUTABKHANA OSMANIA

چکا گو، وسکانسن وغیرہ میں اُردو کی مطبوعات پہنچتی ہیں۔ جہاں میں بیٹھا ہوں کوئی رسالہ مجھے باقاعدہ نہیں پہنچتا حتیٰ کہ ایسے رسالے بھی کم ہی موصول ہوتے ہیں جن میں میری نگارشیں چھپتی ہیں۔

اردو کے کلاسیکی ادب کی ہزار بارہ سو کتابیں اچھے وقتوں میں بہت ہی معقول قیمتوں سے میں نے خرید لی تھیں۔ انہی کی ورق گردانی سے طبیعت کو بہلاتا ہوں۔ بہت سی کتابیں دیکھ نہ سکنے سے جو محرومی ہے اس کا آپ کو اندازہ ضرور ہوگا۔ کئی پرانی مطبوعات اب نایاب ہیں۔ کسی کتاب کو طبیعت بہت ہی ترسے تو لاہور اور کراچی کے دوستوں کو زحمت دیتا ہوں۔ وہ مطلوبہ کتب کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، کتاب مل جائے تو بھیج دیتے ہیں۔

ان مجبوریوں کی وجہ سے اب میں اس سوچ میں ہوں کہ اردو میں ایسی طبع زاد چیزیں لکھوں جو ہمارے زمانے کے گرم وسرد سے متعلق ہوں اور فلورڈا کے ساحل کی سیر کرتے ہوئے سوجھتی رہیں۔

آپ کے آثارِ قلم کو پڑھنے کا خواہش مند ہوں۔ رسالوں سے آپ ان کی فوٹو کاپی کر کے مجھے ارسال فرمائیں تو آپ کو خط لکھنے کے اسباب مہیا ہوں۔

والسلام

خیر طلب بندہ

داؤد رہبر

17 October, 1995

بخدمت پروفیسر عبدالقوی ضیاء!

السلام علیکم! آپ کی فرمائش کا مضمون ارسال ہے۔ شاید پہلی قرأت میں آپ کو انوکھا لگے۔ دوسری بار آپ اسے پڑھیں گے تو مسکرائیں گے۔ تیسری بار پڑھیں گے تو قہقہہ لگائیں گے۔ میں نے ''برف زار'' میں آپ کے احباب کے لکھے ہوئے مضمون پڑھے۔ خود لکھنے کو قلم اُٹھایا تو قلم نے کہا، ان احباب کی کہی ہوئی باتیں نہ دُہراؤ۔ ایسی بات لکھو کہ سونے پر سہاگہ لگے۔ پڑھنے والوں کو اس مقام سے آگاہ کرو جو کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں ضیاء صاحب کو حاصل ہوا۔

میں اپنے اسلوب سے ہٹ کر کیسے لکھوں۔ تحریر اور تقریر میں میں بذلہ کی طرف مایل ہوں۔ رونی صورت کون دیکھنا چاہتا ہے۔ ظرافت کے زعفران کی چٹکی جس نگارش میں نہ پڑی ہو، اسے پڑھنے والے پڑھ تو لیتے ہیں لیکن اسے پڑھ کر انہیں اپنے آپ پر اور لکھنے والے پر رحم آتا ہے۔ خشک تحریر کو پڑھ کر بھلا دیا جاتا ہے۔ یاد وہی چیزیں رہتی ہیں جن میں چند لطیفے بھی ہوں۔

۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو مرحوم سر عبدالقادر نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:-

''سید سلمان ندوی کے ''معارف'' سے ذرا پہلے سر سید کے اعزاز میں وحید الدین پانی پتی نے رسالہ جاری کیا جو خشک تھا...... اس زمانے کے رسایل میں دو باتیں ہوتی تھیں جو ان کو مقبول نہ بنا سکیں یا تو خشک مضامین یا صرف مشاعرے کا ریکارڈ۔''

میرا مضمون پسندِ خاطر ہو اور آپ کی رائے میں قابلِ اشاعت تو گزارش یہ ہے کہ آپ اسے ''ارتکاز''

KUTABKHANA OSMANIA

والوں کو نہ بھیجیں۔ ''قومی زبان'' میں چھپوانے کے لیے مشفق خواجہ صاحب کو بھیجیں۔

آپ کے اعزازات اور تصانیف کی اَپ ٹو ڈیٹ فہرست کو اس ادبی مضمون کا جز بنانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس باب میں میری تجویز یہ ہے کہ مکمل فہرست آپ رسالے کے ایڈیٹر کو بھیج دیں کہ وہ اپنی طرف سے ایک نوٹ لکھ کر میرے مضمون کے عنوان کے نیچے اسے جگہ دیں اور آپ کی بھیجی ہوئی فہرست اس نوٹ میں آ جائے۔

ایک کتاب (People of the Indus Valley) کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ یہ آپ کو واپس بھیج دی جائے۔ اس کا پارسل بنا کر کل یا پرسوں ڈاک کے سپرد کر دیا جائے گا۔

مضمون لکھنے کا مشغلہ نہایت خوشگوار تھا۔

خانہ آباد دولت زیادہ

آپ کا قدردان اور نیازمند

داؤد رہبر

8 January, 1994

بخدمت سہیل صفدر صاحب!

برادرم سہیل صاحب!

السلام علیکم! لاہور میں میری عزت افزائی کو تین اجتماع ہوئے۔ ایک میں لیکچر ہوا، دو میں گلوکاری ہوئی۔ ان جلسوں کے منتظمین نے مجھ کو یقین دلایا کہ اخباروں میں ان جلسوں کے اعلان انعقاد سے پہلے کیا جائے گا۔ چنانچہ مجھے اُمید تھی کہ جب میں کاغذی پیرہن پہن کر سامنے آؤں گا تو میرے بیشتر مہربان وہاں موجود ہوں گے۔

میں اپنی معذرت کے لنگ سے واقف ہوں۔ کوئی معذرت قابلِ قبول نہیں۔ حساب لگایا جائے تو کل تین روز لاہور میں ٹھیرا۔ بیوی کو تنہا چھوڑ کر لاہور پہنچا۔ اس کی صحت نازک ہے۔ طیارہ پر مجھ سے زیادہ میرے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ بھاگڑ کی وجہ سے لاہور پہنچنے کے بعد پیروں تلے کی زمین نکلی ہوئی تھی۔ حسرت کو یہاں واپس لے کر آ گیا اور محرومی وہیں کی وہیں رہی۔ اب دعا کیجیے کہ ۱۹۹۴ء میں آؤں تو دو تین ہفتے قیام کر سکوں اور آپ کے باغیچے کے امرود اپنے ہاتھ سے توڑ کر کھاؤں۔

لاہور کی ٹریفک کا منظر میرے لیے ایک خواب سے کم نہ تھا۔ یونیورسٹی ہال کی عمارت مجھے اب کے بہت ہی سرخ لگی۔ اس کے گرد ٹریفک دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ چاند زمین سے ڈھائی لاکھ میل ہٹ کر کیوں رہتا ہے۔ قدرت نے کرہ ہائے جوی کو یوں رقصاں کیا کہ تصادم سے بچاؤ ہوتا رہے۔ لاہور میں کیا پیادہ اور کیا سوار لحظہ بہ لحظہ جی میں کہے جاتا ہے، میں بچ نکلا، میں بچ نکلا۔ اللہ فضل رکھے۔ میلہ دائم رہے۔ ذوقِ ازدحام قایم رہے۔ بھابی کو اور میزان کو اور اس کے بھائی بہنوں کو دُعا۔

منیر کو سلام محبت۔

بے کارواں

داؤد رہبر

20 February, 1997

سہیل صاحب کو جگنوئے پاکستان کا سلام!

آپ تو پیدائشی ستارے ہیں۔ ضیاء محی الدین خطاب یافتہ ستارۂ امتیاز، میں نے اپنے آپ کو خود ہی خطاب دے دیا، جگنوئے پاکستان یعنی کرمکِ پاکستان۔

آپ کا گلہ بجا ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ لاہور پہنچا تو اس قدر درماندہ حال کہ جو گھنٹے فارغ ملے خلوت میں لیٹا رہا اور وطن میں اپنی بے وطنی پر حیران ہوتا رہا۔ کئی احباب اور اقارب خواہش مند تھے کہ ان کے ہاں پہنچوں اور ماحضر کھاؤں اور شربت پیوں، سوائے ایک دو گھروں کے کہیں نہ گیا۔

اب کے لاہور کی یونیورسٹی معروف بہ لمس (LUMS) میں لیکچر دینے آیا تھا۔ ان کا دعوت نامہ پڑھ کر میں نے کہا

عمر بھر یار نے چھونے نہ دیا ہاتھ اپنا
ہائے کس عمر میں ہے لمس کی دعوت آئی

اقارب اور احباب کی شکایت کے جواب میں کیا کہوں سوائے اس کے کہ درگزر کریں۔ ۱۹۹۷ء میں کسی تقریب کے لیے لاہور آیا تو وہاں پہنچتے ہی آپ کو فون کروں گا اور آپ کے مسکن مبارک میں حاضر ہو جاؤں گا۔

اب درماندگی کی وجہ سنیے۔ مئی کی چھ تاریخ کو اکہتر کا ہو جاؤں گا۔ یہاں فلورڈا میں اپنی بیوی کا دیرینہ تیماردار ہوں۔ میرے سفرِ لاہور سے ذرا ہی قبل اسے ہسپتال سے واپس گھر لایا۔ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دواؤں کا ٹھیک اوقات پر نگلوانا میرے ذمے ہوا۔ اس کی حالت ایسی نازک تھی کہ میں سوچتا رہا لمس والوں کو لکھ دوں، میں نہیں آ سکتا۔ اپنی بہن کو جو اتفاق سے نیویارک آئی ہوئی تھی۔ فون کیا۔ وہ یہاں فلورڈا آ کر اپنی بھاوج کی تیمارداری کو راضی ہو گئی۔

آپ نئے سال کی مبارکباد کا کارڈ باقاعدگی سے بھیجتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ اس سال میں نے کارڈ کسی کو نہ بھیجا۔ خط البتہ کئی دوستوں کو لکھے۔ اب اگر میں نوروز کی مبارکباد آپ کو لکھوں تو یہ سمجھ لیجیے کہ یہ ایرانی نوروز کی تحریک ہے۔ اہلِ ایران کا زرتشتی نوروز ۲۱ مارچ کو ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کہتا ہوں، آپ کو اور بھابی کو اور بیٹیوں کو اور علی فاتح کو نوروز ہی نہیں ہر روز مبارک ہو۔ منیر کو میرا اسلام محبت۔

خیر خواہ

داؤد رہبر

23 February, 1995

عزیزہ محترمہ شبنم شکیل صاحبہ!

السلام علیکم! یہ نگارش جو بھیجی جا رہی ہے، ڈیڑھ دو گھنٹوں کی ایک نشست میں لکھی گئی لیکن اس سوچ میں کہ کیا لکھوں کئی دن لگے۔ مضمون شاعری کے بارے میں ہو تو آمد سے لکھنا چاہیے۔ آپ پڑھ کر دیکھیے کہ گفتگو ٹھیک ہوئی یا نہیں۔ اس کی اشاعت منظور ہو تو اس میں میری بھی خوشی ہے۔ کس رسالے میں چھپے یہ آپ کی

مرضی پر منحصر ہے۔

آپ کی اس کتاب کے عنوان اور انتساب کے ورق ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ زمانے کی ابتری نے آپ کی حساس طبیعت پر کیا اثر کیا ہے۔ افسوس کہ پاکستان قدغنستان ہو کر رہ گیا۔ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل وہاں کب اور کس طرح آئیں گی، خدا ہی جانے، یوں تو ساری دنیا اس وقت بھول بھلیاں ہے۔

آرٹ کا نظریہ بالعموم یورپ اور امریکہ میں اب یہ ہے کہ اگر زندگی میں انتشار ہے تو آرٹ کا منصب یہ ہے کہ پراگندگی کی عکاسی کرے بلکہ اگر گندگی ہے تو اس کی بھی۔ کسی حد تک یہ نظریہ بجا ہے۔ فانی بدایونی کو غم سے نجات نہ ملی تو انہوں نے جھوٹ موٹ کی سرخوشی والے اشعار نہ کہے لیکن آرٹ میں یہ امکان بھی تو ہے کہ اس سے پریشانی رفع ہو۔ افسوس کہ ایسے آرٹ کے لیے دنیا کے احوال اس وقت مساعد نہیں۔ روحانی فضا نہ ہو تو روح افزا آرٹ کیسے پیدا ہو۔ شربتِ روح افزا اس کے لیے کافی نہیں۔ کرب اور درد والی شاعری کے ساتھ ہمدردی والی شاعری بھی کیوں نہ ہوتی رہے! میرا جی اور راشد نے جدید انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر ایسی شاعری کی جس میں نہ کسی دوست کو یاد کیا نہ ارواحِ رفتگاں سے باتیں کیں۔ اپنے اندر گھٹ کر رہ گئے۔ ایسی بغاوت کی کہ دنیا کے کسی ملک کے اسلاف سے واسطہ نہ رکھا۔ عظیم انگریز شاعروں کے ہاں ایسی بات نہیں ہے۔ پاؤنڈ آزاد بلکہ باغی شاعر ہے لیکن اس کا روحانی مرشد کنفیوشس ہے۔ اس تعلق سے اس کے کلام میں روحداری آئی۔

مشرق اور مغرب کی تہذیبوں میں جو سطحیت اس وقت ہے۔ ظاہر بینی سے ہے۔ ٹیلی ویژن میں ایکٹنگ کرنے والے ستارے تو سب خوبرو ہیں ہی (ایک سے ایک بڑھ کر) لیکن ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے والے بھی اب خوبروئی کے لحاظ سے چنے جا رہے ہیں۔ جمالِ صوری کا یہ خبط تہذیب کو لے ڈوبا۔ جنت ساری ایک چہرے میں کیسے سمٹ آئے۔ اس کے لیے شاداب اور وسیع تخیل درکار ہے۔

آپ کا غزل چھوڑ کر نظم کی طرف آنا نیک فال ہے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ آپ چھوٹے بڑے مصرعوں والی آزاد نظم کہا کریں۔ ایسی نظم مجھے آپ کے مزاج کے موافق نہیں لگتی۔ آپ مساوی مصرعوں والی آزاد نظم کہا کریں۔ آپ مساوی مصرعوں والی نظم بہت سلیقے سے کہتی ہیں۔ بھائی بابر صاحب نے آپ کی ایک نظم جو مجھے چند ماہ قبل بھیجی۔ اس کو پڑھ کر میں نے ان کو فون کیا اور کہا سید عابد علی عابد کی یہ شاعرہ بیٹی نکھری طبیعت رکھتی ہے۔

غزل میں عاشقانہ مضمون لانا پڑتا ہے۔ شاعرہ پاکستان کی فضا میں ابھی بیبا کی سے غزل نہیں کہہ سکتی لیکن نظم میں محبت اور اُنس کے مضمون تو لا سکتی ہے۔

لاہور سے میرے ایک عزیز شاعر دوست سہیل صفدر صاحب مجھ سے ملنے یہاں فلوریڈا تشریف لائے۔ انہوں نے میری خلوت کا عالم دیکھ کر تعجب سے پوچھا، یہاں کن لوگوں سے آپ کے مراسم ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ ''ارواح سے'' میرا جواب سن کر نہایت محظوظ ہوئے۔

اللہ آپ کو خوش رکھے تاکہ آپ کے آیندہ مجموعے کا عنوان ہو ''معشوقوں کی ایسی تیسی'' فلورڈا میں تربوز بہت اچھا ملتا ہے۔ اس کا موسم آتا ہے تو میں خرید کر لاتا ہوں۔ اسے خوب ٹھنڈا کر کے کھاتا ہوں اور کہتا

KUTABKHANA OSMANIA

ہوں، غزل کے معشوق کی ایسی تیسی، تربوز ٹھیک چیز ہے۔

والسلام مع الاکرام

خیر طلب

داؤد رہبر

9 March, 1997

محترمہ بیگم رفعت مرتضٰی سلمہا!

السلام علیکم! آپ کے بھیجے ہوئے دونوں افسانے میں نے شوق سے پڑھے۔ آپ کے مشاہدہ کی باریک بینی ان سے ثابت ہے۔ ماشاءاللہ۔ مشاق لکھنے والے ہی ایسا لکھ سکتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں آپ نے کافی لکھا ہوگا جس سے ایسی پختگی آپ کے فن میں آئی۔

غالبؔ کے خطوط کا ترجمہ میں نے بھارت اور پاکستان کے ادیبوں کے لیے نہیں انگلستان، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے انگریزی بولنے اور پڑھنے والے باشندوں کے لیے کیا آپ نے یہ جاننا چاہا کہ اس کی پذیرائی کیسی ہوئی۔

انگریزی کے اہلِ زبان کے دو طبقے ایسے ہیں جن کو اس قسم کے ترجموں میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ایک تو یونیورسٹیوں کے وہ محققین ادب جو عالمی لٹریچر سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ اہلِ علم جنھوں نے یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھانے کے لیے اردو سیکھی ہے۔ ایسے لیکچرار اور پروفیسر یورپ، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں تیس چالیس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ تاہم ان کی اہمیت بہت ہے۔ انگلستان کے پروفیسر رالف رسل صاحب اور جرمنی کی پروفیسر این مری شمل معروف لوگ ہیں۔ یہ جب بھی ہندوستان یا پاکستان گئے، ان کے اعزاز میں جلسے ہوئے اور دعوتیں ہوئیں۔ اردو والے ان سے اردو میں بات کر کے خوش ہوئے۔ یہ دونوں یورپ کے کلچرل سفیر سمجھے گئے۔ سیاسی سفیروں سے کہیں زیادہ ان کی قدر ہوئی۔ ایسے سکالروں کا وجود ملکوں کے درمیان غنیمت ہے۔ دنیا کی مکدر سیاسی فضاؤں میں اگر بین الملل کچھ خلوص اور تپاک باقی ہے تو انہی کے دم سے ہے۔

سکالر لوگ ترجمے ہی نہیں کرتے، ڈکشنریاں تیار کرتے ہیں۔ گریمریں لکھتے ہیں۔ شرحیں لکھتے ہیں۔ تلمیحات سمجھاتے ہیں۔ سوانح عمریاں قلمبند کرتے ہیں۔ قلمی نسخے ڈھونڈ کر ان کے متن شایع کرنے کے لیے محنتیں کرتے ہیں۔ خطاطوں نے نقل کرنے میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ متن درست کر کے انہیں شایع کراتے ہیں۔

پچھلے دو سو برسوں میں یورپ اور امریکہ کے محققینِ علومِ شرقیہ نے عربی اور فارسی اور ترکی اور چینی اور جاپانی کی ہزاروں کلاسیکی تصنیفوں کو کتابت کی اغلاط درست کر کے شایع کیا۔ ان میں سے بہت سی کتابوں کے ترجمے انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں مشرقی فضلا کی سوانح عمریاں ان زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا تیار کیے گئے ہیں۔

کبھی موقع ملے تو واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس کا ایک چکر لگائیے۔ پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ سکالروں نے یہ کام نہ کیے ہوتے تو دنیا میں جہالت کا اندھیرا ہوتا، علم کی روشنی نہ ہوتی۔

دنیا کے کسی مشرقی ملک میں کوئی فتنہ سر اُٹھاتا ہے تو یورپ اور امریکہ کے چوکس اربابِ حکومت کو آناً فاناً اس ملک کی تاریخ سے متعارف ہونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت سکالر ہی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

سکالروں کی خدمات کی افادیت سیاست ہی میں نہیں، کلچرل سرگرمیوں میں بھی ہے اور ایک فایدہ اس کا خود سکالروں کو بھی ہے۔ وہ یہ کہ ایک بے ضرر علمی مشغولیت سے اس کا دل بہلا رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ بیکار بیٹھا مکھیاں مارا کرے یا کوچہ گردی کرتا رہے۔

میں میرزا غالبؔ کے خطوط کا انگریزی ترجمہ کرنے میں بارہ سال لگا رہا۔ بارہ سال اس لیے کہ پروفیسری کی بیشتر ذمہ داریاں تو پڑھانے کی تھیں۔ ان کے درمیان وقت نکال کر یہ کام بھی کرتا رہا۔ چھ سات ہزار گھنٹے اس کام میں صرف ہوئے۔ (اس ترجمے کا صرف نصف امریکہ میں چھپا جو میں نے آپ کو بھیجا۔ باقی ترجمہ غیر مطبوعہ حالت میں میرے پاس پڑا ہے۔ امید ہے کبھی اس کے شایع ہونے کی نوبت بھی آئے گی۔)

ان بارہ برسوں میں مجھے برابر یوں محسوس ہوا کہ میرزا غالبؔ کے گھر کے آنگن میں میرا آنا جانا بھی اسی طرح رہتا ہے جس طرح میر مہدی مجروحؔ اور مولانا حالیؔ کا رہتا تھا اور یہ کہ میرزا کے ارادت مندوں میں میرا بھی ایک خاص مقام ہے اور میرزا کی روح مجھے دعائیں دے رہی ہیں۔ سکالر کے اشغال کی اس افادیت کی طرف شاید آپ کا دھیان نہیں گیا۔

ایک انعام اس ترجمے پر یہ ملا کہ ۱۹۶۹ء میں جب میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی دلی میں منائی گئی تو مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مجھے جشنِ غالبؔ میں شریک ہونے کی دعوت سے نوازا۔ دلی جا کر میں نے گھنٹہ گھر والے حلوائیوں کی تیار کی ہوئی مٹھائی کھائی۔ پورا ہفتہ جشن کی تقریبوں میں اُردو کے ادب نوازوں سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دوسروں کے مقالے سنے۔ اپنا مقالہ جلسے میں پڑھا۔ میرزا کے مزار کے پہلو میں بیٹھ کر کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ واپس آ کر میں نے ایک غزل کہی۔ اس کا مطلع سنیے

محفلِ جاناں میں مجھ تک جام آئے گا ضرور

تربتِ غالبؔ کا بوسہ کام آئے گا ضرور

دیکھی آپ نے سکالروں کے کام کی برکت؟ آپ نے پوچھا۔ ”سکالروں کے کام کی افادیت کیا ہے؟“ بتائیے کہ میں آپ کو ان کے علمی کام کی افادیت کا قایل کر سکا یا نہیں؟ اور یہ بھی بتائیے کہ میں اپنے کام سے خوش لگتا ہوں یا بیزار۔

آپ نے یہ بھی سوچا۔ ”کیا غالبؔ کو ادھر کوئی جاننا چاہتا ہے؟“ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نہیں چاہتا تو یہ ہمارا کام ہے کہ ہم انہیں شوق دلائیں۔ شوق دلانے کا یہ کام میری طرح مشرقی ملکوں سے آئے ہوئے سینکڑوں پروفیسر کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کے قسمت آزماؤں نے یہاں ریستوراں کھول کر امریکنوں کو بریانی اور قورمہ کھانا سکھا دیا ہے۔ دیوانِ غالبؔ کے پڑھنے کا چسکا بھی سب کو نہیں تو چند نیک بختوں کو ہم لگا ہی دیں گے۔

میں نے عربی، فارسی اور اردو ادبیات پر انگلستان، کینیڈا اور امریکہ میں پینتیس سال لیکچر دیئے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی آبِ حیات پر لیکچر دیتے ہوئے مشاعروں کے قصے سنائے۔ مولوی نذیر احمد اور میرزا رسوا اور سرشار کے ناولوں کی باتیں بتائیں۔ طلبہ کی خوش وقتی کا سامان ہوا۔ یہ افادیت ہی تو ہے۔ امریکہ میں چند ہزار

KUTABKHANA OSMANIA

طلبہ کو پڑھا چکنے کے بعد یہاں کے معاشرہ سے بیگانگی کا احساس جاتا رہا۔ مہاجرت کو خوشگوار کرنا تدبیر چاہتا ہے۔

آپ نے لکھا ''کیا آپ اپنے کام سے خوش ہیں؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اپنے کام کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔''

اپنے کام کے متعلق اپنی رائے اس حساب سے بنتی ہے کہ کام کی داد کتنی ملی۔ شاباش کتنی، شاباش مجھے آپ جیسے اربابِ ذوق سے ملتی رہی۔ اس سے اپنے بارے میں کچھ حسنِ ظن پیدا ہو گیا۔ الحمدللہ۔

میں اپنے کام سے اچھی طرح خوش ہوں۔ میرے اعمال سے خدا خوش ہے یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ اپنی زندگی سے میں اتنا ہی خوش ہوں جتنا ایک حساس آدمی آج کی اندھیر نگری میں خوش ہو سکتا ہے۔

اُردو کے شاعر سہیل صفدر صاحب یہاں فلورڈا میں مجھ سے ملنے آئے۔ رخصت کے وقت انہوں نے پوچھا یہاں آپ کا میل جول کن لوگوں سے رہتا ہے۔ میں نے جواب دیا ''ارواح سے'' اس جواب سے وہ بہت محظوظ ہوئے۔

مورّخ مزاجی کی بدولت ارواح سے میرا رابطہ ہوا۔ میں سوانح عمریاں پڑھتا رہتا ہوں۔ ان کے مطالعہ سے حافظہ آباد رہتا ہے۔ معاصرین کے علاوہ گزشتہ نسلوں کے بزرگوں سے بھی تعلق رکھیں تو چہل پہل دُگنی ہو جاتی ہے۔ بزم بجی رہتی ہے، خلوت میں بھی۔

اپنی تہذیب کی داستان ہمیں مورّخوں کی تصانیف ہی میں ملتی ہے۔ افسانہ نگاری اپنی جگہ ہے، تاریخ نگاری اپنی جگہ۔ آپ نے اپنے خط میں اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ آپ کے پوتے، پوتیاں اُردو سے بے بہرہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک المیہ ہے لیکن اس سے بڑا المیہ ہوگا اگر وہ مولانا جلال الدین رومی، امیر خسرو، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، سرسید، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد حسین آزاد، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، مولوی ظفر علی خاں جیسے بزرگوں کے حالاتِ زندگی سے ناواقف رہیں گے۔

اپنی ایک اور کتاب آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں نے اپنے ہاں کی موسیقی کا ایک کورس بیس سال بوسٹن یونیورسٹی میں پڑھایا۔

آپ کو، مرتضیٰ صاحب کو اور فرزندوں کو دعائے صحت و عافیت۔

خیر طلب

داؤد رہبر

30 April, 1997

محترمہ بیگم رفعت مرتضیٰ سلمہا!

السلام علیکم! آپ کا خط ملا اور اس کے ساتھ تین کیسٹ ملے۔ بڑی مہربانی۔ بڑے غلام علی خاں مرحوم کی گلوکاری کی سب چیزیں میرے پاس پہلے سے ہیں۔ ہمرا گوہا کا گانا میں نے پہلے نہ سنا تھا۔ ان کی ہونہاری ثابت ہے۔ آگرہ گھرانے کے کسی استاد کی شاگرد معلوم ہوتی ہیں۔ چھاپ اس گھرانے کی خاص رانگی ہے۔

عابدہ پروین سے میری ملاقات لاہور میں گزشتہ نومبر میں ہوئی۔ میری بیوی کے چھوٹے برادر نے انہیں اور مجھے لنچ کی دعوت دی۔ دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔ بڑی صوفی آدمی ہیں۔ آنکھیں بند رکھ کر

مراقبے میں رہتی ہیں۔ دوسروں کی گفتگو سنتی ہیں، خود کچھ نہیں فرماتیں۔ لب کشائی ان کی نغمہ سرائی کے لیے ہی ہوتی ہے۔ لنچ کے دوران میں صرف ایک بار انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''میرے اُستاد سلامت علی خاں صاحب ہیں۔''

اب کے آپ نے خط میں یہ لکھ کر میری رائے کی ترجمانی ٹھیک نہیں کی:

''آیندہ نسلوں کا اُردو سے بے بہرہ ہو جانا ایک المیہ تو ہوگا مگر وہ علم اور ادب جو اس زبان کا ہے۔ وہ تراجم کی صورت میں محفوظ ہو جائے گا تو اگر اردو زبان بولنے والے اور سمجھنے والے نہ رہے تو یہ کوئی اتنا بڑا سانحہ نہیں ہوگا۔ یہی نا؟''

میرا پہلا خط غور سے پڑھیں، میں نے اس میں یہ ہرگز نہیں کہا کہ ساری دنیا میں آیندہ نسلیں اردو زبان سے بے بہرہ ہو جائیں گی۔ یہ بدقسمتی صرف ان پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کی ہوگی جو پاکستان اور ہندوستان چھوڑ کر مستقلاً یورپ اور امریکہ کو ہجرت کر آئے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان میں آیندہ نسلیں اُردو سے
ان شاء اللہ بہرہ مند رہیں گی۔ اُردو زندہ رہے گی،
اُردو زندہ باد

اُردو کے لیے میرے دل میں اتنا ہی درد ہے جتنا آپ کے دل میں ہے۔ میں نے انگلستان، کینیڈا اور امریکہ میں برسوں اُردو پڑھائی ہے۔ میرے دوستوں کو میرے خادمِ اُردو ہونے کا اعتراف ہے۔

بوسٹن میں میں نے بائیس سال گزارے۔ اس شہر کا ایک محلّہ چائنا ٹاؤن کہلاتا ہے۔ اس میں چین کے پرانے مہاجر بھی رہتے ہیں اور نئے مہاجر بھی۔ پرانے مہاجر بری بھلی انگریزی بول لیتے ہیں۔ ان کی اولادیں امریکی سکولوں میں تعلیم پا کر امریکی لہجے اور محاورے والی انگریزی فرفر بولتی ہیں۔ اس محلے میں بہت سے چینی بزرگ انگریزی نہیں پڑھ سکتے۔ ان کے لیے چینی زبان کا اخبار بوسٹن ہی سے نکلتا ہے۔ ان کی صحبت دوسرے چینی بزرگوں سے چینی زبان ہی میں رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس محلے میں بڑوں اور چھوٹوں کی دنیا میں یکساں نہیں۔ چینی بزرگ یہاں تمبا کو چباتے ہیں اور ان کی اولاد Chewing gum چباتی ہے۔

آپ نے Pearl Buck کا ناول Good Earth پڑھا ہوگا۔ بہت چشم کشا ناول ہے۔ یہ چین سے یہاں آئے ہوئے ایک مہاجر کنبے کی داستان ہے۔

چینی مہاجروں پر کیا منحصر ہے۔ سارا امریکہ مہاجروں ہی کی آبادی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ امریکہ کے ساٹھ فی صد شہری بیسویں صدی ہی میں یورپ سے مہاجر ہو کر یہاں آئے۔ اٹلی سے جو لوگ یہاں آئے۔ ان کی مادری زبان اطالوی تھی۔ ان کی آنے والی نسلیں اطالوی سے بے بہرہ ہو گئیں۔ فرانس سے جو لوگ یہاں آئے ان کی مادری زبان فرانسیسی تھی۔ ان کی اولادیں فرانسیسی سے بے بہرہ ہو گئیں۔ جرمنی سے جو لوگ یہاں آئے، ان کی مادری زبان جرمن تھی۔ ان کی اولادیں جرمنی سے بے بہرہ ہو گئیں۔ سپین سے جو لوگ آئے، ان کی اولادیں ہسپانوی سے، ہالینڈ سے آنے والوں کی اولادیں ولندیزی سے اور پرتگال سے آنے والوں کی اولادیں پرتگالی زبان سے بے بہرہ ہو گئیں۔

KUTABKHANA OSMANIA

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے جو لوگ یہاں آ رہے ہیں، ان کی آیندہ نسلیں اُردو سے بہرہ مند کیونکر رہیں گی۔

یورپ سے آنے والے مہاجر بزرگوں کے دل بھی اسی طرح دُکھے ہوں گے جیسے آپ کا اور میرا دل دُکھا ہے لیکن چارہ اس کے سوا کیا ہے کہ انسان کہے شکر ہے اللہ کا ہر حال میں۔

الحمد لله علی کل حال

اپنے دیس کی زبان کے خسارہ سے زیادہ رونا تو اس بات کا ہے کہ ہمارے دیس سے برکت جاتی رہی۔ سچ کہیے اگر وہاں برکت ہوتی تو ہم مہاجر ہو کر دھکے کیوں کھاتے!

ہمارے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں شمالی ہندوستان کے سب ہندو عربی رسم الخط میں اُردو پڑھتے تھے۔ اب بھارت میں حساب اُلٹا ہے۔ اسی بھارت میں اب ہندی (دیوناگری) سیکھے بغیر کوئی مسلمان سرکاری ملازمت میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان تغیرات پر میں بھی اُتنا ہی ملول ہوں جتنی آپ ہیں، خدا ہم سب کو حوصلہ دے۔

۱۲۔ اپریل کو بوسٹن میں میرے گانے کا ایک جلسہ ہوا۔ میرے ایک شاگرد نے اس کی فلم بنائی۔ اس فلم کی کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔

KUTABKHANA OSMANIA

آپ کی خوشحالی کا خواہاں

داؤد رہبر

22 December, 1995

بخدمت ایوب اولیاء صاحب!

برادرِ مکرم ایوب اولیا صاحب!

السلام علیکم! کئی ماہ پہلے آپ کی طرف سے ایک جلسے کا دعوت نامہ آیا تھا۔ یہ زمانہ بیوی کی تیمارداری میں گزرا۔ اب بھی اس کی صحت اچھی نہیں۔ اپریل میں اس کی عمر پینسٹھ ہو جائے گی اور امریکی قانون کی رو سے اس کے علاج کی سہولتیں حکومت کی طرف سے ہوں گی۔ ایک نرس ہفتے میں دو تین بار آیا کرے گی اور میرے اوقات میں جکڑ اتنی نہ رہے گی۔

آپ نے یاد کیا تو اگلے وقت یاد آئے۔ آپ کے گھر میں جو ساعتیں نصیب ہوئیں وہ زندگی کی غیر معمولی ساعتیں تھیں۔ میں ایسے گھر میں مدعو ہوا جس کی دیواروں میں خوش آیند آوازوں کی بازگشت جمع ہو گئی ہے۔ کاش کہ آپ کے خسر بزرگ ان دنوں لندن میں ہوتے۔ ان سے مل کر خوشی اور برکت دُگنی حاصل ہوتی۔ خوشی کی دُگن بھی طبلے کی دُگن پر منحصر ہے۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب کے ہاں جو شام گزری، وہ بھی خوب تھی۔ آپ کے شریک ہونے سے اس نشست میں سُرولی بات شامل رہی۔ یوسفی صاحب نے ساری گفتگو ٹیپ ریکارڈ کر لی تھی حتیٰ کہ ٹیپ ریکارڈر ٹیبل پر بھی لا رکھا۔ ٹیبل ٹاک ساری ریکارڈ ہو گئی۔ ایسا تجربہ زندگی میں صرف ایک بار ہوا۔

لندن سے الطاف گوہر صاحب میری تقریب کے ایک سال بعد رخصت ہو گئے۔ اُردو مرکز قائم نہ رہ

سکا۔ ضیاء محی الدین برمنگھم میں تھے تو ہر سال وہاں آنے کی دعوت دیتے تھے۔ ان کی رفیقہ ناہید صدیقی ان کو چھوڑ کر چلی گئی تو ضیاء کی طبیعت انگلستان سے اُچاٹ ہو گئی۔ سنٹرل ٹیلی ویژن سے مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک اور شادی کر لی۔ ۱۹۹۶ء میں میں اگر لاہور گیا تو وہاں ان سے ملوں گا۔

آپ کے شغل لندن میں کیسے ہیں۔ خاں صاحب لندن میں ہر سال کتنے مہینے گزارتے ہیں اور بمبئی اور دلی میں کتنے؟ آپ لاہور آتے جاتے ہیں یا نہیں؟

پنڈت شانتا پرشاد پچھلے سال چل بسے۔ اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے انہوں نے بنارس کی ایک سبھا میں جوگت توڑا بجایا، میرے ایک دوست نے اسے فلمایا۔ یہ فلم میں نے گزشتہ گرمیوں میں دیکھی۔ پنڈت جی کے کام میں بایاں بڑھ چڑھ کر بولتا تھا۔ ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اس پر ناچتی تھیں۔ ان کے بیٹوں میں کوئی ان کے ہنر کا قدرشناس نہ نکلا۔ بیٹے لااُبالی نکلے۔ باپ کی سی لگن اور تپسیا ان کو نصیب نہ ہوئی۔ ایک پوتا البتہ ان کا جس کی عمر اب شاید آٹھ سال ہے، نہایت ہونہار ہے۔ اس فلم میں دو چار منٹ اس کی طبلہ نوازی بھی شامل ہے۔ پنڈت جی کی توجہ آخری دنوں میں اسی کی تعلیم پر مرتکز تھی۔ اپنے بیٹوں کی نالائقی کا رونا روتے روتے بھگوان کو پیارے ہوئے۔

بوسٹن میں بائیس سال رہا۔ وہاں کی سردائیں ایسی سخت ہوتی ہیں کہ لندن کی سردیاں ان کے آگے کچھ بھی نہیں۔ ریٹائر ہوا تو فلورڈا کی سکونت اختیار کی۔ یہاں کی گرمیاں سخت گنی جاتی ہیں لیکن ہم لاہوریوں کے لیے ناگوار نہیں ہیں۔ ساحل کے پاس ہونے سے بیشتر وقت ہوا چلتی رہتی ہے اور دن کو درخت کے سائے میں فرحت حاصل ہوتی ہے۔ سردیوں کا موسم یہاں (نومبر تا اپریل) معتدل اور راحت بخش ہوتا ہے۔

ریٹائر ہو کر چار سال قلم چلایا۔ سب کچھ اُردو میں لکھا، چار کتابوں کی اشاعت پر لاہور کے ایک پبلشر کو آمادہ کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی جنوری میں ان شاء اللہ چھپ کر دستیاب ہو گی۔ اس میں میرے اُردو مکاتیب کا ایک انتخاب ہے۔ کتاب کا عنوان ہے "سلام و پیام"۔

محمود میرزا صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام محبت انہیں پہنچا دیں، ممنون ہوں گا۔

بیگم کو سلام، ان کی مہمان نوازی یاد آ رہی ہے۔ خدا کرے اگلے سال کے دوران میں آپ سے ملنا ہو سکے۔

خیر طلب

داؤد رہبر

5 May, 1998

سریلے دوست ایوب اولیاء صاحب!

السلام علیکم! اکثر جی میں کہتا ہوں ایوب صاحب سے ملاقات ہونی چاہیے۔ آج مئی کی پانچویں ہے، کل چھ مئی کو میری عمر بہتر ہو جائے گی۔ سالگرہ کی خوشیاں منائی جاتی ہیں لیکن ایک شاعر نے یہ بھی کہا ہے

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

Imrooz Traders,

33-C, The Mall, Lahore

لندن مجھے ایسے وقت آنا چاہیے جب خاں صاحب آپ کے پاس ہوں۔ ان سے گفتگو کی سعادت مجھے اب تک حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی ہتھیلی اور اُنگلیوں میں نور ہے۔ ان سے مصافحہ ہو تو مجھے بہت کی سرفرازی حاصل ہو۔

بیگم کو سلام۔

اُستادوں کا مرید

داؤد رہبر

26 February, 2000

برادرِ مکرم ایوب اولیاء صاحب!

السلام علیکم! پروردگار آپ کے خسرِ بزرگوار کی روح کو جنت کی سب نعمتوں سے بہرہ یاب فرمائے۔

ہر زمانے کی اپنی محفلیں ہوتی ہیں۔ بیسویں صدی ہماری صدی تھی۔ اس میں کیا کچھ نہیں ہوا مگر ہم تو انہی باتوں اور انہی لوگوں کو یاد کریں گے جن کا وجود ہماری اس صدی کی محفلوں کو گرما گیا

ع دیا کیسے کیسے لوگ!

اُستاد اللہ رکھا خاں صاحب مرحوم کا طبلہ بمبئی کے ریڈیو سٹیشن سے میں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء تک مسلسل سنا۔ گت توڑا بھی اور سنگت بھی۔ ان کی سنگت نے بڑے بڑے گائیکوں کی گلوکاری اور بڑے بڑے سازندوں کی کلاکاری کو سجایا۔ مرحوم کے کمال سے طبلہ نوازی کے فن کو بلند ترین مرتبہ حاصل ہوا۔ ان کی ملنسار طبیعت کے بھی شائقینِ موسیقی ثنا خواں ہوئے۔

ان کی خوش نصیبی میں یہ خوشی بھی شامل ہوئی کہ ذاکر کا سا قابل فرزند اُن کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہو کر ان کے فن کا سچا وارث ہوا اور اپنے عہدِ جوانی ہی میں اُستاد کہلایا۔ مجھ سے پوچھیں تو آپ کی قسمت بھی قابلِ رشک ہے کہ خاں صاحب مرحوم ایسے یگانۂ عصر اُستاد سے آپ کو قرابت کی سعادت حاصل ہوئی اور برسوں ان کی ہم نشینی سے آپ کی روح کو بالیدگی میسر رہی۔

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مرحوم کے احوالِ زندگی کی معلومات جمع کرنے کا تہیہ کریں اور ان کی بھرپور سوانح عمری لکھیں۔ ایسی سوانح عمری جو آپ کے دل کو حاصلِ زندگی لگے اور یادگار ہو کر ادب میں جگہ پائے۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ذاکر حسین صاحب سے مشورہ کریں۔

نائیکوں اور اُستادوں اور مرحوم کے شاگردوں اور اقربا نیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کارپردازوں سے پوچھ پوچھ کر قصے جمع کرنا لازم ہوگا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ سوانح عمری میں رس چھوٹی چھوٹی حکایات سے آتا ہے۔

اوّلاً آپ اپنی یاد کے سرمایہ کو محفوظ کریں اور یادداشتیں لکھنا شروع کر دیں تاکہ ایک مضمون کی شکل میں سوانح عمری کی تمہید قلمبند ہو جائے۔ یہ مضمون اعجاز بٹالوی کو بھیج دیں تو وہ اسے رسالہ ''علامت'' میں چھپوا دیں گے۔

خیال اور گت کے آخر میں تہائیاں لائی جاتی ہیں۔ زندگی کے آخر میں تہائیاں لانے کی سکت نہیں ہوتی۔ ایسے میں گانے کے قواعد بزرگانہ ہونے چاہئیں۔ تان آزمائیوں سے بچ کر گانے کا اسلوب اس عمر کے لیے مناسب ہے۔ خواجہ گھرانے کے اُستاد واحد حسین خاں کا گانا میں نے سنا۔ تانیں اس میں تھیں ہی نہیں۔ جھپ تال کی گائیکی۔ کچھ کچھ ڈھرپد والی بات لیکن سنگت سیدھے ٹھیکے والی، ان کا گانا مجھے نہایت پرتاثیر لگا۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ غالبی تال والا خط آپ کے نام تھا اور چھپ گیا غلطی سے محمود صاحب کا نام۔ مکاتیب کے چھاپے میں اور بہت سی اغلاط ہوئیں۔ ان کی فہرست میں نے بنائی ہے۔ اگر طبعِ ثانی ممکن ہوئی تصحیح کی جائے گی۔

ضیاء محی الدین کے گھر اب دو ہیں۔ ایک لاہور چھاؤنی میں اور ایک برمنگھم میں۔ ان کی بیوی کے کئی اعزہ بھارت میں ہیں۔ ان سے ملنے وہ اب ہر سال دلی اور لکھنؤ بھی جاتے رہتے ہیں۔ ان کی سیاحتوں کے ٹائم ٹیبل سے میں آگاہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب ان کو خط بھی کم ہی لکھتا ہوں۔ لاہور جاؤں تو ان سے ملوں۔

امیر خسرو سوسائٹی کی سرگرمی کا کچھ حال لکھیں۔ سال میں کتنی تقریبیں ہوتی ہیں۔ کون سے کلاکار رونق افروز ہوتے ہیں۔ لندن میں خاں صاحب کے شاگردوں میں ہونہار کون ہے؟ یہاں فلورڈا میں شمالی ہند کے سنگیت کا چرچا برائے نام ہے۔ کرناٹک سنگیت کے جلسے البتہ ہوتے رہتے ہیں۔ بوسٹن میں میرے گانے کا جلسہ پچھلے سال اپریل میں ہوا۔ وہیں امسال نومبر میں ہوگا۔

میں حیران ہوں کہ میرزا کی رباعی نزاعی کیونکر ہوئی۔ ہرگز اس میں کوئی جھول نہیں ہے۔ اس کی تقطیع ملاحظہ ہو:-

دُکھ جی کے پسن	دہو گیا ہے	غالب
مستفعلتن	مفاعلاتن	فعلن
دل رُک رُک کر بن	دہو گیا ہے	غالب
مفعولاتن	مفاعلاتن	فعلن
واللہ کہ شب	کو نیند آتی	ہی نہیں
مستفعلتن	مفاعلاتن	فعلن
سونا سوگن	دہو گیا ہے	غالب
مفعولاتن	مفاعلاتن	فعلن

میں نے تقطیع جس گردان کے حساب سے کی ہے، وہ حافظ محمود خاں شیرانی کی ایجاد ہے۔ رباعی کی تقطیع مروجہ گردان سے کام لے کر کریں تو پہلے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی:-

دُکھ جی کے	پسند ہو	گیا ہے غا	لب
مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فع

ضیاء محی الدین کا پتا لاہور میں ان کے بھانجے نوید ریاض کی معرفت ہے:-

C/o Naveed Riaz

دھرکٹ بجائی) دیکھیے پنجاب رنگ اور بنارس انگ کا فرق ایک جملے میں بتادیا گیا!

اس طرح کے قصے اور لطیفے جمع کیے جائیں تو سوانح عمری کی شکل اختیار کرے۔ اس باب میں ذاکر حسین صاحب کا حافظہ سب سے بڑا ماخذ ثابت ہوگا۔ وہ خود اب یگانۂ زمانہ اُستاد ہیں۔

(۳) اُستادانِ فن کے ساتھ مرحوم کے سلوک اور مراسم پر ایک باب ہونا چاہیے۔

(۴) اپنے خاندان کے بزرگوں سے اور اپنی برادری اور اپنے کنبے سے مرحوم کے تعلقات پر ایک باب تو بہر حال ہوگا۔

آپ نے خود خاں صاحب کے ارشادات برسوں سنے ہیں اور ان کی سیرت کو قریب سے دیکھا ہے۔ کتاب کا ایک خاکہ آپ کو سوجھے گا۔ میں نے اپنے وفورِ شوق کی رَو میں بہہ کر چند تجویزیں لکھ دیں۔

موسیقی پر میری جو کتاب دلی میں چھپی تھی، اس کا پاکستانی ایڈیشن پچھلے مہینے لاہور سے نکلا ہے۔ اس کے شروع میں اور اخیر میں جو اضافے میں نے کیے ہیں، ان کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔

آپ سے ملنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ دسمبر یا جنوری میں لاہور جانا ہوا تو اب کے راہ میں دو تین روز لندن میں ٹھہروں گا۔ محمود میرزا صاحب سے ملنے کیمبرج بھی جاؤں گا۔ ان کو میرا سلام۔

آپ نے کلنٹن صاحب کے خط کی کاپی مجھے بھیجی۔ میں سوچتا رہ گیا کلنٹن صاحب نے خاں صاحب کا طبلہ کبھی سامنے بیٹھ کر سنا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ان کا کوئی ریکارڈ سنا؟ اگر یہ بھی نہیں سنا تو آپ انہیں ایک ریکارڈ کیوں نہ بھیج دیں۔ کلنٹن کا تلفظ ایسا ہے جیسے گھنٹی بج رہی ہو۔

خورشید بیگم کو میرا سلام۔

مشتاقِ ملاقات

داؤد رہبر

6 March, 1996

بخدمت ڈاکٹر جمال قادری صاحب!

مکرمی، السلام علیکم! آپ کا خط ملا تو میں نے اپنی کتابوں میں عروض کے دو رسالوں کی تلاش شروع کی۔ میری آدھی کتابیں گھر میں ہیں۔ آدھی پبلک سٹور روم میں پڑی ہوئی ہیں۔ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ دونوں رسالے مل گئے۔ ان میں سے بہتر رسالہ گلزارِ عروض ہے جو عبدالباقی عباسی صاحب کی تصنیف ہے اور ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شایع ہوا۔

اس رسالے کے پہلے ۲۹ صفحے آپ کے کام کے نہیں ہیں، اس لیے کہ ان میں عربی شاعری کے اوزان سمجھائے گئے ہیں۔ صفحہ ۳۰ تا صفحہ ۶۰ کی فوٹو کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔

اُردو اور فارسی میں جو بحریں مستعمل ہیں، ان سب کی مثالیں آپ کو ان صفحات میں مل جائیں گی۔ بحروں کے جو لمبے لمبے نام ہیں، ان کو سمجھنے اور یاد کرنے کی کوشش آپ کے لیے بے سود ہوگی۔ میں نے ان ناموں (اصطلاحوں) کے گرد سرخ پنسل سے دائرہ کھینچ دیا ہے۔ یہ اصطلاحیں ان بزرگوں نے گھڑیں جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ فارسی میں استعمال ہونے والی ساری بحریں عربی بحروں سے نکلی ہیں۔ اس نظریہ سے مجھے ہرگز اتفاق نہیں۔

اگر میری گزارش سے آپ کے ارادے کو تقویت ہو تو ثواب مجھے بھی حاصل ہوگا۔

عزیزہ خورشید بیگم کو میرا سلام اور تعزیت کا پیغام۔ محمود میرزا صاحب کو بھی میرا سلام پہنچادیں۔

غمگسار

داؤد رہبر

12 April, 2001

محبی ایوب اولیاء صاحب!

السلام علیکم! میں آپ کو یاد کر ہی رہا تھا کہ آپ نے دعوت کا خط لکھ کر یاد کیا۔ بہت ممنون ہوں۔ کاش میں مرحوم کی ولادت کی برسی کے جلسے میں حاضر ہوسکتا۔ اس مہینے کے اخیر میں لاہور سے ایک عزیز آرہے ہیں۔ اس لیے میرا یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔

خاں صاحب مرحوم کی سوانح عمری کے ابواب کی ترتیب کچھ بھی ہو، اس میں ذیل کی باتیں آئیں تو کتاب سب کے لیے دلچسپ ہو:-

(۱) طبلے کا پنجاب گھرانہ اور اس کی شناخت فنی اصطلاحوں میں۔ اس پر روشنی ڈالنے والی گفتگوئیں آپ نے خود مرحوم سے سنی ہوں گی لیکن اہلِ فن سے آپ کی گفتگو اس باب کے لیے مفید ہوگی۔ اس باب میں طبلے کے دیگر گھرانوں کا تعارف بھی فنی اصطلاحات کے ذریعے ہونا چاہیے۔

(۲) خاں صاحب نے سنگیت سبھاؤں کے جو قصے آپ کو اور دیگر اعزہ کو اور اپنے شاگردوں کو سنائے، ان پر ایک باب مشتمل ہو۔ ایک قصہ مجھ تک بھی پہنچا۔ بمبئی میں استاد احمد جان تھرکوا کے گرو بھائی اُستاد امیر حسین خاں صاحب بھی رہتے تھے۔ بمبئی میں ان کے شاگرد بھی بہت تھے۔ ان کے ایک شاگرد پرمود نایک سے امریکہ میں میری صحبت رہی۔ اس نے ایک واقعہ مجھ سے بیان کیا جو ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ ہوا یعنی امیر حسین خاں صاحب اور آپ کے خسر بزرگوار و نامدار کے درمیان طبلے کا ایک دنگل، اس موقع پر پہلے اللہ رکھا خاں صاحب نے گت توڑا بجایا اور ایسا بجایا کہ سننے والوں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ سب دنگ رہ گئے۔ خاں صاحب بجاتے جارہے تھے اور دادر روپوں کے نوٹوں کی بارش بن کر موصول ہو رہی تھی۔ روپے کے نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ یہ زمانہ خاں صاحب کی جوانی کا تھا اور امیر حسین خاں صاحب ان کی نظر میں محترم بزرگ تھے۔ انہوں نے روپوں کے اس ڈھیر کا نذرانہ بنا کر امیر حسین خاں صاحب کے آگے رکھ دیا اور بزرگ کے پاؤں چھوئے۔ یہ قصہ مرحوم کے اخلاقِ حسنہ کی کیسی اچھی مثال ہے۔

امیر حسین خاں صاحب نے اس موقعے پر دانشمندی سے کام لیا۔ تھوڑی دیر انہوں نے بھی طبلہ بجایا لیکن صرف قاعدے بجائے۔ دھوم دھڑکے والا کام نہ کیا۔ سب نے ان کا کام آرام اور احترام سے سنا۔ یوں بھی امیر حسین خاں صاحب کا باج ہمیشہ نرم ہی ہوتا تھا۔

اُستاد اللہ رکھا مرحوم کی ایک بات ناہید صدیقی نے بھی مجھے سنائی تھی۔ وہ یہ کہ مرحوم نے ایک روز فرمایا: ''اسی ترکٹ وجائی تے فیر شانتا پرشاد نے دھرکٹ وجائی۔'' (ہم نے ترکٹ بجائی تو پھر شانتا پرشاد نے

KUTABKHANA OSMANIA

لاہور کے اورینٹل کالج میں منشی فاضل اور ادیب فاضل کی کلاسوں کو عروض کا کورس پڑھایا جاتا تھا۔ یہ کورس تین مہینوں کا ہوا کرتا تھا۔ معلوم نہیں اب بھی پڑھایا جاتا ہے یا نہیں۔

عروض کی اصطلاحیں (Terminology) ایسی پیچیدہ ہیں کہ خط کتابت کے ذریعے ان کا سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں۔ تین مہینوں کے کورس کا خلاصہ دو چار خطوں میں کیسے لکھا جائے۔

طبلے کی تالوں کی طرح اوزانِ شعر بھی آواز کے کھیل ہیں۔ ان کی بحث کے لیے آمنا سامنا ضروری ہے۔ فوٹو کاپی میں چالیس سے زیادہ اشعار آپ کی نظر کے سامنے ہوں گے۔ یقیناً آپ ان اشعار کی بحروں سے پہلے ہی سے مانوس ہوں گے۔ ہر بحر میں ایک غزل کہہ کر دیکھیے۔ مشق بھی ہوگی اور تفریح بھی۔

آپ کی غزل میں نے شوق سے پڑھی۔ ماشاء اللہ آپ طبیعت دار آدمی ہیں۔ آپ کی غزل میں تصنع نہیں ہے۔ خلوص ہے اور سادگی ہے۔ کہتے رہیے۔ زندگی میں رنگ رس انہی مشاغل سے ہے۔

شادمان رہیے اور کامران رہیے۔

خیر طلب

داؤد رہبر

31 July, 1997

بخدمت بیگم عابدہ احمد صاحبہ!

سرپرست فنون وادب ذات المجد بیگم صاحبہ!

السلام علیکم! میری خوش قسمتی نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ اس دور دراز مقام پر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ادبیات اور فنونِ لطیفہ سے آپ کے شغف کو سب جانتے ہیں۔ آپ سے ہمکلام ہو کر اس شغف کی گہرائی معلوم ہوئی۔

کاشکہ ثمینہ بی بی کے برکت کدے میں ایک نشست راگ رنگ کی ہوتی اور میں راگوں میں اپنی بنائی ہوئی بندشیں آپ کو سنا سکتا۔ آیندہ جب آپ تشریف لائیں گی تو محفل قرار پائے گی، ان شاء اللہ

آغا ناصر سے آپ کی قرابت داری معلوم ہوئی۔ ان کے چھوٹے برادر آغا اشرف علی میرے عزیز ترین ہمجولی تھے۔ اب ریٹائرڈ ہیں اور کشمیر چھوڑ کر یہاں آن بسے ہیں۔

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے دو بیٹے آغا ناصر کے ماموں زاد بھائی سید جلال کی بیٹیوں سے بیاہے ہوئے ہیں۔

دسمبر کے جشنِ غالب کی کمیٹی سے میری گزارش ہے کہ اگر مجھ سے مقالہ پڑھوانا منظور ہوا تو مجھے بتادیا جائے کہ مقالہ انگریزی میں ہو یا اردو میں۔ موضوع مجھے یہ سوجھا ہے:۔

میرزا غالب کا کلچر تقابلی تناظر میں

The Culture of Mirza Ghalib

in Comparative Perspective.

میرزا کے کلچر اور انگریزی کے بعض شاعروں کے کلچر کا فرق (جیسے میری سمجھ میں آیا ہے) اس مقالے

KUTABKHANA OSMANIA

میں بیان کروں گا۔

میرا موروثی میدان تو عربی اور فارسی ادبیات کا پڑھنا پڑھانا ہے لیکن موسیقی سے میرا لگاؤ بھی عمر بھر کا ہے۔ میں نے بوسٹن یونیورسٹی میں دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ ایک کورس ہندوستانی سنگیت کا بیس برس پڑھایا اور بوسٹن میں سنگیت کا چرچا جاری رکھا۔

میرے پاس گھریلو بیٹھکوں اور پبلک جلسوں میں اپنی گائی ہوئی چیزوں کے بہت سے ٹیپ ہیں۔ آپ کی خوشی کے لیے میں نے چند چیزیں چن کر دو ٹیپ تیار کیے۔ وہ بھی میرے اس عریضے کے ساتھ ملفوف ہیں۔

سنگت کے لیے بہترین سازندے امریکہ میں مجھے کم ہی نصیب ہوئے۔ تاہم جو کچھ میسر آیا، اس سے اپنا شوق پورا کیا۔ سنگیت سے متعلق اپنی ایک تصنیف بھی بھیج رہا ہوں۔ یہ مکتبہ جامعہ ملیہ (دہلی) نے شایع کی۔

حسب ہدایت اپنی تعلیم اور ملازمتوں کی روداد آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ امید ہے یہ خط آپ کو واپسی کی پرواز سے پانچ چھ روز قبل مل جائے گا۔

میرے حق میں دعائے خیر فرمایا کریں۔

والسلام مع الاحترام

نیاز مند

داؤد رہبر

16 march, 1994

بخدمت جناب مظفر-اے-غفار صاحب!

پرستار تہذیب محترمی مظفر غفار صاحب!

السلام علیکم! آپ کا ۸ فروری کا لکھا ہوا کرمنامہ مجھے ۲۲ فروری کو ملا۔ ممنون ہوں۔

شاکر علی میوزیم والی نشست خوب تھی۔ آپ نے پنجابی میں باتیں کرنے کی فرمائش کر کے اسے تکلف سے آزاد کر دیا۔ میں لاہور صرف چار روز کے لیے آیا تھا۔ اتنے لمبے ہوائی سفر کے بعد دو دن تو ہوش آنے میں لگ جاتے ہیں۔ گانے کے دونوں جلسے حواس باختگی کے حال میں ہوئے۔ گانا بجانا ہاگڑ کا کام نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سنجیدہ اور وضعدارانہ گانا میں آگرہ سٹائل میں گاتا ہوں۔ آگرہ کا گانا اکیلے ایک گویّے کا کام نہیں۔ اس کے پیچھے کم سے کم ایک ساتھی یا شاگرد آس دینے (سر بھرنے) کو لازم ہوتا ہے۔ (دھرپد اور قوالی کے لوازم بھی ایسے ہی ہیں) پھر خیال فرمائیے کہ اُستاد سلامت علی خاں کا رنگ بھی تبھی جمتا ہے جب ایک جگل بند شاگرد ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں نیویارک کے ایک جلسے میں انہوں نے تنہا گایا۔ سننے والوں نے خاں صاحب سے کہا، پچھلے سال آپ نے یہاں اپنے بیٹوں کو آواز لگانے میں شریک کیا تھا تو رنگ جما تھا۔ اب کے آپ کسی کو ساتھ نہیں لائے تو وہ سی بات نہیں۔ اُستاد نے اس کمی پر مجبوری اور افسوس کا اظہار کیا۔

لاہور کے دونو جلسوں میں اس کمی کا مجھے بے حد احساس رہا لیکن کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔

آپ کی خواہش سر آنکھوں پر۔ فلوریڈا میں تین سال خلوت کے گزار چکا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے واپس بوسٹن چلا جاؤں جہاں بائیس سال نوکری کی اور کئی احباب سے مراسم پیدا ہوئے۔ ۱۹۹۴ء میں پہلے تو یہ

انتظام درپیش ہے۔ بوسٹن جا کر جم جاؤں تو پھر لمبی پرواز کے لیے اپنے پر پھیلاؤں۔ جب کوئی صورت نظر آئی تو دو تین مہینے پہلے قبل آپ کو اطلاع لکھ بھیجوں گا۔

آپ میرے دو پرانے مضمون اپنی کتاب میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ میری اجازت کی ضرورت ہرگز نہ تھی، شوق سے شامل کیجیے۔

گانے والے گھرانہ دار بھی ہوتے ہیں اور عطائی بھی۔ سننے والے بالعموم نہ گھرانہ دار ہوتے ہیں نہ عطائی۔ سننے والوں کے دو طبقے ہیں۔ جانکار اور انجان۔ میرا خیال ہے انجانوں کی تھوڑی بہت تعلیم کا اہتمام ہونا چاہیے تاکہ جلسوں میں وہ ہکا بکا اور بھونچکا ہو کر نہ بیٹھیں۔ اس پر کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ میاں کو قوالی زیادہ پسند ہے۔ حمد اور نعت کے مضمون اسی میں ہوتے ہیں۔

یاد فرمانے کا شکریہ۔ اللہ آپ کی بزم کی رونق دگنی اور چوگنی کرے۔

والسلام

نیاز مند

داؤد رہبر

18 December, 1995

محترم جناب خالد اقبال یاسر صاحب!

السلام علیکم! ''ادبیات'' کے وزنی شمارہ کا پارسل پچھلے دنوں موصول ہوا۔ بے حد ممنون ہوں۔ شبنم شکیل صاحبہ کی کتاب ''اضطراب'' کا تبصرہ اس شمارے میں دیکھ کر تسلی ہوئی۔

ایک تجویز ذہن میں آئی۔ آپ اس پر غور فرمائیں تو شاید آپ کو اچھی لگے۔ اردو کی ادبیات عالیہ کی بہت سی چیزیں اب نایاب ہیں۔ ایسے نایاب آثارِ قلم پھر سے چھپنے چاہئیں۔ مجلسِ ترقیِ ادب (لاہور) نے کئی ان میں سے چھاپ کر احسان کیا ہے لیکن ایک ہی ادارہ پر اس کام کی ساری ذمہ داری ڈال دینا ٹھیک نہیں۔

انجمن ترقی اردو کے باوقعت رسالہ ''اردو'' کے بعض شماروں میں بعض نایاب (مختصر) کلاسیکی چیزیں شامل کی گئیں۔ اس رسالہ کی ساری فائل دیکھی جائے تو یہ دکھائی دیں گی۔ ایک مثال یاد آ رہی ہے۔ دیوانِ شاہ قاسم اورنگ آبادی، مرتبہ ڈاکٹر سخاوت میرزا صاحب، دو قسطوں میں یہ پورا چھپ گیا۔ چھپ کر اس کے ۲۴۶ صفحے ہوئے۔

دبستانِ لکھنو کے چار بڑے شاعر اسیر، امیر، منیر اور جلال ہیں۔ یہ چاروں رامپور میں میرزا داغ کے ہم بزم تھے۔ سب سخن شناسوں نے انہیں استاد مانا ہے تو پھر ان کے دیوان دستیاب کیوں نہیں ہیں۔

''ادبیات'' کا جو نمبر آیا ہے، ایک ہزار سے زیادہ صفحات کا ہے۔ اگر آئندہ شمارے بھی اتنی ہی ضخامت کے ہوں گے تو گنجایش کا فایدہ کیوں نہ اُٹھایا جائے اور بڑے اُستادوں کے نایاب دیوان قسط وار ''ادبیات'' میں شامل کیوں نہ کیے جائیں۔ سو صفحے ہر شمارے کے اس مد کے لیے ریزرو کر دیے جائیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور جناب مشفق خواجہ صاحب اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب سے مشورہ کریں۔ اس طرح کی خدمت لاہور کے اورینٹل کالج میگزین نے بھی کی ہے۔ ضخیم

KUTABKHANA OSMANIA

اورینٹل کالج میگزین میں ضخیم کتابوں کے ابواب قسط وار بنا کر چھاپے گئے ہیں۔

نیا سال مبارک ہو۔

خیر طلب

داؤد رہبر

ایک اور بات یاد آئی۔ میرے مضمون ''بشنو از قلم'' کے اعزازی معاوضہ (سات سو روپے) کا چیک کئی مہینوں سے میرے پاس پڑا ہے (مورخہ ۱۳۔اپریل ۱۹۹۵ء) عرض یہ ہے کہ مجھے پاکستان کے کسی بینک میں حساب کھلوانے کی خواہش نہیں۔ چیک واپس آپ کو بھیج رہا ہوں، مہربانی فرما کر آپ یہ رقم میری طرف سے انجمن ترقی اُردو کو بطور نذرانہ پیش کر دیجیے۔

تازہ شمارہ میں محترمہ شبنم شکیل صاحبہ کی کتاب ''اضطراب'' پر میرا تبصرہ چھپا ہے۔ اس کا اعزازی معاوضہ اگر جزوِ حساب ہے تو اس کا چیک بھی انجمن ہی کے نام کا بنوا کر کراچی بھجوا دیجیے اور آیندہ میرے کوئی مضمون ''ادبیات'' کی ادارت قبول کرے تو ان کی رقوم بھی انجمن ہی کو دے دی جائے۔ اس اقدام کے لیے اکادمیٔ ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل یا اکادمی کے کسی دیگر عہدیدار کی منظوری لازم ہو تو میری گزارش انہیں پہنچا کر ان کی تائید حاصل کر لیجیے۔ میں بے حد ممنون ہوں گا۔

والسلام مع الاکرام

بندہ

داؤد رہبر

2 May, 1995

دوستدار اور زندہ دل پروفیسر منظور الٰہی صاحب!

السلام علیکم! آپ بلاریب ''بی بے'' آدمی ہیں۔ آپ نے خط جی لگا کر لکھا، اتنے انکسار کی کیا ضرورت تھی۔ بابا نانک علیہ الرحمتہ پکار اٹھے۔ ''نہ کوئی ہندو نہ کوئی مسلمان'' آج کل یہ نعرہ درکار ہے ''نہ کوئی چھوٹا، نہ کوئی بڑا۔'' آپ نے برسوں علم کی کھیتی کی آبیاری کی ہے۔ آپ کے شاگرد آپ پر جان چھڑکتے ہیں۔ آپ کو یاد کرنے والے سعادت مند سینکڑوں ہوں گے۔ دراصل اُستاد اور مرشدِ رُوحانی چچا ہوتے ہیں۔ وہابی زور لگاتے رہیں، پیری مریدی جاری رہے گی، تصوف زندہ رہے گا۔

دیال سنگھ کالج کا ایک لطیفہ سنیے۔ پطرس بخاری سے ایک نوجوان کی گفتگو یوں شروع ہوئی۔ ''تم کہاں تعلیم پا رہے ہو؟'' نوجوان بولا ''دیال سنگھ کالج میں۔'' بخاری صاحب بولے۔ ''اچھا!!! لیٹر بکس والا کالج!!'' اس کالج کے گیٹ کے پاس جو سرخ لیٹر بکس ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں نے اپنی نظم میں عین اسی طرح لکھا تھا جیسے آپ نے تجویز کیا ہے یعنی:-

کیسے خستہ تھے یہ بسکٹ
دیکھو اب یہ سیلے سیلے ہیں

سین کے نیچے دو نو جگہ جو کسرہ تھی، اس کو ایڈیٹر صاحب نے زیر کی بجائے ''رے'' سمجھا اور جی میں کہا

"رسیلے رسیلے" سے تو وزن ہی غلط ہے۔ بدل کر میلے میلے کر دیا، وزن تو ٹھیک رہا مگر لطف جاتا رہا۔

اس نظم میں اور اس کے ساتھ والی نظموں میں طباعت کی اور غلطیاں بھی نظر آئیں۔ ان کی فہرست میں نے سید امجد الطاف صاحب کو بھیجی۔ اس گزارش کے ساتھ کہ تصحیح کے لیے ایک نوٹ آئندہ شمارہ میں چھاپ دیں۔ اس فہرست کی فوٹو کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ "علامت" میں یہ نوٹ درج نہ کیا گیا۔

"بشنو از قلم" میں متعدد ایسی اغلاط ہیں کہ معنی غت ربود ہو گئے ہیں۔ مثلاً ایک عبارت یوں چھپی ہے:-

> راشٹرپتی بھون میں عصرانہ ہوا۔ چند منٹ ذاکر صاحب کے برابر ایک کاؤچ پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ ملتے ہی آپ نے پوچھا "آپ خوش ہیں؟" میں نے جواب دیا۔
> "اس زمانے میں ایک حساس آدمی جتنا خوش ہو سکتا ہے اتنا ہی خوش ہوں۔"
> ان کو یہ جواب دیتے ہوئے میں ان کے چہرے کی غمگینی دیکھ رہا تھا۔ ان دنوں مرحوم بہت مضمحل تھے۔ قلب ان کا کمزور تھا۔ ہفتہ بھر میں جتنی بار وہ مجمع کے درمیان تشریف فرما ہوئے۔ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے مہمان اور اربابِ وطن ان کے چہرے کی اداسی سے متاثر نظر آرہے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے مجھ سے پوچھا۔
> "آپ خوش ہیں؟" تو میرا جی چاہا کہ کہوں "آپ خوش ہیں؟"

اس عبارت کا آخری جملہ دراصل یوں تھا۔ "آپ خوش ہیں؟" چھاپے میں بدل کر یوں ہو گیا۔ "آپ خوش نہیں؟" عبارت بے معنی ہو کر رہ گئی۔

"نیا دور" والی نگارش ("کلچر کے روحانی پہلو") کی طباعت میں جو اغلاط ہیں، ان کی فہرست بھی بھیج رہا ہوں۔ دیکھ لیجیے۔ کمپوزنگ کی ہڑبونگ اور نیلا گنبد کی ٹریفک ایک ہی چیز ہیں۔

میں ستمبر ۱۹۹۱ء میں پینسٹھ کا ہو کر ریٹائر ہوا۔ امریکہ میں اب بیشتر پروفیسر ستر کے ہو کر ریٹائر ہوتے ہیں۔ میں چاہتا تو پانچ برس اور نوکری کیے جاتا۔ ضمیر نے کہا، اب سب کام چھوڑ کر اُردو کی خدمت کرنی چاہیے۔

رسالہ "اردو" کے دو شماروں (مارچ ۱۹۹۳ء اور مارچ ۱۹۹۵ء) میں میرا ایک بسیط مضمون میرزا داغ کے ذکرِ خیر والا چھپا ہے۔ یونیورسٹی لائبریری میں ضرور یہ رسالہ آپ کو مل جائے گا۔ فرصت ہو تو ملاحظہ فرمائیے۔ یاد فرمائی کا شکریہ، دعائے خیر۔

بندہ

داؤد رہبر

15 September, 1997

بخدمت خورشید غیاث و خالد غیاث!

عزیزان کامران و سعادت مند خورشید اور خالد!

آغو جی کے انتقال کی اطلاع آپ کے خط سے ملی۔ اللہ انہیں جنت کے آرام عطا فرمائے۔ بڑی شان سے زندگی گزار گئے۔ اگر تین سال اور جیتے تو ان کی عمر پوری بیسویں صدی کی زندگی کہلائی جا سکتی۔

میری خوش بختی ہے کہ پچھلے سال ان کی خدمت میں حاضر ہو سکا اور کچھ گفتگو ان سے ہوئی۔

اس سال لاہور آنے کی صورت نظر نہیں آرہی۔ ممکن ہے اگلے سال چند روز کے لیے آؤں۔ اُس وقت قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے حاضری دوں گا۔

یہ خط اماں کو اور عابدہ کو پڑھوا دیجیے اور میرا دست بستہ سلام دونوں کو پہنچے۔

تمہارا غمگسار بھائی

داؤد

31 January, 1999

عزیزانِ من خالد اور خورشید!

سلامت باشید، لاہور کی زیارت دو سال پہلے ہوئی۔ آپ کے آباد گھر میں تین چار دن گزارے وہاں آغا جان اور آپ کی اماں سے باتیں کرنا نصیب ہوا۔ کاش کہ صبیحہ بھی ساتھ ہوتی اور اس سعادت میں شریک ہوتی۔

دو سال کے اندر خاندان کے دونو بزرگوں نے رحلت کی اور ان کا سایۂ شفقت جاتا رہا۔ دونو ستھری اور بابرکت زندگی گزار گئے۔ اپنے فرائض ادا کر گئے۔ اللہ مغفرت کرے۔

کسی اتوار کو فون کروں گا۔ کچھ خبریں دوں گا اور کچھ اطلاعات حاصل کروں گا۔

تمہارا بھائی

داؤد رہبر

27 October, 1993

برادرم محمد ایوب کے نام!

پیارے ایوب، السلام علیکم!

تمہارا دو حرفی استفہامیہ خط بڑی مدت سے جواب کا طالب ہے۔ معافی چاہتا ہوں، تم نے پوچھا۔ "خیریت؟" اس کا رسمی جواب ہوگا۔ "شکر، الحمدللہ" مومن سے یہی توقع رکھی جاتی ہے کہ کہے الحمدللہ علی کل حال۔ لیکن مومن دنیا میں کمیاب ہوتے جا رہے ہیں اور میری کہانی تو سب جانتے ہیں۔ میں کہاں کا مومن ہوں، مومن وہ ہوتے ہیں جو آندھی طوفانوں اور زلزلہ کے مشتاق رہتے ہیں۔ مصایب سے گھبرا جانے والے ناشکرے کہلاتے ہیں۔ اسی لیے میں اپنی مشکلات کا تذکرہ زبان پر نہیں لاتا۔

بھائی اسحاق کے انتقال کی خبر سے مجھے شدید صدمہ ہوا بلکہ چکر آئے۔ اوپر تلے بھائی حمید اور بھائی اسحاق گزر گئے۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کے انتقال نے عاقبت سامنے لا کھڑی کی۔ جتنے دن باقی ہیں ماوراء کے خیال میں گزریں گے۔

افسوس زندگی نے بھائیوں کو یکجا نہ رہنے دیا۔ کئی برس بھائی اسحاق ہمارے ہاں نہ آ سکے۔ نہ میں ان کے ہاں جا سکا۔ دکھ سکھ کی باتیں نہ ہو سکیں۔ میری بدنامی درمیان رہی۔ میری "بے راہروی" کی شکایت انہوں نے دوسروں سے کی۔ رشتہ داروں میں میں "غیبت" کا مضمون ہو کر رہ گیا۔ شکوک اور قیاسات متحرک رہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ بھی مہاجر، میں بھی مہاجر، ساری برادری کے قریب ہونے سے تعلقات میں جو توازن وطن میں ممکن تھا۔ یہاں

KUTABKHANA OSMANIA

کیسے قایم ہوتا! خیر، اب اللہ رحم رکھے، انسان بے بس ہے۔ خدا نے چاہا تو میں دسمبر کے آغاز میں ایک ہفتہ کے لیے لاہور آؤں گا۔ ۲ دسمبر کو الحمراء ہال میں میرا ایک لیکچر ہوگا۔ اس کی تفصیل تم کو بوبی سے معلوم ہوگی۔ اپنی مجبوریوں کے باعث میں فلورڈا سے ایک ہفتہ سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ کیا ملاقات کے لیے تمہارا لاہور آنا ممکن ہوگا؟ چھائی سے تو انشاءاللہ امریکہ میں ملنا ہوگا۔ تم سے ملنا تو پاکستان ہی میں ہو سکے گا۔ الا یہ کہ تم امریکہ آنے کی نیت باندھو۔

یہ خط چھائی کو دکھا دو، راحت اور سیمیں کو دُعا، چھائی کو پیار۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو میں نے اپنی ایک اور تصنیف بھیجی تھی۔ انہوں نے اس کی رسید بھی نہیں بھیجی۔ ان کو فون کر کے "یاددہانی کے لیے" میرا اسلام پہنچا دو۔

کراچی سے ایک رسالہ "نیا دور" نکلتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اس سال اس کا ایک شمارۂ خاص نکلا ہے جس میں میری کتاب "کلچر کے روحانی عناصر" کے سارے باب انہوں نے یکجا چھاپ دیئے ہیں۔ طبیعت مایل ہو تو اسے لے کر پڑھو۔

گم آدمی

24 June, 1997

پیارے ایوب' چھام!

اپریل کے آخر میں تمہارا خط ملا۔ جواب لکھنے میں بہت سستی ہوئی، معافی دی جائے۔

بوسٹن میں گانے کا جلسہ اچھا ہی رہا۔ ایک مرہٹہ وہاں کی ایک یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر ہے۔ اس نے طبلے پر سنگت کی، سنگت بری نہ تھی۔ ہارمونیم پر سنگت ایک دوسرے مرہٹے نے کی، یہ بھی فزکس کا پروفیسر ہے۔ راگ کی اچھی سمجھ رکھتا ہے لیکن سنگت میں گانے کا تعاقب وفاداری سے نہیں کرتا یعنی گائی ہوئی بات دُہرانے کی بجائے اپنی سوچ سے برجستہ کچھ بجا دیتا ہے۔ راگ کے اندر رہتا ہے لیکن سنگت کے حساب سے سنگت نہیں کرتا۔ بہرحال یہ ساتھی غنیمت ہیں۔

ایک گھرانہ خورجہ کا بھی ہے (خورجہ علی گڑھ کے قریب ایک قصبہ ہے) اس گھرانے کے گویّے بڑی نفاست سے گاتے ہیں لیکن تانیں نہیں مارتے۔ سکون اور آرام کے ساتھ گاتے ہیں۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ تانوں کے بغیر گایا کروں۔ اکہتر برس کی عمر کا آدمی تانیں مارتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔

اس سال زیارتِ وطن کے امکان کم ہیں، کچھ کام درپیش ہیں جنہیں ٹال نہیں سکتا۔ ۱۹۹۸ء میں ممکن ہے آؤں۔

راحت اور سیمیں کو دُعا۔ فون پر تم سے باتیں ہوں گی اور مزاج پرسی کی جائے گی۔

ہم جماعت

داؤد

بخدمت تنویر قیصر شاہد صاحب!

خیر خواہِ من تنویر صاحب!

السلام علیکم! میں اپنے ایک عزیز کی دعوت قبول کر کے ٹورانٹو چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو آپ کا خط

پڑھا۔ افسوس ہے کہ آپ کو جواب کا انتظار کرنا پڑا۔

اردو کے قارئین میری تحریروں کی جو تعریف کرتے ہیں وہ تعریف درحقیقت ان بزرگوں کا حق ہے جن کا دلکش اندازِ گفتگو مجھ پر اثر انداز ہوا۔

گزشتہ پچاس برس میں نے وطن سے باہر گزارے۔ یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی اور عربی کی کلاسیکی ادبیات پڑھانے کا کام کیا۔ یہ پہلی خوش بختی ہے، بے وطنی نے دل کو دردمند کیا، یہ دوسری خوش بختی ہے۔

خالد احمد صاحب کا حسن ظن میرے بارے میں حد کو پہنچا ہوا ہے۔ آپ بخیریت لاہور پہنچ کر انہیں میرا اسلام محبت پہنچا دیجیے گا۔ خدا کرے میرا یہ خط آپ کی روانگی سے پہلے نیویارک پہنچ جائے۔

آپ کا شکریہ اور اللہ کا شکر

بندہ

داؤد رہبر

2 October, 1998

سنگیت بیٹھک کے ساتھی قیوم صاحب!

السلام علیکم! آپ نے پرانی ہم نشینی کی یاد تازہ کی۔ اچھے وقتوں کی یاد ہی سے آج کی خرابیوں کا تدارک ہے۔ لائلپور میں آپ کے گھر آنا اور وہاں گانا بجانا مجھے خوب یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ ایوب سے آپ کی دوستی حبیب بینک میں رفاقت کار سے تھی اور اس کے والد کی دوستی آپ کی ستار سے تھی۔ ۱۹۵۱ء کی گرمیاں میں نے لائلپور میں گزاری تھیں۔ میرے خسر آغا غیاث الدین احمد مرحوم زراعتی کالج میں پروفیسر تھے۔ انہی کے گھر میں میرا قیام تھا۔

میں ۱۹۹۶ء کے آخر میں کراچی آیا تھا، وہاں جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اپنے گھر میں ایک شام تیس چالیس احباب کو مدعو فرما کر انہیں میرا گانا سنوایا۔ سنگت کے لیے حمید نسیم صاحب ریڈیو پاکستان کے سازندے لے کر آئے تھے۔ ایوب بھی وہاں موجود تھا۔ کاش کہ آپ بھی آتے اور ہم مل کر اگلا زمانہ یاد کرتے۔

ہمارے اسلاف آج سے پچاس ہزار سال قبل نرے جانگلو تھے، اللہ مغفرت کرے۔ تہذیب کی آمد ہزاروں سال بعد ہوئی۔ اس کے آنے سے نفاستیں آئیں اور روحانی بلندیوں کے مظاہرے ہوئے اور ساتھ ساتھ فوج کشی اور مار دھاڑ بھی مسلسل رہی۔ ہمیں جو زمانہ ملا ہے اس میں درختوں کا جنگل کم اور تجارتی کاروبار کا جنگل زیادہ ہے۔ اللہ میاں اب غالباً اپنے بندوں سے حمد کی بجائے شایستہ فریاد سننا چاہتے ہیں۔ اچھی فریاد یا غزل میں ہوتی ہے یا گیت میں۔

اور کیا لکھوں، ملاقات ہو تو پھر چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے آپ سے باتیں ہوں۔

ایوب کو فون کر کے میرا اسلام کہیں۔

یادی (بروزن فریادی)

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

16 November, 1999

مکرمی محب عارفی صاحب!

آپ کا نوازش نامہ پڑھ کر اور آپ کے شغفِ تحقیق کو معلوم کر کے خوشی ہوئی۔ آپ نے یہ نہ بتایا کہ آپ نے زندگی کس کاروبار میں گزاری؟ تجارت میں یا دانشگاہی ملازمت میں یا گورنمنٹ کے کسی محکمے میں؟

سائنس کی کرامات پہلے بھی کم نہ تھیں اور اب تو حد ہو گئی ہے۔ میں نے ایک نظم کہی تھی جو یوں شروع ہوتی ہے:-

یہ دنیا بدل ہی گئی
خدا کی بنائی ہوئی اب یہ لگتی نہیں

لندن یا نیو یارک کے ہوائی اڈوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو وہاں کے منظر آفریدگار کے بنائے ہوئے نہیں لگتے۔ تحت الشعور میں یہ احساس بسا ہوا ہے کہ دائیں بائیں جو کچھ ہے، سب انسان کا بنایا ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں سائنس کی نارسائیوں کا مضمون نئی نسلوں کے ذہن نشین نہیں ہوتا۔ سائنس کے جدید ترین معجزات کی ایسی دھوم ہے کہ کالجوں کے طلبہ نبیوں کے معجزات کو بھولے ہوئے ہیں۔ بعض خیر طلب اور نیک نیت اکابرِ سائنس نے سائنس کی نارسائی کے جو اعتراف لکھے ہیں، ان کا اثر نئی ذہنیتوں پر کچھ ایسا قابلِ لحاظ نہیں۔ ساری دنیا میں آدمی کی جے کا آوازہ بلند ہے۔ اللہ اکبر کا نعرہ خلوص کے ساتھ صرف مساکین لگاتے ہیں۔ بیشتر تعلیم یافتگان اس نعرہ زنی میں شریک تو ہو جاتے ہیں لیکن بغیر خلوص کے۔

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے دنیا کے مذاہب چھ ہیں: ہندومت، زرتشتیت، یہودیت، بدھ مت، عیسائیت اور اسلام۔ تعجب ہے کہ چین کے دو بڑے مذہبوں کو آپ نے قابلِ ذکر نہیں سمجھا یعنی تاؤمت اور مذہب کنفیوشس۔ ہر چند چین میں اشتراکیت کا غلبہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہاں کی موجودہ تہذیب پر ان دو قدیم مذہبوں کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ وہاں اشتراکیت کو شکست ہوئی تو لامحالہ ان دو مذہبوں کا احیاء زور شور سے ہوگا۔ چین آئندہ باقی دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہے گا اور وہاں کی تہذیب باہر کی آبادیوں پر اثر انداز ہو کر رہے گی۔

مذہب کے معاملے میں اشتراکیت کے دور سے پہلے چین میں جو رواداری دو ہزار برس رہی، بہت بڑا سبق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چین میں آسمان بابا اور مادرِ گیتی (مادرِ فطرت) دونو کے اوراد و اذکار دلوں میں اور زبانوں پر رہے۔ کائناتی نیچر کا جیسا احترام تاؤمت نے سکھایا اور کسی مذہب نے نہیں سکھایا۔ ادیانِ ابراہیمی کی دعوت تسخیرِ فطرت کی دعوت ہے۔

چین کے مذہبوں کی اساسی کتابیں تاؤ تے چنگ اور ملفوظاتِ کنفیوشس ہیں۔ تاؤ تے چنگ میں تاؤ (مادرِ فطرت) کی تسبیح اور فطری حسنِ اخلاق کا سبق ہے اور ملفوظاتِ کنفیوشس میں شائستگی کا۔ ہمیں اپنی گلستاں بوستان پر ناز ہے تو اہلِ چین کو اپنی دو کتابوں پر۔

مادرِ گیتی کے اذکار ہندومت میں بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہندومت میں مادرِ گیتی شفیقہ بھی ہے اور ساحرہ اور شاطرہ بھی۔ چین کے تاؤمت میں مادرِ گیتی سراسر مہربان ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

مذاہب عالم میں "ادیان ابراہیمی" (یہودیت، مسیحیت اور اسلام) باقی سارے مذاہب سے الگ شان رکھتے ہیں۔ ان میں جذبے کی بے پناہ شدت ہے۔ باہر والوں کی رائے ہے کہ ان میں مادرِ گیتی یا کسی اور مہادیوی کی پرستش کے شامل نہ ہونے کے باعث نرمی کم اور گرمی زیادہ ہے اور ان تین ملتوں کی آپس کی دائمی مخاصمت اسی گرمی کی وجہ سے ہے۔ یہ بات غور طلب ہے۔

رومن کیتھولک مسیحیوں میں حضرت مریم علیہا السلام سے دعا کرنا تو عام ہے لیکن ان کو الوہیت کا درجہ نہیں دیا گیا۔

"مذہب اور سائنس" کی بحث کا سلسلہ تو دو صدیوں سے جاری ہے۔ اس سوال پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا خلاصہ آپ نے اپنے مقالے میں لکھ دیا ہوگا۔

مجھے آپ کا دوسرا سوال زیادہ اہم لگا:-

"مذاہب کے بانیوں کی دستیاب سوانح عمریوں اور ان مذاہب کے اساسی، الہامی صحیفوں کے دستیاب مندرجات مستند مغربی مورخوں کی تحقیقات کے مطابق تاریخی اعتبار سے کتنے معتبر یا غیر معتبر ہیں؟"

آپ نے فرمائش کی ہے کہ میں اس بارے میں انگریزی کتابوں کے حوالوں کے علاوہ ان کتابوں کے متعلقہ اقتباسات بھی بھیجوں۔ قبلہ ایسی فرمائش کی تعمیل مہینے ڈیڑھ مہینے کی دوڑ دھوپ چاہتی ہے۔ اقتباسات کا مجموعہ چند صفحوں کا ہوا تو مفید مطلب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ لکھنے والوں نے دلایل اور شواہد کو مختصراً نہیں استقصاء کے ساتھ پیش کیا ہے۔

انگریزی میں دو انسائیکلوپیڈیا ہیں جن کے سارے مقالہ نگار مانے ہوئے ماہرین ہیں۔ ان کے انڈکسوں پر آپ نظر ڈالیں تو اپنے کام کے مقالے آپ کو ان میں مل جائیں گے:-

1. Encyclopaedia Britannica
2. Encyclopaedia of Religion and Ethics. Edited by Prof. M. Eliade

پروفیسر ایلیاڈا کی تصنیف Myth and Reality بڑی خیال افروز کتاب ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صحیفوں کی معنویت نئی روشنی میں کس طرح دیکھی جا رہی ہے۔ متداول اصول تحقیق کی یہ کتاب صحیح نمایندگی کرتی ہے۔

ادیان شناسی کے یہودی اور مسیحی محقق بائبل کو اپنی کتابِ مقدس جانتے ہوئے بھی بلا خوف کہہ دیں گے کہ تخلیقِ آدم و حوا اور روزِ محشر کے بیان جو بائبل میں ہیں اساطیر (Mythology) ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ یہ محققین بائبل کے ان بیانات کو من گھڑت خرافات سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک وجدان اور الہام سے حاصل یہ کہانیاں تاریخی داستانوں سے بڑھ کر پر معنی ہیں۔ یہ ہمارے وجدان کو چھیڑتی ہیں اور اسرارِ غیب پر سوچ کی دعوت دیتی ہیں اور ہمیں جو کچھ بھاتی ہیں، اس سے یک گونہ تشفی حاصل ہوتی ہے اور احوالِ قلبی رنگ پکڑتے ہیں۔

بائبل، رگ وید اور قرآن مجید میں اسرارِ غیب پر سے پردہ اٹھانے کے لیے جو کہانیاں ہیں، مسیحی اور

یہودی محققین کے عندیے میں سب یکساں اساطیر ہیں۔کوئی صحیفہ ان کی نظر میں اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔شعلۂ طور، ولادتِ مسیح، معراجِ مسیح کے قصے ان کے نزدیک اسی طرح اساطیر ہیں جس طرح وشنو کے اوتاروں کے قصے۔

ان یورپین محققین کی نگارشات کے زیرِ اثر ہندومت اور بدھ مت کے پیرو اپنی ہی مقدس کہانیوں کو Mythology جاننے میں اب کوئی برائی نہیں سمجھتے۔اسلامی دنیا میں ابھی ایسا نہیں ہے۔آفرینش اور معاد کے بارے میں جو آیاتِ مصحف ہیں، انہیں Mythology کہنا مسلمانوں کے ہاں ممنوع ہے۔

ہائم (HAIM) کی انگریزی، فارسی لغت میں اور احمد واحد کی انگریزی ترکی لغت میں Mythology کے معنی یوں درج ہیں: اساطیر، خرافات، افسانہ، اسمٰعیل مظہر کی انگریزی۔عربی لغت میں اس کے معنی خرافات اور اساطیر لکھے ہیں۔

ڈکشنریوں کے ان اندراجات سے ظاہر ہے کہ اپنے ہاں کے الہامی قصص کو اساطیر کہہ دینے کی جو آمادگی ساری دنیا کے غیر مسلم علماء کے ہاں پائی جاتی ہے، مسلمان علماء کے ہاں نہیں ہے۔مسلمان علماء سے اگر کوئی باہر والا کہے کہ تم بھی اپنے ہاں کے الہامی قصوں کو اساطیر کہو تو اس کے جواب میں مسلمان علماء کہیں گے۔ **نعوذ بالله من ذلک**

ان امور میں یورپین محققین کا جو اندازِ تحقیق ہے، وہ آپ کو بخوبی Encylopaedia Britannica کے ان مقالوں سے معلوم ہو جائے گا:۔

Bible, Avesta, Quran, Rig Ved قرآن کے ہجے اس انسائیکلوپیڈیا میں Koran ہیں۔ان چاروں مقالوں میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ کتابِ مقدس کے متن کی جمع آوری اور تدوین کن منزلوں سے گزری اور متن بلآخر حتمی اور سربمہر ہوا تو کس شکل میں۔

جس زمرۂ محققین سے یہ مقالہ نگار تعلق رکھتے ہیں، ان کی سمجھ یوں کام کرتی ہے کہ تدوین کے سلسلے میں اگر تھوڑے بہت ردّ و بدل ہوئے تو کیا ہوا۔بڑی بات تو یہ ہے کہ کتابِ مقدس مدون ہو چکی تو روحانیت، برکات اور تہذیب کا سرچشمہ ہو کر میسر رہی۔

انسائیکلوپیڈیا کے ان چار مقالوں کی فوٹو کاپی اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔اگر فوٹو کاپی صاف پڑھی نہ جا سکے تو کراچی کی کسی لائبریری میں بیٹھ کر انسائیکلوپیڈیا کی جلدوں سے رجوع فرمائیے۔

والسلام مع الاکرام

بندہ

داؤد رہبر

22 December, 2000

عزیزی اُویس صادق ملک صاحب!

السلام علیکم! آپ کے اُستاد پروفیسر اورنگزیب صاحب سے میری ملاقات بہت مختصر ہوئی۔یہ میرے

بھی مہربان ہیں۔اپنے دوست اعجاز حسین بٹالوی صاحب سے میں نے ان کی تعریف سنی۔پھر لاہور آؤں تو پروفیسر صاحب کی ملائم صحبت سے لطف اُٹھاؤں۔

آپ میرے مکاتیب کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے یعنی آپ کی زبان تعریف کرتے ہوئے گیلی بلکہ رسیلی ہو گئی، ضرور اُس وقت آپ کے منہ میں پان ہو گا۔

شیخ سعدی کی گلستاں پڑھنے سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا اسلوبِ نگارش اس کے اندازِ گفتگو کا پتہ دیتا ہے۔میں نے اپنی ایک غزل میں کہا تھا ع

کہتے رہنے سے کہنا آتا ہے

یہ بھی کہنا چاہیے کہ

سنتے رہنے سے کہنا آتا ہے

ستار کے اُستاد جمال الدین صاحب ایک روز مجھ سے کہہ رہے تھے "ہمارے والد صاحب ہمیں راگوں کے سرگموں کی گردانیں یاد کرایا کرتے تھے اور ہم ان سرگموں کو ستار پر بجانے کی مشق کیا کرتے تھے اور والد صاحب یہ بھی فرمایا کرتے تھے، صرف سرگمیں ہی نہ سیکھو، جتنا بھی ہو سکے اُستادوں کا بہترین گانا بجانا بھی کان لگا کر سنا کرو۔ ان کی آوازیں حافظ نشین ہوں گی تو پھر ان کی لطافتیں تمہاری انگلیوں میں آئیں گی۔"

یہ بات تحریر اور تقریر پر بھی صادق آتی ہے۔شیریں سخن لوگوں کی گفتگو بھی نغمہ ہوتی ہے۔اس کے سُر حافظے میں سما جائیں تو پھر قلم بھی مضراب بن کر سر نکالے گا۔

میں نے نثر کا کوئی اسلوب ایجاد نہیں کیا۔یہ سراسر ان خوش گفتار بزرگوں کے تکلم کی بازگشت ہے جن کے پاس بیٹھنا مجھے نصیب ہوا۔

میری کتاب "سریلی باتیں" ۱۹۸۷ء میں دلی سے شائع ہوئی تھی۔لاہور کے مکتبۂ سنگِ میل سے دریافت کریں کہ اس کا پاکستانی ایڈیشن کب بازار میں آئے گا۔

پروفیسر صاحب کو میرا سلام۔آپ کی زندگی میں برکت رہے۔

خیر طلب

داؤد رہبر

18 December, 2000

جنابِ جوہر میر صاحب!

السلام علیکم! آپ کا نوازش نامہ ملا اور "زاویہ" کی بسم اللہ والا شمارہ بھی جو نہایت دیدہ زیب ہے۔ رسالے کا اجراء مبارک ہو۔حلقۂ اربابِ ذوق سے اس کا رشتہ اس کی حیثیت کا ضامن ہے۔

آپ نے موسیقی سے متعلق مضمون کی فرمائش کی ہے۔میں سوچ میں پڑا ہوں، اپنے دیس کی کلاسیکی سنگیت کی باتیں لکھوں یا لوک گیتوں کی یا قوالی کی یا سمفنی آرکسٹرا کی یا جیز کی یا پاپولر گلوکاری اور گٹار نوازی کی۔ شرقِ اوسط اور شمالی افریقہ کے مغنیوں اور سازندوں کی یا لاطینی گانے بجانے کی۔ خالی گپ شپ لکھوں یا اصطلاحی تفہیم کی صورت سے لکھوں۔

KUTABKHANA OSMANIA

موسیقی کے قواعد پر اب یورپ اور امریکہ میں جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ان میں تفہیم قواعد کے ساتھ ساتھ صفحوں پر صفحے نوٹیشن سے بھرے ہوتے ہیں۔ مصنف ایک اصول بیان کرتا ہے۔ پھر گلوکاری یا ساز نوازی کے لیے نوٹیشن مہیا فرماتا ہے اور بعض کتابیں جو سکولوں اور میوزک کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے موسیقی کے نصابوں میں داخل ہیں۔ان کی معاونت کے لیے کیسٹ ریکارڈوں کے سیٹ بھی ملتے ہیں۔

نوٹیشن کو اہلِ مغرب کے پڑھے لکھے بچے اسی آسانی سے پڑھ کر گا بجا سکتے ہیں جس آسانی سے ہمارے دیس کے بچے سکول کے تیسرے چوتھے درجے پر پہنچ کر نظم کے مصرعے ٹھیک پڑھ سکتے ہیں اور انہیں وزن سے گرنے نہیں دیتے۔نوٹیشن کی یہ تعلیم مغربی ملکوں میں دو تعلیم گاہوں میں ہوتی ہے۔ پرائمری سکول اور گرجے (یا یہودی عبادت گاہیں) میری دونو بیٹیوں نے نوٹیشن پڑھ کر گانا بجانا امریکہ کے پرائمری سکولوں ہی میں سیکھا۔ایسے درس کے لیے پرائمری سکول کا زمانہ ہی بہترین ہوتا ہے۔اس عمر میں بچے نوٹیشن اور اوزانِ شعر اسی سہولت سے سیکھ لیتے ہیں جس سہولت سے گھڑسواری، بائیسکل سواری اور پیراکی سیکھ لی جاتی ہے۔

نوٹیشن کے طریقے ہمارے ہاں بھی موجود ہیں جنھیں اصطلاح میں سرگم کہتے ہیں (سرگم کا لفظ سارے گاما کا مخفف ہے) ہمارے سکولوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل ان سے شناسائی نہیں رکھتے۔

اب اگر میں کہوں کہ راگ بہاگ کی ایک خوبصورت گت مدت ہوئی میں نے ستار پر سنی۔اس کی استھائی یوں شروع ہوتی ہے:-

ساسا ساسانی ساما گاما پاپا* پاگاما/گاگا اور موٹے حرفوں میں لکھے ہوئے گا پر اس کا سم ہے اور سوائے نی کے سارے سر دھ سپتک کے اس میں لگے اور نی کے نیچے ڈیش اس لیے لگی ہے کہ یہ سر مندر سپتک سے ہے۔

تو بتائیے قارئین کے پلے کیا پڑا! مراد یہ کہ موسیقی کی تفہیم کے لیے تحریر کے ساتھ آواز بھی لازم ہے جو سامنے بیٹھا ہوا اُستاد لگائے گا یا پھر آواز ٹیپ ریکارڈر سے آئے گی۔ کاغذ کی تحریر تو چپ ہوتی ہے، اس سے آواز نہیں آ رہی ہوتی۔

اُستاد فیاض خاں مرحوم ایک راگ گا کر سامعین کو وجد میں لا رہے تھے۔ایک ہندو نایک اپنے گھٹنوں پر شاستر لیے بیٹھا تھا۔ٹوک کر بولا، غلط گا رہے ہو۔شاستر میں یہ راگ یوں نہیں لکھا۔خاں صاحب نے کہا، ذرا شاستر مجھے دینا۔شاستر اس کے ہاتھ سے لے کر پہلے اپنے دائیں کان سے لگایا، پھر بائیں کان سے اور فرمایا ”مجھے تو شاستر سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔“

اپنے تجربات پر مبنی چند باتیں عرض کرتا ہوں:- راگ گن کلی جاپان کی موسیقی میں بھی مستعمل ہے اور بہت مقبول ہے۔سری راگ چین کی موسیقی میں بھی ہے اور اس ملک کا مقبول ترین راگ ہے۔راگ الیہ بلاول بلمپت تال ہی میں مزا دیتا ہے۔راگ بھیم پلاسی مدھ لے کی جھپ تال میں مزا دیتا ہے۔درت لے میں اسے گاتے تو ہیں لیکن درت میں اس کی روحداری ختم ہو جاتی ہے۔یہی بات راگ جونپوری اور راگ ابھوگی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ٹھمری سارے راگوں میں نہیں گائی جاتی۔اس کے خاص راگ یہ ہیں: کالنگڑا، جوگیا، بھیرویں، پیلو، کھماج، پرج، تلک کامود، کافی اور بس' چھایانٹ اور دیسی ٹوڈی سنگارس کے راگ ہیں۔راگ درباری مردانہ راگ ہے۔راگ مالکوس زنانہ، درباری کا مزاج فاتحانہ اور پرشکوہ ہے۔راگ شاہانہ کا عیاشانہ اور راگ سوہا کا قلندرانہ۔

راگ مارو بہاگ کو آگرہ گھرانے کے اُستاد نہیں گاتے۔

اپنے ان مشاہدات کا میں مزا لے رہا ہوں لیکن بتائیے قارئین کے پلے کیا پڑا۔ الا ماشاءاللہ، اپنے دیس کی کلاسیکی موسیقی کے بنیادی اصولوں سے انٹرنس پاس اور گریجوایٹ لوگوں کے ہاں بے خبری بہت بڑی محرومی ہے بلکہ قسمت کی شومی ہے۔اس پر آہ بھر کر یہی کہا جائے گا۔”قوم بے سُری ہے۔“

طبلے اور ہارمونیم کی سنگت کا ٹھیک انتظام فرمائیے۔پھر بندہ نیویارک آ کر گائے گا اور راگ سرائی کی بنیادی باتیں سمجھائے گا، خالی باتوں سے کیا ہوتا ہے!

والسلام
سپاس گزار
داؤد رہبر

12 August, 2001

مکرمی جوہر میر صاحب!

السلام علیکم! ”زاویہ“ کے چار شمارے موصول ہوئے، بے حد ممنون ہوں۔

ایک مضمون اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔سارا مضمون ایک ہی شمارے میں یکجا چھپ جانا چاہیے تا کہ ایک ہی نشست میں پوری بات پڑھنے والے کے سامنے آ جائے۔موضوع اس نگارش کا نازک ہے۔

اس مضمون کی کمپوزنگ اور پروف خوانی میں بڑی احتیاط لازم ہے، اس لیے کہ اس میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کے اقتباس ہیں اور تصوف کی اصطلاحیں بھی ہیں۔

اُمید ہے نیویارک میں کسی روز آپ سے ملاقات ہوگی۔

والسلام مع الاکرام

بندہ
داؤد رہبر

میں نے لفافے پر جو پتہ لکھا ہے اس میں آپ کے اسم مبارک کے ہجے اپنے قیاس سے فرض کر لیے ہیں۔اگر یہ درست نہیں ہیں تو صحیح ہجوں سے آگاہ فرمائیں۔

10 April, 2001

مکرمی اعجاز قمر صاحب!

السلام علیکم! میڈی سن کے دو سالہ قیام کے ایام بڑی چہل پہل کے دن تھے۔اس یونیورسٹی کے طلبہ اور پروفیسر مزے میں ہیں کہ جھیلوں والے سبزہ زار میں گرمیاں گزارتے ہیں۔

ہم پاکستانیوں نے وہاں کیسے کیسے جلسے برپا کیے۔ ضیافتوں کا کیسا دور چلا اور خوب گانا بجانا ہوا۔امان صاحب بڑے زندہ دل دوست تھے۔میلہ لگانے میں پیش پیش رہتے تھے۔یہ پینتیس سال پرانی باتیں ہیں۔امان صاحب ہمارے رُخصت ہونے کے بعد جلد ہی وفات پا گئے۔اس سے میڈی سن کی کشش میرے لیے ویسی نہ

KUTABKHANA OSMANIA

10 September, 2001

بخدمت سجاد حیدر نسیم صاحب!

بھائی نسیم صاحب!

السلام علیکم! پچھلے سال میں آپ کے برکت والے گھر میں حاضر ہوا تھا۔ آپ نے اور صفو مرحومہ نے کمال محبت سے مجھے خوش آمدید کہا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۷۵ء میں ثریا کے گھر میں چند روز میرا قیام رہا۔ اتفاق سے صفو بھی وہاں آ کر ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ یادیں مجھے عزیز ہیں۔ ان کے علاوہ جو یادیں ہیں، رانکین روڈ والے گھر کی ہیں اور ان سے بھی پہلے کی یادیں لائلپور کی ہیں۔ جب میرا اور صفو دونو کا بچپن تھا۔ میری عمر اس وقت پانچ تھی اور صفو کی بھی پانچ ہی تھی۔

ہمارے ابا جی ہماری تائی جی کی فرشتہ خصلت سے متاثر ہو کر کہا کرتے تھے، جب اس کی رحلت ہو گی، یہ سیدھی جنت کو جائے گی۔ صفو کی وفات کی خبر سن کر میں نے اپنے جی میں کہا، ہماری یہ بہن بھی سیدھی جنت کو گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے اور آپ کی تندرستی قائم رکھے۔

آپ کا عزادار بھائی

داؤد

29 December, 2000

کرم فرما کرنل انور احمد صاحب!

السلام علیکم! عنایت نامہ ملا۔ بہت ممنون ہوں۔ آپ مجھے اپنی بستی میں مدعو فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں، مہربانی۔ یہ دعوت گرمیوں ہی میں ٹھیک رہے گی۔ مجھے آپ سے اور آپ کے احباب سے ملنے کا اشتیاق ہے۔

سائنس کے مکڑے نے جو جال پھیلایا ہے، میں اب تک اس سے بچا ہوا ہوں۔ عبوری زمانے میں میری طرح کے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں۔ اب بتائیے اگر میں نے ای میل کی تہذیب اپنائی ہوتی تو ''سلام و پیام'' کا مجموعہ کیسے حاصل ہوتا۔ اس مجموعہ کے چھپنے کے بعد گزشتہ پانچ برسوں میں میری مکتوب نویسی مسلسل رہی۔ ''سلام و پیام'' کی جلد دوم کے لیے مسودہ تیار ہے۔

نامہ نگار کا لفظ اب اخباروں کے خبر نویسوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اخباری دنیا کے نامہ نگار تو اب سینکڑوں ہیں، دوستوں کو خط لکھنے والے (مکتوب نگار) اب کم ہی رہ گئے ہیں۔

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے ''تعجب ہے، آپ نے ابھی تک کم کیوں لکھا ہے؟'' ایک زمانے میں، میں پطرس بخاری کے بارے میں یہی سوال اُٹھایا کرتا تھا اور دوسروں کو بھی میں نے کہتے سنا۔ ''پطرس نے عمرِ عزیز کو رائیگاں کیا، بہت کم لکھا۔'' اب سوچتا ہوں کہ انہوں نے اتنا ہی لکھا جتنے کی ان میں سکت تھی۔ اگر یہ اردو میں چار پانچ کتابیں اور لکھ ڈالتے تو کون سا ناشر تھا جو انہیں جھولیاں بھر کر رائلٹی دیتا اور مالا مال کر دیتا۔ اردو کے سب مصنفوں کو یہ مشکل درپیش ہے۔

پطرس گفتار کے بادشاہ تھے۔ وہ محفلیں گرما گئے، یہی کیا کم ہے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہوتے

رہی اور پھر وہاں جانے کا قصد نہ کیا۔

مدت ہوئی اسمٰعیل شریف صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ ممکن ہے اب وہ بھی ریٹائرڈ ہو چکے ہوں۔ ارسلان صاحب ماشاء اللہ اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہو کر ریٹائرڈ ہوئے۔ پچھلے سال امریکہ آئے تھے، انہوں نے امریکہ ہی کے کسی شہر سے مجھے فون کیا تھا۔ صدیقی صاحب بھی آپ کو یاد ہوں گے۔ انہوں نے بھی کینیڈا کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایلبرٹا کے شہر ایڈمنٹن سے مدت ہوئی ان کا خط آیا تھا۔

شکر ہے دوا آپ کو راس آئی اور آپ صحت یاب ہو کر اب آرام کی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی اولاد کی خوشحالی اور کامیابیوں سے مطمئن ہیں۔ ہماری بڑی بیٹی سمیرہ بوسٹن میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا ایک بیٹا اب لاء سکول میں تعلیم پا رہا ہے۔ چھوٹا ہائی سکول سے فارغ ہو کر واشنگٹن میں کالج شروع کر رہا ہے۔ ہمارا داماد امریکی ہے، بوسٹن یونیورسٹی میں یہ میرا شاگرد تھا۔

ہماری چھوٹی بیٹی انیسہ کی شادی نہیں ہوئی۔ یہ ایک ٹیلی فون کمپنی میں ملازم ہے اور ہمارے پاس ہی رہتی ہے۔

میں گاہے گاہے دوستوں سے ملنے مانٹریال اور اَوٹوا جاتا ہوں۔ آیندہ جانا ہوا تو ٹورانٹو بھی پہنچوں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا۔

آپ کی ثقافتی سرگرمیوں کی خبر سے جی خوش ہوا۔ آپ کا اعزاز آپ کو مبارک ہو، اعجاز کو اعزاز ملا تو قافیہ بھی ملا۔

بیگم صاحبہ کو میرا سلام۔

آپ کا خیر خواہ

داؤد رہبر

23 March, 2001

گرامی ڈاکٹر اعجاز قریشی صاحب و بیگم فوزیہ قریشی صاحبہ!

السلام علیکم! کل صبح میری بہن سارہ حمید نے ٹیلی فون کر کے ایک سانحہ عظیم کی خبر سنائی۔ اپنی بہن کی آواز گلوگیر سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے دل میں اس سانحہ کا غم کتنا گہرا ہے۔ آپ کا فرزند دلبند میری بہن کے نواسوں کا پیارا دوست تھا۔ خود جنت کو سدھارا اور ساتھیوں کو داغ جدائی دے گیا۔

برقی قمقموں کی روشنی اُس اندھیرے کو دُور کیسے کرے جو اس چراغ کے گل ہونے سے آپ کے گھر پر چھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے عزیزوں کو اور مرحوم کے دوستوں کو اس بھاری صدمے کے اُٹھانے کی طاقت عطا فرمائے اور مرحوم کو تا ابدالاباد اپنے جوارِ رحمت میں رکھے۔

انا للہ و انا الیہ راجعونo

شریکِ ماتم

داؤد رہبر

ہوئے بھی وہ فیض اور تاثیر اور صوفی تبسم کے ہمراہ راتوں کو آوارہ گردی کیا کرتے تھے۔ اس کی کوئی گہری وجہ ہوگی۔

"پراگندہ طبع لوگ" کو پڑھ کر آپ نے فرض کرلیا ہوگا کہ بندہ افسانہ نگار بھی ہے۔ افسانہ نگاری میرا فن نہیں ہے۔ میرا مزاج مورخانہ ہے اور مورخانہ تصنیفوں کے لیے ریسرچ ضروری ہے اور ریسرچ وقت چاہتی ہے۔

مورّخ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو معلومات کو جمع اور مرتب کر کے پیش کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو مفکرانہ مزاج رکھتے ہیں، فرد اور معاشرے کی نفسیات پر غور کر کے قلم اُٹھاتے ہیں۔ یہ کام جلد بازی کا نہیں، مرغی اپنے انڈے پر اکیس روز بیٹھتی ہے تب چوزہ اندر سے انڈے کو کھٹک کر برآمد ہوتا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ چوزہ اکیس دنوں میں نہیں دس ہی دنوں میں انڈا کھٹک دے تو فطرت اس خواہش پر ہنسے گی۔

تصنیف کا مزا تب ہوتا ہے جب خیال میں جدت اور تازگی ہو۔ اپنی سوچ میں مجھے تازگی مطلوب ہے۔ کلچر کے روحانی عناصر کے شایع ہونے کے بعد مزید سوچ اور مطالعہ نے مجھے احساس دلایا ہے کہ ایک بڑے سوال کا جواب میری اس کتاب میں نہیں دیا گیا۔ وہ یہ کہ فرد کی نفسیات کا ڈراما تہذیبوں سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے میں ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ اس کی تکمیل کے لیے دو سال درکار ہیں۔

اردو کی خدمت سے میں غافل نہیں ہوں۔ میرے کلیات ان شاء اللہ اگلے دو مہینوں کے اندر کراچی سے شایع ہو جائیں گے۔ ان میں تقریباً بارہ سو غزلیں، ایک مثنوی اور ایک مسدس شامل ہیں۔

خطوطِ غالب کے ترجمے کے سرورق کی فوٹو کاپی اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔ اس سے آپ کو اس یونیورسٹی پریس کا پتہ معلوم ہو جائے گا جس نے یہ ترجمہ شایع کیا۔

آنے والے سال میں ملاقات ہونی چاہیے۔

والسلام مع الاکرام

سپاس گزار

داؤد رہبر

30 March, 2001

مکرمی کرنل انور احمد صاحب!

السلام علیکم! پاکستان سے آپ کے رُقعے مجھے پہنچتے رہے۔ اخباروں میں وہاں کے بحران کی خبریں مسلسل ہیں۔ ہر قوم اور ہر ملک کے مسائل اور پیچیدگیاں اپنی ہیں۔ ان کے کچھ اسباب اندرونی ہیں اور کچھ بیرونی۔ بیرونی خلل اندازیاں ختم ہوں تو اندرونی احوال کی اصلاح سوچی جائے۔ اس کے امکان کم ہیں۔

کراچی اور لاہور میں آپ کی ملاقات ضیاء محی الدین سے ہوئی یا نہیں؟ ان کے پروگرام جا بجا ہوتے ہیں۔ پاکستان میں، ہندوستان میں، انگلستان میں، جاپان میں جم کر کہیں قیام ان کو منظور نہیں۔ خلائی طیاروں نے اُڑتے چاند کو جا پکڑا۔ ضیاء کو پکڑنا اتنا آسان نہیں، میں پچھلے سال مارچ میں لاہور گیا۔ یہ اپنے کسی پروگرام کے لیے عربستان پہنچے تھے۔

میرے کلیات آپ کو لاہور اور کراچی کی دکانوں میں نہیں ملے۔ ان کی طباعت کی نگرانی میرے عزیز دوست وجیہہ الدین احمد صاحب فرما رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ اس کے باعث طباعت کے انتظام

میں دیر ہوئی۔ شکر ہے کہ اب طباعت شروع ہو چکی ہے۔ ان شاء اللہ ایک مہینے کے اندر کتاب دستیاب ہو جائے گی۔

آپ کا فون نمبر میرے پاس ہے، عن قریب آپ کو فون کروں گا۔

خیر طلب

داؤد رہبر

7 December, 2002

بخدمت ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب

برادرِ معظم جاوید صاحب!

السلام علیکم! بھلا ہوا اعجاز کا جو آپ کی آپ بیتی کے پروف میرے لیے لاہور سے اپنے ساتھ لایا' چنانچہ میں افتخار کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس آپ بیتی کے پڑھنے میں مجھے اس کے سارے قارئین پر سبقت ہے' اس سعادت میں ایک خوش بختی اور شامل ہوئی کہ آپ نے مجھے جی لگا کر خط لکھا' اسے پڑھ کر اگلے زمانے کے واقعات کی فلم نظروں میں پھرنے لگی' میں نہایت ممنون ہوں۔

آپ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ علامہ کے انتقال کے بعد آپ نے اوپر تلے تین موٹر کاریں خریدیں' ان میں سے مجھے آپ کی صرف ایک موٹر کار یاد ہے' سرخ رنگ کی سپورٹس کار' اپنی موٹر کار رکھنے والے طلبہ گورنمنٹ کالج میں ان دنوں دو چار ہی ہوں گے۔

امریکہ میں آپ سے جو ملاقاتیں رہیں ان میں سے ایک کسی جلسے میں ہوئی تھی۔ جلسہ غالباً امیر خسرو کی سات سو سالہ برسی منانے کے لیے ہوا تھا یا شاید بابا فرید سے وابستہ کوئی تقریب تھی۔ بہر حال مجھے یاد ہے کہ میں نے اس میں پوریا راگ کا ایک خیال گایا تھا جس کے بول یوں شروع ہوتے ہیں:

عرض سنو دستگیر پیر موری

اسے سن کر آپ نے مجھ سے کہا تھا "بن تیرا گانا اگے توں پنجتا اے۔"

دو تین سال ہوئے لاہور میں بھی آپ کے دیدار ہوئے' وہاں کوئی خواجہ صاحب تھے جن کی دختر کی شادی کی ضیافت میں اعجاز مجھے طفیلی بنا کر ساتھ لے گیا تھا' پہلے ہم آپ کی ہمشیرہ کے گھر گئے' وہاں تجمل بھی بیٹھا تھا' وہاں سے موٹروں پر سوار ہو کر ہم شادی والے گھر گئے' وہاں پہنچ کر میں نے اعجاز سے پوچھا دلہن کے والد صاحب کون ہیں' اس نے کہا خواجہ صاحب' میں نے کہا پورا نام بتاؤ' اس نے کہا فکر نہ کر' روٹی کھا۔

صلّی (جس کا چھوٹا بھائی صباح گورنمنٹ کالج میں میرا ہم درس تھا) کے گھر میں آپ نے معانقہ کے ساتھ یہ کہہ کر میرا جی خوش کیا تھا "ایہہ بدلیا نہیں" اور آپ کو دیکھ کر میرا دل کہہ رہا تھا جاوید کی شخصیت سدا بہار ہے' اس کی رعنائی برقرار ہے۔

جس زمانے میں آپ اور میں کیمبرج میں تھے بھارت اور پاکستان سے آئے ہوئے طلبہ کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ ہمارے والد مرحوم وہاں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس زمانے میں کیمبرج میں ہندوستانی آٹھ دس ہی تھے اور علامہ علیہ الرحمۃ جب وہاں تھے تو تعداد اس سے بھی کم ہوگی۔

پروفیسر آربری نے ایک روز مجھ سے کہا جاوید کو پروفیسر لیوی کے گھر کا راستہ دکھا دو' لیوی صاحب سے

KUTABKHANA OSMANIA

آپ کی پہلی ملاقات ہوئی تو میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ مسئلہ زیرِ غور یہ تھا کہ آپ کے تھیسس کا موضوع کیا ہو۔ لیوی صاحب نے آپ سے پوچھا ایم۔اے آپ نے کس سبجیکٹ میں کیا۔ آپ نے کہا نفسیات میں' لیوی صاحب بولے:

How about Psychoanalysis of Ghazali's Mysticism?

آپ نے جواب یہ دیا:

Ghazali's mysticism is above Psychoanalysis.

لیوی صاحب نفسیات کے فن سے نابلد تھے' انہیں یہ شعور نہ تھا کہ کسی فرد کی تحلیلِ نفسی کے لیے حکیمِ نفسیات اور اس فرد کا متواتر آمنا سامنا ضروری ہے۔

مغربی رقص جس کے آپ چمپئن ہوئے تنہا نہیں کیا جاتا ہم رقص سے ہمکنار ہو کر کیا جاتا ہے۔ ان لطافتوں سے آپ بہرہ مند رہے اور میں بے بہرہ' آپ کو یاد ہو گا گوربچن سنگھ اور میں آپ کو ساتھ لے کر ایک انٹرنیشنل کلب میں گئے تھے' اُس رات آپ زربفت کی اچکن میں ملبوس تھے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ آج کل میرے مشاغل کیا ہیں' میں انگریزی میں ایک کتاب لکھنے میں مشغول ہوں' اس کا عنوان ہے:

Faith of a Lay Individual

اس کے لکھنے کا مدعا یہ ہے ہر فرد کے ضمیر کا رشتہ اس کے موروثی مذہب سے پیچدار ہوتا ہے۔ شعور اور لاشعور دونوں کی آنکھ مچولی اس میں رہتی ہے اور تضادات کا اس میں ہونا اٹل ہے۔ تضاد اور بشریت لازم و ملزوم ہیں۔

اب کے لاہور آنا ہوا تو خط لکھ کر آپ کو مطلع کر دوں گا اور ممکن ہوا تو آپ کے برکت کدے میں حاضر ہو کر ہمنشینی کی تجدید کا لطف اٹھاؤں گا۔

آپ کا برخوردار

داؤد

11 December, 2002

برادرِ معظم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب!

السلام علیکم! میں بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے علالت کے باوجود وہ مضمون میرے لیے ڈھونڈ نکالا جس کے پڑھنے کا مجھے مدت سے اشتیاق تھا۔ اورینٹل کالج میگزین کے پروفیسر اقبال نمبر میں بابائے اردو اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر شجاع الدین کی نگارشیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر باقر صاحب اس نمبر کے لیے کچھ لکھ نہ سکے لیکن چند برس بعد انہوں نے والد مرحوم کی یاد میں ایک مضمون لکھا جو لاہور کے رسالہ الحمرا میں حامد علی خاں صاحب نے (شمارہ جنوری ۱۹۵۶ء میں) شایع کیا۔ اس کی نقل میں نے ڈاکٹر باقر صاحب سے منگوائی تھی۔

ان سب نگارشوں کا انگریزی ترجمہ میں نے آج سے تقریباً چالیس برس پہلے محفوظ کر لیا تھا۔ آپ کی گرانقدر نگارش کا ترجمہ میں نے کل مکمل کیا۔ انگریزی میں والد مرحوم کی جو سوانح عمری لکھ رہا ہوں اس میں یہ سب مضمون شامل ہوں گے۔

میں نے ''اردو کے سبھاؤ اور ذائقہ'' کے عنوان سے جو مضمون آپ کو بھیجا شکر ہے آپ کو پسند آیا۔

اللہ آپ کی صحت قائم رکھے اور آپ کی ناراحتی دُور ہو۔

پرانی صحبتوں کو یاد کرنے والا

آپ کا بھائی

داؤد رہبر

20 November, 2002

محبِ گرامی پروفیسر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! آپ نے کرمنامہ اب کے رجسٹری کرا کے بھیجا۔ معلوم نہیں ایسی ضرورت کیوں پیش آئی۔

آپ نے بتایا کہ آپ نے کچھ چیزیں مجھے بحری ڈاک سے بھیجی ہیں۔ عبدالوہاب خاں صاحب سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے اپنے تجربے کی بنا پر فرمایا کہ بھارت سے بحری ڈاک والا پارسل کبھی تو چھ ہفتوں میں یہاں پہنچ جاتا ہے اور کبھی دُگنا وقت لگ جاتا ہے یعنی تین مہینے' سو میں اس پارسل کا منتظر ہوں۔ شکریہ ابھی ادا کرتا ہوں' جونہی پارسل موصول ہوا اطلاع اور شکریے کا خط لکھوں گا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ اورینٹل کالج میگزین کے پروفیسر اقبال نمبر کے لیے شفیع صاحب نے کوئی مضمون کیوں نہ لکھا' اس کی توجیہہ قیاساً ہی ہو سکتی ہے۔

والد مرحوم کو کیمبرج کے لیے جب سٹیٹ سکالرشپ ملا تو ان کی عمر چوبیس تھی' یہی سکالرشپ جب شفیع صاحب کو ملا تھا تو ان کی عمر چوبیس سے کہیں زیادہ تھی۔ والد صاحب ۱۹۱۸ء کے اوایل میں کیمبرج پہنچے۔ کیمبرج میں شفیع صاحب کے ساتھ ان کی یکجائی صرف چھ مہینے رہی۔ ۱۹۱۸ء کے آخر میں شفیع صاحب وہاں سے رخصت ہوئے۔ ان چھ مہینوں میں ان کا برتاؤ والد صاحب سے پرتپاک نہ تھا۔

ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹۲۱ء سے قبل پی۔ایچ۔ڈی کی دہش کا سلسلہ نہ آرٹس کے میدان میں جاری تھا نہ سائنس کے میدان میں۔ ۱۹۲۱ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ اس کے حصول کی شرائط میں ایک یہ تھی کہ کامیاب تھیسس شائع ہو چکا ہو اور اس کے دو مطبوعہ نسخے رجسٹرار کے دفتر میں داخل کیے جائیں۔

والد صاحب نے ایم۔اے کے لیے الراوندی کی فارسی تصنیف راحۃ الصدور کو ایڈٹ کیا تھا۔ یہ سلاجقہ کی تاریخ ہے۔

۱۹۲۱ء میں ان کا کام مکمل ہوا تو پروفیسر براؤن نے مہربان ہو کر والد صاحب سے کہا پی۔ایچ۔ڈی کا افتتاح امسال ہوا ہے' تمہارا تھیسس گب میموریل سلسلہ میں لائیڈن سے شایع ہو گا۔ میں سیکرٹری آف سٹیٹ کے دفتر کو سفارش لکھ بھیجتا ہوں کہ تمہارے سٹیٹ سکالرشپ کی توسیع کر دی جائے، پروف خوانی کے لیے تم ایک سال اور یہیں رہو، کتاب طبع ہو جائے تو یہاں سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند لے کر جاؤ، جو کام تم نے کیا ہے، اس پر تم اس ڈگری کے مستحق ہو۔ یوں والد صاحب کے قیامِ کیمبرج کی توسیع ہوئی اور آپ ڈاکٹر محمد اقبال ہو کر وطن واپس آئے۔

میرے برادر مرحوم محمد یعقوب نے کیمبرج یونیورسٹی کے رجسٹرار کے دفتر سے معلوم کیا کہ کیمبرج کی

KUTABKHANA OSMANIA

تاریخ میں والد صاحب سے پہلے صرف ایک طالبعلم نے پی۔ایچ۔ڈی حاصل کی۔اس کا تھیسس سائنس کے کسی میدان میں تھا۔

کیمبرج میں شفیع صاحب کے زمانۂ قیام میں پی۔ایچ۔ڈی میسر ہی نہیں تھی، اگر ہوتی تو ممکن ہے شفیع صاحب بھی وہاں سے ڈاکٹر محمد شفیع ہو کر آتے۔

والد صاحب کا تقرر اورینٹل کالج میں بحیثیت صدر شعبۂ فارسی ۱۹۲۲ء میں ہوا، مجھے معلوم نہیں کہ اس تقرر میں شفیع صاحب کے مشورے کا کوئی حصہ تھا یا نہیں، غالباً نہیں تھا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر بیون (Bevan) کی سفارشیں والد صاحب کے حق میں نہایت بااثر ثابت ہوئیں۔

شفیع صاحب لاہور کے علمی حلقوں میں مولوی شفیع صاحب کہلاتے تھے اور ان سے ملنے والے انہیں مولوی صاحب کہہ کر ان سے مخاطب ہوتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب یونیورسٹی نے انہیں اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے شعبے کی سربراہی پر فائز کیا تو انہیں ڈی۔او۔ایل کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا۔ اس ڈگری کے ملنے کے فوراً بعد انہوں نے انسائیکلوپیڈیا کے شعبے کے عملہ کو حکم دیا میرا نام لو تو مولوی شفیع کہہ کر نہ لو۔ ڈاکٹر شفیع کہہ کر لو۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے اس شعبے میں چند مہینے ترجمے کا کام کیا۔ وہاں اس حکم سے مجھے ایک صاحب نے آگاہ کیا۔

پارسل جونہی موصول ہوا میں خط لکھ کر آپ کو مطلع کردوں گا۔

والسلام مع الاحترام

نیازمند

داؤد رہبر

29 December, 2002

مخیر و مہربان گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! آپ کا کرم نامہ مورخہ ۳۰ نومبر عبدالوہاب خاں صاحب نے نیویارک سے ۲۰ دسمبر کو ادھر روانہ فرمایا۔ آپ اپنی دختر سے ملنے بوسٹن گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے واپس نیویارک آئے تو انہوں نے ڈاک کھول کر دیکھی اور پھر میرے نام کا خط روبراہ کیا۔

آپ کے عطیات کا پارسل علی گڑھ سے ۱۰ ستمبر کو چلا اور ۱۹ دسمبر کو مجھے ملا۔ تین مہینے بحری ڈاک کے یہاں پہنچنے میں لگے۔ پارسل سے چھ مطبوعات نکلیں:

(1) سہ ماہی نیا ورق کا شمارہ نمبر ۱۵

(2) بازیافت کے شمارہ نمبر ۱ (بابت جنوری ۲۰۰۲ء) میں سے آپ کا گرانقدر مقالہ۔

(3) ڈاکٹر نسیم اختر صاحب کا مضمون بعنوان ''کربل کتھا کی دریافت''۔

(4) آپ کی تصنیف سیرت بابائے اردو (بزبان انگریزی)۔

(5) محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک (مصنفہ نور الحسن نقوی صاحب)۔

(6) مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی کا تعارف۔

ان سب نگارشوں سے آنکھیں روشن ہوئیں، نقوی صاحب کی تصنیف بروقت موصول ہوئی، محمڈن کالج کی تاریخ اس میں خوبی سے بیان ہوئی ہے۔

آپ کی مہربانی جسے ملے گی وہ کہے گا اللّٰھم زد فزد۔ میں اپنی بڑی بیٹی سے ملنے واشنگٹن گیا ہوا تھا۔ کل واپس آیا۔ اس سفر کی وجہ سے شکریے کا خط لکھنے میں دیر ہوئی۔ معافی چاہتا ہوں۔

آمد کی ضرورت صرف سخن گوئی کو نہیں ہوتی، مکتوب نویسی کو بھی ہوتی ہے۔ طبیعت ترنگ میں ہو تو خط میں بہلاوا آتا ہے۔ طبیعت موج میں ہو تو نئی تان سوجھتی ہے۔

والسلام مع الاکرام

نیازمند

داؤد رہبر

میری موسیقی والی کتاب کوئی صاحب آپ سے مانگ کر لے گئے تھے۔ واپس لائے یا نہیں؟ آپ نے اس کتاب کو ملاحظہ فرمایا یا نہیں؟ اکثر لوگ عاریتہً کتاب لے جاتے ہیں، واپس نہیں لاتے۔ صاحبِ کتاب خود سائل بن جاتا ہے۔

2 Jaunary, 2003

بخدمت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب!

میرے محسن گرامی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم! نیا سال اس لیے مبارک ہے کہ اس میں آپ یہاں تشریف لائیں گے، ہم منتظر ہیں۔

والد مرحوم کے بچپن اور ان کی ابتدائی تعلیم پر دو باب لکھ چکا ہوں۔ اب علی گڑھ کی باری آئی ہے۔ علی گڑھ نے انہیں جو کچھ دیا اس میں سب سے بڑھ کر اُردو کی محبت تھی۔ اُردو سے لگاؤ ہوا تو گویا شاعری سے لگاؤ ہوا۔ دو باب تو اسی سے لازم ہوئے:

(1) اُردو کا ذائقہ

(2) اسلامی تہذیب میں شاعر اور شاعری کا مقام

ان موضوعوں پر سوچ کا مزا لیتا رہا، ان کے ساتھ ایک اور موضوع میرے ذہن پر دستک دے رہا تھا۔ وہ یہ کہ پنجابی شہر فیروزپور میں ہائی سکول کی تعلیم پا کر والا مرحوم جب (یو۔پی کے شہر) علی گڑھ کے کالج میں داخل ہوئے تو اپنے مولد (قصور) کی برادری سے ان کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ پھر عمر بھر علیگ برادری ہی کو انہوں نے اپنی حقیقی برادری جانا۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہماری برادری قصور میں چاولہ برادری کہلاتی تھی۔ میں برسوں یہ سمجھتا رہا کہ ہمارے اجداد برنج فروش تھے۔ وجیہ الدین احمد صاحب سے ایک گفتگو میں معلوم ہوا کہ چاولہ ہندوؤں کی ایک جاتی کا نام ہے۔ چاولہ ایک غذا کا نام ہے جو چاول میں گڑ ملا کر پکائی جاتی ہے۔ چاولہ جاتی کے لوگوں نے اس غذا سے پرہیز کو اپنی پہچان قرار دیا۔ کئی ہندو جاتیوں میں پہچان اسی قسم کے پرہیزوں (Taboos) سے قرار پائی۔

۱۹۶۰ء میں لکھنو سے انگریزی میں ایک کتاب بعنوان Muslim Caste in Uttar Pradesh شایع ہوئی۔ اس کے مصنف ڈاکٹر غوث انصاری صاحب ہیں۔ یہ کتاب زیادہ تر ۱۸۸۸ء سے ۱۹۳۱ء تک کی مردم شماریوں پر مبنی ہے۔ اس سے مسلمان خاندانوں میں ذات پات کے سلسلے معلوم کر کے میں حیران رہ گیا۔

اپنے اس خط کا فوٹو مشفق خواجہ صاحب کو بھیج رہا ہوں اور آج انہیں جو خط لکھا ہے اس کا فوٹو آپ کو۔ انگریزی تصنیف میں لگا ہوا ہوں۔ اردو کا ٹھرک مکتوب نویسی کے ذریعے برقرار ہے۔

آپ کو اور بھابی صاحبہ کو امیہ کا سلام بھابی صاحبہ کو میرا بھی سلام۔

نیازمند

داؤد رہبر

2 January, 2003

شفیق و مہربان مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! جاڑوں میں یہاں تین تہوار اوپر تلے منائے جاتے ہیں۔ نومبر کے اخیر میں عید شکرانہ (Thanks giving) پھر ۲۵ دسمبر کو کرسمس اور پھر یکم جنوری کو نوروز۔ ان میں سے ہر تہوار عید چراغاں بھی ہے اور عید ایاغاں بھی۔ یکم جنوری کے بعد تہواروں کی گھنٹیاں بند ہو جاتی ہیں اور کاروبار معمول پر آ جاتے ہیں۔

کل ٹہلتے ٹہلتے ایک مصرع موزوں ہو گیا ع

دکھائی میکشوں کو میں نے چل کے ایک چال نو

نو کے ساتھ چال کا جوڑ غلط ہے لیکن ہم غلطی گوشالی کا مزا لینے کے لیے جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ یہ مصرع کہتے ہوئے چال نو کا قافیہ سال نو ذہن میں تھا۔ وہ بھی باندھا گیا اور شعر مکمل ہو گیا

سنائی جب انہوں نے پی کے شب کو عید سال نو
دکھائی میکشوں کو میں نے چل کے ایک چال نو

لطف یہ ہے کہ یہ شعر ذو بحرین ہے، جن دو بحروں پر یہ پورا اُترتا ہے ان کی تقطیع یوں ہوگی:

(1) مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

(2) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

آپ کے رسالہ غالب کے لیے "تعلق خاطر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر ان شاء اللہ پانچ چھ ہفتوں کے اندر بھیجوں گا۔ یہ ان گفتگوؤں پر مبنی ہوگا جو گزشتہ دو برسوں میں میرے دوست وجیہہ الدین احمد صاحب (فرزند مولانا صلاح الدین احمد مرحوم) سے ٹیلیفون پر ہوئیں۔ وجیہہ صاحب نے اس مدت میں تقریباً ہر ہفتے مجھے فون کیا۔ ان کی باتوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے مطالعہ کی وسعت غیر معمولی ہے اور ان کا ادراک بھی۔ یہ قلزم نفسیات کے غواص ہیں۔ اس لیے گنہ گاروں پر انہیں رحم آتا ہے۔ اپنی گفتگو سے انہوں نے مجھے قایل کر دیا ہے کہ جنسیات کے عوامل کا خیال نہ رکھیں تو روحانیات کی فہم و تفہیم کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس طرز کے ادراک کی اشاعت کے لیے ہمارا معاشرہ ابھی تیار نہیں۔

وجیہہ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ چاولہ جاتی اروڑہ جاتی کی ایک شاخ ہے اور یہ کہ یہ جو کہتے ہیں دتی کا روڑہ، اصل میں دتی کا اروڑہ ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ بھی بتایا کہ اروڑہ جاتی کھتریوں (کشتریوں) کی ایک شاخ ہے اور یہ کہ کھتری جو عموماً فوج کش سمجھے جاتے ہیں آغاز میں کاشتکار لوگ تھے (کھتری کھیت سے مشتق ہے اور کشتری کشت سے) کھتریوں نے جنگ آزما ہو کر زمینوں پر قبضہ کیا تھا۔ برہمنوں سے ان کی ٹھنی ہوئی تھی۔ ان کی ہیکڑی برہمنوں کو بری لگی تو برہمنوں نے انہیں زک دینے کی ٹھان لی اور ان کے خلاف لشکر کشی کا بندوبست کیا۔ اس لشکر کشی کا جو اسطورہ بنا اس کا ہیرو پرس رام (یا پرشورام) ہے جو وشنو بھگوان کا "کلہاڑی والا اوتار" کہلاتا ہے۔ اس نے تلوار سے نہیں کلہاڑی سے دشمن پر فتح پائی اور برہمنوں کی برتری بحال فرمائی۔

قصور کے مسلمان چاولے جن کے اجداد کھتری ہندو تھے بیسویں صدی کے اوایل تک بڑے خوشحال اور متمول تاجر تھے۔ ریل گاڑی کا جال بچھنے لگا تو ان کے کاروبار کا تنزل شروع ہوا۔ سٹے کی لت لگی اور یہ سب کچھ کھو بیٹھے۔ سکولوں اور کالجوں کی تعلیم پا کر نوجوانوں نے نوکریاں کر لیں، برادری کی یکجائی جاتی رہی۔

۱۹۳۵ء میں برادری کے ایک رُکن عبدالمجید صاحب نے اُردو میں ایک رسالہ شائع کیا۔ اس کے دیباچے میں لکھا کہ رسالہ اصلاً فارسی میں تھا۔ مؤلف اس کے برادری کے ایک بزرگ مولوی حافظ غلام رسول صاحب تھے۔ رسالہ خاندان کے ایک دوسرے بزرگ میاں حاجی محمد گورہ صاحب کو حاصل ہوا تو انہوں نے کسی قابل فارسی داں سے اس کا اردو ترجمہ کرایا۔

رسالے میں جو داستان ہے اس کی رُو سے ہماری قصور کی برادری کا مورث ایک غیر مسلم یمنی تاجر تھا جس نے قصبہ مصطفےٰ آباد میں ایک صوفی پیر کبیر الدین حسن کی تلقین سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ پیر صاحب نے یار محمد اس کا نام رکھا۔ انہی کی تجویز سے آگے چل کر یار محمد کے بیٹے اللہ داد کا عقد قصور کے ایک مالدار تاجر خواجہ محمود چاولہ سے ہوا۔

مؤلف رسالہ کا ادعا ہے کہ شیخ یار محمد کا نسب یمن کے حمیری بادشاہوں سے جا ملتا ہے۔ چنانچہ یہ یار محمد حمیری اور ان کا بیٹا اللہ داد حمیری کہلاتے تھے۔ لیکن اللہ داد کا عقد چاولہ خاندان کی ایک دختر سے ہوا تو بقول مؤلف رسالہ

"گماشتوں اور آڑھتیوں اور شیخ اللہ داد کی زوجہ کی عمہ صاحبہ نے ان کا نسب جو حمیری تھا تبدیل کر دیا۔ اب ہر ایک دادوستد کے معاملہ اور نقدی کے لین دین اور ہنڈیوں میں بجائے شیخ اللہ داد بن شیخ یار محمد حمیری کے شیخ اللہ داد پسر خواجہ محمود چاولہ لکھا جانے لگا۔"

یہ رسالہ شیخ عبدالمجید صاحب نے ۱۹۳۵ء میں لاہور سے شایع کیا۔ ان دنوں قصور کی چاولہ برادری منتشر ہو چکی تھی۔ رسالے کے دعویٰ میں کسی نے دلچسپی نہ لی۔ اب وہ زمانہ آ چکا تھا کہ برادری کے رؤسائے تجارت معدوم و مرحوم ہو چکے تھے اور چاولہ کہلانے میں مزا نہ رہا تھا۔ اب حیثیت کی برتری بی۔اے اور ایم۔اے اور آئی۔سی۔ایس کہلانے پر منحصر تھی۔ ہمارے والد مرحوم اب علیگ ہی نہیں کینٹب (Cantab) یعنی کیمبرج کے تحصیل یافتہ بھی تھے۔ احوال کے اس تغیر پر آج کل ایک باب لکھ رہا ہوں۔ شناخت کے یہ کھیل تماشا نہیں تو کیا ہیں۔

ان کی گفتگوؤں کی یادداشتیں میں اسی طرح قلمبند کرتا رہا جیسے طلبہ کلاس روم میں اُستاد کے لیکچر کے نوٹ لکھتے رہتے ہیں۔ یہ گفتگوئیں مزیدار بھی تھیں اور فکر انگیز بھی' وجیہہ صاحب کی ترجمانی اب میرا کام ہے۔

بیگم صاحبہ کو میرا اسلام۔

نیاز مند

داؤد رہبر

29 November, 2002

بخدمت پروفیسر نعمان الحق صاحب

نعمان صاحب!

تسلیم! اورینٹل کالج میگزین کا پروفیسر اقبال نمبر آپ کے پاس موجود ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد ہمارے والد مرحوم کی یادیں لکھنے کے لیے ان کے دو شاگردوں نے قلم اُٹھایا۔ ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر وحید قریشی۔ ان دونوں نے مہربانی فرمائی یعنی ان تحریروں کی فوٹو کاپیاں بنوا کر مجھے بھیجیں۔ وحید قریشی صاحب کی تحریر آج ہی ڈاک میں موصول ہوئی۔ انہوں نے یہ مضمون لاہور کے کسی جلسے میں پڑھا تھا۔

دونوں مضمونوں کی فوٹو کاپیاں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ان کے ساتھ ایک تازہ مضمون بھی' جو میں نے لاہور کے رسالہ مخزن کے لیے لکھا ہے۔ وحید قریشی صاحب اس رسالے کے مدیر اعزازی ہیں۔ ان کی کوشش سے مخزن لاہور کی قائداعظم لائبریری کی طرف سے جاری ہوا ہے۔ اسے سر عبدالقادر والے مخزن کا نیا جنم کہنا چاہیے۔

آپ کی یونیورسٹی میں امتحانات ہو رہے ہوں گے۔ گریڈنگ کی تکان دور کرنے کو نبیذ کا جام نوش فرمائیے اور سرخوش ہو کر میرا مضمون پڑھیے۔ آپ اسے پڑھ چکیں تو آپ کو فون کروں۔

موجود

داؤد

17 December, 2002

نعمان صاحب، تسلیم!

معذرت خواہ ہوں کہ کل شام فون پر آپ سے باتیں نہ ہو سکیں' جس بستی میں ہماری سکونت ہے' اس میں ایک کلب گھر ہے جہاں ہر مہینے طرح طرح کی موسیقی کے جلسے برپا ہوتے ہیں۔ کل شام رَوک اینڈ رول کا بدیع الزماں موسوم بہ چبی چیکر آیا ہوا تھا۔ اہلیہ مصر ہوئی کہ میں سماع میں اُس کا ساتھ دوں' آپ نے رات فون کیا ہو گا۔ افسوس میں گھر میں نہ تھا۔

جس لفافے سے آپ نے میرا یہ خط نکالا ہے اسے کھولنے سے پہلے آپ کو تجسس ہوا ہو گا کہ دیکھیں اس کے اندر کیا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ مدت ہوئی الطاف گوہر مرحوم نے God of Justice کو پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے اس کی فوٹو کاپی مجلد کرا کے انہیں بھیج دی۔ انہوں نے اس کا ذکر اعجاز حسین بٹالوی صاحب

سے کیا۔ گزشتہ اگست میں اعجاز صاحب امریکہ آئے تو میں ان سے ملنے میری ٹاؤن (نیویارک) پہنچا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا ''تم نے اپنی تصنیف گوہر کو بھیجی مجھے نہ بھیجی۔'' میں نے کہا میں ایک فوٹو کاپی بنوا کر تمہیں بھیج دوں گا۔

میں نے چند برس پہلے ایک فوٹو کاپی اس کتاب کی آپ کو پیش کی تھی' پھر سال ڈیڑھ سال ہوئے ایک دوسری کاپی اس غرض سے آپ کو بھیجی تھی کہ آپ اسے کراچی لے جائیں اور کتاب کی طبع ثانی کی تجویز آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی ایک کمیٹی کے سامنے رکھتے ہوئے کتاب اس کے اراکین کو دکھا سکیں۔

کثرت مصروفیات کے باعث وہاں آپ میٹنگ نہ کرا سکے۔ آپ کی واپسی کے بعد آپ سے پھر گفتگو ہوئی تو آپ نے ٹھیک سجھایا کہ میں کسی ایسے پریس سے گفت و شنید کروں جو مفید کتابوں کے Reprint شایع کرتا ہے۔ مجھے یہ تجویز اچھی لگی اس لیے کہ Reprint کی صورت ہو تو پروف خوانی کا جھمیلا نہیں ہوتا۔

فی الحال میں یکسوئی کے ساتھ اپنی نئی تصنیف میں لگا ہوا ہوں۔ آیندہ سال وقت ملا تو میں ایسے ناشروں کے پتے معلوم کروں گا جن کا کاروبار Reprint کا ہے۔

آپ کا کرم ہو گا اگر فوٹو کاپی نمبر ۲ جو آپ کے پاس ہے' اعجاز صاحب کو دینے کے لیے آپ ارسال فرما دیں۔

آپ کی غیر معمولی مصروفیت کا خیال کر کے میں نے ایک لفافے میں اپنا پتہ لکھ کر بھیجا ہے' یہ خط آپ کو مل چکے تو پھر فون کروں۔

متقاعد

(عربی میں ریٹائرڈ کا مترادف)

7 January, 2003

نعمان صاحب!

تسلیم! ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی نگارشات کا پارسل کل موصول ہوا۔ مہربانی' میں نے پلندا ایک دوسرے لفافے میں ڈال کر کل ہی عبدالوہاب خاں صاحب کو بھیج دیا۔ اسے مجلد کرا کے کسی لائبریری میں رکھوانے کا ذمہ انہوں نے لے لیا ہے۔

آپ سے باتیں کرنے کے لیے ایک شعر ابھی میں نے کہا

زد فزد کہتا ہوں میں جب جور کرتا ہے وہ شوخ
مجھ سے یہ سنتے ہی پھر کچھ اَور کرتا ہے وہ شوخ

غزل کی تاویلات کا اُصول اجازت دیتا ہے کہ شوخ سے مراد کوئی معشوق ہم جنس لیا جائے یا اللہ میاں' چنانچہ شعر کہنے والا اس سوچ کا مزا لیتا ہے کہ اللہ میاں (جو سمیع و خبیر ہیں) اس شعر کی خبر پا کر اور اس شعر کو چھیڑ سمجھ کر ہنس دیئے ہوں گے کہ ستم کش نے انہیں شوخ کہا۔

جدید شاعروں کو اللہ میاں سے چھیڑ چھاڑ کا کوئی محاورہ میسر نہیں' اس لیے جدید شاعر یا اداس ہو گا یا غصیلا۔

KUTABKHANA OSMANIA

قافیہ تنگ نہ ہوتا تو میں چند شعر اور فی الفور کہہ کر غزل پوری کر لیتا۔

دلّی کی غالب اکیڈیمی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کی تیاری کر رہی ہے۔اس میں ان کے احباب اور نیاز مندوں کی تحریروں کا ایک ''گلدستہ'' انہیں پیش کیا جائے گا۔اکیڈیمی کی فرمائش کی تعمیل میں میں نے ایک اظہار لکھ کر بھیجا۔اسے آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔اس میں مولانا میمن کے ذکرِ خیر سے آپ کو دلچسپی ہوگی۔

غت ربود

(داؤد کا یہ قافیہ سب سے اچھا ہے)

13 December, 2002

بخدمت ضیاء محی الدین

معرفت عزیز گرامی نوید ریاض صاحب!

بھائی! والد مرحوم نے ۱۹۳۵ کی گرمیاں ایران میں گزاری تھیں۔گورنمنٹ نے انہیں سفر خرچ دیا تھا۔اس میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ اپنی بیٹی اور اپنے پانچ بیٹوں میں سے ہر ایک کے لیے کوئی چھوٹا سا تحفہ لے کر آتے۔ہاں اپنی خوشی کے لیے خیام کے شہر نیشاپور سے ایک صراحی لے کر آئے گو یا وطن کو لوٹتے ہی بھولا رام کلال کی دکان سے مئے گلفام خرید کر لائیں گے اور اسے صراحی میں ڈال کر اس سے قلقل کہلوائیں گے۔مشاعرہ نواز مومنوں کو معلوم ہے کہ خالی صراحی کو دیکھ کر مست رہنے کا نام ہی تغزل ہے۔

ایران سے البتہ خاص میرے لیے ایک تحفہ آپ خرید کر لائے۔(بوجھو تو جانیں) مصر کا چھپا ہوا ایک نظر نواز قرآن مجید۔آپ بفضل الٰہی خود حافظِ قرآن تھے۔ان کے دل میں اُمید ہوگی کہ ان کا خلف الصدق بھی حفظِ قرآن کی نیت باندھ لے گا۔مانو نہ مانو میں نے اپنے آپ حفظ کا تہیہ کر لیا۔سورۂ فاتحہ پہلے سے ازبر تھی کہ اس کے بغیر نماز ممکن نہیں۔سورۂ بقرہ کی تیس چالیس آیات ایک ہفتے کے اندر حفظ کر لیں۔پھر ہمت ہار دی۔

تم جانتے ہی ہو والد مرحوم ایک زمانے میں مغرب کی نماز التزام کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، باجماعت نماز۔جماعت میں اولاد کے سوا وہاں کوئی نہ ہوتا۔مرحوم میری غزل گوئی سے ڈرے ہوئے تھے۔چنانچہ احتیاطاً پہلے تو انہوں نے مجھے گھر کا مؤذن مقرر کیا۔اس کام میں مجھے مزا ملا کیونکہ اس میں بھیرویں کے سروں والی گلوکاری تھی۔ہماری بہن سارہ بھی باجماعت نماز میں شریک رہتی تھی۔جھٹ پٹے کے وقت آنگن کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگادی جاتی تھی تا کہ آنگن سے باہر کسی کو اذان سنائی دے تو وہ اندر نہ آسکے۔

میری غزل گوئی کے رجحان کا توڑ کرنے کے لیے انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا آج نماز کی امامت تم کرو۔میں نے کر تو دی لیکن خیال کرو میری جھجک کا کیا عالم ہوگا علی الخصوص بوقتِ سجدہ۔اس کے بعد اکثر تو نہیں گاہے گاہے امامت مجھ سے کرائی گئی۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ میں غزل گوئی کو نماز مان کر اس میں مشغول ہوا۔ریٹائرڈ ہو کر فلورڈا آیا۔خلوت کو انجمن بنانا لازم ہوا۔سویرے کافی پینے میکڈانلڈ میں جا بیٹھتا اور گھنٹے کے اندر ایک غزل کہہ کر اُٹھتا۔دس برس میں سینکڑوں غزلیں فراہم ہو گئیں۔اگر طبلے کی سنگت کرنے والا یہاں کوئی ہوتا تو غزل کہنے

کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بڑے غلام علی خاں صاحب نے دلّی کے ایک جلسے میں بہاگ کا ایک خیال گایا۔اس کا ٹیپ کسی نے مجھے دیا۔اس کے بول سنو:

لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم
میرے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے

عذرا اور عالیہ کو دعائے سلامت 'بوبی' کو پیار۔

بلند بانگ

داؤد

7 December, 2002

بخدمت ڈاکٹر آصف فرخی صاحب!

حبیب لبیب اور طبیب ادیب ڈاکٹر آصف صاحب!

السلام علیکم! میرے شفیق دوست وجیہہ الدین احمد صاحب سے جن صاحبوں کی سرسری شناسائی ہے وہ انہیں مولانا صلاح الدین احمد کے فرزند کی حیثیت ہی سے جانتے ہیں۔کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہیں ان کی سرکاری ملازمتوں کے گرم و سرد سے کچھ واقفیت ہے لیکن پاکستان میں کم ہی کسی کو معلوم ہے کہ یہ دس برس یونائٹڈ نیشنز کی ملازمت کے وسیلے سے الازہر کے پروفیسروں کے مستشار ہو کر قاہرہ میں مقیم رہے۔وہاں ریسرچ کی ان مساعی میں ان سے مدد لی جاتی تھی جن میں نفسیات کی مہارت درکار ہو۔اپنی ملازمتوں کے ہر زمانے میں ان کا شوقِ مطالعہ زوروں پر رہا لیکن ریٹائرڈ ہونے کے بعد تو مطالعہ میں ان کا انہماک انتہا کو پہنچا۔نفسیات سے دلبستگی کے باعث یہ مسلم الثبوت لٹریچر ہی نہیں پڑھتے سوقیانہ لٹریچر کے بھی قدردان ہیں۔

انہوں نے مجھے ایک لوری سنائی تو میں نے ان سے کہا یہ لوری میں قلمبند کر لیتا ہوں تا کہ یہ محفوظ ہو جائے۔اس کی نقل میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔کیسے افسوس کی بات ہے کہ لوریاں کسی نے جمع کر کے آج تک محفوظ نہیں کیں۔

کیا ہی اچھا ہوا گر آپ لوریاں جمع کرنے پر تل جائیں۔کسی اخبار (مثلاً جنگ) میں اشتہار دیں کہ جن بی بیوں کو لوریاں یاد ہیں وہ انہیں قلمبند کر کے آپ کو بھیج دیں۔چند بار اشتہار نکلے تو شاید خاصی تعداد میں لوریاں ہاتھ آئیں۔اپنے دوستوں کو بھی اُکسائیں کہ وہ اپنی ماؤں، بہنوں اور خالاؤں اور پھوپھیوں اور دادیوں اور نانیوں سے لوریاں حاصل کریں۔تہذیب ایسی تیزی سے بدل رہی ہے کہ یہ کام اب نہ ہوا تو کہاوتوں کی طرح لوریاں بھی ملیامیٹ ہو جائیں گی اور صرف گلوریاں رہ جائیں گی۔

ایک اور کام بھی میرے خیال میں ہے۔شیکسپیئر کی ایک اعلیٰ سوانح عمری ہے بعنوان Shakespeare of London اس کی مصنفہ کا نام ہے Marchette Cuteh اس کا ترجمہ اردو میں ہونا چاہیے۔یہ کام آپ کے مزاج کے موافق ہے۔کراچی کی لائبریریوں میں اس کا نسخہ موجود نہ ہو تو مجھے لکھیے میں یہاں کے کسی کتب فروش سے حاصل کر کے کسی کے ہاتھ بھجوادوں گا۔

KUTABKHANA OSMANIA

آپ کے والد ماجد کو میرا مؤدبانہ سلام۔ انہوں نے میرے کلیات کو اِدھر اُدھر سے دیکھا ہوگا۔ انہیں میری تک بندی کیسی لگی۔ مجھے یہ جاننے کا اشتیاق ہے۔

اپنے حال پر شاکر

داؤد رہبر

ایک لوری

ایک تارا
دھری تارا
دھری نے مجھ کو راہ دکھائی
راہ میں میرے کانٹے لگے
کانٹے میں نے
کنواں کھدایا
کنوئیں سے میں نے
ڈابر کھینچا
ڈابر نے مجھ کو
دھان دیئے
دھان لے میں نے
ہپاّ بنایا
ہپاّ لے میں نے
فقیر کو دیا
فقیر نے مجھ کو
ہیں ہیں گھوڑا دیا
ہیں ہیں ہیں

ہیں ہیں ہیں کہتے ہوئے ماں بچے کو گدگداتی ہے۔ ن۔م۔ راشد کی شاعری میں اس لوری جیسی بات کہاں! اس میں ہیں ہیں ہیں کہاں!

8 January, 2003

برملا دوست شمیم میرزا صاحب!

السلام علیکم! پروفیسر قدیر صاحب کا یہ سوال آپ نے مجھے پہنچایا:

''داؤد صاحب نے جو تخلص اختیار کیا' کیا یہ تکبر کی چغلی نہیں کھاتا؟''

میں قدیر صاحب کے التفات سے خوش ہوا اور ان کے سوال سے محظوظ۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے تخلص ''رہبر'' سے عمر بھر محظوظ رہا۔ اب قدیر صاحب کے سوال کا جواب سنیے۔

قدیم یونان و روما کے زمانوں سے لے کر آج تک ایکٹنگ کو یورپ کے فنونِ لطیفہ میں ایک بلند حیثیت حاصل رہی ہے۔ انگریزی میں ڈراما تختانے کی سرگرمیوں کو شیکسپیئر کے عہد میں فروغ ہوا۔ اس کے ڈراموں کا مجموعہ انگریز ادیبوں کی بائبل ہے۔ ممتاز ایکٹروں کو انگلستان میں سر کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب میں اس فن کا مقام بہت پست ہے۔ اس پیشے کے لوگ ہمارے ہاں بھانڈ' نقال اور بہروپیے کہلاتے رہے ہیں۔

ایکٹر کسی بھی معاشرے کا ہو اور کتنا ہی زبردست ہو وہ بہرحال بہروپیا ہوتا ہے یعنی کسی کردار کا روپ تماشائیوں کے آگے دھارتا ہے اور سوانگ رچاتا ہے۔

یورپ کے معاشرے میں ڈرامے کا سٹیج ہے تو ہمارے ہاں مسندِ مشاعرہ' یورپ میں ایکٹروں کا سوانگ ہے اور ہمارے ہاں شاعروں کا سوانگ۔

شاعروں کے سوانگ کا نسخہ یہ ہے کہ پہلے تو ایک تخلص اختیار کیا جائے۔ ماں باپ نے جو نام رکھا تھا وہ اپنی جگہ رہتا ہے۔ شاعری خصوصاً غزل گوئی کا ارادہ کرنے والا شخص ایک نام اپنی مرضی سے یا کسی استاد کی تجویز سے اپنے پیدائشی نام کے علاوہ اختیار کرتا ہے۔ یہ اعلان ہوتا ہے عمر بھر کے ایک سوانگ کا۔ غزل گو اب ایک عاشق اور میخوار کا روپ دھار کر اپنے آپ کو مجالس میں پیش کرتا ہے۔ اپنی غزلوں میں اپنی خیالی بدمستی اور عاشقانہ بدحالی کے مضمون باندھتا ہے۔

اگر ایک شاعر اپنا تخلص بسمل رکھ لیتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے گلے پر واقعی چھری پھر رہی ہے۔ یہ صرف ایک سوانگ ہے۔ اگر ایک شاعر اپنا تخلص نالاں رکھ لیتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقعی دن رات روتا رہتا ہے۔ اگر کسی شاعر نے اپنا تخلص خلوت رکھ لیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقعی تنہائی پسند ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اکثر یاروں کے ساتھ تاش کھیلتا ہوا دکھائی دے۔ اگر جگر مراد آبادی نے اپنا تخلص جگر رکھ لیا تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اُن کا بدن سر سے پاؤں تک جگر ہو کر رہ گیا۔

تخلص کا مقصد ہوتا ہے سوانگ' میں نے اپنے تخلص رہبر بچپن میں کسی اُستاد سے مشورہ کیے بغیر خود ہی اختیار کیا جب میری عمر دس برس سے کم تھی' کسی حکیم نفسیات سے پوچھیں تو وہ کہے گا اپنے آپ کو رہبر کہنا کسی گہری ضرورت کا غماز ہے لیکن آٹھ نو برس کا بچہ یہ نام کسی غرور کی وجہ سے اختیار نہیں کر رہا' یہ اپنے اندر ایک رہبر کی ضرورت محسوس کر رہا ہے جو باہر اُسے نصیب نہیں۔

اگر آج مجھ سے کوئی پوچھے تم رہبر کس کے ہو تو میں اس سوال کا کوئی شاعرانہ جواب دوں گا۔ مثلاً یہ کہوں گا میں اپنی ہی عقل کا رہبر ہوں یعنی اپنی عقل کو گمراہی سے بچانے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ یا یہ کہ میں ان اجنبی مسافروں کا رہبر ہوں جو تشنگانِ مے ہیں' میں انہیں میکدے کا رستہ بتاتا ہوں یا ان عاشق مزاجوں کا رہبر ہوں جنہیں خوبانِ خوب تر کی تلاش ہے۔

والسلام۔

بھٹکا ہوا

داؤد رہبر

7 August, 1994

بخدمت آغا بابر مرحوم!

(نوٹ:- آغا صاحب کے نام میرا یہ خط کاغذوں کے ایک ڈبے سے پچھلے دنوں برآمد ہوا۔ انہوں نے ۱۹۹۴ء میں مجھے اپنی کتاب خدوخال کے ایک باب کا مسودہ بھیجا۔ اس میں شملہ اور پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے کچھ اذکار تھے۔ آغا صاحب کی پہلی ملازمت اس اسمبلی کے دفتر میں تھی۔ میں نے فون کر کے ان سے کہا آپ اسمبلی کی کچھ یادیں لکھیے اور یہ خط انہیں لکھا۔ کسی وجہ سے یہ پڑا ہی رہ گیا۔ ڈاک میں نہ ڈالا جا سکا۔)

بھائی جی، تسلیم!

اس قسط نے بھولے ہوئے شملہ کی سیر کرا دی۔ اسمبلی کے ایام کی کہانی بھی اس میں آئی لیکن آدھی۔ اسمبلی ہال کے لطیفے اس میں نہیں آئے۔ اسمبلی کی عمارت کی شان اور اسمبلی کے دفاتر کا عملہ، یہ تو بیان ہوئے۔ ایوانِ اسمبلی کا منظر سامنے نہ آیا۔ اس دور کے اسمبلی ہال کا جیتا جاگتا ڈراما آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اکابر کی حرکات و سکنات دیکھیں۔ انہوں نے چھینک ماری وہ بھی آپ کے سامنے تھی۔ ان کی تقریریں سنی گئیں۔ پنجاب اسمبلی کے مقرر سب خطیب نہ تھے لیکن وہ نمائندے تھے۔ بنچ سے اُٹھ کر جو بولتا تجویزوں کو تولتا۔ بحث کرتا، دلیل دیتا، اتفاق کرتا یا اختلاف، یہ بھی ڈراما تھا، لیکن اس ایوان کی کارروائی میں ایکٹروں کی دلچسپی کی چیز تو یہ تھی کہ پنجابی لہجہ میں انگریزی اور اُردو تقریر ہوتی تھی۔ پنجاب کے جاٹ پارلیمنٹری ضوابط کے مزے لیتے تھے۔ کہانی تب بنے گی اگر یہ بھی بتایا جائے کہ ایوان میں ننگے سر کتنے تھے، طرے کتنے، رومی ٹوپیاں کتنی، پھندنے کتنے۔

بھائی عاشق اسمبلی پر ایک باب لکھتے تو سیاسی تبصرہ کیے جاتے۔ آپ لکھیں گے تو طرے اور پھندنے سامنے آئیں گے۔ لہجے سنائی دیں گے۔ آپ عجائب پر ہنسائیں گے۔ مسایل میں نہ پھنسائیں گے۔

حاشیہ نشیں

10 January, 2003

گرامی و محترمی چودھری نیاز احمد صاحب!

السلام علیم! پچھلے دنوں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کا ایک خط مجھے ملا۔ میں نے انہیں شکریے کا خط لکھا تو خیال آیا کہ اگر میرا یہ خط سلام و پیام کی جلد دوم میں شامل ہو جائے تو جاوید صاحب خوش ہوں گے۔ چنانچہ اس خط کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔

ان دنوں اور بھی کئی خط لکھے گئے۔ ان میں سے جو مجھے خصوصاً اچھے لگے ان کے فوٹو بھی بھیج رہا ہوں۔ یہ بھی دوسری جلد میں شامل ہو جائیں تو خوب ہو۔

عزیز مکرم افضال احمد سلمہ کو میر سلام۔

نیاز مند

داؤد رہبر

357 Tilfor Q

Century Village East

Deerfield Beach, Fl.33442

10 March, 2002

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی

میرے ہم سفر!

اپنا دل بہلانے کو مضمون لکھتا ہوں اور بہلاوے میں دوستوں کو شریک کر لیتا ہوں۔ فنِ عروض کے ایک مسئلہ پر مضمون لکھنے کا ارادہ برسوں رہا، نقلِ مکانی کے لیے کاغذوں کی چھانٹی کرتے ہوئے ایک رسالہ ''عروض'' کا برآمد ہوا۔ اسے دیکھا تو مضمون لکھ ہی ڈالا۔

کہا جاتا ہے کہ فارسی بحور عربی بحور سے نکلی ہیں، یہ کہنا ایسا ہے جیسے سوامی لوگوں کا یہ کہنا کہ رامائن اور مہابھارت ویدوں سے نکلی ہیں۔

مشفق خواجہ صاحب کراچی سے ایک رسالہ نکالتے ہیں (بعنوان ''غالب'') انہوں نے چاہا کہ میں اس رسالے کے لیے کوئی مضمون لکھ بھیجوں، ان کی فرمائش کی تعمیل میں، میں نے یہ مضمون انہیں بھیج دیا ہے۔ اس کی جو کاپی تمہیں بھیج رہا ہوں اپنے پاس ہی رکھنا، سعید شیخ صاحب کو نہ دینا۔ اگر یہ ''علامت'' میں بھی چھپ گیا تو مشفق صاحب ناراض ہوں گے۔ ''علامت'' کے لیے کچھ اور لکھ کر بھیجوں گا۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

ہم سفر

داؤد

29 April, 2002

زندہ دل!

اکثر مندروں کے اندر ہی نہیں ان کی دیواروں پر باہر بھی مورتیاں درشن کے لیے ہوتی ہیں۔

''نقوش'' کے لاہور نمبر میں لاہور کے مندروں پر ایک مضمون فدا حسین اسیر کا لکھا ہوا شامل ہے، اس میں ان گیارہ مندروں کا تعارف ہے:-

چاندرات مندر، بھیرو کا مندر، بیکنٹھ داس کا ٹھاکر دوارہ، شوالہ پنڈت رادھا کشن، مندر کالی دیوی، سیتلا مندر، ٹھاکر دوارہ پنڈت رادھا کشن، رانی جھی کا ٹھاکر دوارہ، مندر باوا جھنگر شاہ، ٹھاکر دوارہ چور مور والا، شوالہ ترپولیہ۔ کبھی فرصت ملے تو دو چار مندروں کے موجودہ حال کی تحقیق کرو کہ ان کی مورتیوں کا کیا ہوا۔

ماڈل ٹاؤن کے سی بلاک میں شاید دو مندر تھے، ایک آریہ سماجی اور ایک سناتنی۔ معلوم کرو کہ یہ ڈھا دیے گئے یا ان کی عمارتیں کسی اور استعمال میں آ گئیں۔

بھارت کے مندروں کی تصویروں سے بھرپور چار پانچ کتابیں میرے پاس ہیں، ایک کتاب سے چار تصویروں کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ مندروں کی بیرونی سجاوٹ یعنی مورتیوں کے جھرمٹ دیکھ لو۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

خوگرِ مجاز

داؤد

27 March, 2002

خوبیوں والے!

علی گڑھ میگزین کے ایک پرانے شمارے میں جو ۱۹۴۷ء کا ہے، عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کو میری کہی ہوئی ایک نظم دکھائی دی۔ اس کی فوٹو کاپی انہوں نے مجھے بھیجی، اسے دیکھ کر میں حیران ہوا اور سوچتا رہ گیا کہ میری نظم علی گڑھ والوں کو کہاں سے ملی۔ حافظے کو ٹٹولا تو دھندلی سی یاد آئی کہ ۱۹۴۶ء میں میں مباحثے کے انعامی مقابلے کے لیے علی گڑھ گیا اور وہاں اس میگزین کے ایڈیٹر صاحب سے میرا تعارف ہوا تو انہوں نے چاہا کہ میگزین کے لیے کچھ لکھ کر بھیجوں۔

دوسری چیز جو بھیج رہا ہوں سرسید کی ایک نگارش ہے جس میں انہوں نے عارفوں کے دعوائے کشف پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ اس نگارش کے اخیر میں انہوں نے عربی کی ایک عبارت نقل کی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ عبارت ان کے ہاتھ کہاں سے آئی، اس کا ترجمہ یوں ہوگا۔

> اللہ اللہ! کیا دودھ کا چشمہ پھوٹتا ہے اُس طبیعت دار کی طبع سے جس نے کہا تصوف اسے کہتے ہیں کہ آدمی اپنے نفس کو امورِ خیالیہ کی طرف راجع کرے اور ان امور پر ایک مدت اپنا دھیان جمائے رکھے حتیٰ کہ وہ امور اسے یوں لگیں گویا کہ وہ اس کے نفس میں حقیقۃً موجود ہیں لیکن (سچ تو یہ ہے کہ) جو کچھ اس کے خیال میں موجود ہوا وہ خیال ہی خیال ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح وہ ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف بڑھ جاتا ہے اور ایک اور چیز کا تصور باندھتا ہے لیکن یہ دوسری چیز بھی کچھ نہیں سوائے اس شخص کے اپنے خیال کے اور جب یہ خیال ایک اور شے کی طرف ترقی کرتا ہے تو وہ آدمی خیال کرتا ہے کہ یہ (خود) اللہ ہے یا اللہ کی شانوں میں سے ایک شان ہے۔ ایسے میں وہ خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنے نفس کو بلند ترین درجے پر پہنچا دیا اور اللہ کی ایسی معرفت حاصل کر لی جیسا کہ اس کا حق ہے۔
>
> اللہ اس سے بَری ہے اور سچ تو وہی ہے (جو قرآن مجید کی آیت ہے) کہ لیس کمثلہ شیءٌ. ''کوئی شے اس کے مثل نہیں۔'' (آخری مضامین) اللہ والے کی قومی دکان (بارِ سوم، لاہور) غیر مورخہ۔ ص۔۹۲۔

علی گڑھ میگزین والی نظم بھی دیکھ لو۔ اس کی کاپی وجیہہ کو بھی بھیج رہا ہوں، وہ اسے پڑھ کر میری تحلیل نفسی فرمائے گا۔

''معاصر'' کا جو شمارہ تم نے ڈاکٹر جمیل کو بھیجا تھا وہ ان کے گھر سے کوئی اُٹھا کر لے گیا اور واپس نہیں لایا۔ اس میں تمہارا جو مضمون ہے اس کی فوٹو کاپی بنوا کر مجھے بھیج دو تو مہربانی ہوگی۔ میرے مضمون کی کاپی مجھے درکار نہیں اس لیے کہ اس کا مسودہ میرے پاس محفوظ ہے۔

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔

افتاں وخیزاں

راہ رو

خود پرستی

کنارِ آب پر یہ دو چٹانیں — ذرا آگے کو کیونکر جھک گئی ہیں
ہیں اپنے عکسِ روشن کی تلاشی — کہ اپنا عکس پا کر رُک گئی ہیں

خود اپنی ذات کا شیدا ہے پتھر — یہ کیا جانے ہمالہ کی بلندی
یہ خود اپنی پرستش کر رہا ہے — یہ کیا جانے گا رازِ دردمندی

وہ کوہِ سخت کی آتش فشانی — زمیں کے دل کی آہیں کھولتی ہے
وہ پتھر ٹوٹ کر ٹکرا رہے ہیں — وہ شعلے کی زباں کچھ بولتی ہے
اُدھر دیکھو تلاطم خیز دریا — بپھر کر بن گیا ہستی مجسم
رگِ جاں بن رہی ہیں اس کی لہریں — اُچھلتی ہیں بگڑتی ہیں دما دم

مگر یہ دو چٹانیں بے دل و عشق — نہ جانے آب میں کیا دیکھتی ہیں
دوئی کی لذتیں کیا ان کو معلوم — بس اک معکوس دُنیا دیکھتی ہیں

علی گڑھ میگزین، اگست ۱۹۴۷ء

3 July, 2002

پرسانِ حال!

میں جب تمہیں فون کرتا ہوں تم کہتے ہو سائیں حال دے، حال کیا دوں۔ صبح اُٹھ کر میکڈانلڈ سے کافی کے چار پیالے خرید کر لاتا، پھر دُکھیا بچی کو ناشتہ کراتا اور دُکھیا بیوی کو دوا پلاتا۔ پھر دوپہر اور شام کے تناولوں اور چاولوں کے تردد میں رہتا۔ بھلا یہ بھی کوئی احوال ہیں جنہیں فون پر دُہرایا جائے! ہاں تمہارے معیار پر اترنے والی بھی کچھ باتیں ہیں، ان کے اظہار کے لیے میں تمہیں ہر مہینے خط لکھتا ہوں اور چھیڑ جاری رکھتا ہوں۔

محمود نظامی کے مرتبہ ملفوظاتِ اقبال میں یا شاید کہیں اور عشق کے بحث پر اقبال کی ایک گفتگو نظر سے گزری تھی۔ پوچھنے والے نے اقبال سے پوچھا عشق کا الٹ کیا ہے؟ اقبال نے فرمایا عشق کا الٹ سوال ہے۔ جب میں نے یہ عبارت پڑھی تو سوچتا رہ گیا کہ سوال سے اقبال کی مراد ''پوچھنا'' تھی یا ''مانگنا''

انگریزی والی تصنیف کی اُٹھان کو ٹھیک کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ جس میں ہمارے والد مرحوم نے آنکھیں کھولیں، شرعی وضع کے بزرگوں اور برقعہ پوش بیبیوں کا زمانہ تھا۔ مخلوط ضیافتوں کا زمانہ نہ تھا۔ پاک دامنی اور وضو اور پنجگانہ پر زور تھا۔ جمعہ کی نماز اور تراویح کے لیے محلے کی مسجد میں حاضری فرض تھی۔ مولود شریف کی مردانہ اور زنانہ مجالس جا بجا برپا رہتی تھیں۔ جملہ ضروریات کے لیے پانی کنوئیں سے نکالا جاتا تھا۔ شہروں میں گائیں، بھینسیں، بکریاں، مرغیاں اور بطخیں بکثرت ہوتی تھیں۔ بیل گاڑیاں اور یکے اور ٹمٹمیں اور تانگے، گدھے اور اونٹ۔ سب کی یکجائی سے روزانہ میلہ لگا رہتا تھا۔ موڈل ٹاؤن اور گلبرگ کالونی جیسے ہنگستان

KUTABKHANA OSMANIA

ابھی تعمیر نہ ہوئے تھے، بازار حکیماں کی بیٹھکیں جما کرتی تھی۔ بازار اور منڈیاں اطراف شہر سے قریب ہوتی تھی، پیدل چل کر لوگ وہاں پہنچ جاتے تھے۔ سڑکوں پر نہ موٹر کار تھی نہ گھروں میں بجلی کے قمقمے اور پنکھے اور نہ فلش والے بیت الخلا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس امن اور ارزانی کا زمانہ تھا۔ برہمی اور پریشانی کا زمانہ نہ تھا، لوگ شاکر تھے، شاکی نہ تھے۔

ہزار برس سے زیادہ اسلامی معاشرے میں زنانہ اور مردانہ کے درمیان جو دیوار کھڑی رہی وہ دیکھتے دیکھتے ڈھے گئی۔ والد صاحب کے بچپن کے تجربات اُس دیوار والے معاشرے کے تجربات تھے جس میں ہماری قصوری برادری میں شادیاں خالہ زاد اور ماموں زاد اور چچا زاد اور پھوپھی زاد بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان ہی ہوا کرتی تھیں، معاشقے شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ مشاعروں کی محفلوں میں بیبیاں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ عورتوں میں عطر اور غازہ کا استعمال شیطانی فیشن سمجھا جاتا تھا، صرف سرمہ لگایا جاتا تھا یہ کہہ کر کہ یہ بصارت کے لیے مفید ہے۔ بیٹیوں کی تعلیم ناظرہ اور گلستان تک محدود تھی۔ فرشی نشست والے اس معاشرے کی تصویر کھینچنا آسان نہ تھا۔ یہ باب میں نے بڑی مشکل سے لکھا ہے۔

اب دوسرا باب پنجابیوں اور پنجابی زبان پر لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد اُردو اور علی گڑھ پر لکھوں گا۔ پھر والد مرحوم کے قیام کیمبرج کی کہانی کہوں گا جہاں انہیں فرنگی مستشرقین نے ادب برائے ادب اور علم برائے علم کا سبق یعنی دینی جھگڑوں سے بچ کر رہنے کا سبق سکھایا۔ لاہور کا اورینٹل کالج بھی آکسفورڈ اور کیمبرج کا مقلد تھا۔ علی گڑھ، کیمبرج اور اورینٹل کالج تینوں نے والد صاحب کو برٹش راج سے مانوس کیا۔

آخری باب تغزل پر ہوگا کہ والد صاحب کا ''مذہب'' یہی تھا۔ اس باب میں قرآن مجید، علم الکلام اور تصوف کے مضامین لازماً آئیں گے، ان پر کچھ کہنا میرے لیے نسبتاً آسان ہوگا۔ سب سے مشکل پہلے باب کا لکھنا تھا اس لیے کہ اس میں قصوری برادری اور باعفت بیبیوں کا تذکرہ شامل تھا۔

تائیدِ الٰہی شامل حال رہی اور زندگی رہی تو یہ کام دو برس میں تکمیل کو پہنچے گا اور اگر نہ پہنچا تو نقصان کسی کا نہ ہوگا۔ ہزاروں کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور چھپ کر بک رہی ہیں۔ سب کچھ تاریخ کی آندھی کی لپیٹ میں ہے، اکبر الٰہ آبادی کا فرمودہ ہے۔

بدھو میاں بھی خیر سے گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

فلاحت کو سلام، سلمان کو دُعا۔ تمارے مضامین اور افسانوں کے مجموعے جونہی طبع ہو کر بازار میں آئیں مجھے ہوائی ڈاک سے بھجوا دینا، مہربانی۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں، اب تفریحاً کچھ پڑھوں گا تاکہ نیند آ جائے۔

داؤد

30 August, 2002

ابوشاہد ابوسلمان!

کل شام بابرہ کے گھر کا فون نمبر گھمایا۔ عمر نے بتایا تم بیٹے سے ملنے واشنگٹن کو چلے گئے اور ۱۲ ستمبر کو

وہاں سے تمہاری واپسی ہوگی۔ عمر نے شاہد کا فون نمبر بتا دیا۔ ایک گفتگو اس نمبر پر بھی انشاء اللہ ہوگی۔ تم نے کہا تھا کہ امریکہ سے تمہاری روانگی ۱۰ یا ۱۲ ستمبر کو ہوگی لیکن عمر نے کہا تم ۷ ستمبر کو روانہ ہو جاؤ گے۔

کاش تم ادھر آسکتے اور ایک ہفتہ یہاں ٹھہر سکتے، ساحل پر بیٹھ کر اچھی طرح باتیں ہوتیں۔

انتظار حسین کی بیشتر کہانیاں میں نے پڑھ لیں۔ محمد کاظم کی تصنیف (مسلم فکر و فلسفہ) کو جستہ جستہ دیکھ لیا، آہستہ آہستہ ساری کتاب پڑھ کر اس سے استفادہ کروں گا۔

بڑا تحفہ تو جاوید کی آپ بیتی ہے، اشاعت سے قبل ہی تم نے مجھے پہنچا دی۔ سارے قارئین سے پہلے اسے پڑھنے کا امتیاز مجھے حاصل ہوا۔ یہ احسان تمہارا بھی ہے اور نیاز احمد صاحب کا بھی، انہیں شکریے کا خط ضرور لکھوں گا۔

جاوید سے کیمبرج میں میری ''معاصرت'' چار سال رہی۔ (۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء) اس مدت کے آغاز میں میں ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں میری حیثیت گرہستی کی ہوگئی تو جاوید سے ملاقاتوں میں کمی آگئی۔ میرے وہاں سے رُخصت ہونے کے بعد جاوید کا قیام وہاں مزید تین برس رہا۔ ان تین برسوں میں وہاں ان کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں، ان سے میں بے خبر ہی رہا۔

آپ بیتی کے ''جاوید منزل'' والے باب کو پڑھ کر میں نے لطف اُٹھایا، خصوصاً ''آنٹی ڈورس'' کا تذکرہ پڑھ کر۔ بھوپال کے قیام کا بیان بھی دلچسپ ہے۔ ڈراما نویسی اور مغربی رقص سے جاوید کی وابستگی مجھے معلوم تھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں۔

کتاب کا بڑا حصہ سیاسی حکایات سے پُر ہے۔ وزراء اور ججوں اور وکیلوں کے قصے اور پھر جاوید کے ان سفروں کی روداد یں جو سفیرانہ حیثیتوں سے کیے گئے۔ ان سب کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ لکھنے والے کی مصروفیتیں عمر بھر کیسی غیر معمولی رہیں۔

گوناگوں مصروفیات کے درمیان شاید بہترین فرحت جاوید کو امریکہ کے قیاموں سے حاصل ہوئی۔ انگلستان کے سات برس تو طالب علمی میں گزرے۔ ادھر کیمبرج کی ڈگری کے لیے مطالعہ، ادھر قانون کے امتحان کے لیے پڑھائی۔ دُہری مشقت، یونائیٹڈ نیشنز کی جنرل اسمبلی کے ایوان میں بیٹھنا اور وہاں مباحثہ میں حصہ لینا شاندار رہا۔ پھر اس کی ضیافتوں میں شریک رہنا یعنی عیش ہی عیش، موج ہی موج۔

مجموعی تاثر یہ ہوا کہ باپ کی وفات کے بعد جاوید کی زندگی میں خوشحالی رہی۔ اس خوشحالی کو روز افزوں رکھنے میں ان کی بیگم ناصرہ نے جن خوش تدبیریوں سے کام لیا اس پر شکرانے کا اظہار شوہر نے سچے دل سے کیا ہے۔

قصہ گوئی کے بیچ بیچ جاوید نے جا بجا اپنی طبیعت کے میلانات کا اظہار بر ملا بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کیا مثلاً۔

''مذہبی فرائض ادا کرتا ہوں لیکن اسی حد تک جو میری فطرت قبول کرے...... میں گرفتارِ مذہب نہیں۔'' (صفحہ ۷)

''بعض انسانوں کے اندر کا حیوان مذہبی چابک ہی سے قابو میں رکھا جاتا ہے، مگر دیگر منہ زوروں کو شرارت سے دور رکھنے کے لیے شاید ثقافتی بوس و کنار موزوں

KUTABKHANA OSMANIA

ہو۔'' (صفحہ ۷ تا ۸)

''میں مذہبی سے زیادہ ثقافتی مسلمان ہوں۔'' (صفحہ ۱۳)

''روحانی تجربہ سے محروم ایک عام انسان کی طرح میں کبھی کفر کبھی ایمان کبھی نیکی کبھی بدی کی سیڑھیاں اتر تا رہا ہوں۔'' (صفحہ ۵۸)

''میں سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں انسان انسان کے مابین فاصلوں کو دُور کرنا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا شاید مذہب کے لیے ممکن نہ رہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ مذہب کی جگہ تصوف لے لے اور اخلاقیات کا معیار ثقافت یعنی ادب اور فنون لطیفہ متعین کریں۔ اپنے آپ کو تہذیب یافتہ سمجھنے والے بعض افراد تو آج بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔'' (صفحہ ۸)

''اسلام پاکستان کی قومی ہم آہنگی کا باعث نہیں بن سکا۔'' (صفحہ ۹)

''پاکستان کی نظریاتی اساس دراصل مسلم ثقافت کا ہندو ثقافت سے امتیاز ہے۔'' (صفحہ ۹)

''انگریزی ادب کے مطالعہ نے میرے قلب و ذہن کو بڑی وسعت عطا کردی۔'' (صفحہ ۴۹)

کیمبرج میں جو تھیسس میں نے لکھا اس کی تیاری کی نگرانی دو پروفیسروں کے سپرد تھی، پروفیسر ریوبن لیوی اور پروفیسر آرتھر آربری۔ ان دونوں سے میرا تلمذ برائے نام ہی تھا۔ چار برس ہفتہ وار ان کے ہاں میں حاضری دیتا رہا، انہوں نے مجھے کچھ نہیں سکھایا۔ جاوید کے بیان سے معلوم ہوا کہ انہیں بھی اسی طرح کی مایوسی ہوئی، لکھتے ہیں۔

''کیمبرج کے قیام کے دوران مجھے آربری اور لیوی سمیت جن مستشرقین سے تبادلۂ خیال کے مواقع ملے میں ان میں سے کسی ایک سے بھی متاثر نہ ہوا۔'' (صفحہ ۷۰)

''منتخب کردہ موضوع پر تحقیق بھی ایک کٹھن فکری سفر تھا کیونکہ رہبر قابلِ اعتماد نہیں تھے۔'' (صفحہ ۷۰)

''آربری کا اپنا موضوع چونکہ اسلامی تصوف تھا اسے لیے انہوں نے تجویز کیا کہ میں امام غزالی کے نفسیاتی پہلو پر تحقیقی مقالہ تحریر کروں۔'' (صفحہ ۶۹)

''آربری چونکہ برطانیہ کی ٹوری پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے روحانی تجربہ کو محض نفسیاتی الجھن ثابت کرکے اس کی اہمیت کو ختم کردیا جائے۔'' (صفحہ ۶۹)

جاوید کے اس بیان پر میں اضافہ کرتا ہوں کہ دوسری جنگ عالم کے برسوں میں آربری کی ملازمت محکمۂ جنگ (War Office) میں رہی۔ اس سے ان کی ذہنیت میں سیاست سرایت کر گئی تھی۔ برٹش راج کے خاتمے کا غم بھی انہیں لاحق تھا۔ میں ملنے جاتا تو وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ پیتے رہتے تھے اصم بکم اور مجھ سے میرا مافی الضمیر اُگلواتے رہتے تھے۔

پروفیسر لیوی بھی خاموش طبع تھے لیکن سیاست سے انہیں اجتناب تھا۔

راجا نریندر ناتھ کے کہنے سے علامہ نے جاوید کی جنم پتری بنوائی۔ اس کی وجہ جاوید کے عندیے میں یوں آئی کہ باپ کو اپنے بڑے بیٹے (آفتاب اقبال) کی سرکشی اور ''بے راہروی'' کا غم تھا اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ چھوٹے کی اُٹھان ٹھیک رہے گی یا نہیں۔ اس توجیہہ کے بعد جاوید لکھتے ہیں۔

''بعض اوقات ذاتی محرومیاں ایک خود اعتماد انسان کو ضعیف الاعتقاد بنا دیتی ہیں۔'' (صفحہ ۱۲)

بیٹے کے دل میں باپ کی عظمت کا اعتراف سچا ہے دکھاوے کا نہیں لیکن اس کے ہوتے ہوئے بیٹے نے باپ کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی، اپنے منفرد مفکر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصاً کتاب کے آخر میں باپ کے نام ''دوسرا خط'' لکھ کر جو سوال اس خط میں اُٹھائے گئے ہیں شاید ایسی جرأت سے کھلم کھلا اور کسی نے نہیں اُٹھائے۔ البتہ اس خط میں خودی کے پیغام پر جاوید نے کچھ نہیں کہا۔ میری سوچ کہتی ہے کہ یہ پیغام صرف خاص الخاص خواص کے کام کا ہو تو ہو، عوام کے کسی کام کا نہیں۔ علامہ اقبال والی خودی کے لیے فرد کا غیر معمولی قابلیتیں لے کر پیدا ہونا لازمی ہے جیسی قابلیتیں خود علامہ کو ودیعت ہوئی تھیں۔ کیمیاگری سے سچ مچ سونا کبھی بن نہیں سکا، علامہ کا نسخۂ خودی نسخۂ کیمیا قسم کی کوئی چیز ہے۔

جاوید کی یہ شکایت بجا ہے کہ ملک میں لوگوں نے انہیں ''فرزندِ اقبال'' ہی کی حیثیت سے پہچانا اور بس، لکھتے ہیں۔

''میں جب بھی ملک سے باہر لیکچروں کے لیے بلوایا جاتا ہوں تو میری شناخت ''جاوید اقبال'' کے طور پر ہوتی ہے، مگر میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے اندر میری حیثیت ''فرزندِ اقبال'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' (صفحہ ۲۵۸)

''زندگی میں اچھا برا اپنا مقام پیدا کیا، تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے بہت برا لگا .... اب بوڑھا ہو چکا ہوں تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا نہیں ہونے دیا، ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا۔'' (صفحہ ۹)

میں سوچ رہا ہوں یہی مشکل شہزادہ سلیم کو بھی پیش آئی تھی۔ سلیم پر ظلِ الٰہی کا گھنیرا سایہ تھا۔ وہ دھوپ کو ترسا ہوا تھا۔ قدرت نے نور جہاں کو اس کی بیگم بنا کر اس کی زندگی میں دھوپ کا انتظام کردیا۔ جاوید کی زندگی میں سنہری دھوپ ان کی بیگم ناصرہ کے دم سے ہے۔

جاوید سے ملاقات ہو تو ان کو میرا اسلام پہنچا کر کہنا کہ کم سے کم ایک برخوردار لاہور کا ایسا ہے جس نے ہمیشہ جاوید اقبال کو اپنا برادرِ کلاں جانا اور اپنے آپ کو جاوید کا برادرِ خرد۔

یہ خط تمہیں تین چار دنوں میں ملے گا، اس سے پہلے فون پر باتیں ہوں گی۔ ڈاکٹر بابرہ اور ڈاکٹر جمیل کو میرا اسلام۔

تمہارا ابھی برخوردار

داؤد

KUTABKHANA OSMANIA

3 October, 2002

بخدمت ضیاء محی الدین!

خو! آج کل آپ کا خیالات کیا کہتا ہے؟ اور آپ کا حالات کیا کہتا ہے؟ آپ نے ایک کالم انگریزی میں لکھا تھا، اس میں بالا خانہ نشستہ بودم کی راویہ کا نام آپ نے پھوپھی سکینہ لکھ دیا تھا۔ بھائی یہ ریختہ ہم نے پھوپھی سکینہ سے نہیں پھوپھی رقیہ یعنی بشیر کی والدہ سے سنا تھا۔ لو ان کا سنایا ہوا ایک مکالمہ سنو۔

میاں جی، میاں جی، کجا می روی؟
کبوتر کا بچہ بلی لے گئی۔
حراموشطا نو کہاں لے گئی؟

جاوید اقبال نے آپ بیتی لکھی ہے، عنقریب اس کی طباعت مکمل ہو جائے گی۔ اعجاز اگست میں امریکہ آیا، میں ملاقات کے لیے اُڑ کر نیویارک پہنچا۔ جاوید کی آپ بیتی کے پروف اس نے مجھے پڑھنے کو دیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب جاوید نے پنجگانہ نماز پڑھنی شروع کر دی ہے۔

نماز کے آسن چار ہیں: اقامت، رکوع، سجدہ اور قعود۔ بیٹھک کو پہنچ کر جو وظیفہ زیرِ لب ادا ہوتا ہے اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

التحیات للہ و الصلوٰات و الطیبات

تحیات تحیہ کی جمع ہے۔ تحیہ کے معنی ہیں درازیٔ عمر کی دُعا۔ نماز ہمیں بھائی رفیق نے یاد کرائی تھی، التحیات کا جو تلفظ انہوں نے کسی مولوی سے سیکھا تھا ہمیں بھی سکھا دیا یعنی اتا حیات۔

مجھے معلوم نہیں تمہیں نماز کس نے سکھائی؟ قیاس ہے کہ سکھانے والے نے تمہیں بھی اتا حیات ہی یاد کرا دیا ہوگا۔ میں نے کئی پڑھے لکھے پنجابی دوستوں سے پوچھا، سب اتا حیات کے حافظ نکلے۔

خیال گائیکی میں بھی تلفظات کے لطائف کی کمی نہیں، برکھا کے راگ میاں کی ملہار کی بلمپت کے بول تمہیں معلوم ہیں۔

کریم نام تیرو
تو صاحب ستار

ستار کے معنے ہیں بھیدوں پر پردہ رکھنے والا۔ میراثی لوگ صاحب ستار کو صاحبِ ستار سمجھ کر گائے جا رہے ہیں۔ گویا اللہ میاں جو مینہ برساتے ہیں ستار بھی بجاتے ہیں۔

عذرا اور عالیہ کو تحیہ۔

خواہانِ سنگت

17 April, 2002

محبی و محترمی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! پرانے مکان کی فروخت اور ایک نئے اور چھوٹے مکان کی خرید اور نقل مکانی کے چکر میں پانچ چھ مہینے صرف ہوئے۔ اس لیے خط لکھنے میں دیر ہوئی، درگزر فرمائیں۔ عبدالوہاب خاں سلیم صاحب سے

KUTABKHANA OSMANIA

معلوم ہوتا رہا کہ آپ مجھے یاد فرماتے رہتے ہیں۔ میں اس فکر میں تھا کہ اپنے گانے کی صوت بندی کا ایک انتخاب آپ کے لیے تیار کروں۔ آج چار پانچ گھنٹے اس کام میں لگے۔ سنگیت سجاؤں اور گھریلو بیٹھکوں میں ریکارڈ کی ہوئی چیزیں سنیں اور پھر ان چیزوں میں سے چند چنیں اور ایک ٹیپ آپ کے لیے تیار کیا۔

ان میں کوئی ریکارڈنگ تیس برس پرانی ہے تو کوئی بیس برس پرانی۔ بعض پانچ چھ برس قبل کی بھی ہیں۔

امریکہ میں سنگت کے لیے بہترین سازندے شاذ ہی میسر آئے۔ بہر حال جو کچھ میسر آیا اس میں سے چند چیزیں حاضر ہیں۔

ٹیپ کے شروع میں "غالبی تال" کے عنوان سے ایک ریکارڈنگ ہے، یہ تال جو میرزا غالب کے نام سے موسوم کی گئی ایجادِ بندہ ہے، میرزا کی ایک غزل کو سن کر سوجھی۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

اس وزن سے منطبق جو تال بنی اس کے بول ریکارڈنگ کو سن کر آپ کو معلوم ہو جائیں گے۔

یہ ریکارڈنگ جشنِ غالب (۱۹۶۹ء) کے دنوں میں آل انڈیا ریڈیو کے دہلی سٹیشن میں ہوئی۔ ریڈیو والوں نے چاہا کہ یورپ اور امریکہ سے آئے ہوئے مندوبین ریڈیو سٹیشن میں آ کر پانچ پانچ منٹ کی برجستہ تقریر کریں۔

سٹیشن کے اندر ہم اس سٹوڈیو میں پہنچائے گئے جو تقریروں کے لیے مقرر تھا۔ اس کے ایک کونے میں طنبورے اور طبلے رکھے ہوئے تھے۔

وہاں پہنچنے سے پہلے میرا ارادہ تھا کہ تقریر میں جشنِ غالب کی شاندار تقریبوں کی اور میرزا غالب کی ہر دلعزیزی کی باتیں کروں گا۔ طبلے اور طنبورے دیکھتے ہی میرا ارادہ بدل گیا۔ اب جو پیشکش مجھے سوجھی اس سے آپ ٹیپ نمبر (۲) کے آغاز کو سن کر واقف ہو جائیں گے۔

کارکنانِ ریڈیو سے میں نے کہا، ایک طبلچی اور ایک سارنگیے کی سنگت مجھے درکار ہے۔ فوراً دونو موجود کر دیے گئے۔ طبلچی کا نام رمضان خاں تھا، یہ سٹاف آرٹسٹ تھا لیکن کم عمر تھا اور اُستادی کے پائے کا نہ تھا۔ میں نے اسے "غالبی تال" کے بول بتائے، یہ سن کر ہچکچایا۔ اس کی پیشہ ورانہ ذہنیت کو اس سے گھبراہٹ ہوئی کہ ایک عطائی اپنے آپ کو ایک نئی تال کا موجد کہتا ہے۔ بے دلی سے دو تین منٹ طبلے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "یہ کام مجھ سے نہ ہوگا جو کچھ آپ گا رہے ہیں، اس کے ساتھ جھپ تال بھی چلے گی۔ وہ بھی دس ماتروں کی ہے۔"

دروازے کے پاس داڑھی والا ایک ہندو طبلچی کھڑا تھا۔ اس نے صورتِ حال دیکھی تو آگے بڑھ کر بولا۔ "اس میں کوئی مشکل نہیں، میں بجا دیتا ہوں۔"

رمضان خاں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی جگہ یہ ہندو بیٹھا اور نہایت سہولت سے اس نے سنگت کر دی۔

دوسرے روز میں اپنے ایک دوست سردار اوتار سنگھ رکھی سے ملنے گیا، یہ ان دنوں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے۔ "غالبی تال" کی ریکارڈنگ کا قصہ انہیں سنا کر میں نے کہا، اس ریکارڈنگ کی ایک کاپی آپ بنوا کر مجھے عطا

کریں تو احسان ہوگا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے میری خواہش پوری کر دی۔

طبلے کے اُستاد اللہ رکھا خاں مرحوم کے داماد ایوب اولیاء صاحب میرے دوست ہیں۔ میں نے اس ریکارڈنگ کی نقل انہیں بھیجی اور چاہا کہ خاں صاحب بھی اس تال کو سن لیں۔ ایوب صاحب نے فون کر کے مجھے بتایا کہ خاں صاحب نے اس تال کو پسند فرمایا۔

تصوف میں ظرافت غزل ہی کے ذریعے شامل ہوئی۔ قوالی کے ساتھ مل کر غزل گائیکی نے درگاہوں میں سماں باندھا۔ ظرافت اور سماع کے بغیر تصوف بے مزہ سنوف ہے، کوئی صوفی ہو تو ظریف ہو یا پھر مجذوب ہو۔

مجذوبوں کا مستقل تذکرہ آج تک کسی نے تصنیف نہیں کیا۔ یہ کام بھی ہونا چاہیے۔

میں نے سنا ہے کہ بوعلی قلندر کے مزار تین ہیں۔ ایک کرنال میں، ایک بڈھا کھیڑا میں اور ایک پانی پت میں۔ بڑی درگاہ ان کی شاید کرنال میں ہے۔ ممکن ہے وہاں مجاوروں نے اس بزرگ کی حیات پر کوئی رسالہ شایع کیا ہو یا اس کے ملفوظات شایع کیے ہوں۔ اگر ایسی کوئی مطبوعات مل سکیں تو کسی کے ہاتھ بھجوا کر مجھے حسب سابق ممنون فرمائیں۔ والسلام۔

نیازمند

داؤد رہبر

25 June, 2002

مجی و مکرمی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! عبدالوہاب خاں سلیم صاحب سے فون پر شاید آپ نے فرمایا تھا کہ اب کے آپ انہیں خط لکھ کر جس لفافے میں بھیجیں گے اسی لفافے میں ایک کرم نامہ میرے نام بھی ہوگا۔ موصوف ہر سال عمرہ کرتے ہیں۔ گزشتہ ہفتے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر پھر عازم کعبہ ہوئے، واپسی کی تاریخ مجھے بتا کر نہیں گئے۔

میرے گانے آپ نے سن لیے ہوں گے۔ رسمی اور جم کر تلمذ مجھے کسی ایک اُستاد سے نہیں رہا لیکن میرے مراسم کئی اُستادوں سے رہے۔ جب بھی ان میں سے کسی سے ملاقات ہوئی اس سے میں نے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ اہل فن کہیں گے استاد ایک ہونا چاہیے اور اس سے اُسی کے گھرانے کی بانی سیکھنی چاہیے۔ اس کے بغیر استعداد یکسو نہیں ہوتی اور طبیعت میں آوارگی رہتی ہے۔

غائبانہ ارادت مجھے سب سے زیادہ آگرہ گھرانے کے اُستاد فیاض خاں صاحب سے رہی۔ مجھے اس گھرانے کا اویس قرنی سمجھ لیجیے، اس گھرانے کا انداز شاہانہ شکوہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ بادشاہی دور یعنی شہنائی اور نوبت کا زمانہ گیا، اب سامعین بھارت میں بانسری انگ کی گائیکی مانگتے ہیں۔ جمہوریت کے تقاضے بھی اثر رکھتے ہیں۔

میں نے اُستاد فیاض خاں صاحب کا گانا ریڈیو پر چند برس سن سن کر ان کے انداز کو اپنایا اور اس پر ریاض کیا اور اُستادوں کو اس انداز سے گانا سنا کر ان سے داد پائی۔

دیگر گھرانوں کی گائیکی سے بھی میری دلچسپی رہی۔ تفریحاً اس کو گلے سے ادا کرنے میں کوشاں ہوا، کیونکہ ہر بانی مزا رکھتی ہے۔

بعض راگنیاں خاص گھرانوں کے کام کی ہیں، مثلاً ہمیر کلیان کو مرہٹے ہی ٹھیک گاتے ہیں، آگرہ والے اسے گاتے ہی نہیں، کیدارہ کو پنجاب والے خوب گاتے ہیں وغیرہ۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں بوعلی قلندر کی سوانح عمری اور اقوال سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ قلندری سلسلہ دُرویشاں کی سرگرمیاں ایران اور ترکستان میں رہیں۔ تعجب ہے ہندوستان میں اس کا زور کم رہا۔ بوعلی قلندر اور غوث علی قلندر کے ناموں کے سوا اور کسی صوفی کے نام کے ساتھ قلندر کا جوڑ سننے میں نہیں آیا۔

پاکستان سے میرے عزیز کتابیں خرید کر مجھے بھیجتے رہتے ہیں لیکن اُردو کی بعض کتب ایسی ہیں کہ پاکستان میں ان کا ملنا محال ہے۔ مثلاً یاس یگانہ چنگیزی کے کلام کے مجموعے (نشترِ یاس اور آیاتِ وجدانی) اور سوامی دیانند کی تصنیف ستیارتھ پرکاش اور حیاتِ بوعلی قلندر۔ آپ سے یہ کتابیں مانگتے ہوئے جھجکتا ہوں، آپ کی مصروفیات غیر معمولی ہیں۔ اپنے کسی شاگرد کے تعاون سے اگر یہ چیزیں حاصل کر کے مجھے کسی مسافر کے ہاتھ بھجوا دیں تو بہت بڑا احسان ہوگا۔

آپ کے دردولت کا سائل

داؤد رہبر

26 July, 2002

محترم گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! ماہ جون میں ایک روز عبدالوہاب خاں سلیم صاحب نے فون کی گفتگو میں کہا، میں بہت مصروف ہوں، عمرہ کے سفر کی تیاری ہو رہی ہے۔ دراصل اس وقت ان کے کنبہ کے چند افراد عمرہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ خود عبدالوہاب صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ اب ۲۳ جولائی کو عمرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اگست کے وسط میں واپس نیویارک پہنچیں گے۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ مشفق خواجہ صاحب اپنے ایک آپریشن کے لیے ہسپتال میں تھے، وہاں سے آپریشن کے بعد کراچی ہی میں اپنی بہن کے گھر گئے۔ وہاں ایک ماہ سے زیادہ ٹھہر کر اپنے گھر واپس آئے۔ فون پر ان سے گفتگو ہوئی تو خبر ملی کہ کلیاتِ یاس یگانہ کی طباعت دو مہینوں میں مکمل ہو جائے گی اور ایک نسخہ اس کا مجھے بھجوا دیا جائے گا۔

والد مرحوم کے عینِ حیات صاحبزادہ واجد علی خاں صاحب جب بھی لاہور آئے ہمارے گھر ہی میں انہوں نے قیام فرمایا، ان دنوں وہ شاعر کی حیثیت سے معروف نہ تھے اور تخلص (اشک) شاید ابھی انہوں نے اختیار نہ کیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں خواجہ ناظم الدین نے کیمبرج میں اپنی تعلیم ختم کی تو ان کے ہندوستانی احباب نے ان کو الوداعی ڈنر کی دعوت دی۔ یہ دعوت والد مرحوم کی قیام گاہ میں ہوئی، اس لیے کہ ان کی لینڈ لیڈی ہندوستانی کھانا پکانے کی ماہر تھی۔ ڈنر کا گروپ فوٹو کھینچا گیا، اس کی فوٹو کاپی بنا کر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس میں واجد صاحب کی جلوہ گری دیکھ لیجیے۔

لندن میں ان کی اور والد صاحب کی دوستی ایک پنجابی طالب علم سے تھی جس کا نام بھول گیا ہوں،

KUTABKHANA OSMANIA

اس نے وکالت کی سند لے کر لاہور میں پریکٹس کی۔

واجد صاحب پہلی بار لاہور آئے تو انہوں نے ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی۔ والد صاحب نے اس وکیل دوست کو کھانے کے لیے مدعو کیا اور بتایا نہیں کہ واجد صاحب آئے ہوئے ہیں۔ وکیل صاحب اندر آئے تو والد صاحب سے بغلگیر ہوئے اور پھر اس توقع میں رہے کہ مہمان سے تعارف کرایا جائے گا۔ والد صاحب چپ رہے۔ وکیل صاحب نے چند لمحے حیران رہ کر ڈاڑھی والے مہمان کو پہچان لیا اور بغلگیر ہوتے ہوئے کہا ''ارے بدمعاش!'' یہ ڈراما ہم نے بھی دیکھا اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ لندن میں واجد صاحب کا زمانہ کیسی رنگ رلیوں میں گزرا ہوگا۔

ایک روز انگلستان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بولے ''زندگی ایسی گزری ہے کہ کوئی حسرت باقی نہیں۔'' ایک روز اپنی حسن پرستی جتاتے ہوئے بولے ''بدصورت عورت کے ہونے سے کیا فائدہ! اسے تو ہونا ہی نہیں چاہیے۔'' میں نے سن کر کہا ''بدمذاق لوگوں کی حق تلفی ہوگی۔'' اس جواب کا انہوں نے اور والد مرحوم نے لطف اُٹھایا۔

میری ایک تصنیف آج سے پندرہ برس پہلے مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آپ کی نظر سے نہیں گزری۔ اس کا عنوان ہے ''باتیں کچھ سریلی سی'' پچھلے سال اس کا پاکستانی ایڈیشن لاہور کے مکتبہ سنگ میل نے شائع کیا۔ اس میں میں نے چار ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ میں عنقریب لاہور سے اس کا ایک نسخہ آپ کو بھجوا دوں گا۔ اس کتاب میں آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ آگرہ گھرانے کے گویے ہمیر کلیان کیوں نہیں گاتے اور پنجاب کے گویے شدھ کلیان کیوں نہیں گاتے۔

آگرہ گھرانے کا انداز باوقار انداز ہے۔ اس کو بھاری بھرکم راگ درکار ہیں۔ ہمیر کلیان کا چلن چنچل ہے، یہ اُتر انگ (یعنی اونچے سُروں کا) راگ ہے۔

ایوب اولیاء صاحب لندن میں رہتے ہیں۔ استاد اللہ رکھا کی وفات کی خبر سن کر میں نے انہیں تعزیت کا خط لکھا تھا، اس کے بعد ان سے مراسلت نہیں ہوئی۔ ان کا پتہ یہ ہے۔

M.Ayub Aulia
291 Seely Road
London- SW7 9RB

والسلام مع الاکرام

نیاز مند

داؤد رہبر

7 August, 2001

محترم گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! ۱۹۱۹ء کے اواخر میں خواجہ ناظم الدین کیمبرج سے فارغ التحصیل ہوئے تو وہاں ان کو الوداع کہنے کے لیے ہمارے والد مرحوم کی اقامت گاہ میں ایک ڈنر کی تقریب ہوئی، اس کے گروپ فوٹو کی کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تصویر کے نیچے شرکائے ضیافت کے نام یوں درج ہیں۔

نشستگان: لطیف، واجد، ناظم، گائیکواڑ، احسان، اقبال

استادگان: جعفر، بشیر، اسحاق

خواجہ ناظم الدین جب پاکستان کے گورنر جنرل ہوئے تو آپ نہایت کیم شحیم ہو چکے تھے۔ کیمبرج کے دنوں میں چھریرے تو نہ تھے لیکن چاق چوبند تھے اور ٹینس خوب کھیلتے تھے۔

اس تصویر میں قدوائی خاندان کے مبشر حسین بھی ہیں۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں انگلینڈ میں ریل کا سفر کرتے ہوئے چلتی گاڑی سے کود کر خودکشی کر لی تھی، اللہ مغفرت کرے۔ ۱۹۶۹ء کے جشن غالب میں شرکت کو میں دلی پہنچا تو استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے مبشر مرحوم کے ایک صاحبزادے مہمانوں کی آسائش کے انتظام میں رضاکار ہو کر شریک تھے۔

جن لوگوں نے واجد علی خاں اشک رامپوری کو مشاعرہ پڑھتے دیکھا ہے، اس تصویر میں ان کا جلوہ دیکھ کر حیران ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام

نیاز مند

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

19 August, 2002

محترمی و گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب!

السلام علیکم! میرا خط مورخہ ۷ اگست مع فوٹو آپ کو مل چکا ہوگا۔ والد مرحوم کی سوانح عمری میں ایک باب علیگ برادری پر مجھے لکھنا ہے۔ کم ہی کوئی دانشگاہ دنیا میں ایسی موجود ہوئی ہوگی جس کا سیاسی اور تہذیبی اثر ایسا دُور رس اور اس پیمانے پر رہا ہو۔ یہ موضوع ایسا ہشت پہلو ہے کہ ایک کتاب بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکتی چہ جائیکہ ایک باب۔ اس پر قلم اُٹھانے سے پہلے مطالعہ کے ساتھ سوچ کی تپیا بھی درکار ہے۔

افسوس حیات جاوید کے انگریزی ترجمہ کا اب تک کسی کو خیال نہیں آیا۔ مہاتما گاندھی کی تعظیم مغربی دنیا میں انتہا کو پہنچی۔ بین الملل احترام کا جو انداز اور سبق سرسید کے ہاں ملتا ہے بے نظیر ہے۔ سرسید کی سیرت سے مغربی ممالک میں جو بے خبری ہے عبرت ناک ہے۔

آپ سے دو باتیں پوچھنی ہیں۔

۱۔ علی گڑھ کے نشان (Emblem) میں تین علامتیں ۱۹۴۷ء سے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ ہلال، کھجور کا درخت اور تاج تاجور برطانیہ۔ آزادی کے بعد یہ نشان متروک ہو گیا ہوگا، اگر ایسا ہوا ہے تو اس کی جگہ کیا نشان ایجاد ہوا؟

۲۔ علی گڑھ کے مشاہیر میں ایک زمرہ تو وہاں کے اساتذہ کا ہے جیسے آرنلڈ صاحب، مولانا شبلی، سید احسن مارہروی، سر ضیاء الدین احمد، مولوی میمن صاحب، مختار الدین احمد صاحب، ہادی حسن صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب، آل احمد سرور صاحب۔ دوسرا زمرہ ان بزرگوں کا ہے جنہوں نے علی گڑھ سے تعلیم پا کر کارہائے نمایاں کیے جیسے بابائے اردو، مولوی ظفر علی خاں، ان

کے علاوہ آپ کو نامور علیگ بزرگوں کے جو اسماء گرامی اور ان کی حیثیتیں یاد آئیں تو ان سے مجھے آگاہ فرمائیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

بابائے اردو کی بھرپور سوانح عمری بھی اب تک لکھی نہیں گئی، یہ اُردو میں لکھی جانی چاہیے اور اس کا نفیس انگریزی ترجمہ بھی ہونا چاہیے تاکہ اردو کی اہمیت اور بابائے اردو کی عظمت کا اعتراف مغربی ممالک میں ہو، ایسے کاموں کے لیے کمربستگی کی توقع بھارت ہی کے فضلاء سے ہے۔

والسلام مع الاکرام

نیازمند

داؤد رہبر

30 September, 2002

گرامی و محترمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! آپ کا کرم نامہ مورخہ ۸ ستمبر موصول ہوا، نہایت مفید معلومات اس سے حاصل ہوئیں۔

علی گڑھ کی داستان تو ہزار داستان بلکہ الف لیلہ ہے یعنی ایک ہزار ایک کہانیاں۔ سرسید کے حینِ حیات تو علی گڑھ میں کالج ہی تھا، یونیورسٹی نہ تھی۔ یہ کالج جس شان کے ساتھ تاریخ ساز ثابت ہوا اس کی مثال تاریخ عالم میں مشکل سے ملے گی۔ یہ کالج اپنے عصر کا بیت الحکمت تھا۔ سرسید کی شیر نر شخصیت بھی بے مثل ہے۔ میں سوچ رہا ہوں سرسید کی ملاقات گاندھی جی سے ہوتی تو اخباروں کی سرخیاں کیا کہتیں، یہ بزرگ ایک دوسرے سے کیا کہتے۔ ایک خیالی قصہ اُن کی ملاقات کا گھڑنا چاہیے۔

والد صاحب نے چھ برس علی گڑھ میں تعلیم پائی اور عربی میں ایم۔ اے کیا۔ چھ میں سے پہلے چار سال پروفیسر محمد حبیب صاحب ان کے ہم جماعت رہے۔ بی۔ اے میں حبیب صاحب نے بھی عربی لے رکھی تھی، دونوں میں مسابقت رہتی تھی۔

والد صاحب ریاضی میں بھی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے منظور نظر شاگردوں میں سے تھے۔ جب انگلستان سے واپس آکر اورینٹل کالج میں پروفیسر ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے جلد ہی انہیں علی گڑھ یونیورسٹی کے کورٹ کا ممبر بنوا دیا تھا۔ ۱۹۴۷ تک یہ رکنیت قایم رہی، کورٹ کی سالانہ میٹنگ کے لیے والد صاحب علی گڑھ جایا کرتے تھے۔

والد صاحب نے ہمیں بتایا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی دختر کی شادی کے روز میں ان کے حکم سے دیگوں کی نگرانی پر فائز تھا۔ ایک دیگ میں مرغ کا سالن مجھے قریب الختم ہوتا دکھائی دیا تو میں نے ایک آدمی بھیج کر ڈاکٹر صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے، دیگ کے اندر نگاہ ڈال کر آپ نے حکم دیا پانی کی بالٹی لاؤ۔ پانی کی بالٹی دیگ میں انڈیل کر سالن کی کمی پوری کر دی گئی۔

علی گڑھ میں والد صاحب کا داخلہ غالباً ۱۹۱۱ء میں ہوا اور اس حساب سے ایم۔ اے انہوں نے ۱۹۱۷ء میں پاس کیا۔ مجھے دراصل جاننا یہ ہے کہ ان چھ برسوں میں درجہ بعد درجہ آپ کے مضمون کون کون سے تھے اور ان مضمونوں کے نصاب کیا تھے اور ان کے پڑھانے والے اساتذہ کون کون تھے؟

یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پرانے ریکارڈ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی یونیورسٹیوں میں شاید ایسا نہیں ہوتا۔

یہ خط جو آپ کو لکھ رہا ہوں اس کی ایک فوٹو کاپی ڈاکٹر عطا خورشید صاحب کو اور ایک جناب مہرالٰہی صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ یہ علم دوست صاحبان کچھ پتہ لگا سکیں تو میری بے خبری دور ہو۔

مولوی شفیع صاحب کے حینِ حیات ان کے شاگردوں نے ایک شاندار مجموعہ مقالات بعنوان ''ارمغانِ علمی'' شایع کر کے انہیں پیش کیا تھا۔ ہمارے والد صاحب کا انتقال ۲۱ مئی ۱۹۴۸ء کو ہوا، اورینٹل کالج میگزین کا پروفیسر اقبال نمبر نومبر ۱۹۴۹ء میں نکلا۔ اس میں دو تحریریں مرحوم کے علیگ ہم درسوں کی شامل ہیں، بابائے اردو نے بھی ایک مختصر مضمون اس کے لیے لکھا تھا۔ بہترین مضمون اس شمارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہے۔ شفیع صاحب نے اس شمارے کے لیے کچھ نہ لکھا، کیوں نہ لکھا اس کی وجوہ گہری ہیں۔

یہ شمارہ غنیمت تھا، اس کے بعد پاک سرزمین کے ارباب علم پر سیاست سوار رہی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ن۔ م۔ راشد، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد والد صاحب کے شاگردوں میں سرفہرست تھے۔ پرمغز مقالات سے بھرا ہوا ایک یادگار نامہ پروفیسر اقبال شایع کرنے کا خیال ان شاگردوں میں سے کسی کو نہ آیا۔

اب کے لفافے میں ایک خط عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کے نام ملفوف نکلا اور ایک آپ کے برخوردار حسین امام صاحب کے نام۔ دونوں خط میں نے ان صاحبوں کی جانب روانہ کر دیے۔

موسیقی پر میری کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبۂ 'سنگ میل' (لاہور) نے شایع کیا۔ میں نے کل اپنے برادر محمد ایوب صاحب کو فون کیا اور ان سے درخواست کی کہ مکتبہ سے اس کتاب کا ایک نسخہ لے کر آپ کی خدمت میں علی گڑھ بھیج دیا جائے۔

والسلام مع الاکرام

نیازمند

داؤد رہبر

بخدمت گرامی ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

2 October, 2002

محبِ گرامی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! اس روز میں فون پر بولتا چلا گیا، یہی بتاتا رہا کہ والد مرحوم کی سوانح عمری کے ابواب کیا کیا ہوں گے؟ سمندر پار کی ٹیلی فونی گفتگو میں وہ بات کہاں جو حقہ نوشوں کی بیٹھک میں ہوتی ہے یعنی ہمدمی۔

والد مرحوم کا اپنی قصوری برادری سے رابطہ کم رہا۔ ایک اور برادری کو آپ اپنی حقیقی برادری سمجھتے تھے، وہ تھی علیگ برادری۔ علی گڑھ میں انہوں نے چھ سال طالب علمی کے گزارے (۱۹۱۱ تا ۱۹۱۷ء) ۱۹۲۲ء میں انگلستان سے واپس آئے تو ان کے استاد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے جلد ہی انہیں علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کا

KUTABKHANA OSMANIA

ممبر بنوادیا، کورٹ کی سالانہ میٹنگ کے لیے والد صاحب علی گڑھ جایا کرتے تھے۔

علی گڑھ نے انہیں کیا دیا، آج کل ایک باب اس پر لکھ رہا ہوں۔ انگلستان اور امریکہ کے قارئین کو علی گڑھ سے ایک ایسے پیرائے میں متعارف کرانا چاہتا ہوں جس سے مغائرت دُور ہو۔ علی گڑھ سے والد صاحب کے رشتے کی کہانی درمیان لاؤں گا تو علی گڑھ کالج کی کہانی محبت کی کہانی کا رنگ پکڑے گی۔

امّا بعد ستمبر کے آخر میں ہر سال پھلوں کی مارکیٹ میں انار دکھائی دیتے ہیں۔ کسی سال ترش اور کسی سال شیریں۔ الحمدللہ اس سال کی فصل میٹھی ہے۔ روز دو تین انار خرید کر لاتا ہوں اور کھاتا ہوں۔ اللہ سب کو اپنی پسند کے پھل کھانے کی استطاعت عطا فرمائے۔ (آمین)

۱۹۹۰ء میں ریٹائرڈ ہو کر یہاں آیا۔ تقریباً ہر سال دوستوں سے ملاقات کے لیے بوسٹن جاتا رہا اور مہمان ہو کر یونیورسٹی میں دو ایک لیکچر بھی ہر سال دیتا رہا، اب اتنے سفر کی بھی ہمت نہیں۔ بس یہی جی چاہتا ہے تصنیف میں لگا رہوں۔ آپ بھی تاریخِ ادبِ اردو کے شاندار کام میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی لگن میری لگن سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اخبار تو میں پڑھتا ہی نہیں، ٹیلی ویژن پر خبریں البتہ روز سنتا ہوں۔ ہارون الرشید کے شہر بغداد کی خبریں، بیت المقدس کی خبریں۔ خبریں سننے کے بعد خیام کی رباعیاں پڑھتا ہوں۔ کبھی فارسی میں، کبھی انگریزی میں۔

ایتھنز کے چوک میں سقراط مباحثہ گرم کیا کرتا تھا، اس کی منطقیت یورپ کی اقوام نے اپنائی، خود یونانیوں کا مزاج خانقاہی ہو کر رہ گیا۔

آپ اگلے سال امریکہ تشریف لائیں گے تو انشاءاللہ ملاقات ہوگی۔ بھابی صاحبہ کو میرا سلام، اہلیہ بھی سلام لکھوا رہی ہے۔

اپنی ایک پرانی نظم بھیج رہا ہوں، یہ پچیس تیس سال پہلے کہی گئی۔

آپ کا نیازمند

داؤد رہبر

7 March, 2002

میرے شفیق دوست محترمی مشفق صاحب!

السلام علیکم! رسالہ ''غالب'' کے لیے آپ کی فرمائش کی تعمیل میں یہ مضمون لکھا جو خط کے ساتھ ارسال ہے۔ اس کی نوعیت ایسی ہے کہ کمپوزنگ یا کتابت میں پوری احتیاط درکار ہوگی، اوّل تو اعراب کا لگانا ضروری ہوگا، زیر زبر میں پوری احتیاط نہ ہوئی تو مطلب خبط ہوگا۔ پھر پروف خوانی اور کمپوزنگ کی اغلاط کی درستی بھی پوری توجہ اور احتیاط چاہے گی، امید ہے آپ کے معاونین کے اعتناء سے اس کی طباعت بخوبی ہو جائے گی۔

''سلام و پیام'' کی جلد اوّل میں آپ کی خدمت میں لکھے گئے جو خطوط ہیں ان میں سب سے پہلے خط کی تاریخ ۱۷۔ جنوری ۱۹۶۱ء ہے۔ پس برادرم محمد ایوب صاحب کو بھیجنے کے لیے آپ جو خطوط انتخاب فرمائیں ان کی تاریخیں اس خط کی تاریخ سے قبل کی ہوں گی، مہربانی مہربانی۔

بیگم صاحبہ کو میرا سلام، ڈاکٹر جالبی صاحب اور ڈاکٹر فرخی صاحب اور آفتاب احمد خاں صاحب کو بھی سلام۔

نیازمند

داؤد رہبر

12 June, 2002

میرے محترم کرم فرما مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! آپ کے فون کا نمبر گھماتا رہا، گھنٹی بجتی رہی۔ اِدھر کسی نے ریسیور نہ اُٹھایا۔ میں نے قیاس کیا کہ آپ لاہور میں ہوں گے۔ آخر عبدالوہاب خاں سلیم صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ ہسپتال میں تھے اور آپریشن کے بعد آرام کے لیے ایک عزیز کے گھر میں مقیم ہیں۔ اُمید ہے اب کامل افاقہ ہو چکا ہوگا اور چلنا پھرنا، کھانا پینا اور ملنا جلنا اپنے معمول پر آ گئے ہوں گے۔

عبدالوہاب خاں صاحب سے ان گیارہ خطوط کے فوٹو موصول ہوئے جو آپ نے ڈھونڈ نکالے، میں احسان مند ہوں۔ ''سلام و پیام'' کی جلد دوم کا مسودہ مکتبۂ ''سنگِ میل'' کو پہنچ چکا ہے، یہ گیارہ خطوط اور مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے نام کے سولہ خطوط بطور ضمیمہ جلد دوم میں شامل کروں گا۔ ان کے شمول سے جلد دوم کو برکت حاصل رہے گی، باباے اردو کو لکھے گئے چند خطوط بھی مل جائیں تو افزودیِ برکت ہو۔

ہمارے والد مرحوم کی تاریخ ولادت ۱۸۹۴ء ہے اور تاریخ وفات ۱۹۴۸ء۔ برٹش راج کے ختم ہونے کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوا، زندگی کی وہ سادگی جو انہوں نے اپنے بچپن میں دیکھی کم ہوتی گئی اور تہذیب کچھ سے کچھ ہوگئی۔ مٹی کا دیا گل کر دیا گیا اور برقی قمقمے کا بٹن دبا دیا گیا۔ زمانے کے ان تغیرات سے وہ کس طرح متاثر ہوئے اس کہانی کے چار باب ہیں۔

فیروزپور میں بچپن اور لڑکپن کے بارہ برس، علی گڑھ میں طالب علمی کے چھ سال، کیمبرج میں تعلم کے چار سال، پھر لاہور میں تدریس کے اُنیس سال۔ ان میں سے ہر ایک دور اپنا اپنا رنگ رکھتا ہے۔ اورینٹل کالج کی سکالرشپ کی ایک اپنی ہی روایت ہے۔ اس دبستان کو دینی علوم کی تحقیقات سے حتی الامکان اجتناب رہا۔ والد صاحب کو اس ''دُنیوی'' سکالرشپ کی تربیت کیمبرج میں حاصل ہوئی۔ یہ اور ایسے کئی موضوع میرے خیال میں ہیں، ان سے سوانح عمری کے ابواب بنیں گے، انشاءاللہ۔

یہ خط آپ کو جون کے آخر میں ملے گا، اس وقت آپ کو فون کروں گا اور فون پر آپ سے باتیں ہوں گی۔

بیگم صاحبہ کو میرا سلام۔

شکرگزار

داؤد رہبر

27 September, 2002

گرامی جناب چودھری نیاز احمد صاحب!

السلام علیکم! ہمارے مہربان دوست اعجاز حسین بٹالوی صاحب اگست کے وسط میں امریکہ میں رونق

KUTABKHANA OSMANIA

مسند مشاعرہ پر غزل خوانی میری قسمت میں نہ تھی، اس کی تلافی سنگیت سبھا کی شرکت سے ہوتی رہی، رہے نام اللہ کا۔

بندہ

داؤد رہبر

6 October, 2002

عمیم الاحسان عبدالوہاب خاں صاحب سلیم!

السلام علیکم! تین عطیات موصول ہوئے۔ بریگیڈیئر اسمٰعیل صدیقی کی کتاب کے دو باب اور مختار نامہ۔ مختار نامہ کی تالیف آپ کی تشویق سے سرانجام ہوئی۔ آفرین۔

''ارمغان'' کے پہلے چار مقالات پر میں نے نظر ڈال لی، مرحوم کے پوتے مظہر محمود شیرانی کا مضمون ان میں اچھا ہے۔ اس میں ٹونک کا کچھ تذکرہ شامل ہے۔

اورینٹل کالج میگزین کا شیرانی نمبر فروری ۱۹۴۷ء میں نکلا۔ اس کے لیے سید عبداللہ، مولوی شفیع صاحب اور شیخ عبدالعزیز نے بہت اچھے مضمون لکھے۔

انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''اردو'' کا شیرانی نمبر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں نکلا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے لیے ایک مضمون ہمارے والد مرحوم سے لکھوایا۔ اس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔

ارمغان میں ان دونوں رسالوں کے یہ مضمون شامل کر لیے جاتے تو اس میں رس کی کمی نہ ہوتی۔ والسلام۔

خیر طلب

داؤد رہبر

15 June, 2002

برادرم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب!

السلام علیکم! آپ کی تندرستی کے لیے دعا گو ہوں اور اس کی اچھی خبر سننے کا خواہشمند۔ اُمید ہے گزند پا کی ناراحتی رفع ہو گئی ہوگی۔

بہت چاہا کہ ''مخزن'' کے لیے کچھ لکھ کر بھیجوں۔ انگریزی میں والد مرحوم کی سیرت لکھنے کا کام جاری ہے، یہ بڑا مشکل کام ہے۔ مرحوم کی حیات کی کل مدت چون سال کی ہے (۱۸۹۴ء تا ۱۹۴۸ء)۔ پاکستان کا یوم آزادی تو انہوں نے دیکھا۔ آگے چل کر ملک پر کیا گزری اس کا تجربہ ان کو جیتے جی نہ ہوا۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں زندگی گزارتے ہوئے انہیں لطف کن باتوں سے حاصل ہوا اور بیزاری کن باتوں سے ہوئی، یہ کہانی ایسے پیرائے میں لکھنا چاہتا ہوں کہ اس زمانے کے تہذیبی تغیرات کی تاریخ سامنے آ جائے۔

ایک طویل نگارش بھیج رہا ہوں۔ کاغذوں کی چھانٹی کرتے ہوئے یہ دکھائی دی تو مجھے خیال آیا کہ یہ ''مخزن'' میں چھپنی چاہیے۔

یہ ایک رسالہ ہے، جس کے ناشر ہمارے بہنوئی شیخ عبدالحمید مرحوم (آڈیٹر جنرل حکومت پاکستان)

افروز ہوئے اور ۷ ستمبر کو واپس لاہور گئے۔ نیویارک کے قریب اپنی بھتیجی (آغا بابر مرحوم کی دختر) کے گھر میں انہوں نے قیام کیا۔ ۲۴ اگست کو میں وہاں ان سے ملنے پہنچا، چند گھنٹے بہت اچھی ملاقات رہی۔

انہوں نے مجھے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی آپ بیتی دیتے ہوئے کہا: ''پروف کی شکل میں یہ مکمل نسخہ چودھری نیاز احمد صاحب نے خاص تمہارے لیے بنوا کر بھیجا ہے۔'' یہ تحفہ وصول کر کے میں نہایت متاثر اور ممنون ہوا، آپ کی ہر مہربانی میری خوش بختی ہے۔

''نسخہ ہائے وفا'' بغیر دیباچوں کے چھپ گئی تھی، عزیز مکرم افضال احمد صاحب نے مجھے خط لکھ کر اطلاع دی کہ اس کی طباعت دیباچوں کو شامل کر کے دوبارہ ہوگی۔ اُمید ہے سالِ رواں کے ختم ہونے سے پہلے اس کی طباعت سرانجام ہوگی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدرنشین ڈاکٹر مختار احمد صاحب نے میری موسیقی والی کتاب پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ اس پتے پر بھجوا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

Professor Mukhtar ud-Din Ahmad

4/286 Nazima Manzil

Amir Nishan Road, Dodhpur

Alihgarh 202002(U,P) India

کتاب کی قیمت اور ڈاک کے خرچ کی رقم میرے برادر محمد ایوب صاحب ادا کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملات کی برکت روز افزوں رکھے۔

نیاز مند

داؤد رہبر

20 June, 2002

پاسدارِ خاطرِ احباب عبدالوہاب خاں سلیم صاحب!

السلام علیکم! آپ میرے کلیات کے خریدار ہوئے اور پھر میری اس تحریر کے طلب گار۔ آپ کی مہربانیاں ہیں لگاتار۔

میری غزلوں میں آپ کو نہ کوئی گہرا تصوف ملے گا نہ کوئی گہرا فلسفہ۔ غزلیں کہہ کر میں نے اپنا جی بہلایا، مجھے اُمید ہے کہ میری غزلیں پڑھنے والوں کو اُداس نہ کریں گی۔ ہر غزل کہتے ہوئے میری خواہش رہی کہ کوئی چٹکلا حاصل ہو یا خیال کی کوئی قلابازی۔ فی غزل ایک چٹکلا حاصل ہوا تو میں نے جانا کہ کوشش رائیگاں نہ گئی۔

صدیوں غزل کا لطف اسی میں تھا کہ واعظ، ناصح، محتسب، قاضی، شیخ اور مفتی پر کوئی پھبتی ہو جائے یا رقیب کی بوالہوسی، دربان کی بے رحمی، نامہ بر اور قاصد کی بددیانتی جتائی جائے۔ میری غزلوں میں یہ روایتی مضمون آپ کو ملیں گے۔

مثنوی ''آسمان پیداست'' کہہ کر میں نے اگلے وقتوں کی سادگی کی یاد منائی ہے اور ''بزمنامہ'' میں فرشی نشست والی بزم آرائی کو یاد کیا ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

کے دادا شیخ عبدالمجید صاحب ہیں۔ انہوں نے رسالے پر جو دیباچہ لکھا ہے اس میں ان کا بیان ہے کہ ابتداً یہ رسالہ فارسی میں تھا اور اس کا اردو ترجمہ ہماری قصوری برادری کے ایک بزرگ شیخ حاجی محمد گورہ صاحب نے اردو میں کیا۔ حاجی صاحب معلوم نہ کر سکے کہ رسالے کا مصنف کون ہے۔ اس کے اُردو ترجمہ کو اشاعت کے لیے مرتب کرنے میں دو بزرگوں نے حصہ لیا۔ ایک مولوی حافظ غلام رسول صاحب اور دوسرے شیخ عبدالمجید صاحب۔ ترجمہ ۱۹۳۵ء میں لاہور سے شایع ہوا۔

شستہ اُردو میں لکھے ہوئے اس رسالے کو پڑھ کر میں سوچتا رہا کہ آج سے ستر اسی برس پہلے بزرگوں کی لسانی لیاقت عربی اور فارسی کے علم کی بدولت کیسی عمدہ ہوا کرتی تھی۔

رسالے کے مصنف نے ہماری قصوری برادری کا نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا ملایا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ایک جدِامجد شیخ اللہ داد ابن شیخ یار محمد حمیری کا عقد قصور کے ایک صاحب ثروت تاجر خواجہ محمود چاولہ کی دختر سے ہوا تو خواجہ صاحب کے گماشتوں نے اپنی تحریروں میں داماد یعنی شیخ اللہ داد کے نام کے ساتھ بھی چاولہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس تبدیلی کے باعث حمیری کی نسبت متروک اور غیر معروف ہوگئی۔

برسوں میں اس گمان میں رہا کہ ہماری برادری جو چاولہ برادری کہلاتی ہے، برنج فروشوں کی برادری ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے دوست وجیہہ الدین احمد صاحب ابن مولانا صلاح الدین احمد نے (جن کے پردادا نے اپنے جدی مذہب ہندومت کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا) مجھے بتایا کہ ''چاولہ ذات کو برنج فروشی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ذات اروڑہ ذات کی ایک شاخ ہے۔ چاولہ ایک خورش کا نام ہے جو گڑ میں چاول ملا کر پکائی جاتی ہے۔ چاولہ ذات کے ہندوؤں نے اس غذا سے پرہیز کو اپنی پہچان قرار دیا اور اسی بنا پر یہ لوگ چاولے کہلائے۔'' وجیہہ صاحب نے اتنا بتا کر کہا تمہارے اجداد ہندو تھے اور جب اسلام لائے تب بھی چاولے کہلاتے رہے۔

چاولہ ذات سے متعلق معلومات وجیہہ صاحب کو جس کتاب سے حاصل ہوئیں، اس کے مصنف کا نام A.K.Rose ہے اور کتاب کا عنوان ہے۔

"Glossary of Castes and Tribes of Punjab"

ہمارے والد مرحوم کو جب شیخ عبدالمجید صاحب سے یہ رسالہ اور اس کے ساتھ رسالے پر مبنی شجرۂ نسب موصول ہوا تو انہوں نے ان چیزوں کو چنداں اہمیت نہ دی۔

حافظ محمود خاں شیرانی صاحب نے یہ رسالہ پڑھ کر والد صاحب سے کہا، یہ شجرہ خواہ مخواہ کا توڑ جوڑ ہے۔ آپ کے اجداد ہندو تھے۔ سولھویں صدی میں انہوں نے اسلام قبول کیا۔ کہیے تو اس کی دلائل کے لیے قلم اٹھاؤں؟ والد صاحب نے ہنس کر جواب دیا، اس سے بہتر کئی مباحث آپ کی تحقیق کے لائق ہیں۔

رسالے میں شیخ یار محمد کے قبولِ اسلام کی حکایت اور ان کے داماد شیخ اللہ داد کی چاولہ خاندان کی دختر سے شادی کی حکایت پڑھ کر میں نے جی میں کہا، ان حکایتوں میں صداقت ہو یا نہ ہو یہ حکایتیں بہر حال رنگینی رکھتی ہیں۔

اس رسالے کے بیانات کی رو سے ہماری برادری کا جو شجرہ بنتا ہے اگر یہ جعلی ہے تو پھر ہم کہیں گے کہ لکھنے والے نے کمال کی افسانہ طرازی فرمائی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہماری قصوری برادری کے بعض اشخاص اپنے نام کے ساتھ ''چاولہ'' کی

بجائے ''گورہ'' لکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ احمر کی طرح لفظ حمیر بھی مادہ حمر سے مشتق ہے بمعنی سرخ۔

اگر آپ اس رسالے کو ''مخزن'' میں اشاعت کے لیے قبول فرمائیں تو میرے اس خط کو بطور تعارف شامل فرمائیں۔

والد مرحوم کی یاد میں آپ نے جو مضمون لکھا تھا اس کے پڑھنے کا مجھے بہت اشتیاق ہے۔ مرحوم کی سوانح عمری میں اس کا انگریزی ترجمہ شامل کرنا چاہتا ہوں۔

اللہ آپ کی تندرستی بحال رکھے۔

آپ کو چاہنے والا بھائی

داؤد رہبر

22 October, 2002

برادرم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب!

السلام علیکم! اُمید ہے آپ کی صحت بہتر ہوگی اور ناراحتی دُور ہوگئی ہوگی۔ میں نے وسط جون میں آپ کو ایک خط لکھا تھا اور اس کے ساتھ اپنے ایک بزرگ شیخ عبدالمجید مرحوم کا لکھا ہوا ایک رسالہ بھیجا تھا جس میں ہماری قصور کی چاولہ برادری کے اجداد کا آگا پیچھا بیان ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طوالت کے باعث یا کسی اور وجہ سے آپ نے اس رسالہ کو ''مخزن'' کے لیے مناسب نہ سمجھا۔

رسالے کے مؤلف شیخ عبدالمجید صاحب کی مراسلت سید حسام الدین راشدی صاحب سے ہوئی تھی جو ان دنوں سکھر کے روزنامہ ''ستارہ سندھ'' کے ایڈیٹر تھے۔ یمن سے کچھ لوگوں کا ہجرت کر کے بھکر (سندھ) میں سکونت اختیار کر لینا انہیں تحقیق معلوم تھا۔ انہوں نے ''ستارۂ سندھ'' میں شیخ صاحب کا بھیجا ہوا ایک استفسار بھی شائع کیا تھا اور جزیرہ بھکر کے بارے میں کچھ معلومات شیخ صاحب کو لکھ بھیجی تھیں (ملاحظہ ہو رسالے کے صفحہ ۱۴ کا فٹ نوٹ)۔

وجیہہ الدین احمد نے یہ رسالہ پوری توجہ سے پڑھا اور فون کر کے مجھ سے کہا، یمن کے ایک قبیلہ کا سندھ میں آ کر آباد ہو جانا اور پھر بعد ایک مدت کے وہاں سے پنجاب کے شہر قصور میں منتقل ہو جانا اور اس کے ایک فرد کا عقد قصور کی چاولہ برادری کی ایک دختر سے ہو جانا، یہ کوئی انہونی قسم کی بات نہیں۔

بہر حال یہ رسالہ بہت طویل ہے اور ''مخزن'' کے ایک شمارے میں اس کو جگہ دینا واقعی مناسب نہیں۔

پچھلے دنوں ''مخزن'' کا شمارہ نمبر۲ موصول ہوا۔ بہت ممنون ہوں، اب خاص ''مخزن'' کے لیے میں نے ایک مضمون لکھا ہے۔ خدا کرے یہ اشاعت کے لیے آپ کو مناسب لگے۔

والد مرحوم کی یاد میں آپ نے کچھ لکھ کر کسی رسالے میں چھپوایا تھا۔ اگر اس کے ڈھونڈنے میں آپ کو دشواری نہ ہو اور وہ تحریر آپ مجھے عنایت فرمائیں تو میں اس کا انگریزی ترجمہ کر کے والد مرحوم کی سوانح عمری میں اسے شامل کر سکوں۔

احباب کو میرا سلام۔

آپ کا بھائی

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

2 May, 2002

نعمان صاحب!

تسلیم! پچھلے ہفتے اعجاز حسین بٹالوی صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے یہ لطیفہ سنایا۔

الطاف گوہر کا تقرر ڈھاکے میں ہوا تو وہاں ان کے ایک دوست کو جنون کا دورہ پڑا، اسے پاگلوں کے ہسپتال لے گئے۔ گوہر صاحب وہاں عیادت کے لیے پہنچے اور دوست سے پوچھا ''کیا ہوا؟'' دوست نے جواب دیا ''مرشد نے ذکر کا شغل بتایا، ذکر بہت ہوا لیکن فکر میں کمی رہ گئی''۔

القفطی کی ''تاریخ الحکماء'' میں اخوان الصفاء کے عنوان سے ایک باب ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ جو غلام جیلانی برق صاحب نے کیا تھا میرے پاس ہے۔ اس میں سے اخوان الصفاء والے باب کی نقل بھیج رہا ہوں۔ اس باب کی آخری سطور میں اسی خیال کا اظہار ہے کہ ذکر میں فکر شامل ہو تو بات بنتی ہے۔

خدا کرے یونیورسٹی میں آپ کے مشاغلِ تحقیق و تدریس کی قدر دانی روز افزوں رہے اور آپ کا تقرر اس میں پکا ہو جائے۔

بندہ بشر

6 October, 2002

نعمان صاحب!

تسلیم ''نیا دور'' کا یہ شمارہ بہت پرانا ہے۔ اس پر کوئی تاریخ درج نہیں۔

شعر میں برہمی کا اظہار راشد کے ہاں ہے اور یگانہ کے ہاں۔ اقبال نے جواب شکوہ لکھ کر شکوہ کو واسوخت کر کے رکھ دیا۔

ضیاء محی الدین کو جو خط میں نے لکھا اس کے آخری حصہ سے آپ کو دلچسپی ہوگی۔

بھولا بھٹکا

23 April, 2002

عزیزہ عاتکہ صدیقہ سلمہا!

السلام علیکم! ''لاہور'' کا پچاس سالہ انتخاب نمبر موصول ہوا، بڑی مہربانی۔ طرح طرح کی مصروفیتوں کے باعث مکتوب نویسی ملتوی رہی۔ معذرت خواہ ہوں۔

میں نے سارا رسالہ پڑھا۔ اس میں نظم اور نثر کے نفیس نمونے ہیں۔ پرانے وقتوں کی طربناک اور عبرتناک یادیں بھی اس شمارے کے ذریعے تازہ کی گئی ہیں۔

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ان کے والد ماجد احمدی تھے۔ خود سالک صاحب کی وابستگی احمدیت سے کس طرح تھی، اس سوال کا جواب مجھے اب تک نہیں ملا۔

میں اپریل ۱۹۴۹ء میں پاکستان کو خیر باد کہہ کر پھر باہر ہی رہا۔ مختصر ملاقاتوں کے لیے گاہے گاہے وہاں گیا۔ چنانچہ بہت سے اچھے اصحاب کے تعارف سے محروم رہا۔

''لاہور'' کا یہ شمارہ پڑھ کر ثاقب زیروی مرحوم کی سیرت سے واقف ہوا۔ اس میں ان کا فوٹو دیکھا تو

معلوم ہوا کہ مرحوم حلیم الطبع اور عالی ظرف انسان تھے۔

جغرافیہ جو سکول میں پڑھا تھا اس کی ایک تفصیل یاد رہ گئی۔ وہ یہ کہ ضلع فیروزپور کی تین تحصیلیں ہیں۔ زیرہ، موگا اور مکتسر۔ زیروی کی نسبت غالباً تحصیل زیرہ سے نکلی ہے۔

وجیہہ سے فون پر اکثر گفتگو ہوتی ہے۔ ان کی بینائی اب اور بھی کمزور ہو گئی ہے۔ پھر بھی ان کی ہمت برقرار ہے۔ مطالعہ جاری ہے اور کچھ نہ کچھ لکھتے بھی رہتے ہیں۔

اب میں نے انگریزی میں ایک تصنیف شروع کی ہے۔ اُردو میں قلم چلاتا رہوں گا لیکن اس میں رفتار اب آہستہ رہے گی۔

اللہ آپ کی تندرستی قائم رکھے۔

خیرخواہ

داؤد رہبر

16 May, 2002

محترم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب!

السلام علیکم! لفافہ تحفہ کی صورت سے موصول ہوا، بڑی مہربانی۔ ''پراگندہ طبع لوگ'' پر آپ کا تبصرہ سراسر بندہ نوازی ہے۔ ''علامت'' محمد سعید شیخ صاحب کی کمر بستگی سے ظہور میں آیا تھا۔ یہ بیمار ہوئے تو دیگر ادیب مددگار نہ ہوئے۔ رسالہ بند ہو گیا، اس کا افسوس ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ تبصرہ ''جنگ'' یا کسی اور اخبار کے ایڈیٹر کو بھیج دیں تاکہ آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے۔

سر ظفر اللہ خاں مرحوم اپنے عصر کی سیاست المدن کے اُستاد یگانہ تھے۔ روشن جبیں، شیریں کلام، چوکس دماغ، فرض شناس، برملا گو اور اپنے انداز کے خطیب۔ جس کرسی پر وہ بیٹھے وہی کرسی کرسیٔ صدارت بن گئی۔

تحریک آزادی میں انہوں نے پیش بینی کے ساتھ حصہ لیا اور جہاں تک ہو سکا اپنی گہری بصیرت سے برطانوی حکام کو معقولیت کی راہ دکھائی۔ آپ نے ریسرچ سے جو معلومات جمع اور مرتب کی ہیں اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں۔

انگریزی مراسلتوں اور تقریروں کے اقتباسات کا اردو ترجمہ آپ نے چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔

جزاکم اللہ۔ اس سے کس معقول آدمی کو انکار ہوگا کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی آمد تک ہندوستان میں سیاسی ہنگاموں اور نعرہ زنیوں اور ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کے ہر محکمہ میں فرض شناس اور لائق عہدہ داروں کی کارگزاری درکار تھی۔ یہ کہنا کہ برطانوی دور کے آخری ایام میں ہر سرکاری ملازم کو روزِ روشن میں دفتر کی کرسی چھوڑ کر سیاسی جلوسوں میں نعرہ زنی کرنی چاہیے تھی، نامعقول بات ہے۔ اپنے منصبی فرائض کو تندہی سے ادا کرنے والے بھلے مانس اس زمانے میں ہزاروں تھے۔ دیس کے لوگوں کو ان کی فرض شناسی کا احسان ماننا چاہیے۔ سیاسی پلیٹ فارموں پر کود پڑنا بہادری ہے اور بہت قابلِ آفرین بات ہے لیکن اس کے لیے قدرت نے خاص شوریدہ سر لوگ پیدا کیے ہیں۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

چودھری صاحب کا غیر معمولی وصف یہ تھا کہ فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ انہوں نے بلند ترین سطح پر مشیرانہ حیثیت سے سیاست میں حصہ لیا۔ امن پسندی میں ان کا مرتبہ گاندھی جی کے مرتبہ سے کم نہیں۔ مورخین ٹھنڈے جی سے غور کریں تو اس رائے سے متفق ہوں۔

میرا نیا پتہ نوٹ فرمالیں۔

شکرگزار

داؤد رہبر

9 April, 2002

برادرم وزیر آغا صاحب!

السلام علیکم! اس سال کے آغاز میں آپ کی انگریزی نظموں کا گلدستہ تبریک نو کے ساتھ ملا۔ نہایت ممنون ہوا۔ میرا پتہ بدل گیا ہے۔ پرانا مکان بیچ کر ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہو گیا ہوں۔ آپ کا تحفہ پرانے پتے پر پہنچا۔ ڈاکخانے میں ڈاک کو نئے پتے کی جانب روبراہ کرنے کا پکا بندوبست ہے۔

خاصی مدت ہوئی ایک اور گلدستہ بھی آپ کا موصول ہوا تھا۔ (بعنوان: ایک کتھا انوکھی) اپنی اس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی آپ نے کیا تھا، وہ بھی میرے پاس ہے۔ فلوریڈا کی ایک یونیورسٹی میں ایک امریکی پروفیسر ''اسلام اور ارضیات'' پر ایک مقالہ لکھ رہا تھا، میں نے آپ کی نظم A Tale so Strange کی فوٹو کاپی بنا کر اسے بھیجی۔ آئندہ اس سے ملاقات ہوئی تو آپ کی اس نظم کے بارے میں اس سے گفتگو ہوگی۔

اکیسویں صدی آن پہنچی۔ آپ کی کتھا اندوہ بھی ہے اور تسلیم بھی، رجا بھی اور بیم بھی۔ اس لیے کہ آپ کے شاعرانہ اور ماورائی شعور میں کلجگ خاتمہ ہی نہیں، ست جگ کا پیش خیمہ بھی ہے۔

آپ اپنے سارے اُردو کلام کا انگریزی ترجمہ کر ڈالیں تو انگریزی مبصروں کی توجہ اچھی طرح آپ کی شاعری کی طرف منعطف ہو۔

کیا آپ آغا شاہد علی کی انگریزی شاعری سے واقف ہیں؟ انہوں نے سرطان کے مرض سے گزشتہ برس تینتالیس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ ایک امریکی یونیورسٹی میں انگریزی انشاء کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے اپنی لکھنوی والدہ کی مدد سے فیض کے کلام کا ایک انتخاب انگریزی نظم میں ترجمہ کیا۔ اصلاً یہ کشمیری تھے، اردو رسم الخط سے نابلد، دیوناگری البتہ پڑھ سکتے تھے۔ ان کے والد ڈاکٹر آغا اشرف علی ایم اے (علیگ) ماڈل ٹاؤن میں میرے ہمجولی تھے۔ اشرف صاحب کشمیر میں تعلیمات کے ڈائریکٹر ہو کر ریٹائرڈ ہوئے۔ اب انہوں نے سری نگر میں نادار بچوں کے لیے ایک پرائمری سکول کھولا ہے۔ امریکہ آتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں امریکہ کے مختلف کالجوں میں پروفیسری پر فائز ہیں، ماشاءاللہ۔

آغا شاہد علی کے کلام کے پانچ چھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ امریکہ میں ان کی شاعری بہت سراہی گئی ہے۔ ان کی چند نظموں کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔

''ادبی دنیا'' مرحوم ہوا تو ''اوراق'' اس کا جانشین ہوا۔ ''اوراق'' کو جاری رکھنا آپ ہی کا کام تھا۔

جستہ جستہ مضمون لکھنے کا اب میرے پاس وقت نہیں، انگریزی میں ایک مستقل تصنیف میں مشغول ہوں۔

امید ہے آپ کی اور بیگم صاحبہ کی صحت برقرار ہوگی۔

آپ کا بھائی

داؤد رہبر

بخدمت نوید ریاض صاحب

15 May, 2002

مکرم بھانجے جی، سلامت!

اپنے ہاں یادوں کا تو کوئی انت ہی نہیں، ایک بہترین یاد سنیے۔ ۱۹۷۵ء میں چند روز میرا قیام آپ کی امّی کے برکت کدے میں رہا۔ اُن دنوں اُمراؤ بندو خاں ہر ہفتے آپ کی امی کو راگ سکھانے آتے تھے، ایک روز ہماری میزبان نے کہا، آج سبق اُستاد کے گھر میں ہوگا۔ میں وہاں جا رہی ہوں۔ میں نے کہا، مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مجھے اُستاد سے کچھ پوچھنا ہے، چنانچہ رکشا پر سوار ہو کر ہم دونوں اُستاد کے گھر پہنچے۔

اُستاد سے میری گفتگو یوں شروع ہوئی۔

میں: میں آپ سے راگ بہار میں فیاض خاں صاحب کی ایک چیز سیکھنے آیا ہوں۔

اُستاد: کونسی؟

میں: وہ جس کی استھائی ہے ''سرسوں لے جائیے''

اُستاد: سرسوں نہیں، کرسوں یعنی ہاتھ سے۔

میں: مکمل بول عطا فرمائیے۔

اُستاد نے پورے بول مجھے لکھا دیے۔

استھائی: کرسوں لے جائیے گڑوا
پی پاس موتین کی لرسوں
ہاں کرسوں لے جائیے گڑوا

انترہ: موتیا مدن بان چنبیلی
اور کھلے گل لالہ
کہت شوق رنگ ایسی پھولی
آنگھن میں کرسوں سرسوں لے جائیے

(گڑوا کے معنی ہیں گلدان، مدن بان یاسمن کی ایک قسم کا نام ہے)
لر کے معنی ہیں لڑی، شوق رنگ بندش بنانے والے کا تخلص ہے)

بول میں نے لکھ لیے اور خاں صاحب سے کہا، اب انہیں گا کر بتائیے۔ آپ کی امی نے اور میں نے اُستاد کے ہمنوا ہو کر یہ بول گائے۔ یہ ہمنوائی بھول نہیں سکتی۔ یہ ہمنوائی بہار راگنی میں تھی۔

غمگسار ماموں

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

بخدمت وجیہہ الدین احمد صاحب

3 April, 2002

وجیہہ!

ابھی میں نے پستے کے ٹکڑوں والی آئس کریم کھائی اور ربِ کریم کا شکر ادا کیا۔ ذاتِ بحت ذاتِ رحمانی نہ بنتی تو پستے والی آئس کریم کیسے ایجاد ہوتی!

اگلے سال مارچ میں مجھے ایک یونیورسٹی میں ایک لیکچر دینا ہے۔ اس کے لیے موضوع یہ سوچا ہے۔

Monotheism and the Question of Divine Disposition

یعنی توحید اور خدا کے سجاؤ کا مسئلہ۔ فون کروں گا تو اس پر باتیں ہوں گی۔

اسلام آباد والے چیک تمہارے حساب میں جمع ہو جائیں تو کتابیں خرید کر ہوائی ڈاک سے مجھے بھجوا دینا۔ فہرست حاضر ہے، مہربانی۔

ایوب نے تین کتابیں خرید کر بھجوا دیں۔ صراطِ مستقیم، فتوحاتِ مکیہ کا ترجمہ اور تفسیرِ عزیزی، دو تین روز میں پارسل مجھے مل جائے گا۔

عطیہ کو سلام

طنبورہ نواز

فہرستِ کتبِ مطلوبہ

شیخ محمد اکرام:	ارمغانِ پاک
ابن العربی:	فصوص الحکم کا اردو ترجمہ
نظیری:	دیوان
فیضی:	دیوان
شاہ ولی اللہ:	سطعات
خواجہ عزیز الحسن مجذوب:	حیاتِ مولانا اشرف علی تھانوی (یہ چار جلدوں میں ہے)
محمود شبستری:	گلشنِ راز مع اردو ترجمہ
خواجہ شاہ محمد عبدالصمد:	اصطلاحاتِ صوفیہ
مولانا اشرف علی تھانوی:	بہشتی زیور، عرفانِ حافظ (اس میں اشعارِ حافظ کی تاویلات ہیں) مولانا تھانوی کی دیگر تصانیف جو تمہارے خیال میں میرے کام کی ہیں۔

بوعلی قلندر کی کوئی سوانح عمری یا ان کے ملفوظات مل سکیں تو کیا ہی بات ہے۔

محسن فانی کی کتاب دبستانِ مذاہب کے انگریزی ترجمہ کی فوٹو کاپی بنوا کر تم نے میرے لیے مجلد کرائی تھی، یہ بھی پارسل میں شامل رہے تو مجھے خوشی ہو۔

ابن العربی کی حیات اگر اردو میں کسی نے لکھی ہے تو وہ بھی مجھے چاہیے۔

2 July, 2002

اُستادِ تفنن وجیہہ!

شاعری اور موسیقی میں تو میں تلمیذ الرحمٰن ہی رہا لیکن ادب برائے تفنن کے میدان میں بے اُستاد نہیں ہوں۔ تم نے مجھے وہ راہ دکھائی جس پر چلنے والا ادب برائے ادب کے چکر سے نکل جاتا ہے اور آداب عرض کہتے ہوئے آنکھ مارتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک گفتگو میں تم نے کہا "میرے علم کی وسعت کی تعریف کر رہے ہو یا اپنی جہالت کا اعتراف؟" میں نے جواب میں کہا تھا "دونوں ہی باتیں ہیں۔"

میرے کئی دوست میری نگارشیں پڑھ کر میرے مبلغ علم کی تعریف کرتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں میرا علم ہے مبلغ ایک دونی اور یہ بھی کہتا ہوں کچھ سیکھنا ہے تو وجیہہ کے پاس جاؤ۔

جیسی آزاد خیالی تمہاری ہے اس کے لیے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کے کلاس روم ٹھیک ہیں۔ یہاں تم درس دو تو طلبہ تم کو جہاں اُستاد مانیں۔

مولوی رومی نے شمس تبریز کے کہنے پر اپنی کتابیں تالاب میں پھینک دی تھیں۔ میں اب تک کتابوں کی جمع آوری میں لگا ہوا ہوں۔ سچ ہے کہ سائنسی علم دریاؤ اور اب تو سائنسی علم کی جگہ سائنسی علم آ گیا ہے۔ یہ دریاؤ کا بھی باپ نکلا۔

چلنے پھرنے سے تمہاری معذوری کی خبر بری ہے۔ تم پہیوں والی کرسی (Wheel Chair) کیوں نہیں خرید لیتے۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ بیٹری سے چلنے والی اور دوسری وہ جسے کوئی خدمت گار دھکیل کر چلاتا ہے۔ بیٹری والی کو اس پر بیٹھا ہوا آدمی خود ڈرائیو کرتا ہے۔

عطیہ کو سلام۔

داؤد

9 August, 2002

وجیہہ!

دس کتابیں جو ایوب نے خرید کر مجھے بھیجی ہیں، ان کی فہرست اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔ مطلوبہ کتابیں جو اسے باوجود کوشش کے لاہور میں دستیاب نہ ہوئیں، ان کی فہرست ایک الگ لفافے میں ڈال کر بھیج رہا ہوں۔ فضلی بک مارکیٹ والوں کی مدد سے اگر ان میں سے کچھ مل جائیں تو سبحان اللہ۔

مطلوبہ اقتباسات:

(۱) روز (Rose) کی تالیف جس میں پنجاب کے قبائل، مسالک اور جاتیوں کی معلومات فراہم کی گئی ہیں، اگر کراچی میں مل جائے تو خیر ورنہ اس میں سے صرف ان صفحات کا فوٹو عنایت کرو جن میں اروڑہ ذات کی شاخوں اور ان کے شناختی اجتنابوں (Taboos) کی معلومات ہیں۔

(۲) ابن کثیر کی تصنیف (جس کا عنوان مجھے یاد نہیں) سے ہابیل کے مرثیے کا فوٹو چاہیے۔ اللہ میاں کو حضرت آدم علیہ السلام کی یہ سخنوری اچھی نہ لگی اور چنانچہ انہوں نے باوا کو مرتبہ نبوت سے معزول

KUTABKHANA OSMANIA

کردیا۔ یہ بیان بھی تمہیں شاید ابنِ کثیر کی تصنیف ہی میں ملا۔ اس کا فوٹو بھی مفید رہے گا۔

(۳) فون پر ایک روز تم نے کہا تھا کہ امام طبری کی تاریخ کے اُردو ترجمہ میں ایک حدیث (صفحہ ۱۷ پر) تمہاری نظر سے گزری تھی جس سے ثبوت ملتا ہے کہ رسول اکرمؐ شعر و شاعری کو پسند نہ فرماتے تھے۔ اس کا اقتباس بھی مجھے درکار ہے۔

ان تین اقتباسوں کی فوٹو کاپیاں مجھے مل جائیں تو میں خوشی مناؤں۔ جن کتابوں سے فوٹو کاپیاں بنوائی جائیں، ان کے سرورقوں کے فوٹو بھی حاصل ہو جائیں تو ان کی اشاعت کے مقامات اور تاریخوں کے حوالے حاشیے میں درج کرسکوں۔

باقی باتیں فون پر، عطیہ کو سلام۔

داؤد رہبر

مندرجہ ذیل کتابیں ایوب نے لاہور سے خرید کر مجھے بھیج دی ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ: سطعات
(۲) مولانا تھانوی: بہشتی زیور
(۳) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی: قصص القرآن
(۴) فتاوائے عزیزی
(۵) کفایۃ المفتی
(۶) ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی
(۷) شرح کلیات فارسی علامہ اقبال از یوسف سلیم چشتی
(۸) تفسیرِ عزیزی (چار جلدوں میں)
(۹) فتوحاتِ مکیہ
(۱۰) صراطِ مستقیم

7 October, 2002

وجیہہ!

مجھے اب صراحت سے معلوم ہوگیا کہ آنکھوں کی کمزوری کے باعث اب کتب بینی تمہارے لیے سہل نہیں، پھر کیوں تم سے ایسی مدد مانگوں جس کے لیے تمہیں ورق گردانیاں کرنی پڑیں۔ میرے پاس اب اپنے مطالب کے لیے اردو اور انگریزی کی جتنی کتابیں جمع ہوگئی ہیں کافی سے زیادہ ہیں۔

ایک نئی سہولت امریکہ میں یہ ہے کہ اب اس ملک کے ہر شہر کی مقامی پبلک لائبریریاں اپنے ممبروں کے لیے ملک بھر کی بڑی بڑی لائبریریوں سے کتابیں مستعاراً منگا کر مہیا کرسکتی ہیں۔ اس انتظام کے تحت سرسید کی سوانح عمری جو کرنل گریہم نے لکھی تھی، یہاں کی مقامی لائبریری نے منگا کر پچھلے ہفتے مجھے دی، ڈیڑھ مہینہ میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔

پرسوں میں نے تمہیں فون کیا تو تم نے بتایا کہ اے۔ کے۔ روز (A.K.Rose) اور کارمائیکل کی

کتابوں کے اقتباس تم نے ڈھونڈ رکھے ہیں۔ اگر ان کا بھجوانا بلا زحمت شاقہ ہو سکے تو بھجوا دو۔ مہربانی، قصور کی چاولہ برادری پر میں تمہاری مدد کے بغیر قلم اُٹھا نہیں سکتا۔

کاغذات کی چھانٹی کرتے ہوئے پچیس تیس برس پہلے کہی گئی اپنی ایک نظم دکھائی دی۔ خط کے ہمراہ تمہیں بھیجی جارہی ہے۔

عطیہ کو سلام۔

داؤد رہبر

بخدمت محمد ایوب صاحب

11 June, 2002

بنام برادرم محمد ایوب صاحب، معرفت عزیز گرامی نوید ریاض صاحب!

پیارے ایوب، سلام

مجھے مندرجہ ذیل کتابوں کی ضرورت ہے۔ ثواب کمانا ہے تو یہ کتابیں خرید کر مجھے بھجوا دو۔ وجیہہ الدین احمد کراچی سے عنقریب تمہیں چالیس ہزار روپوں کا ایک چیک بھیجے گا۔ یہ رقم اپنے حساب میں جمع کرا لینا اور کتابوں کی خرید اور ڈاک پر جو کچھ خرچ ہوگا، اس رقم سے وضع کر لینا۔

دُعاگو

داؤد

(۱)	شیخ محمد اکرام	ارمغانِ پاک
(۲)	خواجہ شاہ عبدالصمد	اصطلاحاتِ صوفیہ
(۳)	خواجہ عزیز الحسن	حیاتِ مولانا اشرف علی تھانوی (یہ چار جلدوں میں ہے)
(۴)	شاہ ولی اللہ	سطعات (اس کا اردو ترجمہ)
(۵)	ابن العربی	فصوص الحکم (اس کا اردو ترجمہ)
(۶)	اشرف علی تھانوی	بہشتی زیور
(۷)	محمود شبستری	گلشنِ راز (اس کا اردو ترجمہ)
(۸)	فیضی	فارسی دیوان
(۹)	شاہ اسمٰعیل	خطوط (مرتبہ میرزا حیرت)
(۱۰)	مولانا مظہر	مکاتیبِ مظہری
(۱۱)	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	قصص القرآن
(۱۲)	سوامی دیانند	ستیارتھ پرکاش

انگریزی:-

Glossary of Castes and Tribes of Punjab-edited by A.K.Rose

یہ تین جلدوں میں ہے۔

KUTABKHANA OSMANIA

10 July, 2002

عزیز مکرم اویس ملک صاحب سلمہ!

السلام علیکم! آپ نے اپنے خط میں مجھ سے انتہاء درجے کی تکریم کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ اسے پڑھ کر میں محجوب ہوا۔ میں کہاں کا ''حضرت'' ہوں۔ البتہ آپ کی سعادت مندی آپ کے پیرایۂ تخاطب سے ثابت ہے۔

آپ نے مجھ سے مجھے اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنانے کی اجازت چاہی ہے۔ اس طلب نے مجھے اور بھی زیادہ محجوب کیا۔ میں نے کوئی ایسا میدان نہیں مارا کہ مجھ پر مضمون اور مقالے لکھے جائیں۔

میں آج کل اپنے والد مرحوم کی سوانح عمری انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ اس کی تکمیل میں کم سے کم دو برس لگیں گے۔ مرحوم کی سیرت پر میں نے بہت غور کیا ہے۔ انہوں نے ساری زندگی برٹش راج کے زمانے میں گزاری اور دیس کی آزادی کی آمد سے نو ماہ بعد انتقال کیا۔

علی گڑھ میں ان کا تعلم چھ سال رہا۔ پھر کیمبرج میں چار سال، پھر لاہور کے اورینٹل کالج میں اُنیس برس۔ انہوں نے فارسی ادبیات پر انگریزی میں لیکچر دیئے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے فارسی اور عربی کی ایم۔ اے کلاسوں کی بیشتر تدریس انگریزی ہی میں ہوتی تھی۔

مرحوم نے سوٹ بھی پہنا اور شیروانی بھی۔ آپ حافظ قرآن بھی تھے اور خواجہ حافظ اور عمر خیام کے مرید بھی۔ تہذیب نو کی صرف ایک بات سے آپ متوحش تھے۔ یہ تھی پردے کا اُٹھ جانا اور مسلمان لڑکیوں کا بے نقاب ہو کر کالجوں میں تعلیم پانا، اسی ایک امر میں آپ قدامت پسند تھے۔ باقی امور میں ان کے ہاں ایک خاموش اور محتاط قسم کی آزاد خیالی برقرار رہی۔

ان کی سیرت پر قلم اُٹھانا میرے لیے آسان نہیں۔ ایک طرف احترام کے تقاضے ہیں اور دوسری طرف واقعیت کے بیان کے تقاضے۔ اس عصر کی سب ممتاز شخصیتوں کی ذہنیتوں میں اقدار کے تضادات تھے۔ ان تضادات کی چھان بین اور ان کا اعتراف اب تک ہمارے ادب میں اچھی طرح نہیں ہوا۔

ٹالسٹائے نے War and Peace کے عنوان سے ناول لکھا۔ ٹالسٹائے کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ جنگ اور امن کا ڈراما ٹالسٹائے کے وطن ہی میں نہیں اس کی ازدواجی زندگی میں بھی برپا رہا۔ ایک جنگ ملک میں تھی اور ایک ناول نگار کی اپنی بیوی سے تھی۔

ہمارے والد مرحوم کی زندگی میں بھی ایک ڈراما ہوا۔ یہ ڈراما علوم شرقیہ اور مغربی سائنس کی مسابقت کا ڈراما تھا۔ برطانوی دور کے ہندوستان میں یورپین سائنس کے علوم کو علوم شرقیہ پر تفوق حاصل ہوا۔

میرے دو بڑے بھائی (محمد اسحاق اور محمد یعقوب) سائنس کے آدمی تھے۔ اسحاق صاحب میڈیکل ڈاکٹر تھے اور یعقوب صاحب فزکس سیکھ رہے تھے۔ (اسحاق صاحب نے پاکستان اور امریکہ کے میڈیکل کالجوں میں اناٹومی پڑھائی اور یعقوب صاحب نے امریکہ کے کالجوں میں فزکس)

مجھے والد مرحوم نے عربی اور فارسی کے تعلم کی شاہراہ پر ڈال دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے سائنس والے دو بھائی عربی اور فارسی علوم کو مولویانہ چیزیں سمجھتے ہیں اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے

ان کا یہ رویہ سخت نامعقول لگا۔ اِدھر والد مرحوم اپنے دو فرزندوں کی سائنس دانی سے خاصے مرعوب تھے اور اپنے دیسی علوم کی ''پسماندگی'' سے قدرے محجوب اور انہی پر کیا منحصر ہے، ایسا احساسِ کمتری بے شمار لوگوں کو ان دنوں لاحق تھا اور آج بھی ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں میرے دل میں یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ ادیان شناسی کا میدان بھی سائنس ہی کا میدان ہے۔ بشرطیکہ اس میدان کے طلبہ اور محقق معقولیت اور روشن خیالی کو عزیز رکھیں۔

روشن خیالی آزاد خیالی کے بغیر کیسے آسکتی ہے۔ بڑی بڑی ملتیں آپس میں معاصر اور آمنے سامنے ہو کر ہر زمانے میں موجود رہی ہیں۔ عالمی تاریخ کی قوسِ قزح بھی ہفت رنگ ہے۔ اس میں اسلام کے سبز رنگ کے ساتھ دوسرے چھ رنگ بھی ہیں۔ ہر ملت نے دوسری ملتوں کے ساتھ معاصرت کے مزے لیے ہیں اور ملتوں کے درمیان افکار اور اقدار اور ذوق اور ذائقوں کے لین دین ہوئے ہیں۔ اس لین دین کی کہانی کو معلوم کر کے محظوظ ہونا چاہیے۔ اِدھر ہماری الف لیلہ ہے تو اُدھر پریم ساگر بھی ہے۔ اُدھر فردوسی ہے تو اِدھر ہومر اور والمیکی بھی ہیں۔ اِدھر مولوی رومی اور اقبال ہیں تو اُدھر ملٹن اور دانتے بھی ہیں۔ اِدھر مکہ ہے تو اِدھر بنارس ہے۔ اِدھر کھجور ہے تو اُدھر آم بھی ہے۔ اِدھر سلام ہے تو اُدھر پرنام بھی ہے۔

دکھ سکھ میں شریک

داؤد رہبر

24 July, 2002

بزرگوارم ڈاکٹر گیان چند صاحب!

تسلیم، ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے مجھے جو کرم نامہ بھیجا اس کے ہمراہ لفافے میں ایک خط آپ کے نام بھی ڈال دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ یہ آپ کے امریکی پتے پر روبراہ کر دیا جائے، سو یہ خط حاضر ہے۔

حیات جاوید کا ایڈیشن میرے پاس ہے اکادمی پنجاب کی جانب سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اکادمی مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے قائم کی تھی۔ مولانا نے ایک نسخہ مجھے عطا فرمایا تھا۔

میں اپنے والد مرحوم (پروفیسر محمد اقبال، اُستاد فارسی، اورینٹل کالج لاہور) کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ مرحوم نے چھ برس (۱۹۱۱ تا ۱۹۱۷ء) علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ علیگ برادری سے آپ کی وابستگی کیا معنی رکھتی تھی آج کل اسی کی سوچ میں رہتا ہوں۔ اس لیے جن کتابوں کا مطالعہ درکار ہے ان میں حیات جاوید سرِفہرست ہے۔ ان دنوں اس کی جدائی سے میرا کام رُک جائے گا۔ اس لیے معذرت خواہ ہوں کہ اصل کتاب میں آپ کو بھیج نہیں سکتا۔

البتہ کتاب کی فہرست مضامین کی دو فوٹو کاپیاں بھیج رہا ہوں۔ آپ ان میں سے ایک کاپی پر ان صفحات کی نشاندہی فرما دیجیے جو آپ کو درکار ہیں۔ میں ان کی فوٹو کاپی کا ایک سیٹ تیار کر کے آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔

نیاز مند

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

17 September, 2002

بخدمت گرامی ڈاکٹر گیان چند جین صاحب!

گرامی جناب ڈاکٹر صاحب!

تسلیم! ایک ہی روز دو کرم نامے موصول ہوئے، ایک آپ کی جانب سے اور ایک ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی جانب سے۔ انہوں نے حسب سابق آپ کے نام ایک خط اسی لفافے میں ڈال کے بھیجا ہے جس میں میرے نام کا خط آیا ہے۔ ان کی ہدایت کی تعمیل میں وہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں۔

مشفق خواجہ صاحب نے جو پلندا مجھے بھیجا تھا اس خط کے ساتھ ملفوف ہے۔

اُردو کے ساتھ جو کچھ ہوا، از روئے قانون قدرت ہوا۔ زمانے کی طغیانیوں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

آج سے سو برس پہلے کہا جاتا تھا اُردو دیس کی سب ملتوں کی زبان ہے۔ اب کہا جاتا ہے ہندی دیس کی سب ملتوں کی زبان ہے۔ مبالغہ اُس دعوے میں بھی تھا اور اس دعوے میں بھی ہے۔ پہلے ہندو خوشی خوشی عربی رسم الخط سیکھتے تھے اب مسلمان دیوناگری سیکھتے ہیں۔ موسم موسم کی بات ہے، زیر و بم کی بات ہے۔

آپ کی خیر و عافیت کا خواہاں۔

نیاز مند

داؤد رہبر

30 July, 2002

مکرم بندہ سیّد شمیم رجز صاحب!

السلام علیکم! ''میر کارواں'' کی جلد دوم کا عطیہ موصول ہوا۔ اس مہربانی کا دلی شکریہ۔ احادیث پاک کا ترجمہ آپ نے پاکیزہ زبان میں کیا، برجستہ اور سہل ممتنع۔ بچوں اور بالغوں کے لیے یکساں موثر۔ آپ کی طبع موزوں خیر و برکت کا چشمہ ہے۔ آپ محترم ہیں اس لیے کہ آپ احترام کے مبلغ ہیں۔

مدت ہوئی میں ٹیلی وژن پر کشتی کا پروگرام دیکھا کرتا تھا۔ تماشائیوں کی جانبداریوں کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ میچ کسی بھی کھیل کا ہو تماشائیوں کے دلوں میں ''ہماری ٹیم، ہماری ٹیم'' کی رٹ لگی رہتی ہے۔ فرقہ بندی اور تعصبات کی نفسیات بھی ''ہماری ٹیم'' والی نفسیات ہوتی ہیں۔

میرزا داغ کا شعر ملاحظہ ہو

سرِ نیاز سلامت رہے پئے تسلیم
نہیں تمیز مجھے دیر کیا حرم کیا ہے

اور میر تقی فرماتے ہیں

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا

والسلام مع الاکرام

بندہ

داؤد رہبر

5 September, 2002

بخدمت گرامی جناب شفیق نیازی صاحب!

ایڈیٹر رسالہ ''ہم لوگ'' کیلیفورنیا

محترم! السلام علیکم!

رسالہ ''ہم لوگ'' کے دو شمارے سابق میں موصول ہوئے۔ پچھلے دنوں اس کا شمارہ نمبر ۱۹، موصول ہوا۔ اس عنایت مسلسل کا شکریہ۔

سارے کا سارا رسالہ آرٹ پیپر پر چھپا ہے۔ شمارے کے کل صفحات بائیس ہیں۔ نگارشات بارہ صفحوں پر سمائی ہیں اور تصاویر دس صفحوں پر۔

مشورہ دیتے ہوئے مجھے جھجک ہے لیکن مشورہ دینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ اسے قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔

میرا خیال ہے کہ آئندہ کسی شمارے کی تزئین کسی دُلہن کی تصویر سے کی جائے تو اس تصویر سے سرورق کی زیبائش کا کام نہ لیا جائے بلکہ رسالے کے اندرونی جانب تصویر کو ذرا چھوٹا کر کے اسے چھاپا جائے۔ ع

نئی نویلی ہووے دُلہن تو گھونگٹ اچھا لگتا ہے۔

چھوٹے سے رسالے کے اندر پانچ صفحات پر شادیوں کے فوٹو، آگے چل کر تین اور صفحے دیگر تقریبوں کی تصویروں والے! سرورق پر ڈھیر سارے طلائی زیوروں سے لدی ہوئی دُلہن کی تصویر! سنجیدگی سے غور فرمایئے۔ رسالے میں نگارشات کے صفحات تصاویر کے صفحات سے کہیں زیادہ ہونے چاہئیں ورنہ رسالہ پر مغزنہ لگے گا۔ آگے آپ کی مرضی۔

خیر خواہ

داؤد رہبر

30 September, 2002

محترم جناب راغب شکیب صاحب!

السلام علیکم! ''ارتکاز'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس کا احیاء مبارک ہو۔ معذرت خواہ ہوں کہ شکریے کا خط فوراً نہ لکھ سکا، میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ عمر چھہتر کو پہنچی چند ضروری کام معطل ہیں۔ مدت سے اپنی ضعیفہ بیوی کا تیماردار ہوں۔ گرہست کے کام دھام سے جو وقت بچ رہتا ہے وہ ایک انگریزی تصنیف میں صرف ہوتا ہے۔ یہ کام پانچ چھ سال ملتوی ہوتا رہا۔ اب اس کی تکمیل کو پوری یکسوئی درکار ہے۔ تاہم آپ کی فرمائش کا پاس بھی دل میں ہے۔ اُردو نثر کی کوئی غیر مطبوعہ چیز اس وقت میرے پاس نہیں البتہ کاغذوں کی چھانٹی کرتے ہوئے پچیس تیس سال پہلے کہی گئی ایک نظم نظر کے سامنے آئی۔ پسند آئے تو اسے آئندہ شمارے میں شامل فرمائیں۔

والسلام مع الاکرام

خیر خواہ

داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

ظہورِ حیات

حرفِ آزادی کی سرگوشی فضائے بیکراں
لطفِ معنی کی ضیافت فاصلوں کے درمیاں
آسمانوں کی فضا کا خاص منظر کہکشاں
نور کے بکھرے ہوئے ذروں کا دریائے رواں
قلزمِ ادوار کی موجوں کا رقصِ بے نیاز
جس کی گہرائی میں ہر چشمِ صدف ہے نیم باز

کاروانِ کثرتِ امکاں ازل سے گامزن
داستانِ عقلِ حیراں نغمۂ سازِ سخن
اتفاقات و عجائب کے تواتر سے زمن
منتظر رکھتے ہیں ہم کو صبح و شام اے جانِ من
نسل بعد از نسل تقویم نوی سے بہرہ ور
فصل بعد از فصل تخمِ تازہ کا تازہ ثمر

ہست کی پہلی نمود آرائشِ دشتِ عدم
اک بیاباں جس کے سینے میں تمنائے ارم
عالمِ ہُو جس کے دل میں خوابِ تعمیرِ حرم
اک خمیرِ قوت وجدان اسبابِ کرم
خامشی کی ایک انگڑائی جو ہے تمہیدِ ناز
اک اندھیرا آشنائے رازہائے دلگداز

شاہکار اوّلیں یہ پردۂ اسرارِ غیب
اہتمام خاص ہے تدبیرِ کاروبارِ غیب
کیوں کہے جبریل کیا ہے رونقِ بازارِ غیب
صورتِ ایماں نہ ہووے کی بجز پندارِ غیب
چھن کے اُس پردے سے آتا ہے اِدھر نورِ صفات
اس لیے دنیا میں ہیں قوسِ قزح کے رنگ سات

ذرے ذرے کو ودیعت ہے نفوذِ التہاب
بزمِ نار و نور کے شاہد ہزاروں آفتاب
جاری وساری کشش کا اک نظامِ اضطراب
رقص کے رسیا، مجسم عشق، شعلے بے حساب
پھینکتا ہے کون آتش بازیِ عیدِ دوام
ہے بپا اک جشنِ پراسرار اُدھر بالائے بام

اک تحول کا کرشمہ ہے ظہورِ اعتدال
جوش کا ٹھہراؤ، رفتہ رفتہ شعلے کا زوال
غیظ کی واماندگی، آثارِ موجِ انفعال
روحِ قدرت میں نئے جذباتِ ایجادِ جمال
تھا جہاں شعلہ فروزاں، ہے وہاں اب آبشار
مرحبا اے لطفِ ہستی، آئی ہے پہلی بہار

زندگی کے واسطے اک ساز گار آب وہوا
قلب وترکیبِ عناصر کے عمل کی ابتدا
کار فرما کیمیاگر کا فسونِ بے خطا
ذرہ و قطرہ میں جذبہ باہمی تاثیر کا
آتشِ خوابیدہ ہی کا نام ہے یارو جماد
اب عناصر دیکھتے ہیں ایک خوابِ اجتہاد

اُسوۂ حسنِ صلابت کوہِ سنگ ناتراش
جس کے اعضا کی تڑپ ہے زلزلے کا ارتعاش
اف نہیں کرتا جو پاکر ضربِ تیشہ سے خراش
اور ہوتا ہے کبھی سوزِ دروں سے پاش پاش
بطن میں جس کے نہاں اصنامِ نازائیدہ ہیں
جس کے سینے میں درخشاں جوہرِ نادیدہ ہیں

سنگ ہی کا معجزہ تولیدِ تخمِ اوّلیں
جس کی کوئی ماں نہیں جس کا کوئی باوا نہیں
ناگہاں سر چشمۂ ذوقِ نمو زیرِ زمیں
ہاں گزرتا ہے گماں یہ تخم ہے خود آفریں
نرم پہلوئے حجر سے پھوٹی ہے شاخِ نبات
اور ہی اک شان سے امروز نازاں ہے حیات

ہیں زمرد کی رگوں سے رُستہ اوراقِ شجر
آئے ہیں یہ سایۂ جاں بخش کی لے کر خبر
برگزیدہ سبز ہے سامانِ آرامِ بصر
پانہیں سکتا مقام اس کا کوئی رنگِ دگر
زردِ زریں روئے ماہ و نیلگوں روئے فلک
کیفِ خضرائے چمن ان کی ملاوٹ کی جھلک

KUTABKHANA OSMANIA

جانِ احساس لطافت شغل توصیف نبات
اہتزاز و نکہت و رنگ و نزاکت کی برات
شاخ کی انگشت کے زیور، شگوفہ، پھول، پات
جلوۂ حسنِ ثمر، سایہ، سراسر طیبات
فرحت پائے برہنہ نرم سبزے کی بساط
دورِ جامِ نو بہاراں، برگِ تجدید نشاط

باغ و نخلستاں نہیں ذوقِ سفر سے آشنا
شاخ و بُن کب ہیں اصولِ بال و پر سے آشنا
کون یہ جانے سمن ہے خیر و شر سے آشنا
ہاں فقط موسم کے ہے زیر و زبر سے آشنا
ہو نہ ہو آپس میں کچھ تو بات کرتے ہیں درخت
غالباً ہنس بول کر دن رات کرتے ہیں درخت

آخرش ذروں نے سازش کی نئی سر جوڑ کر
ایک دن زنجیر ہائے بیخ و بن کو توڑ کر
بھاگ نکلی زندگی خود بھاگ اپنے پھوڑ کر
قصد نے پاؤں نکالے اک طرف منہ موڑ کر
خوش ہوا دن کا اجالا، جانور پیدا ہوا
چشم و گوش و ہوش والا جانور پیدا ہوا

اس نئی خلقت کے عنصر، گوشت، خون اور استخواں
لاکھ ان کی بستیاں اور لاکھ ان کی بولیاں
بال و پر اور پاؤں ان کے خوگرِ نقلِ مکاں
ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں کرتے ہیں خواہش بیاں
مار و مور و مرغ و ماہی، شیر غاب و موش و میش
مائل اشغال جفتی، ہم کنارِ یارِ خویش

دوریاں، نزدیکیاں ہیں، ہجر ہیں، دیدار ہیں
امتیازات من و تو کے نئے اظہار ہیں
نعرۂ زورِ انا کے اک طرف آثار ہیں
اور اُدھر قصدِ فنا کے رنگ ہیں، ایثار ہیں
گوشت کے پتلے ہزاروں لقمہ ہائے یک دگر
زندگی کے صحن میں قربانیاں شام و سحر

زیست کی سرشاریوں کا مبتدا: مُل کا عمل
درمیانِ جام و مینا وحیِ قلقل کا عمل
منحصر شوقِ محبت پر تناسل کا عمل
جزو کی تولید سے آگے چلا کل کا عمل
مامتا کے ولولوں سے شیر کا سینے میں جوش
باپ شوقِ پرورش میں جاں فشان و سرفروش

تھی فضا میں ایک انجانی ادا، طرفہ ترنگ
دہر میں اک لہر تھی، اک آرزوئے شوخ و شنگ
دل میں آخر چار پائے کے اُٹھی تازہ امنگ
ایک دن حیواں نے اپنی بے بسی سے آ کے تنگ
سطحِ میداں سے اُٹھائے اپنے اگلے دونو پیر
حضرتِ آدم ہوئے جلوہ نما، یادش بخیر

KUTABKHANA OSMANIA

2 October, 2002

محترمی جناب ڈاکٹر عطا خورشید صاحب!

السلام علیکم! آپ سے میرا تعارف جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے کرایا ہے اور ادھر امریکہ میں جناب عبدالوہاب سلیم خاں صاحب سے میرا رابطۂ دوستی مسلسل ہے۔ ان دونوں مہربانوں نے آپ کی علم دوستی کی ثنا فرمائی ہے اور مجھے ہمت دلائی ہے کہ میں آپ سے مدد کی درخواست کروں۔

میرے والد مرحوم پروفیسر محمد اقبال پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر تھے۔ علی گڑھ میں ان کی طالب علمی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک رہی۔ ۱۹۱۷ء میں انہوں نے وہاں سے عربی میں ایم۔اے پاس کیا۔ میں مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ ان کے تعلم کی روداد کے لیے مجھے جاننا ہے کہ علی گڑھ میں

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک عربی کا نصاب کیا تھا؟
(ایف۔اے۔ کے لیے) تاریخ کا نصاب کیا تھا؟
انگریزی کا نصاب کیا تھا؟
ان نصابوں کی تدریس کن اُستادوں کے سپرد تھی؟

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک عربی کا نصاب کیا تھا؟
(بی۔اے۔ کے لیے) تاریخ کا نصاب کیا تھا؟
انگریزی کا نصاب کیا تھا؟
ان نصابوں کی تدریس کن اُستادوں کے سپرد تھی؟

۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک عربی کا نصاب کیا تھا؟

السلام علیکم! قومی زبان کے باقاعدہ پڑھنے والوں میں ہوں اور اپنے محسنِ عظیم مولوی صاحب قبلہ کے خاص نیاز مندوں میں اپنا شمار کرتا ہوں۔

(۱) انقرہ آنے سے پہلے میں مانٹریال (کینیڈا) میں تھا۔ آپ کی عنایت سے قومی زبان مجھے وہاں باقاعدہ ملتا تھا۔ کینیڈا سے چلے آنے کے بعد قومی زبان اب تک مجھے مانٹریال ہی کے پتے پر بھیجا جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ مانٹریال سے ہو کر یہاں آتا ہے جس میں کم سے کم دو مہینے لگ جاتے ہیں۔ آپ کی خاص مہربانی ہوگی اگر شعبۂ ترسیل میں میرا موجودہ پتہ درج کرا دیں۔ زحمت معاف۔

(۲) قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں میں نے ایک تصویر مع نوٹ بھیجی تھی جو ہماری یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے بچپن کی ہے۔ تصویر میں مرحوم ڈاکٹر انصاری بھی شامل ہیں۔ یہ تصویر استنبول میں کھینچی گئی۔ پروفیسر موصوف (دانیال بدیز) کی مساعی حسنہ کو انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی تاسیس میں جو درجہ حاصل ہے، اس کو میں ہی جانتا ہوں۔ میری استدعا ہے کہ یہ تصویر قومی زبان میں مشمولہ نوٹ کے ساتھ شائع کی جائے۔ تصویر کی ایک کاپی مع نوٹ پھر بھیج رہا ہوں۔

انقرہ میں میں نے اُردو کا ایک پبلک کورس پڑھانا شروع کیا ہے جس کی مفصل اطلاع انشاء اللہ عنقریب آپ کو بھیجوں گا۔ میرے لیے کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔

آپ کا خاکسار

محمد داؤد رہبر

پروفیسر اُردو و تاریخِ پاکستان انقرہ یونیورسٹی

خطوط بخدمت مشفق خواجہ صاحب!

25 February, 1958

مکرمی، تسلیم!

پچھلے سال مئی یا جون میں میں نے مخدومی قبلہ مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کی خدمت میں بیک وقت دو چیزیں قومی زبان میں شائع ہونے کی غرض سے بھیجی تھیں۔ ایک تصویر جو انقرہ میں اردو کی پبلک کلاس اور جناب سفیر پاکستان پر مشتمل تھی اور ایک مشہور ترک شاعر نامق کمال مرحوم کے شاہکار ''قصیدۂ حریت'' کا منظوم اردو ترجمہ۔ مولوی صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ دونوں چیزیں قومی زبان میں چھپیں گی۔

قومی زبان کا وہ شمارہ جس میں یہ چیزیں چھپیں اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اگر از راہِ عنایت اس شمارے کی تین کاپیاں مجھے ارسال فرمائیں۔

آپ کا خاکسار

محمد داؤد رہبر

انقرہ (غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۵۸ء میں یہ خط لکھا گیا)

مشفق مکرم!

آپ کا وہ عنایت نامہ ملا جس میں آپ نے قبلہ مولوی صاحب کے ان خطوط کی نقلیں طلب فرمائی

KUTABKHANA OSMANIA

(ایم۔اے۔کے لیے) اس کے پڑھانے والے استاد کون تھے؟

اگر یونیورسٹی کے پرانے کیلنڈروں سے آپ ان سوالوں کے جواب نکال کر مجھ تک پہنچائیں تو میں آپ کو اپنا محسن جانوں گا۔

بندہ

داؤد رہبر

8 October, 2002

مکرمی پروفیسر ندیم خاں صاحب!

السلام علیکم! کئی مہینوں میں اس سوچ میں رہا کہ آپ کے کالج کے لیے لیکچر کس موضوع پر تیار کروں، آخر ایک موضوع ذہن میں آیا۔

"Monotheison and the Question of Divine Disposition"

معلوم نہیں آپ کو اور دوسرے پروفیسر صاحبان کو جو میری پذیرائی میں حصہ لیں گے، یہ موضوع پسند آئے گا یا نہیں۔

دانشگاہوں اور نشرگاہوں اور اخباروں کے حلقوں میں آج کل سارا دھیان ملتوں کے تعلقاتِ عصری پر ہے۔ ان پر گفتگو کرنے والے مبصر آپ کو امریکہ میں بہت مل جائیں گے۔ میری دلچسپی اس مبحث سے ہے کہ اپنے موروثی مذہب سے فرد کی نفسیات کس طرح متاثر ہوتی ہیں۔ میرا لیکچر ایسے ہی موضوع پر ہونا چاہیے، جس پر میں نے برسوں غور کیا ہے۔

ڈاکٹر ایڈمز صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بتا دیں کہ انہیں یہ موضوع کیسا لگا۔

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب

داؤد رہبر

بہت پرانے خطوط

بخدمت: رضوی صاحب

مشفق خواجہ صاحب

مولانا صلاح الدین احمد صاحب

بابائے اردو

Ankara-4 December, 1956

بخدمت رضوی صاحب!

(رضوی صاحب کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ یہ انجمن ترقی اردو کے اہلکاروں میں سے تھے)

مشفق مکرم رضوی صاحب!

ہیں جو میرے نام ہیں۔ ان میں سے منتخب خطوط کی نقلیں میں دو ہفتوں کے اندر اندر بھیج دوں گا۔

قبلہ مولوی صاحب کے خطوط کی اشاعت کی تحریک اگر آپ کی طرف سے ہوئی ہے تو میں آپ کو دلی مبارک باد بھیجتا ہوں۔

قومی زبان کے لیے انشاء اللہ ضرور کچھ لکھ کر عنقریب بھیجوں گا۔

آپ کا خاکسار

محمد داؤد رہبر

انقرہ ۲۵ نومبر ۱۹۵۸ء

مشفق بندہ مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! آپ کے حسب فرمائش قبلہ مولوی صاحب مدظلہم کے جملہ خطوط کی نقلیں عنقریب بھیج دوں گا۔ بوجہ علالت اتنے دنوں اس مبارک کام کو شروع نہ کر سکا۔ دیکھیں اب انشاء اللہ دیر نہ ہوگی۔

کیا اس امر کا کوئی امکان ہے کہ اس مجموعۂ خطوط (جس کا خطاب مجھ سے ہے) کے دیباچے کے طور پر ایک مضمون میرے قلم سے قبلہ مولوی صاحب کی ذاتِ عالی پر شامل ہو؟ اس سلسلے میں ایک مختصر مکتوب تحریر فرمائیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔

خاکسار

محمد داؤد رہبر

KUTABKHANA OSMANIA

انقرہ ۵ جنوری ۱۹۵۹ء

محترمی خواجہ مشفق صاحب!

السلام علیکم! نوازش نامے کا شکریہ۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ خطوط کا مجموعہ آپ کو پہنچ گیا۔ خطوط کی اشاعت کی تحریک پر پھر تبریک قبول ہو۔

حسب وعدہ ایک مختصر تحریر ان خطوط کے دیباچے کے طور پر بھیج رہا ہوں۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو اس کو فی الحال قومی زبان میں بھی شائع فرما دیں اور خطوط کی جلد میں بھی۔ اس کو وقت آنے پر بطور دیباچۂ خطوط میری طرف سے شامل فرما دیں۔

اس مضمون کے علاوہ اپنے طلبہ کی ایک تصویر مع ایک مختصر نوٹ کے بھیج رہا ہوں، یہ بھی قومی زبان کے لیے ہے۔

امید ہے آپ ہر طرح بخیریت ہوں گے۔ قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔

قومی زبان کے جس نمبر میں یہ تصویر مع نوٹ شائع ہو اگر اس کے آٹھ نسخے ارسال فرمائیں (رجسٹری کے ساتھ) تو بے حد نوازش ہوگی۔ طلبہ کو ایک ایک نسخہ بطور ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہوں، زحمت معاف۔

خاکسار مخلص

داؤد رہبر

انقرہ ۲۲ جنوری ۱۹۵۹ء

محترمی مشفق خواجہ صاحب!

تسلیمات، اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ حسب فرمائش میں نے اپنے نام خطوط عالی جناب مولوی صاحب کے (اوران کا دیباچہ) رجسٹری کرا کے ہوائی ڈاک سے بھیج دیا تھا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اُردو طلبہ کی تصویر مع نوٹ بھیجی تھی، اُمید ہے مل گئی ہوگی۔ ایک مختصر نوٹ ان چیزوں کے مل جانے کی اطلاع کا تحریر فرمائیں تو دل کو تسلی ہو۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ممکن ہے برضائے الٰہی پاکستان کا ایک چکر لگاؤں، اس وقت ملاقات ہوگی۔

قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں سلام مؤدبانہ۔

خاکسار

داؤد رہبر

انقرہ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء

دوست مہربان خواجہ مشفق صاحب!

السلام علیکم! آپ کے خط کا شکریہ۔ مجھے بہت اطمینان ہوا کہ تصویر مع نوٹ اور ساتھ ہی بابائے اردو کا ارادت نامہ جو میں نے لکھا تھا وصول ہو گیا۔ مولوی صاحب کی سالگرہ منانے کی تحریک اور اس کے ضمن میں اشاعت مکاتیب کی تحریک پر میری دلی مبارک باد۔ آپ کا خیال کہ میرا وہ مضمون مجموعۂ مکاتیب کا جز بنے مقام صاد ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا کہ آپ ازراہ احسان مجھے قومی زبان مورخہ یکم جنوری (جس میں تصویر مع نوٹ چھپ رہی ہے) کے آٹھ نسخے ارسال فرمائیں گے۔ اس خط کے ملنے تک اگر ترسیل نہ فرمائی ہو تو گزارش ہے کہ احتیاطاً رجسٹری کرا دیں۔ اس طرح ان کا ملنا محقق ہو جائے گا ورنہ بعض مرتبہ رسالے وغیرہ راستے میں خورد برد ہو جاتے ہیں۔

قبلہ والد مرحوم کے نام بابائے اردو کے خطوط مبارک لاہور میں ہوتا تو تلاش سے ضرور نکال لیتا لیکن ہمارے اس گھر کی (جہاں سب تر کہ ایک جگہ تھا) بہت سی چیزیں منتشر ہو گئی ہیں اور میں بھی گزشتہ متعدد سال وہاں جم کر کبھی نہ رہا، اس لیے افسوس کہ ان خطوط کی فراہمی کی کوئی صورت اس وقت نظر نہیں آتی۔ جو خطوط میرے نام تھے انہیں جان سے لگائے پھرا اور حسب فرمائش بھیج دیے۔

کراچی آنے کی صورت نکلی تو ضرور ملاقات سے صدور سُرور ہوگا۔ قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں سلام مودبانہ۔

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

انقرہ ۲ جولائی ۱۹۵۹ء

محترمی خواجہ مشفق صاحب!

السلام علیکم! عنایت نامے کا بے حد شکریہ یونیورسٹی کا سیشن ختم ہو رہا تھا اور امتحانات جاری تھے۔ کل سے فراغت ملی ہے تو مکتوب نویسی جاری ہوئی ہے۔ مجھے واقعی شرمندگی ہے کہ قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں خط نہ لکھا۔ آپ قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں ذیل کی عبارت پڑھ کر شکر گزاری کا موقع دیجیے اور ان سے میرا سلامِ شوق و نیاز کہیے۔

حکومتِ پاکستان کی تازہ خوشگوار تبدیلیوں کے بعد انجمن کی خوشحالی کے امکانات بڑھنے سے دل کو بہت سکون ہوا اور مولوی صاحب کی ذاتِ پرفیض سے قوم کو بہتر مستفید کرنے کی جو تحریک حکومت کی طرف سے ہوئی اس کی خبریں مختلف اخباروں میں پڑھیں اور جنابِ الٰہی میں شکر گزار ہوا۔

میں گرمیوں کے آخر میں انقرہ کی ملازمت سے مستعفی ہو کر امریکہ جا رہا ہوں جہاں ریسرچ کا ایک منصب مل گیا ہے۔ ٹرکی میں قانون ہے کہ غیر ترک کو مستقل ملازمت نہیں ملتی۔ سالانہ معاہدہ کی تجدید ہوتی ہے۔ اس شرط میں بعض ایسی دقتیں ہیں کہ مستقل ملازمت کو اس کے مقابلے میں ترجیح ہوگی۔ بہر حال تین سال میں میں نے شعبۂ اُردو کی بنیادیں پکی کر دی ہیں اور عنقریب قبلہ مولوی صاحب کو اس کی رپورٹ بھیجوں گا جو میں نے ترکی اور انگریزی میں لکھ کر یہاں پیش کی ہے۔

مکاتیب بابائے اردو کی طباعت کب تک مکمل ہوگی؟ اس سے مطلع فرمائیے۔ خط کا مکرر تہ دل سے شکریہ۔

خاکسار

داؤد رہبر

Hartford Seminary

55 Elizabeth Street

Hartford 5, CONN, U.S.A

21 September, 1959

مکرمی خواجہ مشفق صاحب!

السلام علیکم! قبلہ مولوی صاحب کے وسیلے سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ انقرہ یونیورسٹی میں تین سال ”مہمان پروفیسر“ رہ کر میں اب امریکہ چلا آیا ہوں جہاں تحقیق اور تدریس کے نئے مشاغل میرے منتظر ہیں اور میں ان کا منتظر۔ گزشتہ سوموار (یعنی ۱۴۔ ستمبر کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ) یہاں پہنچا اور ایک اچھے مکان کی تلاش سے فرصت ملی تو خط لکھنے بیٹھا۔

آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ نے میرا مضمون ”بابائے اردو سے ارادت“ والا غالباً الشجاع نامی ایک رسالے کے بابائے اردو نمبر کے لیے اس کے ایڈیٹر صاحب کو دے دیا تھا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ مضمون مکاتیب عبدالحق میں بھی بعد کو شامل کیا جائے گا۔

KUTABKHANA OSMANIA

حسبِ سابق آپ کا خاص کرم ہوگا اگر الشجاع کے ایڈیٹر صاحب سے ایک نسخہ یا دو نسخے میرے نئے پتے پر بھجوانے کی فرمائش کریں۔ بالتاکید، بے حد شکر گزار ہوں گا۔

مکاتیب عبدالحق کی اشاعت کے متعلق پیشگوئی ممکن ہو تو کچھ اندازہ تحریر فرمائیں کہ کب تک چھپ جائیں گے اور قبلہ مولوی صاحب کی سالگرہ کا جشن کب منایا جائے گا۔

قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں سلامِ عقیدت۔

خاکسار

داؤد رہبر

ہارٹفورڈ ۳ مارچ ۱۹۶۰ء

محبی خواجہ مشفق صاحب!

السلام علیکم! یاد فرمانے کے بے حد شکریہ۔ ابھی قبلہ مولوی صاحب کی خدمت میں خط لکھوں گا۔ جب سے یہاں آیا ہوں ہارٹفورڈ میں اُردو کے اجراء کی تحریک میں کوشاں رہا ہوں اور کسی قدر کامیاب ہوا ہوں۔ اُمید ہے مستقلاً یہاں اُردو جاری ہو جائے گی۔ ارادہ تو یہاں جم جانے کا ہے تائیدِ غیبی شاملِ حال رہی تو۔

الشجاع کا عبدالحق نمبر مجھے نہیں ملا۔ اپنی خاص توجہ سے ایک نسخہ رجسٹری کرا کے مجھے بھجوا دیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔

مکاتیب عبدالحق کی تدوین کہاں تک پہنچی اگر یہ مجموعہ چھپ چکا ہے تو اس کا بھی ایک نسخہ مرحمت ہو۔ (رجسٹرڈ ڈاک سے)۔ کیا میرے نام کے تمام خطوط اس میں طبع ہو گئے؟ دو چار سطروں میں آگاہ فرمائیں تو شکر گزاری کا مقام ہوگا۔

آپ کی بعض آراستہ غزلیں پڑھیں، جی بہت ہی خوش ہوا۔ یومِ عبدالحق کا جلسہ ہو چکا یا ابھی کسی آئندہ تاریخ کو ہوگا۔ مجھے اس کی خبر ضرور دیجیے گا۔ وہاں آنا نہ ہوا تو کم سے کم یہاں محفلِ خیال برپا کریں گے۔ وائے محرومی!

آپ کا خوش خواہ دوست

داؤد رہبر

ہارٹفورڈ ۱۸ مارچ ۱۹۶۰ء

محبی خواجہ مشفق صاحب!

السلام علیکم! قبلہ مولوی صاحب مدظلہم کے لفافے میں ایک خط آپ کے نام بھی ڈالا تھا۔ اُمید ہے مل گیا ہوگا۔ اس میں میں نے خبر دی تھی کہ الشجاع کا عبدالحق نمبر مجھ کو نہیں ملا۔ ایڈیٹر صاحب سے تاکید کے ساتھ کہہ کر ایک نسخہ رجسٹرڈ بھجوا دیں تو حدِ امتنان نہ ہوگی اور اطمینان کی حد بھی نہ ہوگی۔

مزید یہ کہ مکاتیب عبدالحق کی اشاعت اب کس منزل پر ہے۔ اس سلسلے میں بھی دو ایک سطریں لکھ کر منت دار کریں۔

تصنیف تالیف کے منصوبے رکھتا ہوں۔ اُمید ہے اب جم کر ایک جگہ بیٹھنا نصیب ہوگا۔ اُردو کی

خدمت میں اس عاجز کو احباب ہمیشہ والہ اور مجنوں پائیں گے۔ اُردو زبان اور ہندوستانی سنگیت میرے نزدیک تمدنِ انسانی کے سب سے قیمتی سرمائے ہیں۔ جہاں جاتا ہوں ان دونوں کا نام بلند کرنے میں سرگرم ہو جاتا ہوں۔

قبلہ مولوی صاحب مدظلہم کی خدمت میں سلام فرزندانہ۔

خاکسار

داؤد رہبر

ہارٹفورڈ، ۴ جولائی ۱۹۶۰ء

مکرمی مشفق خواجہ صاحب!

السلام علیکم! آپ کا عنایت نامہ ملا، بے حد شکر گزار ہوں۔ پاکستان آنے کی حسرت رہتی ہے لیکن ناشکری کیوں کروں، ہر دو تین سال بعد ایک آدھ موقع واپسی کا مل ہی جاتا ہے۔ دیکھیے توفیق کی زنبیل میں سے اب کی بار کیا برآمد ہو۔ پاکستان میں کب ہماری درآمد ہو۔

قومی زبان کے لیے آپ نے سفرنامے کی جو فرمائش کی ہے اس کے لیے ممنون ہوں۔ مضامین کا پورا سلسلہ نہ سہی تو جستہ جستہ لکھنا ضرور ممکن ہے۔ کوشش کروں گا کہ ترکی کی یادوں سے کچھ نکالوں۔ ترکی پر اور اس قوم کے رجحانِ فکر پر دلچسپ باتیں لکھی جا سکتی ہیں۔

کیا مکاتیب عبدالحق کی کتابت ہو رہی ہے یا ابھی فراہمی جاری ہے؟

آپ کا تخلص روایاتِ غزل میں نباہ کے لیے بہت موزوں ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ اپنے مقطعوں میں تخلص نہیں لاتے۔ کیا یہ مشاہدہ درست ہے؟

خاکسار

داؤد رہبر

Institute of Islamic Studies

Mc Gill University,

3520 University Avenue

Montreal, Canada

26 September, 1954

بخدمت مولانا صلاح الدین احمد صاحب!

مولانا!

السلام علیکم! مجھے یہاں پہنچے اب دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں مکان کی تلاش رہی۔ خدا کے فضل سے بہت اچھا فلیٹ مل گیا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہے اور معقول لوگ آباد ہیں۔ یونیورسٹی کے بیشتر پروفیسروں سے تعارف ہو چکا ہے، متعدد دعوتیں کھا چکا ہوں۔ یہاں کی یونیورسٹی میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ تمام مضامین کے پروفیسر آپس میں تقریباً روزانہ ملتے جلتے رہتے ہیں۔ یہاں ایک فیکلٹی کلب ہے جہاں تمام پروفیسران لنچ اور ڈنر کے لیے جمع ہوتے ہیں اور اکثر متباین اور مختلف مضامین کے علماء ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ خوب فقرہ بازی

رہتی ہے جس میں ابتذال کا نام نہیں ہوتا۔ بہت خوش طبع، مہماں نواز اور منکسر لوگ ہیں۔

شاید آپ کو عاشق صاحب کا خط لندن سے آیا ہوگا۔ ان سے خوش قسمتی سے لندن میں ملاقات ہوئی لیکن بدقسمتی سے بہت مختصر۔ مجھے لندن میں صرف ایک رات نصیب ہوئی۔ دوسرے ہی روز مجھے دوسرے جہاز پر سوار ہونا تھا۔ عاشق صاحب ریلوے سٹیشن پر مل گئے لیکن مجھے سامان کی زیادتی کی وجہ سے ہوش نہ تھا۔ اس پر زیادتی یہ کہ ابھی تک میرے پاس دوسرے جہاز کے ٹکٹ نہ تھے اور ٹامس کُک کی ہدایت تھی کہ لندن پہنچتے ہی ان کے دفتر پہنچوں اور ٹکٹ حاصل کروں۔ چنانچہ رات کے نو بجے ان کے دفتر سے ٹکٹ ملے اور سفر کے کاغذات درست ہوئے۔ صبح لندن سے ساؤتھمپٹن پہنچنا تھا۔ چنانچہ بمشکل اس بندرگاہ سے دوسرا جہاز پکڑا۔ عاشق صاحب سے ملاقات تشنہ رہی، مجھے اس کا بہت افسوس ہے لیکن سفر کی حالت میں مجبوری تھی۔

اُمید ہے اکیڈمی کا کام بدستور چل رہا ہوگا۔ میری ملازمت یہاں مقدم طور پر ریسرچ کی ملازمت ہے۔ ہفتے میں صرف ایک لیکچر دینا ہوگا لیکن اس میں توقع یہ رکھی جاتی ہے کہ بدیع اور کام کی باتوں کا نچوڑ ہو اور ٹھوس ریسرچ کے بعد لیکچر دیے جائیں۔ گپ شپ نہ ہو۔ اس لیے محنت طلب کام ہے۔ خدا مدد کرے۔

موسم بہت اچھا ہے، لوگ بہت سادہ اور خوش طبع ہیں۔ شہر کشادہ اور بشاش ہے۔ کھانے پینے کی افراط ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ عنقریب آپ کو مفصل خط لکھوں گا۔ آج کل لیکچروں کی تیاری جاری ہے۔ اکتوبر کے شروع سے سیشن جاری ہوگا۔ احباب کو سلام، وجیہہ کو بہت پیار، جیلانی کو سلام، جواب ضرور لکھیں۔

جیلانی سے ایک بات پوچھ کر لکھ سکیں تو ممنون ہوں گا۔ راجہ افتخار اللہ ان کے دوست ہیں، ان کا ٹھیک پتہ درکار ہے۔

ادبی دنیا کے لیے ضرور کچھ بھیجوں گا۔ ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔

آپ کا خاکسار

محمد داؤد

Dil Ve Tarih Cografya Fakultesi

Ankara, Turkey

1st November, 1956

ادبی دنیا کے لیے ایک نظم:-

قلعۂ انگورا

اتنی صدیوں میں نہیں آیا کمر میں تیری خم
تو ابد سے آشنا اے پاسبانِ یلدرم
ہو گئی ہے اس کہستاں میں وہ چوٹی سرفراز
جس کے قدموں پر رکھے ہیں تیرے فرخندہ قدم

KUTABKHANA OSMANIA

کردیا وابستگی نے تیری اس کو سر بلند
تیری منت دار ہو کیونکر نہ تیموری کمند
کھینچ کر تو نے اتاترکی نگاہِ انتخاب
اپنے سائے میں کیا ہے انقرہ کو شہرہ مند

آج تو اس مسکنِ مشہور کا سرتاج ہے
انقرہ اک حور ہے، تو حور کا سرتاج ہے
جا چکا اس ملک سے وہ تاجِ سلطانی کا دور
تو مگر اس ملک کی جمہور کا سرتاج ہے

قلعۂ انگورا کہہ وہ داستانِ لاجواب
تیرا سینہ بن چکا ہے جس کی سر بستہ کتاب
مدتوں سے رہ چکے ہیں اہلِ ترکی گامزن
درس دے ہم کو کہ ہے زیر و زبر کیا انقلاب

پیچ پڑ کر کھلتے ہیں کیونکر سیاسیات میں
منزلیں آتی ہیں کیا کیا راہِ تنظیمات میں*
کون بڑھواتا ہے ہمت، کون اُٹھواتا ہے پاؤں
مشعلِ رہ کون ہوتا ہے اندھیری رات میں

اس نواحِ کوہ میں دیکھے وہ تو نے باغباں
جن کے ہاتھوں خشک پتھر بن گئے اک گلستاں
جن کی ہمت سے ہوا پیدا اُمیدوں کا شجر
جذب سے جس کی اِدھر اُٹھا رُخِ ابرِ رواں

ان کی محفل میں نہیں کوئی بلند آہنگ ساز
زمزمہ پرداز سب ہیں پر نہیں ہیں نعرہ باز
پا چکے ہیں نکتۂ "باآسماں پرداختی
کم نہیں" کارِ زمیں سمجھا انہوں نے خوب راز

* ترکی کے اس عصرِ قریب کو جس میں جدید یورپین نظامِ عدالت اور نظامِ حکومت نے رفتہ رفتہ جڑ پکڑی عہدِ تنظیمات کہتے ہیں۔

توڑ ڈالی اُن نے تقسیمِ جہاں غرب و شرق
جس سے اک پیوستہ دنیا ہو گئی تھی فرق فرق
انقرہ ہے ایشیا اور انقرہ یورپ بھی ہے
پائے فطرت کی زینت ہے لباسِ زرق برق

کون کہتا ہے کہ مغرب ہے فقط دُنیا پرست
کون کہتا ہے کہ مغرب میں ہوئی دیں کو شکست
کون کہتا ہے کہ مشرق ہے جہانِ پاک باز
مرجعِ روحانیت اور منبعِ نورِ الست

کون کہتا ہے خرد ہے دشمنِ ایمان و دیں
سوچتے رہنا کبھی ممکن نہیں ہے بے یقیں
دوڑتے رہنا کبھی ممکن نہیں بے نصب عین
دوڑنے والے نہیں قصرِ شکستہ کے مکیں

دیدنی ہے دیدنی ہے کاروانِ شبہ و شوق
دوڑنے والوں نے دیکھا اک جہانِ شبہ و شوق
سننے والے کہہ اٹھیں گے ہے یہی نورِ ہدیٰ
دوڑنے والے کہیں گے داستانِ شبہ وشوق

---

23 March, 1957

مولانا صلاح الدین احمد صاحب!

آج پاکستان کا یومِ جمہوریت ہے اور اتفاق دیکھیے کہ میں پچھلے سال بالکل اسی تاریخ کو کینیڈا سے انقرہ پہنچا جس روز کہ پاکستان جمہوریت میں منتقل ہوا۔

ایک نظم ارسال ہے۔ یہ ۱۹۔نومبر ۱۹۵۶ء کو یومِ مولانا کی تقریب پر انقرہ یونیورسٹی میں پڑھی گئی۔

مولانائے روم سے

کن عناصر سے عبارت تیری ذات
آسمانوں کی اشارت تیری ذات
مثنوی ہے صبح کا اُجلا سرور
پاک تراز زمزمہ ہائے طیور
تیری طبع مرتعش گویا نسیم
جس سے پیدا تیرے گلشن کی شمیم
مثنوی فیضانِ ذاتِ بے حدود
مثنوی آئینۂ نقشِ وجود
مثنوی رودِ خرامان و جمیل
دیکھنے میں ساکن و شفاف جمیل

KUTABKHANA OSMANIA

12 February, 1958

مولانا

آج پاکستان سے قدم باہر نکالے (ہوائی جہاز کے سفر کے لیے قدم باہر نکالنا استعارہ ہی تو ہے) پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ طبیعت پر دو کیفیتیں گزرتی ہیں، ایک یوں کہ گویا اس بات کو برسوں ہو گئے اور دوسری یوں کہ گویا کل وہاں سے واپس آیا ہوں۔

Colloquium کے منتظمین نے مجھ کو لکھا ہے کہ وفود کے لیڈران کی میٹنگ میں میرے مقالے کی نظرِثانی کا سوال زیرِ بحث آیا تھا اور "The subject of revision was met with general approval" یہ فقرہ مجھے مبہم معلوم ہوتا ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس میٹنگ میں ووٹ کے ذریعے کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ مصری اور شامی مندوبین کے کہنے سے دوسرے مسلمان مندوبین نے صرف یہ اظہار کیا تھا کہ اس حقیر فقیر سے کہہ دیکھیں کہ Colloquium کی کارروائی کے دوران میں کی گئی تنقید کو ملحوظ رکھ کر مقالے میں ترمیم (Amendment) کرے۔

Colloquium کے کارکنوں کے کہنے سے میں نے مقالے کے متنازعہ مجمل حصوں میں اضافے کر کے مقالہ بھیج دیا ہے۔ واضح رہے کہ مقالے کے ان حصوں میں کسی میں بھی میں اپنی رائے سے پیچھے نہیں ہٹا بلکہ اپنے عندیوں کی بدلائل تقویت کی ہے۔ ان اضافوں کو میں مقالے کی تبدیلی کی بجائے تکمیل کہوں گا۔

اس تکمیل یافتہ شکل کے متن کا فیصلہ انشاءاللہ عنقریب ہو جائے گا۔ Colloquium کے ارباب نے مصری و شامی زعماء کو خاموش کرنے میں بہت کوشش کی ہے اور وائس چانسلر صاحب نے ۱۴۔ جنوری کو اخبار میں جو بیان دیا اسی سلسلے میں تھا۔

میں اہتمام کروں گا کہ تکمیل یافتہ متن کی معقول اشاعت ہو تا کہ احباب اور عوام الناس کا یہ گمان دُور ہو جائے کہ میں اپنی کسی رائے سے پیچھے ہٹا ہوں۔

یقین جانیے کہ اب تک میں نے اس سلسلے میں صرف آپ کو خط لکھا ہے۔ اس سے قبل دو خط لکھ چکا ہوں۔ آپ کی تحریر کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔

وجیہہ جو سلامِ شوق، گھر میں سب کو سلام

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

21 May, 1958

مولانا

ابھی ابھی آپ کا نامۂ الطاف جامہ اس میز کی زینت ہوا۔ انقرہ میں کئی دن سے شفاف دھوپ نکل رہی ہے اور میرے گھر کے قریب ایک گھنے درخت کے پتوں میں پوشیدہ ایک فاختہ بولتی ہے۔ دیارِ مغرب میں بہت کچھ ہے لیکن فاختہ کا سا پرسوز پرندہ اور چنبیلی، موتیا، رات کی رانی اور اس خاندان کے دوسرے پھول نہیں ہیں۔ لاہور کی سب سے بڑی نعمتیں یہی ہیں علاوہ اس فراغت کے جو ہم مسلمانوں کے

مثنوی تیری ریاضت کا نشاں
ابتدا فیضاں کہ شب بیداریاں؟
تیری تمثیلوں میں رقصاں شوخ رنگ
تیری اک اک بات ہے من کی ترنگ
تارِ جاں تیرا ہم آہنگ نجوم
تیز تر یوں تابش و رنگ نجوم
زیست تیری جستجوئے لامکاں
نام تیرا آشنائے لازماں

---

17 July, 1957

مولانا

خواب سب کو دکھائی دیتے ہیں اور خواب کے بے تکے پن کو معاف کرنا خدا نے سب کو ودیعت کیا ہے۔ رات ایک مختصر خواب دیکھا یا شاید یاد رہ کر سکڑ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ لاہور پُر جور کی سڑکوں پر چل پھر رہا ہوں۔ میری دونو بچیاں ساتھ ہیں، ایک تانگہ لیا، مال پر چلتے چلتے ادبی دنیا کا دفتر نظر پڑا، طبیعت بے تاب ہو گئی۔ تانگے والے سے کہا کہ ذرا آدھ منٹ یہاں رُک جا میں ابھی آیا۔ بچیوں کو تانگے میں بیٹھا رہنے دیا اور سوچا کہ سیڑھیاں چڑھ کر مولانا سے بغلگیر ہو کر فوراً اجازت لوں گا اور کہوں گا بس اس وقت صرف اپنی آمد کا اعلان کرنے آیا ہوں۔ کل مفصل نشست ہوگی اور باتیں ہوں گی۔ اُوپر چڑھا، سیڑھیاں چڑھ کر ادبی دنیا کا دفتر ہمیشہ داہنے ہاتھ کی قطار کے تقریباً سرے پر دیکھا تھا، اب جو ایک ایک کمرا دیکھتا ہوں وہاں مولانا کا کہیں پتہ نہیں، میں پریشان، خدایا! کیا دفتر پھر بدل گیا؟ وہیں دو تین ملازم چل پھر رہے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا کہ ادبی دنیا کا دفتر کہاں اُٹھ گیا، وہ بولا "یہ دروازہ ہے" اور بجائے داہنی قطار کے بائیں قطار کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اُدھر بڑھا تو عالم ہی اور تھا۔ ایک کمرہ کیا چار پانچ متصل کمروں سے ملا ہوا دفتر، کمرے بھی سب اپنی اپنی جگہ ایوانِ ریاست، دروازہ کھولتے ہی ایک سروقامت خاتون نے کہ بہت فاخرہ ساری میں ملبوس تھیں بہت تپاک سے میرا خیر مقدم کیا حالانکہ اس خاتون سے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ خاتون کے انداز سے کچھ محسوس ہوتا تھا کہ گویا میری آمد کی ان کو خبر تھی۔ پھر جو چاروں طرف نگاہ کی تو حیرت، ہر طرف عمدہ قالین بچھے ہوئے، کمخواب کے پردے، خس کی بھینی خوشبو اور طراوت، پنکھے چل رہے ہیں اور خلقت! خدایا، اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔ اس ہجوم میں صرف فضل الٰہی کی آشنا شکل نظر آئی، باقی سب چہرے ان جانے اور ہر شخص بے تکلفی ٹہل قدمی کر رہا ہے۔ ایک طرف ایک تخت بچھا ہوا ہے، جس کے صدر ایک شاعر ہیں اور بجائے کپڑے کی پوشاک کے طباشیر کے ایک خول میں ملبوس ہیں۔ صورت میں غالب کے خدوخال کی کچھ جھلک ہے۔ ان کے دائیں بائیں دو ادیب بیٹھے ہیں اور خوب مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ آگے بڑھا تو ایک صوفے پر مولانا صلاح الدین احمد بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر کسی اور شخص کے ساتھ کسی کام میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد خواب کا سلسلہ بیداری کے ساتھ ٹوٹا نہیں بلکہ خواب کا مضمون بدل گیا اور صبح جب اُٹھا تو سارے خوابوں میں ادبی دنیا والا خواب یاد رہا۔

وجیہہ سے اس خواب کی تعبیر پوچھیے۔ گو وہ اپنے مطلب کی تعبیریں بھی کرتے ہیں۔ گھر میں سب کو سلام۔

آپ کا فقیر خاکسار

داؤد رہبر

لیے شراب ناب کا بدل ہے۔

کتاب کی تکمیل کے سواد کا ظہور دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ پروف پڑھنے کا کام مجھ پر ہرگز بھاری نہیں لیکن لاہور اور انقرہ کا فاصلہ واقعی نامساعد ہے۔ اس میں بہت وقت لگے گا اور بہت تاخیر کا موجب ہوگا۔ اس لیے کہ چھٹیاں عنقریب شروع ہو رہی ہیں اور ان چھٹیوں میں میرا ارادہ مفصل سیاحت کا ہے اور اس کے علاوہ اردن سے مجھے ایک کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ آیا ہے اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ان اطراف میں بھی جا رہا ہوں اور اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر بیت المقدس اور بعض دوسرے تاریخی مقامات کی زیارت کا خیال ہے۔ چنانچہ ڈاک کا تسلسل آسان نہ ہوگا۔

یہ محقق ہے کہ آپ کی تشویق کے بغیر میں یہ مضمون نہ لکھتا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب آپ کی تشویق کی تخلیق بھی ہے اور کتاب کی اشاعت کے لیے آپ کے مساعیِ طیبہ میری احسان مندی کا موجب ہیں۔

گھر میں سب کو آداب و دُعا، وجیہہ کو سلام شوق۔

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

P-S یعنی پچھوں کچھی، یعنی بعد کو سوجھی۔ آپ کو پروفیسر نندہ تو یاد ہوں گے۔ (ہمارے لیے تو یہ لوگ جیتے جی آں جہانی ہو گئے) پچھوں کچھی کی ترکیب میں نے ان سے سنی تھی۔

''ہمارے وقت کی گائیکی'' والے نمبر میں ''کیمبرج سے ایک خط'' بھی شامل تھا اگر اب کتابت کے بعد اس خط کو متعلقہ مضمون سے عین پہلے ملحق کرنا ممکن نہیں تو تمام مضامین کے اخیر میں علیحدہ شامل فرما دیں اور حاشیے میں اس علیحدگی کے سبب کی توضیح فرما دیں۔ بے حد ممنون ہوں گا۔ یہ خط مجھے بے حد عزیز ہے۔

P.O. Box 18

Jerusalem, Jordan

19 July, 1958

مولانا

گزشتہ تین روز سے میں بیت المقدس میں ہوں۔ یہاں ایک کانفرنس میں چار لیکچر میری جانب سے کانفرنس کے پروگرام میں شامل ہیں:

(۱) افکار مربوط بہ اصولِ تفسیر

(۲) توحید

(۳) تقدیر

(۴) اقبال

KUTABKHANA OSMANIA

ان میں سے دو لیکچر دے چکا ہوں اور دو باقی ہیں جن کے لکھنے میں دن گزر جاتا ہے۔ بیت المقدس پر ایک مضمون لکھ کر بھیجوں گا۔ معلوم نہیں ''ادبی دنیا'' جاری ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو مضمون کیسے شائع ہوگا۔

اس سرزمین میں سبزہ اور درخت نہیں لیکن جہاں میرا قیام ہے وہاں کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے ہیں جن پر گھنے سرسبز درختوں کے جھنڈوں کی تصویریں ہیں۔ حیرت ہے کہ اسرا اور معراج کا یہ سنگم اپنی چٹانوں میں روحانیت کے کیسے شرارے چھپائے ہوئے ہے۔

کانفرنس ۲۹ جولائی کو ختم ہوگی۔ اس کے بعد کچھ روز یہاں تاریخی مقامات کے دیکھنے کو ٹھیروں گا۔ بیوی بچے ساتھ ہیں۔ آپ اس عقیدت نامے کے جواب میں ایک خط اس پتے پر لکھیں کہ ایک مقدس مقام پر ایک مقدس دوستی کا نشان پاؤں۔

نسخہ ہائے وفا اب کس منزل پر ہے؟ طبیعت اسے دیکھنے کی مشتاق ہے۔

وجیہہ کو سلام شوق، گھر میں درجہ بدرجہ سلام، آداب اور دُعا۔

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

3 August, 1958

مولانا

اردن سے شام ہوتے ہوئے کل صبح ہم سب انقرہ پہنچے اور معمولی صبح و شام پھر سے نصیب ہوئے۔ ارادہ شرقِ اوسط میں دو ماہ سیاحت کرنے کا تھا لیکن سیاست کے بگڑ جانے سے جلد لوٹنا پڑا۔ بیت القدس میں قریب دو ہفتے گزارے اور معراج کے اس مقام سے آنکھیں سیراب کیں جو پیغمبرؐ کے لیے ارضی منزل تھی لیکن گناہگار بندوں کے لیے یہی سماوی ہے۔

انقرہ پہنچ کر فراغت نظر آئی۔ قریباً چار سال بعد مجھے ایک مہینہ ایسا ملا ہے کہ کوئی خاص کام نہیں اور نہ کرنے کا ارادہ ہے۔ بیت المقدس کی کانفرنس کے لیے پانچ لیکچر لکھ رکھے تھے، وہ دیے۔ ان کے علاوہ تین لیکچر فی البدیہہ دیے۔ سارا وقت مباحثے رہے۔

لاہور سے احباب کا اکا دکا خط کبھی آ جاتا ہے اور اسی طرح لندن سے پاکستان جاتا ہوا کوئی بھولا بھٹکا پاکستانی یہاں آ نکلتا ہے۔ وطن کی باتیں سنتا ہوں لیکن سناتا نہیں۔ دل و دماغ لاہور کی یادوں سے بھرپور ہیں اور یادیں فسردگی بے سبب ہو کر ذوقِ نظر اور شوقِ طلب کا سامان ہوتی ہیں۔

یادِ وطن فسردگی بے سبب بنی
ذوقِ نظر بنی کبھی شوقِ طلب بنی

(اقبالؔ)

اس خط کے ساتھ ایک ورق اپنے پتے کے ساتھ بھیج رہا ہوں جس پر ہوائی ڈاک کے لیبل لگے ہیں۔

ساتھ ہی پچیس روپے کا ایک چیک بھیج رہا ہوں۔ نسخہ ہائے وفا جب مجلد ہو کر تیار ہو تو ایک نسخہ ہوائی ڈاک سے ارسال فرمائیں۔ اس ڈاک کا مصرف اندازاً پچیس روپے ارسالِ خدمت ہے۔

ممکن ہے آپ نے بیت المقدس کے پتے پر مجھے خط لکھا ہو۔ وہ خط گھوم کر یہاں آئے گا۔

گھر میں سب کو آداب وڈعا، وجیہہ کو سلامِ شوق۔

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

7 September, 1958

مولانا،

عرصہ ہوا آپ نے لکھا تھا کہ وجیہہ فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) میں متعین ہو گئے ہیں۔ اس مرتبہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ خوبیٔ موسم کی تلاش میں وہاں چلے گئے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

آپ نے فرحت اللہ بیگ کی زبانی ''نذیر احمد کی کہانی'' پڑھی ہوگی۔ اس میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ''دانی'' (غلام یزدانی) اور فرحت اللہ عربی کا متن پڑھ رہے تھے۔ دونوں نے پڑھنے میں اوٹ پٹانگ غلطیاں کیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے کتاب صحن میں دُور پھینک دی اور کہا ''نکل جاؤ میرے گھر سے''۔ دانی تو گھبرا کر اُٹھنے لگے لیکن فرحت اللہ ڈٹے رہے اور کہا کہ ''ہم تو سبق لے کر جائیں گے۔'' فرحت اللہ لکھتے ہیں کہ ہم جانتے تھے کہ آج اٹھ گئے تو ہمیشہ کے لیے اُٹھ گئے۔

وہی حال فرحت اللہ والا میرا ابھی ہے۔ میں ڈٹا رہوں گا۔ گزشتہ خطوں میں جو بیتابی میں نے ظاہر کی ہے اس پر کبھی معافی نہ مانگوں گا کیوں کہ مجھ سے تمام حرکات بہ باعثِ محبت صادر ہوتی ہیں ''سرزد'' نہیں۔ ''صادر'' وطن نے اور مجھے کیا دیا ہے؟ بیوی اور بچوں سمیت برسوں کی جلاوطنی۔ کیا میں کبھی احتجاج زبان پر لایا ہوں؟ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کا صدمہ میرے دل پر نہیں۔ نسخہ ہائے وفا میرے لیے ان تمام دکھوں کی تلافی ہے۔ یہ کتاب میری محبتِ لاہور کی زندہ سند ہے۔ لہٰذا اس پر بے تاب ہونے کی مجھے اپنی خاموشی سے سزا نہ دیجیے۔ میں معافی کیوں مانگوں اس لیے کہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ کتاب جلدی چھاپیے بلکہ صرف اطلاع مانگتا ہوں کہ کتاب کس منزل پر ہے۔ سو اس سے استعجال کا مفہوم نہ لیجیے۔ کیا میں ایک لمحہ بھی بھولا ہوں کہ آپ ہی نے یہ مضمون لکھوائے اور آپ ہی اب بہ التفات ان کو چھاپ کر مجھ کو احسان مند کر رہے ہیں۔

میں نے بیت المقدس سے آپ کو ایک خط لکھا اور اس کے بعد تین یہاں سے لکھے، اب پھر لکھ رہا ہوں۔

یہ خط چھ روز میں لاہور پہنچے گا۔ پھر چھ دن اس کا جواب آنے میں لگیں گے۔ کیا بارہ دن انتظار کے کم ہوتے ہیں؟

وجیہہ کو میرا اسلامِ شوق لکھیے گا۔ صبیحہ اور جیلانی کو بھی آداب وڈعا لکھیے، گھر میں سب کو آداب۔

آپ کا خاکسارِ دیرینہ

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

9 September, 1958

مولانا،

آج صبح ایک خط آپ کی خدمت میں رجسٹری سے بھیجا۔ اس کے بعد یونیورسٹی آیا تو آپ کا حسرت نامہ پایا۔ ایسی ہی خبر پر جی چاہتا ہے کہ میں لاہور میں ہوں اور اپنے اقرب الاقارب کے احوال میں شریک ہوں۔ مجھ کو وجیہہ اور جیلانی کے پتے لکھیے تاکہ میں ان دونوں کو خط لکھوں۔ مجھے آپ کا موڈل ٹاؤن کا اے بلاک والا گھر یاد آ رہا ہے جہاں وجیہہ کی والدہ صحن میں بیٹھی صبیحہ سے کہا کرتی تھیں ''سارا دن ایوب داؤد کے گھر کھیلتی رہتی ہے، گھر تو آتی ہی نہیں''۔ خدا ان کو امنِ لطیف کے ایوان میں رکھے اور ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ وجیہہ اور اس کے بھائی بہنوں کو میری طرف سے ان کی محرومی پر ہمدردی کا پیغام پہنچایئے۔ خدا آپ کو وجیہہ اور اس کے بھائی بہنوں پر سایہ بنا کر رکھے۔ میں نے گزشتہ جنوری میں وجیہہ کی والدہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے دُعائیں لیں۔ یہ میری خوش بختی تھی لیکن اس کے بعد اس قدر جلد ان کے جاں بحق تسلیم ہونے کی خبر سوا خدا کے کس کو تھی۔ میری بیوی اس غم میں میری شریک ہے۔

وجیہہ اور جیلانی دونوں کا پتہ مجھے ضرور لکھیے گا۔

خاکسار غمگسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

1st October, 1958

مولانا،

آپ کا شفقت نامہ ملا۔ وجیہہ اور جیلانی کو خط لکھوں گا۔ اس وقت یونیورسٹی کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ڈاک دیکھنے چلا آیا اور چند سطور بطور امتنان لکھ رہا ہوں۔ یہ جان کر دل مسرت سے لبریز ہوا کہ آپ نے میرے اظہار میں خلوص کی جھلک پائی۔ ہائے مولانا، کیسے کہوں جن سے محبت ہے اس درجہ ہے کہ اس محبت سے بعض مرتبہ مجھے خوف آتا ہے اس وجہ سے کہ مجھے ان عزیزوں کا ملاپ خدا جانے کبھی نصیب ہوگا یا نہیں۔ تاہم یہ آسمان اور چاند اور ستارے اخلاص اور محبت کے ہمراز ہیں۔ آپ بھی ان کو دیکھا کیجیے۔

خدا آپ کا غم ہلکا کرے اور آپ کو وجیہہ، صبیحہ، سہیلہ و سائرہ کا نگہبان رکھے اور سب آپ کے سائے میں عاطفت مادرانہ کا بدل پائیں۔

میں نے اکیڈمی کی خدمت میں پانچ سو روپے کی حقیر رقم پیش کرنے کا جو خیال ظاہر کیا تھا کسی ہنگامی تحریکِ ذہنی سے نہ تھا۔ مدت سے خیال تھا اس کا اظہار اب کیا۔ کتاب کے نسخے ملتے ہی چیک ارسال کر دوں گا۔ یہ روپیہ آپ کے لیے تھوڑے ہی ہے کہ آپ انکار یا تامل کریں۔ یہ اکیڈمی کے لیے ہے جس سے خاص و عام مستفیض ہیں اور ہوں گے۔

گھر میں سب کو آداب اور دُعا۔

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

KUTABKHANA OSMANIA

28 December, 1958

مولانا،

سالِ نو مبارک، خدا کرے یہ سال آپ کے لیے روحانی دولتوں کا منبع ہو اور آپ کے قلب کو سکون پہنچانے کا سامان کرے۔ مجھ کو اپنے بچپن سے اب تک کا کوئی عہد یاد نہیں کہ اس میں ایک دم کے لیے بھی مجھے اضطراب نہ ملا ہو۔ چنانچہ اُس اضطراب کے تازیانوں نے مجھے مدتوں تیز دوڑایا، کبھی لمبی لمبی سیریں کرائیں، لمبے لمبے سفر کرائے۔ باغبانی کرائی اور تان پلٹوں کی مشقیں کرائیں لیکن اب مجھے تھکن ہونے لگی ہے۔ اضطراب وہی ہے لیکن ٹانگوں میں اتنی سکت نہیں۔ اُمید ہے خدا ایک روز ایک مستقل گھر اس آسمان کے نیچے دے گا۔ کیا عجب ہے کہ وہ گھر قبر کی منزل سے پہلے نصیب نہ ہو۔ ترکی میں اب مجھے تین سال ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا اب باقی دن اسی سرزمین میں گزریں گے۔ کیا واقعی لاہور ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا؟ لیکن وہ دن بھی عجب نہیں کہ آئے جب لاہور والے کہیں: کیا وہ عاشقِ لاہور واقعی ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا؟

پچھلے ماہ کی (یعنی نومبر کی) ۲۹ کو آپ نے ایک شفقت نامہ لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ دسمبر کے آخر تک کتاب مجلد ہو کر تیار ہو جائے گی۔ اس خط کے ملنے پر اگر ایک مختصر خط اطلاع کے طور پر تحریر فرمائیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ ترکی میں ''ممنون'' کا لفظ منت دار کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ مسرور کے معنوں میں آتا ہے۔ معنوں کے لحاظ سے ایسا فرق بے شمار لفظوں کے باب میں موجود ہے۔

گھر میں سب کو دُعا اور آداب۔

آپ کا خاکسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

6 February, 1959

مولانا

آج کل انقرہ یونیورسٹی میں تعطیلات ہیں۔ (پورا مہینہ فروری کا یہاں تعطیل کا ہوتا ہے۔) محض آپ کے خط کے اشتیاق میں وہاں بلا ناغہ ڈاک دیکھنے جاتا ہوں۔

آپ کو میرے حال پر جو دیرینہ اور مرشدانہ التفات ہے اور مزید برآں آپ پر حال ہی میں جو صدمہ عظیم گزرا ہے ان دونو باتوں کے احساسِ بے پایاں کے ہوتے ہوئے مجھے آپ پر کبھی گمانِ تغافل بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ گمانِ فراموشی ہو۔ میرے لیے آپ کا وجودِ مشفقانہ ویسا ہی سرمایہ زیست ہے جیسا کہ وجیہہ اور اس کے بھائی بہنوں کے لیے۔ خدا آپ کے غموں میں تخفیف کرے۔

گزشتہ ہفتے چند ترک اربابِ موسیقی کی بزم میں شریک ہونے کا موقع ملا جس میں میں نے ان لوگوں سے خاص موسیقیٔ مولوی رُومی یعنی ''نے'' کے سوز سنے اور خود میں نے ان لوگوں کو امیر خسرو کے ایجاد کیے ہوئے

متصوفانہ ترانے سنائے۔ ترانہ ہماری ٹھیٹ موسیقی میں ایک خاص اصطلاح ہے۔ ترانہ ہر راگ راگنی کا ہو سکتا ہے۔ اس کے بول تا۔نا۔در۔دیر۔دوم۔نوم وغیرہ ہوتے ہیں۔ محفل رات کے ایک بجے تک رہی۔ نہایت لطیف و جانفزا ''نے'' کا وہ نالۂ نیم شبی کبھی نہ بھولے گا۔ اس کو سن کر آدمی چلا اُٹھتا ہے۔

ہائے دنیائے دُوں! تجھ میں کیا رکھا ہے۔

خاکسار غمگسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

13 April, 19590

مولانا،

آپ کا پیغام کل تارِ جاں بن کر آیا۔ پاکستان سفارت کا ایک ملازم مجھے گھر آکر دے گیا۔ ترکوں کے تار گھر میں انگریزی داں کم ہیں اور چونکہ پتہ انگریزی میں تھا، لہٰذا پتے میں لفظ پاکستان پڑھ کر تار پاکستان سفارت میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے فوراً مجھے پہنچا دیا گیا۔

کتاب کی طباعت کے سلسلے میں جو اعتنا آپ فرما رہے ہیں، اس سے میرا دل موم ہوا۔ آپ اس کو ضرور ایسا ہی کام جانیے جیسا وجیہہ کا۔ میرے دل کو آپ سے سراسر فرزندانہ تعلق ہے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں (گرمیوں کی چھٹیوں کے تین ماہ کے لیے) میں انشاءاللہ ایک لیکچر ٹور کے لیے امریکہ روانہ ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اُمید رکھتا ہوں کہ لطف خاص سے کتاب کی ایک کاپی جون کے شروع میں موصول ہو سکے گی۔ امریکہ میں میرا مستقل پتہ ممکن نہ ہوگا، اسی وجہ سے یہ درخواست ہے۔

میں نے اپنے چند خطوں میں اپنے ہدیۂ حقیر بخدمت اکیڈمی مبلغ پانچ سو روپے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ اس کو ہرگز اپنے مساعیٔ حسنہ کا عوض نہ جانیے۔ محبت کے اشاروں کا عوض میں کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ یہ قلیل رقم محض عقیدت کا ایک اظہار ہوگا اور اکیڈمی کی فعالیت کے ثواب میں شریک ہونے کو۔ اپنے آئندہ خطوں میں اس رقم کا ذکر نہ کروں گا لیکن کتاب کے دس نسخے جس روز ملیں گے (بشرطِ صحت و حیات من جانب اللہ) اسی روز اس رقم کا چیک بنام اکادمی پنجاب، لاہور روانہ کر دوں گا۔

ان دس نسخوں کے بعد مجھے اُمید ہے کہ پچیس نسخے علاوہ قیمۃً خریدوں گا۔ ان پچیس نسخوں کی قیمت مارکیٹ کی مقررہ قیمت کے مطابق جداگانہ ادا کروں گا۔

گتے اور اس کے ہمسائے کی جملہ یادداشتیں اس بار میں نے ایک ہی گتے پر درج کر دی ہیں۔ شیشے کے نیچے دبا کر رکھ لیجیے۔

انتسابی پرچہ بنام پروفیسر دانیال بدیز بھی ملفوف ہے۔ گھر میں سب کو آداب و دُعا بحفظ مراتب۔

خاکسار غمگسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

KUTABKHANA OSMANIA

متصوفانہ ترانے سنائے۔ ترانہ ہماری ٹھیٹ موسیقی میں ایک خاص اصطلاح ہے۔ ترانہ ہر راگ راگنی کا ہو سکتا ہے۔ اس کے بول تا۔ نا۔ در۔ دیر۔ دوم۔ توم وغیرہ ہوتے ہیں۔ محفل رات کے ایک بجے تک رہی۔ نہایت لطیف وجانفزا ''نے'' کا وہ نالہ نیم شبی کبھی نہ بھولے گا۔ اس کو سن کر آدمی چلا اٹھتا ہے۔

ہائے دنیائے دُوں! تجھ میں کیا رکھا ہے۔

خاکسار غمگسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

13 April, 19590

مولانا،

آپ کا پیغام کل تار جاں بن کر آیا۔ پاکستان سفارت کا ایک ملازم مجھے گھر آ کر دے گیا۔ ترکوں کے تار گھر میں انگریزی داں کم ہیں اور چونکہ پتہ انگریزی میں تھا، لہٰذا پتے میں لفظ پاکستان پڑھ کر تار پاکستان سفارت میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے فوراً مجھے پہنچا دیا گیا۔

کتاب کی طباعت کے سلسلے میں جو اعتنا آپ فرما رہے ہیں، اس سے میرا دل موم ہوا۔ آپ اس کو ضرور ایسا ہی کام جانیے جیسا وجیہہ کا۔ میرے دل کو آپ سے سراسر فرزندانہ تعلق ہے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں (گرمیوں کی چھٹیوں کے تین ماہ کے لیے) میں انشاءاللہ ایک لیکچر ٹور کے لیے امریکہ روانہ ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اُمید رکھتا ہوں کہ لطف خاص سے کتاب کی ایک کاپی جون کے شروع میں موصول ہو سکے گی۔ امریکہ میں میرا مستقل پتہ ممکن نہ ہوگا، اسی وجہ سے یہ درخواست ہے۔

میں نے اپنے چند خطوں میں اپنے ہدیۂ حقیر بخدمت اکیڈمی مبلغ پانچ سو روپے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ اس کو ہرگز اپنے مساعیٔ حسنہ کا عوض نہ جانیے۔ محبت کے اشاروں کا عوض میں کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ یہ قلیل رقم محض عقیدت کا ایک اظہار ہوگا اور اکیڈمی کی فعالیت کے ثواب میں شریک ہونے کو۔ اپنے آئندہ خطوں میں میں اس رقم کا ذکر نہ کروں گا لیکن کتاب کے دس نسخے جس روز ملیں گے (بشرطِ صحت وحیات من جانب اللہ) اسی روز اس رقم کا چیک بنام اکادمی پنجاب، لاہور روانہ کر دوں گا۔

ان دس نسخوں کے بعد مجھے اُمید ہے کہ پچیس نسخے علاوۂ قیمۃً خریدوں گا۔ ان پچیس نسخوں کی قیمت مارکیٹ کی مقررہ قیمت کے مطابق جداگانہ ادا کروں گا۔

گتے اور اس کے ہمسائے کی جملہ یادداشتیں اس بار میں نے ایک ہی گتے پر درج کر دی ہیں۔ شیشے کے نیچے دبا کر رکھ لیجیے۔

انتسابی پرچہ بنام پروفیسر دانیال بدیز بھی ملفوف ہے۔ گھر میں سب کو آداب و دُعا بحفظ مراتب۔

خاکسار غمگسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey

7 May, 1959

مولانا

کل صبح استنبول سے واپس آیا اور آپ کا فرحتِ جاں خط میز پر پڑا شعاعیں پھینک رہا تھا۔ استنبول کو میرا جانا یوم اقبال کی تقریب سے ہوا اور ترکی میں پہلی بار میں نے ایک پبلک جلسے میں آدھ گھنٹہ ترکی میں تقریر کی۔

آپ کو معلوم ہے کہ والد مرحوم کا تخصص تاریخ سلاجقہ میں تھا۔ ان کا کیمبرج کا مقالہ اسی میدان میں تھا اور بعد کو بھی سلجوقیوں کی تاریخ میں انہوں نے تحقیق جاری رکھی۔ اس کے باعث انقرہ اور استنبول یونیورسٹیوں کے مورخ پروفیسر والد مرحوم کا نام بخوبی جانتے ہیں اور یہاں دو پروفیسروں نے اپنی اپنی جگہ والد مرحوم کی ایڈٹ کی ہوئی سلجوقی تاریخ کی دو کتابوں کا ترکی ترجمہ عربی اور فارسی سے کیا ہے۔ اس معنوی نسبت سے ان پروفیسروں سے میرے بہت مخلصانہ تعلق پیدا ہو گئے ہیں اور قیامِ ترکی میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

آپ کی طرف سے یہ تسلی باعثِ شکرگزاری ہے کہ کتاب آخر مئی تک چھپ جائے گی۔ یکم جون یا جون کے پہلے ہفتے میں آپ کتاب کا ایک نسخہ ہوائی ڈاک سے بھیج دیں تو مجھے وسط جون سے پہلے مل جائے گا۔ باقی ''نو'' نسخے بحری ڈاک سے اسی وقت بھیجے جائیں تو جولائی کے شروع میں یہ بھی مجھے مل جائیں گے۔ اس طرح میں امریکہ کے ٹور سے قبل آپ کی خدمت میں چیک بھیج دوں گا۔

اُمید ہے کہ میرے استفسار ذیل کا جواب تحریر فرما کر آپ شکرگزاری کا موقع دیں گے۔

آپ کے مکتوب مرغوب میں گتے کے ملنے یا نہ ملنے کا ذکر نہیں اگر گتہ مل گیا ہے تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کتابت شدہ مواد میں گتے کی نشان دہی کے مطابق سب مضمون موجود ہیں یا نہیں۔ امید ہے کہ گتہ شیشے کے نیچے دبا لیا گیا ہوگا۔

مولانا! آپ کی صحت کی کمی کی خبر سے دل پر چوٹ لگتی ہے مگر یقین ہے کہ آپ کی روحانی قوتیں تداوی میں پیش پیش رہیں گی اور آپ کا نادر الحسن قہقہہ اور آپ کی گمک دار آواز کی بازگشت محفلوں سے اُٹھ کر خود ہی آپ کی تقویت کرتی رہے گی۔

اس خط کا جواب ضرور تحریر فرمائیں، تار پر آپ نے جو صرف بے جا فرمایا ہے اس کا مجھے رنج ہے۔

منشی محمد شریف صاحب کی یار فراموشی سے جو مسودہ جاتا رہا اس سے مجھے حد درجہ تشویش ہوئی، مطلع فرمایئے کہ تازہ گتے کی دلالت کے مطابق تمام مضامین شاملِ کتاب ہیں یا نہیں۔

گھر میں سب کو آداب و دُعا بحفظِ مراتب۔

خاکسار

داؤد رہبر

Ankara, Turkey